جدیداردو نظم اور تصورِ کائنات

[مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو]

مقالہ نگار:
غلام عباس
لیکچرار
گورنمنٹ ڈگری کالج ملک وال
ضلع منڈی بہائوالدین
فون نمبر:۰۳۴۵ -۶۳۳۰۰۶۶

نگرانِ کار:
ڈاکٹر جواز جعفری
ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اُردو
گورنمنٹ ایم۔اے۔او کالج
لاہور

شعبۂ اُردو
علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد
۲۰۱۶ء

اظہارِ تشکّر

شکرانے کے سجدے کی پہلی حق دار وہ ذات ہے جس نے مجھے قالبِ انسانی عطا کرنے کے ساتھ امتِ محمدی ؐ کا ایک فرد ہونے کا اعزاز بخشا۔ وہ ذات کے جس کی مرضی کے بغیر اس وسیع و عریض کائنات میں کوئی پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ پی ایچ ڈی کی ابتدا سے ہی دنیاوی مسائل نے یوں آن گھیرا تھا کہ اس مقالے کی تکمیل کی امید ٹوٹ ٹوٹ جاتی رہی لیکن شکرانے کے حق دار ہیں وہ تمام لوگ جو حوصلہ دیتے رہے‘ معاونت کرتے رہے اور آج ان کی کاوشوں اور دعائوں کی بہ دولت اس قابل ہوا کہ یہ مقالہ پیش کر پائوں۔

ان احباب میں سب سے پہلے میں اپنے محترم اساتذہ کے آگے سرِ تسلیم خم کروں گامحترم ڈاکٹر عبدالعزیز ساحرؔ صاحب‘ صدرِ شُعبۂِ اُردو علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اور محترم ڈاکٹر ارشد محمود ناشادؔ صاحب کا تعلق اساتذہ کے اس گروہ سے ہے جنھوں نے ہم جیسے لوگوں کو تحقیق کی راہ پر انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا۔ محترمہ ڈاکٹر محسنہ نقوی صاحبہ کا شمار شُعبہ کی ان ہستیوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اس دورانیے میں کبھی نرمی سے

سمجھایا اور کبھی گرمی سے چلنے پر مجبور کیا۔ پھر میری خوش قسمتی کہ مجھے محترم ڈاکٹر جوازؔ جعفری صاحب جیسے نگران میسر آئے جنھوں نے اپنی بگڑتی ہوئی طبیعت اور شدید مصروفیات کے باوجود مجھے اس راہ پر چلنے کا ہنر یوں دیا کہ ہمیشہ ان کا شرمندۂ احسان رہوں گا۔ اس تمام دورانیے میں وہ وقت بھی آیا کہ جب میں نے اس کام کو ادھورا چھوڑ دینے کا ارادہ کرلیا اور میں یہ بات پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ اگر اُس مشکل وقت میں ڈاکٹر جواز جعفری صاحب مجھے حوصلہ نہ دیتے تو یہ کام کبھی بھی مکمل نہ ہوپاتا۔ انھوں نے کتب کی دست یابی کے ساتھ ساتھ جس انداز میں فنی و فکری معاونت کی وہ میری زندگی کا حاصل ہے۔

مقالے کی تکمیل کے دوران بہت سے لوگوں سے واسطہ پڑا۔ اچھے تجربات بھی ہوئے اور برے بھی۔ لیکن اچھے تجربات کا احساس ہمیشہ میرے ذہن کے دریچوں پر دستک دیتا رہے گا۔ ان اچھی یادوں سے وابستہ لوگوں میں ڈاکٹر سعید احمد صاحب' اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی فیصل آباد ' شعبۂ اردو کا نامِ نامی انتہائی اہم ہے۔ انھوں نے مواد کی دست یابی اور فکری معاونت کا حق ادا کردیا۔ ان کی عطا کردہ کتب ایک لمبے عرصے تک میرے پاس رہیں اور ان کی دیر سے ترسیل کی وجہ سے جیسے ان سے دست بستہ پہلے معافی مانگی اب بھی اسی معافی اور دعا کا خواست گار ہوں۔ گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی فیصل آباد سے ہی محترم جناب ڈاکٹر طارق ہاشمی صاحب کا ممنونِ احسان ہوں کہ انھوں نے ٹیلی فون کے رابطے کے ذریعے ہی جو کہ عزیز دوست محمد رمضان بلوچ کی معاونت سے ہوا' میرا حوصلہ بھی بڑھایا اور اپنی کتاب بھی جو کہ اس وقت تک شایع نہ ہوئی تھی' ارسال فرمائی۔ ان کے شکریے کا فرض ادا کرنا بھی میری گردن پر ہے۔ محترم پروفیسر جمیل قلندر صاحب نے بھی نہ صرف اپنی دل کش کتاب سے نوازا بل کہ اپنے قلندرانہ انداز سے میری مہمان نوازی اور راہ نمائی بھی کی۔

محترم ڈاکٹر سہیل عباس خان بلوچ صاحب بھی خصوصی شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ملک سے باہر رہ کر بھی میری فنی و فکری معاونت کا حق ادا کردیا۔ میں گاہے گاہے انٹرنیٹ کے ذریعے اپنا کام انھیں بھی بھیجتا رہا اور وہ اس سلسلے میں میری راہ نمائی فرماتے رہے۔ محترم محمد نعیم صاحب' چیف لائبریرین گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی لاہور نے مجھ سے بالکل ان جان ہونے کے باوجود کچھ بہترین امدادی مواد جس دوستانہ اور مشفقانہ انداز میں میرے حوالے کیا وہ یقینا ان کی علم دوستی پر دال ہے جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔اس کے علاوہ ڈاکٹر راجا رمیض صاحب کے شکرانے کا قرض بھی میری گردن پر ہیں۔ وہ اپنے پیشے کے لحاظ سے پاکسان اٹامک انرجی کمیشن میں ایک محقق اور سائنس دان کے طور پر اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہیں لیکن ان کے ادبی ذوق اور عملی طبیعیات خصوصاً کوانٹم طبیعیات سے وابستگی نے بہت سے نئے پہلو اجاگر کیے۔

اس مقالہ کی تیاری کے دوران بہت سے رابطے بنتے رہے بگڑتے رہے' مگر کچھ لوگ ایسے تھے جن کے ساتھ کسی نہ کسی صورت رابطہ قائم رہا۔ میرے کلاس فیلو محترم محمد رمضان بلوچ اگرچہ خود ابھی تک تحقیق کے راستوں میں الجھے ہوئے ہیں لیکن جہاں کہیں ان کی ضرورت محسوس ہوئی انھوں نے بھرپور انداز میں تعاون کیا۔ محترمہ ڈاکٹر اسما امانت صاحبہ ' استاد شعبۂ اردو' گورنمنٹ گرلز کالج شاہدرہ نے میری معاونت اس موقع پر کی جہاں یہ تحقیقی کام ایک لحاظ سے ٹھہراؤ کا شکار تھا۔ اور یہ سب دراصل میرے عزیز

دوست اور ساتھی محترم شیخ محمد طاہر صاحب‘ استاد گورنمنٹ بوائز ڈگری کالج ملک وال کی کوششوں کے طفیل ممکن ہوا‘ جو اگرچہ خود تو انگریزی کے استاد ہیں لیکن ایک منفرد لب و لہجے کے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب پر ان کی گرفت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کا ایم اے انگریزی کا مقالہ میر اور غالب کی حسیت پر ہے پر اور ایم فل کا مقالہ سرسید احمد خان کے حوالے سے بہت سی نئی جہات کو سامنے لانے میں معاون ثابت ہوا ہے۔ شیخ صاحب کو اس مقالہ کی تسوید و پیش کش کے دوران میں ‘ میں اگر یارِ غار کہوں تو غلط نہ ہوگا۔ علاوہ ازیں میرے اپنے ادارے کے ساتھی اساتذہ میں محترم ڈاکٹر عبدالرئوف صاحب‘ پرنسپل گورنمنٹ بوائز ڈگری کالج ملک وال‘ ڈاکٹر فاروق احمد گوندل (شعبۂِ حیاتیات)‘ محترم ڈاکٹر خالد محمود (شعبۂِ کیمیا)‘ محترم دبیر عباس صاحب (شعبۂِ اردو)‘ محترم محمد خرم شہزاد صاحب (شعبۂِ ریاضی)‘ محترم محمد عامر رضا صاحب (شعبۂِ شماریات)وہ افراد ہیں جن کی معاونت میرا اثاثہ ہے اور میں اس کے لیے ان کا شکرگزار ہوں۔

تحصیلِ علم کے اس سفر میں بارہا مجھے لاہور اور اسلام آباد کی سڑکوں کی خاک چھاننا پڑی تو وہ افراد جنھوں نے بالخصوص ایک کشادہ دلی کے ساتھ میری میزبانی کا فریضہ رضا کارانہ طور پر اپنے سر لیا ان میں میرے دوست محترم فخر عباس صاحب ‘ استاد شعبۂِ فزکس اسلام آباد ماڈل سکول اور میرے عزیز دوست اور طلبہ محترم ملک محمد طارق ‘ اسلام آباد اور محترم محمد طیب رسول‘ لاہور شامل ہیں۔ علاوہ ازیں اس مقالے نے مجھے چند اچھے دوستوں سے نوازا جن میں ایک اہم نام سردار گوپال سنگھ چاولہ (چیئرمین پنجابی سکھ سنگت پاکستان‘ جنرل سیکرٹری پاکستان سکھ گوردوارہ پربندھک کمیٹی)‘ محترم سردار مہندر سنگھ (چئیر مین قومی کمیشن برائے انسانی حقوق و بین المذاہب ہم آہنگی ضلع ننکانہ صاحب)‘ محترم پیٹر پرسی صاحب (مہتم کیتھولک چرچ مال روڈ لاہور)اہمیت کے حامل ہیں۔ ان افراد نے مجھے نہ صرف اچھے دوست کے طور پر قبول کیا بل کہ بین المذاہب رشتوں کو سمجھنے میں بھی معاونت فرمائی۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب کا شمار بھی ان بزرگ ہستیوں میں ہوتا ہے جنھوں نے ابتدائی طور پر انٹرنیٹ کے ذریعے مجھے مطلوبہ مواد تک پہنچے کا راستا دکھایا۔میں ان سب کا ممنونِ احسان ہوں۔اس کے ساتھ وہ تمام ادبا بھی یقینا شکریے کے حق دار ہیں جن کی تحاریر سے اس مقالے میں کسی بھی صورت میں استفادہ کیا گیا۔

مقالہ کی تکمیل کے بعد اس کی پروف ریڈنگ ایک اہم مسئلہ تھا جس میں میری کلاس فیلو محترمہ کُبرٰی رشید صاحبہ کی معاونت حاصل رہی اور اس معاونت کے لیے میں ان کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ میرے چند قریبی دوست احباب بھی شکریے کے حق دار ہیں یہ وہ لوگ تھے جنھیں مجھ سے زیادہ اس مقالے کی تکمیل کی بے قراری تھی ۔ ان افراد میں میرے دوست محترم چودھری راشد صدیق‘ محترم چودھری محمد اشرف‘ میرے والد کااحساس دلانے والے بہنوئی محترم میاں عبدالعزیز اور چھوٹا بھائی محمد بلال شامل ہیں۔ مجھے اس کام کے لیے جہاں دوست حوصلہ دیتے رہے وہیں میرے رشتہ داروں میں میرے مرحوم چچا محترم چودھری حاجی محمد بشیر (اللہ انھیں جوارِ رحمت میں بلند مقام عطا فرمائے ۔ آمین) اور میرے گھر کے دیگر افراد جن میں میری بہنیں اور میری شریکِ حیات شامل ہیں ‘ مجھے مسلسل حوصلہ دیتے رہے۔ اس کے علاوہ میرے شکریے کے حق دار ہیں میرے وہ والدین جو اگرچہ آج اس دنیا میں موجود نہیں(اللہ کریم انھیں غریقِ رحمت کرے۔

آمین) لیکن یہ ان کی علم دوستی اور تربیت کا ہی فیضان ہے کہ میں یہ مقالہ پیش کرنے کے قابل ہوا۔اور آخری شکریہ ان دو ننھے معصوموں محمد اعمش عباس اور محمد شاہ میر عباس کا کہ جن کے حصے کا بڑا وقت اس مقالے کی نذر یوں ہوا کہ ان کی بہت سی کھلکھلاہٹوں کا حقیقی طور پر جواب اس مقالے کی مصروفیات کی وجہ سے نہ دے پایا۔

غلام عباس

پیش لفظ

زیرِ نظر مقالہ ’’جدید اردو نظم اور تصورِ کائنات‘‘ دراصل مختلف علوم کے تناظر میں کائنات اور انسان کے باہمی رشتوں کی کھوج کا اک سفر ہے۔ یہ ایک مشکل کام تھا۔ میں یہ دعوا تو نہیں کرتا کہ میں اس کا حق ادا کرپایا ہوں تاہم اس امر کا اعادہ ضرور کرتا ہوں کہ اپنی ناقص عقل کے مطابق میں نے مختلف علوم کی روشنی میں جس طرح اس کائنات کو سمجھا اسے پیش کرنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ اگرچہ یہ مقالہ جدید اردو نظم کو محیط ہے اور اردو نظم دنیا کے بہت سے ممالک میں کہی جا رہی ہے تاہم اس مقالے میں شامل ادبا کی اکثریت کا تعلق سرزمینِ پاکستان سے ہے۔ لہٰذا اسے اسی تناظر میں دیکھا جائے۔

یہ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب بہ عنوان ’’شاعری‘ سائنس اور کائنات‘‘ اس مقالے کا بنیادی باب ہے۔ اس باب میں اس بات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مختلف علوم و فنون نے ان کائناتی رشتوں کو کیسے سمجھا ہے۔ اس تفہیم کے لیے انسان کے عقلی سفر کو بھی راہ نما کے طور پر لیا گیا ہے۔ انسان کی ذہنی بلوغت وہ بنیادی عامل ہے جس نے انسان کو کائنات کو سمجھنے اور اپنے ‘ کائنات اور خدا کے درمیان رشتوں کو اجاگر کرنے پر ابھارا ہے۔ اگرچہ ان تمام افکار کو احاطۂِ تحریر میں لانا کارِ آسان نہیں تاہم کوشش کی گئی ہے کہ اس سلسلے میں اہم علوم کی مد میں سائنس‘ مذاہب‘ اساطیر اور ادب کے رشتوں کو واضح کیا جا سکے۔

باب دوم بہ عنوان ’’جدید اردو نظم کا فکری ارتقا‘‘ دراصل جدید اردو نظم کے فکری حوالوں کا بیانیہ ہے کہ کس طرح زمانے کے بدلتے ہوئے تناظرات جدید اردو نظم نگاروں کو متاثر کرتے رہے۔ ان عوامل کو سامنے رکھتے ہوئے چند اہم ادبا کے نمایاں فکری زاویوں کی مدد سے ایک ایسا راستا سامنے لانے کی سعی کی گئی ہے جس کی بہ دولت جدید اردو نظم نگار شعرا کی سوچ بدلتی چلی گئی اور ایک ایسے انسان کا ظہور ہونے لگا جو کائنات اور اس کے مظاہر کے بارے میں پہلے سے مختلف اندازِ نظر کے حامل ہوتے چلے گئے۔ نظم کے اس سفر کی ابتدا میں دیگر اصنافِ شعر کے مددگار رویّے کو بھی مختصر طور پر سامنے لاتے ہوئے اس باب کی ابتدا کا حصہ بنایا گیا ہے اور اس سفر کے تسلسل کا نقطۂِ اختتام عصرِ حاضر تک آپہنچتا ہے۔ یہ بات بھی اس مقالے کو سمجھنے میں مددگار ہوگی کہ تمام ادبا نے کسی نہ کسی صورت کائناتی تفہیم کی کوششیں کی ہیں تاہم اس مقالے میں عمومی طور پر ان شعرائے کرام کو جگہ دی گئی ہے جن کی سوچ کا عمومی محور یہ کائنات رہی ہے۔

باب سوم کا عنوان ’’جدید اردو نظم‘ کائناتی شعور اور فطری سائنسز‘‘ ہے۔ اس باب میں فطری سائنسز یعنی کیمیا‘ حیاتیات اور ریاضیاتی تناظرات میں کائناتی لوازمات کے نظریات اور ان کی جدید اردو نظم میں پیش کاری کو تحریر میں لایا گیا ہے۔ یاد رہے کہ طبیعیات کا تعلق بھی اگرچہ فطری سائنسز سے ہے لیکن کیوں کہ اس میں کائناتی تناظرات کا بیانیہ انتہائی زیادہ ہے لہٰذا اس کے لیے ایک علاحدہ باب بنایا گیا ہے اور طبیعیات اور مابعد الطبیعیات کے کائناتی تناظرات کو یک جا کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

باب چہارم بہ عنوان ’’جدید اردو نظم‘ سماجی سائنسز اور تفہیم کائنات‘‘ ہے۔ سماجی علوم نے بھی اس کائنات کو سمجھنے میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ باب ھذا میں ان علوم کے تناظر میں کائنات کو سمجھنے کی کوششوں کا جائزہ لیتے ہوئے جدید اردو نظم میں ان کی پیش کش کو موضوع بنایا گیا ہے۔

باب پنجم کا عنوان ’’جدید اردو نظم‘ طبیعیات اور مابعدالطبیعیات ‘‘ ہے۔ اس باب میں فلکیاتی اور طبیعیاتی اندازِ نظر سے کائناتی تفہیم کی کوششوں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے نیز کائناتی رشتوں کو سمجھنے کے لیے مابعدالطبیعیاتی عناصر کے کردار پر بھی بحث کی گئی ہے اور محاکمہ میں ان تمام مباحث کو سمیٹتے ہوئے نتیجے کو سامنے لانے کی سعی کی گئی ہے۔

یہ مقالہ عمومی طور پر سائنسی نکات پر بنیاد بنائے ہوئے ہے اور اس بنیاد کی پیش کاری جدید اردو نظم کے تناظر میں کی گئی ہے۔ کیوں کہ اس انداز کا کام اس سے پہلے نہیں کیا گیا ہے لہٰذا مقالہ نگار کو اپنے طور پر ہی اشیا کو ان رشتوں کے تناظر میں سمجھنا تھا۔ بنیادی مباحث کو ابتدائی باب میں اور ہر باب کی ابتدا میں سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے باقی مقامات پر ان افکار کی پیش کاری کو ہی موضوع بنایا گیا ہے اور جہاں انتہائی ضرورت محسوس کی گئی ہے وہاں ان عوامل کی وضاحت بھی کردی گئی ہے ورنہ عمومی انداز یہی رہا ہے کہ افکار کی پیش کش کو ہی اولیت دی گئی ہے ۔ لیکن جہاں بھی کچھ نیا پن سامنے آیا ہے اس کی وضاحت کو لازمی خیال کرتے ہوئے اسے بھی احاطۂ تحریر میں لایا گیا ہے۔ لہٰذا پہلا باب اور ہر باب کی ابتدا اس ضمن میں بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔

یہ مقالہ جدید اردو نظم کے تناظر میں کائناتی اور بین العلومی رشتوں کو سامنے لانے کی ایک ابتدائی کوشش ہے ۔ یہ ایک طالب علمانہ کوشش ہے اوراپنے علمی معیار کے مطابق اس سے انصاف کرنے کی بھرپور سعی کی ہے۔ کائناتی بے پناہی اور مختلف علوم کے تناظر میں یہ دعوا کرنا تو غلط ہوگا کہ اس کے ذریعے پوری کائنات کو حقیقی معانی میں سمجھ لیا گیا ہے تاہم اتنا ضرورہے:

؎تکمیلِ فن تو اک کٹھن کام ہے مگر
ہیں رہنمائے شوق ادھوری محبتیں

فہرست ابواب

نمبرشمار
عنوان
صفحہ نمبر
باب اوّل
شاعری٬ کائنات اور سائنس
۱
باب دوم
جدید اُردو نظم کا فکری ارتقا
۵۸
باب سوم
جدید اُردو نظم٬ کائناتی شعور اور فطری سائنسز
۱۱۶
باب چہارم
جدید اُردو نظم٬ سماجی سائنسز اور تفہیمِ کائنات
۲۰۵
باب پنجم
جدید اُردو نظم٬ طبیعیات اور مابعد الطبیعیات
۲۸۵

محاکمہ
۴۲۷

کتابیات
۴۳۵

باب اوّل

شاعری ‘ کائنات اور سائنس

یہ کائنات جسے انگریزی میں کبھی UNIVERSE کہا جاتا تھا جس کا لفظی مطلب ایک منفرد نوع ہے‘ ہمیشہ سے ہی انسان کی توجہ کا مرکز بنی رہی ہے۔ ابتداً یہ سمجھا جاتا رہا کہ شاید یہ اپنی نوع کی واحد قسم ہے اور ایسی کسی اور کائنات کا وجود کسی بھی صورت ممکن نہیں ہے لیکن وقت کے بدلتے ہوئے تناظرات نے اس UNIVERSE کو ایک نیا نام دے دیا جسے سائنسی اصطلاح میں MULTIVERSE کا نام دیا گیا۔ یہ بات اپنی جگہ بحث طلب ہے کہ یہUNIVERSE ہے یا MULTIVERSE تاہم اسے سمجھنے کی کوششیں ہمیشہ سے ہی انسان کا مطمعٔ نظر رہی ہیں۔ کائنات کا لفظ اپنے اندربہ ذاتِ خود ایک ہمہ گیری اور وسعت رکھتا ہے۔ جہاں افراد کے مختلف گروہ اس کے بارے مینمختلف نظریات رکھتے ہیں وہیں مختلف مذاہب اور دیگر علوم بھی اس کے بارے میں اپنا اپنا نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ جدید ماہرین کونیات میں کارل ساگان (Carl Sagan)کی مشہور زمانہ کتاب "Cosmos" نے جب ڈرامے کی صورت میں ٹیلی ویژن پر پذیرائی پائی تو لوگوں کے اذہان کو شدید طور پر متاثر کیا۔ کارل ساگان کائنات کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ

’’کائنات (Cosmos) وہ سب کچھ ہے جو آج ہے کبھی تھا اور کبھی ہو گا۔۔۔ کائنات کی عمر اور جسامت عام انسانی سمجھ سے بالاتر ہے۔ لامحدود اور لافانیت کے درمیان کہیں گم ہمارا حقیر سا سیاراتی گھر ہے۔۔۔ کائنات اتنی وسیع ہے کہ زمین پر استعمال ہونے والے عام پیمانے میٹر اور میل مضحکہ خیز لگتے ہیں۔ اس کی بجائے ہم یہ فاصلے روشنی کی رفتار سے ناپتے ہیں۔‘‘(۱(

اردو دائرۃالمعارفہ پر کائنات کی تعریف کرتے ہوئے وضاحت کی گئی ہے کہ وہ سب کچھ جو موجود ہے وہی کائنات ہے۔ اور بنیادی طور پر دو ہی چیزیں ہیں جو موجود کے دائرے میں آتی ہیں‘ 1۔ مادہ 2۔ توانائی‘ لہٰذا یوں بھی کہ سکتے ہیں کہ تمام مادے اور توانائی کو ملا کر مشترکہ طور پر کائنات کہا جاتا ہے۔ گو عموماً کائنات سے مُراد اجرامِ فلکی اور ان کے مابین موجود فضائیں اور ان کے مربوط نظام کی لی جاتی ہے جو قدرت کی طرف سے بنائے گئے ہیں ۔ مگر کائنات میں وہ سب کچھ ہی شامل ہے جو موجود ہے ۔۔۔کائنات‘ ذرّات اور

توانائی کی تمام موجودہ اقسام اور زمان و مکان کا وہ مجموعہ ہے کہ جس میں تمام عوامل و واقعات رونما ہوتے ہیں۔

اسی بات کو اگر کسی سائنسی علم کی بنیاد پر پرکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ کائنات دو چیزوں پر مشتمل ہے ایک خلا اور دوسرا مادہ ہے جو خلا کے اندر مختلف صورتوں میں موجود ہے اور مادہ مرکب ہے۔مادہ ایک جبر کا شکار ہے جس کا نام فطری عمل ہے جو ہر چیز پر ہر آن ہو رہا ہے اور کوئی بھی چیز جمود کی حالت میں نہیں ہے۔ یہ فطری عمل اجزائے کائنات میں تضادات کی وجہ سے جاری و ساری رہتا ہے۔(۲)یہ زمان و مکان مختلف النوع عوامل اور اشیا کا مرقع ہیں اور ہر شے کی ضد بھی اسی کائنات کا حصہ ہے۔ بالکل اسی طرح سے جیسے اندھیرے کے ساتھ روشنی‘ نیکی کے ساتھ بدی‘ جھوٹ کے ساتھ سچائی‘ خالق کے ساتھ مخلوق وغیرہ۔ انھی تضادات کی جھلک کو سائنس نے آج کائنات کے ہر ذرّے میں تلاش کر لیا ہے۔ اسی لیے تو سائنس یہ کہتی ہے کہ ہرBody کا Antibody بھی اسی کائنات کا حصہ ہے۔ حتیٰ کہMatter کے ساتھ Antimatterبھی اسی طرح موجود ہے۔ گویا یہ کائنات مجموعۂ اضداد کا نام ہے۔

’’ہر شے اپنے افتراق سے پہچانی جاتی ہے۔ ہر شے میں منفی اور مثبت عناصر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے ہیں جن کے سبب کائنات میں حرکت نظر آتی ہے اور تبدیلی کے عناصر بھی اس کش مکش میں در آتے ہیں۔ جن سے فکر کے نئے سرچشمے پھوٹتے ہیں۔‘‘(۳(

یہی اضداد ایک دوسرے کے ساتھ برسرِ پیکار رہتے ہوئے نہ صرف نظامِ کائنات میں توازن پیدا کرتی ہیں بل کہ اپنی خصوصیت و ماہیت کے اعتبار سے یہ انسان کو غور کرنے پر بھی اکساتی ہیں۔ لوازماتِ کائنات میں مادہ اور توانائی سب سے اہم ہیں۔ تاہم مادہ اور توانائی سے منسلک بہت سے تصورات‘ مثلاً خُدا‘ مخلوقات کی و اموات‘ روح اور مادہ کا تعلق‘ جبر و قدر‘ کائنات میں انسان کی تخلیق اور اُس کا مقام‘ بے تحاشا و بے محابہ کائنات میں ہمارے گھر یعنی زمین کا مقام و مرتبہ‘ زمان و مکان کے مباحث‘ آخرت‘ مخلوقات کے سماجی رشتے اور ان پر افکارِ کائنات کے اثرات‘ سوچ کی بلندی اور جسم و روح بھی زیرِ بحث آتے ہیں ۔ ان تمام عناصرکو سائنس‘ مذہب‘ فلسفہ اور تاریخی تناظر میں واضح کرنا بہت زیادہ وسعت کا حامل ہوگا۔ لیکن یہ تمام چیزیں کیوں کہ اس مقالے میں روح کا درجہ رکھتی ہیں اس لیے ہم انتہائی مختصر انداز میں ان کا تعارف کراتے ہوئے آگے بڑھیں گے۔کائنات نے روزِ اوّل ہی سے کسی نہ کسی صورت انسان کو خود پر اور خدا پر اور اپنے ‘ خدا اور کائنات کے باہمی رشتوں کو سمجھنے پر ابھارا ہے۔ اس سلسلے میں تمام علوم و فنون اپنا اپنا منفرد نظریہ رکھتے ہیں۔ جہاں ان نظریات میں یک سانیت اور ہم آہنگی دکھائی دیتی ہے وہیں ان میں اختلافات بھی خاصے گہرے ہیں۔ سب سے پہلے ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ مختلف علوم و فنون کس طور اسے واضح کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں اور عصرِ حاضر میں ان تناظرات کا مقام کیا ہے۔ ان تمام عوامل و نظریات کو سمجھنے کے لیے ہمیں جن چیزوں کی بنیادی تشریح و توضیح کی ضرورت ہے وہ کائنات کی تخلیق و ابتدا‘ اس کی انتہا‘ کائنات میں مقامِ خالق‘ مخلوقات کی پیدایش اور ان میں حضرتِ انسان کے مقام کی وضاحت سب سے بنیادی اہمیت کے حامل سوالات ہیں۔ بہ قولِ شاعر:

اس ایک بات کی مجھ کو تلاش ہے‘ جس سے

ہر ایک راز زمان و مکاں کا کھُل جائے
یہ آشکار ہو مجھ پر 'یہ کائنات ہے کیا؟
یہ آشکار ہو مجھ پر'یہ کائنات ہے کیوں؟
حقیقتیں ' کہ جو بکھری ہوئی ہیں ہر جانب
ہیں جزو ایک حقیقت کا ۔ اور وہ کیا ہے؟
ازل سے اس کا تعلق ہے کیا۔ ابد کیا ہے؟
یہ بات بھی مجھے اب تک نہ ہوسکی معلوم
ازل بھی کوئی حقیقت ہے' یا کہ واہمہ ہے؟
ابد بھی کوئی حقیقت ہے' یا کہ واہمہ ہے؟
ابد۔ ازل ہی کا پرتو ہے' یا کہ خود بھی ہے؟
مکاں کے بعد کوئی لامکاں بھی ہے کہ نہیں؟
زماں' مکاں میں کوئی فرق ہے تو وہ کیا ہے؟
زماں' مکاں میں تعلق اگر ہے' وہ کیا ہے؟
یہ باتیں راز ہیں' یہ راز فاش ہونا ہیں
یہ راز جب بھی کھلیں' آج یہ حقیقت ہے
حیاتِ نو کے تقاضے بلا رہے ہیں مجھے
حیاتِ نو' کہ جس کی تلاش مجھ کو بھی
حیاتِ نو ' کہ جو خود بھی مری تلاش میں ہے)کمال صدیقی:آفاق)(۴(

جب سے انسان نے عقل و شعور کی ہم راہی اختیار کی ہے تب سے ہی یہ کائنات اُس کی سوچ کا محور رہی ہے۔ اگرچہ آج دنیا کوGLOBAL VILLAGE کہا جاتا ہے' تاہم آج بھی دنیا کے مختلف خِطّوں میں بسنے والے لوگوں کے لیے شایدکسی دوسرے خِطّے میں بسنے والے لوگوں کے حالات کو سمجھنا مکمل طور پر ممکن نہیں ہے تو پھر زمانۂ ماضی کے افراد کے ادراک کا پیمانہ کیارہا ہوگا؟ لیکن اگر آج بھی اوّلین نسلِ انسانی کے کسی فرد سے مل پائیں تو یقیناً جس چیز کے بارے میں ہم اجنبیت کا شکار نہیں ہوں گے وہ ہمارے سر پر پھیلا ہوا وسیع و بسیط نیلا آسمان ہے۔ اسی لیے آسمان کی حقیقت ہمیشہ سے ہی بنیادی سوال کے طور پر سامنے رہی۔

جب میں پہلی بار آسمان سے اترا تو زمین نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا
آخری راستے پر چلتے چلتے مجھے اندھیرے نے گھیرلیا)زاہد ڈار)(۵(

آسمان خاموش ہے
آسمان نہ ہنس سکتا ہے' نہ روسکتا ہے
میں آسمان کے لیے فکر مند ہوں)زاہد ڈار)(۶(

یہ وہ مظہرِ قدرت ہے جس کا مشاہدہ ہر عہد کے انسان نے کیا چاہے وہ پتھّر کے عہد سے ہو' دھات کے عہد سے یا عصرِ حاضر کا انسان ہو۔ یہی وجہ ہے کہ علمِ فلکیات ان علوم میں گردانا جاتا ہے جنھیں انسان نے سب سے پہلے ایجاد کیا۔فلسفہ کے مطابق انسان نے اپنے طور پر اس کائنات کو سمجھنے کی کوشش میں دو بنیادی رویّے اپنائے:

ٍ ۱۔ عقلی ۲۔ غیر عقلی

عقلی رویوں کا تعلق استدلال سے ہے۔ جہاں تمام چیزوں کو علل و معلول کے حوالے سے پرکھنے کا ڈول ڈالا گیا۔ جب کہ غیر عقلی رویوں میں وہ تمام تر نظریات شامل ہو گئے جنھیں بغیر سوچے سمجھے صرف اس بنا پر اختیار کر لیا گیا کہ وہ روایات کی صورت نسل در نسل منتقل ہوتے رہے ہیں۔ نسل در نسل چلنے والے ان رجحانات نے بھی یقینا وقت کے بدلتے تقاضوں کے مطابق اپنے اندر مختلف تبدیلیاں کی ہیں۔

عقلی رویّے وہ تھے جنھوں نے بعد ازاں فلسفہ اور سائنس کی صورت اختیار کی ۔
فلسفہ کی تعریف و تاریخ بیان کرتے ہوئے سید علی عباس جلال پوری رقم طراز ہیں:

’’لفظ فلسفہ یونانی الاصل ہے اور سوفیا (دانش) اور فیلوس (محبت) سے مرکّب ہے۔ اس کا معنی ہے‘ دانش کی محبت‘ یہ ترکیب فیثاغورث نے وضع کی تھی۔ شروع شروع میں فلسفی کا اطلاق ہر اس شخص پر ہوتا تھا جو صاحبِ بصیرت اور خرد مند ہو۔ بعد میں جب اہلِ دانش نے اپنے افکار و آرا کو عقلی استدلال کے رنگ میں پیش کرنا شروع کیا تو مدلل علم کو فلسفہ کہنے لگے۔‘‘(۷(

جب کہ اس حوالے سے محمد دین شفیقی کا یہ کہنا ہے کہ

’’ہر ایک فلسفی ایک خاص فلسفہ رکھتا ہے اور اپنے سلیقے‘ ذوق اور معلومات کے مطابق خوشی و غم اور مرگ و زیست کی تاویل و تفسیر کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ جو کچھ اس کے لیے اچھا یا برا ہے‘ خواہ موجود ہے یا ہوگا‘ اس سے آگاہ ہوجائے۔‘‘(۸(

جب اسی فلسفیانہ نقطۂ نظر سے اس کائنات کو دیکھا گیا تو اس کے مہیب راز اپنا آپ عیاں کرنے لگے۔ جب انسان حقائق کی بجا آوری کی تلاش میں نکلتا ہے تو اس کائنات کی کوئی شے بھی اس کے تخیل کی دست رس سے باہر نہیں رہتی اور وہ یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ

کہکشاں میرے پائوں کے نیچے ہے
اور میرا سر اور سینہ کائنات سے باہر
کائنات جو میرے جیسے شاعر کے لیے بہت چھوٹی ہے
مفلس کی چدّر کی طرح
جسے اس کی محبوبہ نے سورج چاند ستاروں سے ٹھیک دیا ہو
پہلے میں شوقیہ فن کار تھا
دیوتائوں اور خدائوں کو تخلیق کرتا رہا
اب جاگتی سوچتی آنکھوں سے زمیں کو دیکھتا ہوں)مبارک احمد: زندگی کے سفر میں)(۹(

غیر عقلی رویّے‘ توہمات‘ دیو مالا اور مذاہب کی صورت میں سامنے آئے جن میں کسی چیز کو محض اجداد کی نسبت سے مان لیا گیا۔تاہم اس کی ابتدا بھی عقل کے استعمال ہی کے نتیجے کے طور پر سامنے آئی۔ مذاہب کے غیر عقلی ہونے سے ہرگز یہ مراد نہیں ہے کہ ان کا عقل سے بیر ہے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ واضح ہے کہ ہر مذہب کے بانی نے اولاً عقل کو ہی راہ نما بنایا اور اُسی کے ذریعے حالات کے مطابق تفہیم کی۔ تاہم بعد ازاں کُچھ طبقات کی طرف سے استدلال اور عقل پر پہرے بٹھا دیے گئے۔ جیسے مغربی دنیا جو آج عقل اور استدلال کو ہی سرمایۂ کل سمجھتی ہے‘ اُس پر ایک وقت ایسا بھی رہا ہے کہ جب بڑے بڑے لوگوں کو محض اس بنیاد پر صعوبتیں دی گئیں کہ ان کے افکار مروّجہ مذہبی افکار سے لگا

نہ کھاتے تھے۔ مذہب ہی کو بنیاد بنا کر سقراط کو زہر کا پیالا دیا گیا اور گلیلیو جیسے سائنس دان کو پھانسی کی سزا سُنائی گئی۔یہاں ہم فرداً فرداً ان نظریات کو چند اہم مذاہب‘ سائنسی افکار اور فلسفہ کے حوالے سے مختصراً واضح کرنے کی سعی کریں گے۔دیو مالا کے بارے میں علی عباس جلال پوری رقم طراز ہیں کہ

)’’دیو مالا) ان قصّے کہانیوں کا علم ہے جو دیوتائوں سے منسوب کی جاتی ہیں۔ دیو مالا کے وسیلے سے انسان نے قدیم زمانے میں کائنات کے ساتھ جذباتی تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔‘‘(۱۰(

شروع شروع میں انسان یہ سمجھتا رہا ہے کہ یہ کائنات صرف ہمارے سیّارے تک ہی محدود ہے۔ اسی لیے اس کی تمام تر کاوشوں کا مرکز یہ زمین ‘ آسمان اور انسان ہی رہے ہیں کیوں کہ انسان نے ہی زمین و آسمان کے ان گنجلک اندھیروں سے روشنی کی طرف سفر کرتے ہوئے دیگر عناصر کی وضاحت کی ہے۔ حالات جو بھی رہے ہیں ۔ ان میں معیارات بھی عقلی ہوں یا غیر عقلی تاہم اس تکوین سے فرار کبھی بھی ممکن نہیں رہا۔ ہر عہد کے رویّے اور رجحانات انھی باتوں کی غمازی کرتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً ان میں تبدیلی ضرور آتی رہی ہے۔ کبھی ان مباحث میں انسان کو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی تو کبھی خدا کو۔ اور ان دونوں کے باہمی تعلقات کی توضیح و تشریح کے لیے ہمیشہ کائنات نے ہی وسیلے کا کردار ادا کیا ہے یعنی کبھی کائناتی حوالے سے انسان نے خدا کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور کبھی یہ کہا گیا کہ اس کائناتی تناظر نے انسان میں خدا کا تصور پیدا کیاشکیل الرحمٰن کے بہ قول:

اساطیری کردارووقعات‘ انسان کی سائیکی سے بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ان سے انسان کے ابتدائی تخلیقی ذہن اور اس کی جمالیاتی کیفیات کو بہت حد تک سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔(۱۱(

زیرِ نظر مقالہ انھی تصورات کے گرد گھومتا ہے کہ یہ کائنات‘ کب ‘ کہاں‘ کس نے پیدا کی؟ اس کے کام کرنے کا طریقۂ کار کیا ہے؟ زمان و مکان کیا ہیں؟ اس کائنات کی حدود کیا ہیں؟ کیا انسانی شعور اس بلندی پر پہنچ سکتا ہے جہاں کائنات کی صحیح معنوی تفہیم ممکن ہو سکے؟ جب یہ کائنات بنی ہے تو کیا یہ اچانک بنی یا اس کے پیچھے بھی کوئی باقاعدہ پروگرام عمل پذیر رہا ہے؟ اگر یہ کائنات بنی ہے یا بنائی گئی ہے تو اس کا ارتقا کن اصولوں کے تحت ہو رہا ہے؟ وہ اصول و ضوابط جو اس ارتقائی سفر کی مختلف منازل کو آشکار کرتے ہیں‘ ان کے حوالے سے اس کائنات کا نقطۂ انتہا کیا ہے؟ انسان اس دنیا میں کس مقام پر فائز ہے؟ وہ مجبورِ محض ہے یا اس ارتقائی سفر میں مداخلت کی کوئی قوت رکھتا ہے؟ اگر وہ مداخلت کی کوئی قوت رکھتا ہے تو کس حد تک اور اگر مجبور ہے تو کتنا؟ حیات کیا ہے؟ ممات کیا ہے؟ کیا روح کی کوئی حقیقت ہے؟ وقت کیا ہے اور کیسے تشکیل پذیر ہوا؟تفہیمِ کائنات کی ابتدائی کوششوں نے دیومالائی ادب کو پیدا کیا۔ یہ دیو مالائی ادب انسانی فکر کی اڑان اور اس کے ارتقا کو بہت تفصیل سے واضح کرتا ہے کہ کس طرح انسان نے لمحہ بہ لمحہ فکری ترقی کے راستے پر قدم آگے بڑھائے ہیں۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

ـوقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

اور ذہنِ انسانی صدیوں کی پرورش کے جن مراحل سے گزرا اُن کا سب سے بہترین اظہار دیو مالائی ادب میں ہوتا ہے۔ انسان چاہے دنیا کے کسی بھی خطّے میں بستا ہو‘ اس کا

تعلق کسی بھی تہذیب سے ہو، یہ حقیقت کسی صورت بھی بھلائی نہیں جا سکتی کہ کبھی اس پر ایسا وقت بھی یقینا رہا ہوگا جب اُسے اپنی کم مائیگی کا احساس شدت سے دامن گیر رہا ہوگا اور اس نے تفکّرِ کائنات کو اپنی زندگی کا مقصد بناتے ہوئے اس دنیا اور اس کی حقیقت کو سمجھنے کی سعی کی ہوگی۔ انسانی تاریخ نے نشوونما اور تہاذیب کے مختلف ادوار دیکھے ہیں۔ یہ تاریخ پتھر، لکڑی، دھات کے زمانوں سے ارتقائی سفر کرتے ہوئے آج اک ایسے موڑ پر آکھڑی ہوئی ہے جہاں یہ عہدِ قدیم کے انسان کو حیرت ناک نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ ہمارا عہد ، ہمارا طرزِ زندگی اور ہماری زندگی کے لوازمات ماضی سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں تاہم ایک بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ ایک بنیادی چیز ایسی ہے جس پر سوچ بچار کرنے میں اس عہد کا انسان اور عصرِ حاضر کا انسان ایک ہی سطح پر کھڑے ہیں تو غلط نا ہوگا۔ اور وہ چیز آسمان ہے۔ آسمان ابتدا سے ہی انسانی سوچ کا مرکزو محور رہا ہے۔ اگر آج کا انسان آسمان میں تھگلی لگانے کے لیے سرگرداں ہے تو قدیم انسان نے بھی اس تک رسائی کی سعی کی ہے اور اس کی دوری اور بلاخیزی نے اسے سوچنے کا ایک نیا انداز دیا اور یہ آسمان اس کے لیے دیوی دیوتائوں کی جائے رہایش قرار پایا۔

سید علی عباس جلال پوری ’’رسومِ اقوام‘‘ کے پیش لفظ میں رقم طراز ہیں:

’’علم الانسان کے مطالعے کے دوران میں راقم السطور کو اقوامِ عالم کی رسوم کا جائزہ لینے کا موقع ملا اور اس ضمن میں چند دل چسپ انکشافات ہوئے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ رسمیں بڑی حد تک آپس میں ملتی جلتی ہیں--، روحوں سے رابطہ قائم کرنے کے لیے کم و بیش ملتے جلتے ٹونے کیے جاتے ہیں۔ دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ اکثر معاشرتی رسموں میں جادو، ارواح کے مت اور قدیم مذہب کے شعائر کے جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔‘‘(۱۲(

اگردنیا کے کسی بھی مذہب کی تاریخ کو اٹھا کر دیکھا جائے تو اس میں ہمیں قصّے کہانیاں ملتی ہیں اور انھی کہانیوں کی بہ دولت تعلیمات دوسروں تک پہنچانے کی سعی دکھائی دیتی ہے۔ دیو مالا ئی ادب دراصل انسانی آتما کی ندا اور انسانی تفکر کی آواز ہے۔ یہ ایک ایسی صدا ہے جس کی بازگشت ہر دل اور ہر ذہن کے ایوان میں ہزار ہا برسوں سے سنائی دے رہی ہے اور جب تک نسلِ انسانی اس خِطۂِ زمین پر باقی ہے تب تک یوں ہی گونجتی رہے گی۔ عالمی کلاسیکی ادب کی یہ دیو مالائی کہانیاں بہ ظاہر صد رنگ ہیں مگر حقیقت میں ان کا ایک ہی رنگ ہے جو قدرت کی نیرنگیوں اور رازوں سے پردہ ہٹانے کی کوشش میں سرگرداں انسان کی کہانی ہے۔ سومیری اور بابلیوں کی گل گامش کی داستان ہو یا مصریوں کے غرقاب سفینہ کا ملاح، یونانی ہومر کی ایلیڈ اور اوڈیسی ہو یا لاطینی شاعر ورجل کی اینیڈ، کیلٹس کی فنجل اور ٹیمورا ہو یا سیکنڈے نیویا کی والسونگا ساگا، جرمنوں کی رزمیہ نی بی لنگ این لینڈ ہو یافن لینڈ کی کلے ولا، آرتھر اور شارلیمانی رومانز ہوں یا جزیرہ نما سپین کی رزمیہ ایمیڈس ڈی گال، چینی و جاپانی اساطیر ہوں یا ہندوستانی رزمیہ مہا بھارت اور رامائن یا ایران کا شاہ نامۂِ فردوسی۔ بہ ظاہر یہ ہمیں مختلف خِطوں ، نسلوں اور تہاذیب سے متعلق نظر آتی ہیں تاہم ہیئت، موضوع اور مواد کے اعتبار سے سب ایک ہی نوعیت کی ہیں۔ یہ تمام تر کہانیاں جہاں انسان کی ذہنی ترقی کو تاریخی تناظر میں سمجھنے میں معاون ہیں وہیں یہ انسان اور کائنات کے رشتوں کی بھی وضاحت کرتی ہیں۔ اور یہ رشتے انسان کو ہمہ دم اک نئے پن کی تعلیم دیتے ہیں کیوں کہ ہر لمحہ ایک نئی دریافت کا لمحہ ہے۔

تم اتنے مضمحل کیوں ہو
اٹھو اور کینچلی بدلو!
تمھارے سب رویّے اب پرانے ہوچکے ہیں
تمھیں اس اجنبی بہروپ میں رہتے
--- زمانے ہوچکے ہیں

)شہزاد احمد: تم اتنے مضمحل کیوں ہو)(۱۳(

یہ دیو مالائی کہانیاں انسان کے عقلی سفر کے وہ پہلے نقوش ہیں جن میں دیوی دیوتائوں کے قصّے بیان کرتے ہوئے کائنات میں خالق کا مقام اور انسان کی حیثیت کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ کائنات کے کام کے طریقہ ہائے کار کی وضاحت بھی ملتی ہے۔ ان دیومالائی قصّوں میں مختلف دیوی دیوتائوں کو مختلف کاموں کی تفویض بھی بڑی واضح ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ علاقائی سطح پر پنپنے والی ان کہانیوں میں ایک ہی کردار مختلف نام بھی رکھتا ہے اور ایک ہی نام کے مختلف کردار بھی سامنے آتے ہیں۔ جیسے سومیری دیوی ’’اننا‘‘ اور یونانی دیوی ’’عشتار‘‘ ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں جو علاقائی تنوع کی بدولت مختلف نام ضرور رکھتی ہیں لیکن درحقیقت یہ تخلیق کی دیوی ‘دھرتی ماتا کی ہی شکلیں ہیں۔ اسی طرح سیاسی ‘ معاشی و معاشرتی حالات کے مطابق بھی دیوی دیوتائوں کے مقام میں تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ زیرِ نظر مقالہ میں ہم دنیا کی اہم تہاذیب کے حوالے سے فکری اثاثہ ‘جو کائناتی تفکر سے متعلق ہے‘ کو مختصر الفاظ میں بیان کرنے کی سعی کریں گے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان دیوی دیوتائوں کو انسان نے ہمیشہ ہی خود سے بالاتر مانا ہے۔ انھیں سمجھنے کے لیے انسان نے اپنے شعور کی پرواز کا سہارا لیا ہے۔ کیوں کہ انسان کا شعور صرف اپنی ہی ذات تک محدود رہا ہے لہٰذا اس دیومالائی ادب میں ہمیں جن دیوی دیوتائوں کا ذکر ملتا ہے ان کی اشکال اور اطواروعادات میں بھی انسان کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً یہ دیوی دیوتا بھی انسانوں کی طرح محبت‘ نفرت‘ خوشی اور غم کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں باہم قربت کے ساتھ ساتھ باہم بُعد بھی موجود ہے اسی لیے یہ بھی انسانوں کی طرح کسی بات پر باہم لڑتے بھڑتے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ قربانیوں سے خوش ہو کر نوازتے بھی ہیں اور اپنے احکام کی حکم عدولی کی بنا پر شدید برہمی کا اظہار کرتے ہوئے نقصان بھی پہنچاتے ہیں۔ جہاں تک ان کی اشکال کا تعلق ہے تو وہاں بھی انسانی شعور کی کارفرمائی دکھائی دیتی ہے۔ ان کی اشکال ہی ان کی خصوصیات کا علامتی اظہار ہیں۔ مثلاً راون کے گیارہ سر ہیں جن میں سے دس انسانی اور ایک گدھے کا ہے۔ یہ دس سر اس کی عقل پر دلالت کرتے ہیں اور گیارھواں سر اس کی حماقت کا اظہاریہ ہے۔ اسی طرح کئی قدیم دیوتائوں کے سر بیل کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ عہدِ قدیم سے ہی بیل کو طاقت اور بارآوری کا مظہر مانا جاتا رہا ہے۔ خصوصاً زرعی معاشرہ میں تو انسانی زندگی کا انحصار ہی بیل پر رہا ہے۔ جس کی طاقت نہ صرف ہل چلانے میں استعمال ہوتی تھی بل کہ اسی کے ذریعے انسان گھرے کنوئوں سے پانی بھی نکالا کرتا تھا۔ اسی کے طفیل نسل کشی بھی ہوا کرتی تھی۔ لہٰذا تمام تر قوتوں کا علامتی اظہار بیل کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ ماہرینِ زبان و ادب تو اس بات پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ انگریزی کا حرفِ تہجی (A) بھی بیل کے سر کی الٹائی ہوئی شکل ہے اور اس کی قوت کا علامتی اظہار ہے۔ تاہم یہ بات بھی اہم

ہے کہ ان دیوی دیوتائوں کو انسان نے کئی صفات سے مملو دکھانے کے لیے کئی کئی اشکال کے مجموعے بھی تخلیق کیے۔ جن میں انسان اور دیگر جانوروں کا انضمام دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیوی دیوتائوں کی جو مورتیاں پیش کی جاتی ہیں اور کی جاتی رہی ہیں ان میں بھی انسان اور دیگر جان ور ایک دوسرے سے باہم پیوست دکھائی دیتے ہیں اور ہر شکل ان خصائص کو بھی ظاہر کرتی ہے جن میں وہ دیوی یا دیوتا ممدومعاون ثابت ہوسکتے ہیں۔

آسمان کے بعد دوسری چیز جس نے انسانی سوچ کو اپنی طرف مبذول کیا وہ زمین ہے۔ جس طرح قدیم دیومالائی ادب میں آسمان کا بیان بارہا ہے اسی طرح زمین کا ذکر بھی جابجا ہے۔ قدیم عہد کا انسان نسوانی معاشرے کا انسان تھا جہاں عورت کو عظمت حاصل تھی۔ وہی قبیلے کی سردار اور تمام معاملات کی نگران سمجھی جاتی تھی۔ یہ انداز آج بھی بہت سے افریقی قبائل میں مروّج ہے۔ اس کی بنیادی وجہ عورت کی خالق کی حیثیت تھی جو جنم داتا کا درجہ رکھتی تھی۔ اسی کے ساتھ یہ تصور بھی روز افزوں ہوتا گیا کہ زمین بھی عورت ہی کی طرح تخلیق کا باعث ہے جو کہ مختلف نباتات کو جنم دیتی ہے۔ اُموی معاشرے میں عورت کے برتر مقام کی طرح زمین کو بھی دھرتی ماتا کے درجے پر فائز کردیا گیا۔

مادری معاشرے کے بعد جب مرد کو تفوّق حاصل ہوا تو پہلے جو مقام زمین کو حاصل تھا وہی مقام آسمان کو مل گیا۔ زمین نے ماں کا درجہ پایا تو آسمان نے باپ کا۔ ان دونوں کے ساتھ تثلیث میں شمولیت اختیار کرنے کے لیے سورج بھی آدھمکا کیوں کہ وہ بھی تو آسمان کی زینت ہے۔ اور باپ کی ہم سری میں اسے بھی بسا اوقات باپ کے برابر قرار دے دیا گیا۔اس طرح تخلیقی عوامل میں درجہ بہ درجہ دیگر عوامل شمولیت اختیار کرتے چلے گئے۔ آہستہ آہستہ انسان نے بہ تدریج دیگر مظاہرِ فطرت کو بھی خدائی کا درجہ دے کر ان کے سامنے سر کو جھکانا شروع کر دیا۔

تخلیقِ کائنات اور اس کے طریقہ ہائے کار کا تمثیلی بیانیہ ہمیں انسانی تاریخ کے دیومالائی ادب میں دکھائی دیتا ہے۔ اسی میں ہمیں خدا کے مقام کی طرف بھی نشانات دکھائی دیتے ہیں کہ کس طرح انسان نے دیوی دیوتائوں کی اس کثرت سے وحدت کی طرف سفر طے کیا۔ اسی سفر کے دوران مینہی مختلف مذاہب اور اخلاقی قوانین نے ترقی کی منازل طے کیں۔ اگر ہم ان دیومالائی عناصر پر غور کریں تو واضح ہوتا ہے کہ ابتدا میں انسانی عقل و شعور انتہائی محدود تھا لیکن اس کی حد بندی سے کبھی خارج نہ ہونے والے عناصر میں انسان‘ خدا اور ان دونوں کے درمیان باہمی تعلق ہمیشہ شامل رہے۔ لہٰذا خدا کی ذات کے بعد جو سب سے زیادہ مباحث دکھائی دیتے ہیں وہ انسان کی اپنی ذات سے ہی متعلق ہیں۔ خدا پر کیے گئے مباحث میں بھی انسان کسی نہ کسی صورت سامنے ضرور رہا ہے اور انسان نے اپنے شعور کے مطابق ان دیومالائی داستانوں میں خدا اور اس کائنات کی وضاحت کی کوششیں کی ہیں۔اس حوالے سے’’اساطیر‘‘ اظہر غوری کی ایک طویل نظم ہے‘ جس میں کائنات کو سمجھنے کی بہت سی جہات ملتی ہیں جن کا تعلق‘ مذہب‘ سائنس‘ فلسفہ اورقدیم اساطیر سے ہے۔ وہ اس طویل نظم کی ابتدا اس سوال سے کرتے ہیں کہ تخلیق کیسے ہوئی اور پھر ا س سفر پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

)زن ومرد خود کو مخلوق کہلوانا پسند کرتے رہے ہیں‘ اسی لیے
سب سے بہتر خالق کی تلاش ہمیشہ سب سے بڑا مسئلہ رہی ہے
افسوس کہ کوئی ایسا کیلنڈر نہیں جو

کرۂ ارض کے بننے یا انسان کے معرضِ وجود میں آنے کا پتا دے سکے‘ پھر بھی
میرے ذہن سے خیالات اور حقائق کا جھرنا یوں پھوٹتا ہے‘ جیسے
شمسی آندھی سورج کی مقناطیسی لہروں کے گرد دائرے میں گھومتی ہے‘ اور
خلا میں موجوں کی صورت بہت دور تک بہتی چلی جاتی ہے
میرے اردگرد بے تُکی اساطیر کا انبار لگا ہے
)میں جس میں سے اپنی تحقیق و تخلیق کی راہ ہموار کررہا ہوں (
تحقیق کے نتیجے میں ہر بار ایک نہ ایک نئی کہانی ہی سامنے آتی ہے:
بابلی عقیدے کے مطابق ابتدا میں کائنات بے آب و گیاہ تھی
یہودا نے زمین و آسمان کو بنایا
زمین کی مٹّی سے انسان کو گھڑا‘ اُس کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا‘ پھر
مشرق کی طرف باغِ عدن بنایا‘ جس میں ہر قسم کے درخت تھے‘ شجرِحیات اور نیک و بد کی پہچان کا درخت بھی
بیچ میں ایک دریا تھا‘ جو باغ سے نکل کر چار حصّوں میں بٹ جاتا:
جیجوں‘ سیحوں‘ دجلہ اور فرات
پھر سب پرند چرند پیدا کیے‘ آدم نے اُن کے نام رکھّے
پھر حوّا کو آدم کی پسلی سے پیدا کیا
یہودیوں کے خدا نے اپنے آخری حکم میں
بیویوں اور مائوں کو مویشیوں اور جائیداد کے برابر مرتبہ دیا
مَردوں کوباقاعدہ یہ دُعا مانگنی پڑتی تھی:
’’ اے خدا میں تیرا ممنون ہوں کہ تو نے مجھے کافر یا عورت نہیں بنایا‘‘
تحقیق کے نتیجے میں ہر بار ایک نہ ایک نئی کہانی ہی سامنے آتی ہے:
بعل‘ پورے کنعان میں افزایش ‘ زرخیزی اور بارش کا دیوتا مانا جاتا
اُس کے برعکس یم دیوتا سمندر‘ موت اور تخریب کی علامت تھا
تجربہ بتاتا ہے کہ سمندر اہلِ کنعان کا دُشمن تھا
دراصل جہاز رانوں کی قوم کو دن رات خوف ناک موجوں سے نبرد آزما رہنا پڑتا
چوں کہ درختوں‘ سبزہ زاروں‘ پھلوں‘ پھولوں‘ کھیتوں‘ مویشیوں‘ اور
انسانوں کو لازماً موت کا مزہ چکھنا ہوتا تھا‘ لہٰذا
بعل اور یم کی جنگ واقعتا تخلیق اور تخریب کی طاقتوں کی جنگ تھی
ہر سال خزاں کے موسم میں موت غالب آجاتی‘ اور پھر
موسمِ بہار کی آمد پر بعل دیوتا دوبارہ زندہ ہوجاتا
تخلیق و تخریب کا یہ نظام ابدی سمجھا جاتا تھا اور موجوداتِ عالم کا سبب بھی
تحقیق کے نتیجے میں ہر بار ایک نہ ایک نئی کہانی ہی سامنے آتی ہے
پان کو‘ اٹھارہ ہزار برس تک انڈے جیسے ہون تون میں پرورش پاتا رہا
اندرونی تاریک حصّہ زمین بنا اور بیرونی چمکیلا حصّہ آسمان
مزید اٹھارہ ہزار برس تک روزانہ آسمان دس فٹ اونچا‘ اور
زمین دس فٹ نیچے ہوتی چلی گئی
پان کو کا قد بھی روزانہ دس فٹ بڑھتا گیا

جب زمین اور آسمان میں تیس ہزار میل کا فاصلہ ہوا تو پان کو مرگیا‘ تب
اُس کے بدن کے حصّے قدرتی عناصر میں تبدیل ہوگئے
سر سے پہاڑ بن گئے‘ دا ہنی آنکھ سورج اور بائیں چاند بنی
سانس سے ہوا اور بادل بنے‘ آواز گرج چمک بن گئی
اس کے خون سے دریا اور سمندر بنے
رگوں اور پٹھّوں نے زمین کی تہوں کی شکل اختیار کرلی
اس کے گوشت سے زمین اور ہریالی وجود میں آئی
سر کے بالوں سے ستارے اور جوئوں سے سیّارے بنے
دانتوں اور ہڈیونسے دھاتیں بنیں
اس کا پسینہ بارش میں تبدیل ہوگیا‘ اور
اس کے بدن سے لپٹی جونکوں سے مختلف جان دار پیدا ہوئے
تحقیق کے نتیجے میں ہر بار ایک نہ ایک نئی کہانی ہی سامنے آتی ہے:
نوکوا دیوی نے پیلی مٹّی کو پِیٹ پِیٹ کر آدمی بنائے
یہ بڑی محنت کا کام تھا‘ سارا دن اسی میں صرف ہوجاتا‘ لہٰذا
اس نے ایک رسّی لی اور اسے کیچڑ میں بھگودیا‘ جس سے ٹپکتے ہوئے قطرے آدمی بنے
تحقیق کے نتیجے میں ہر بار ایک نہ ایک نئی کہانی ہی سامنے آتی ہے:
آریائوں کی رگ وید کا کردار اِندر دیوتا دھرتی اور آکاش کا بیٹا تھا
اُس کی پیدایش کے وقت زمین آسمان آپس میں جڑے ہوئے تھے
اُس نے دھرتی کی چھاتی سے نکلا ہوا سوم رس پیا
اس کی طاقت کے خوف سے آسمان زمین سے دور چلا گیااور بیچ میں اُس کا راج ہوگیا
تحقیق کے نتیجے میں ہر بار ایک نہ ایک نئی کہانی ہی سامنے آتی ہے:
ازل سے دُنیا کے سمندر پر کنول کا پھول اُگا
جس میں انوم دیوتا نے جنم لیا
اس کی اولاد نے سینڈوچ کی طرح جُڑے ہوئے زمین اور آسمان کو الگ کیا
تحقیق کے نتیجے میں ہر بار ایک نہ ایک نئی کہانی ہی سامنے آتی ہے:
نارائن ایک ہزار برس تک سمندر پر تیرتے انڈے میں لیٹا رہا‘ پھر
اُس کی ناف سے کنول کا پھول اُگا جو ہزار سورجوں سے زیادہ چمک دار تھا
اور جس میں ساری کائنات سماسکتی تھی
اس کنول سے برہما نکلا (جس میں نارائن کی طاقت تھی)
جس سے دُنیا کی تمام چیزیں پیدا ہوئیں‘ جنھیں شکل اور نام دیے
تحقیق کے نتیجے میں ہر بار ایک نہ ایک نئی کہانی ہی سامنے آتی ہے:
ہندی دیو مالا کے خالق برہما نے دنیا کو پیدا کیا تو
پہلے مختلف عناصر سے سورج‘ چاند‘ ستاروں‘ پہاڑوں اور جنگلوں کی
اور بالآخر آدمی کی صورت بنائی
عورت وضع کرنے کے موقع پر تمام ٹھوس عناصر صرف ہوچکے تھے‘ چناں چہ
اس تخلیق کے لیے اسے عجیب و غریب خمیر تیّار کرنا پڑا
اس مجموعۂ اضداد میں بہت سے مجرّد اجزا شامل تھے

چاند کی گولائی، سورج کی کرنوں کی چمک دمک، ہوا کے جھونکوں کی متلوّن مزاجی،
کُہر کے آنسو، گھاس کی تھرتھراہٹ، بیلوں کے پیچ و خم،
درختوں کے سوتوں میں چمٹنے اور لپٹنے والی وہ قوّت، جو ایک درخت کو دوسرے سے ملا دیتی ہے
روئیں کی نرماہٹ، نرسل کی نازک بدنی، پھولوں کا مخمل
پروں کی سبک رفتاری، قُمری کی چہک، شور مچانے والے پرندوں کی دماغ چٹ بکواس
مور کی خود پسندی، غزالِ رعنا کی شوخیٔ چشم، خرگوش کی بزدلی،
باگھ کی بے رحمی، سانپ کا زہر،
شہد کی مٹھاس، آگ کی گرم جوشی، برف کی ناگوار سردمہری اور ہیرے کی کنی کی سختی
آدمی عورت کو پاکر خوشی کے مارے باغ باغ ہوگیا کہ
رفیقۂ حیات اس کے رنج و غم کی شریکِ حال رہے گی، لیکن
کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اُس نے کہا: ''اے برہما!
آپ کی عطا کردہ مخلوق نے تو میری زندگی اجیرن کردی ہے
یہ لگاتار توجّہ کی طالب ہے، یکساں کلکلاتی اور بکواس کرتی رہتی ہے
ہردم پاس و لحاظ چاہتی ہے
بے وجہ روتی دھوتی اورچیختی رہتی ہے، بے حد کاہل اور آرام طلب ہے''
شکایت سُن کر برہما نے عورت کو آدمی سے واپس لے لیا
چند روز کے بعد آدمی پھر عرض پرداز ہوا: ''میرے مالک!
عورت کے بغیر میری زندگی تو سُنسان اور بے یارومددگار ہوگئی
میں تنہائی سے اُکتا اور گھبرا گیا ہوں
مجھے اُس کا ہنسنا، بولنا اور دل لُبھانا یاد آتا ہے
اُس کا پیار، چائو اورچمٹنا ترساتا ہے
میں عورت کی رفاقت میں آسودگی محسوس کرتا اور میرا غم غلط ہوجاتا تھا
اُس کے باعث مجھے تاریکی میں اجالا محسوس ہوتا تھا
اس کی شیرینی سے میری تمام تلخیاں دور ہوجاتی تھیں
اب میں اُس کے لیے رات دن تڑپتا رہتا ہوں''
یہ سب کچھ سُن کر برہما مُسکرایا اور دوبارہ عورت کو مرد کے حوالے کردیا
بہ مشکل کچھ ہی دن گزرے ہوں گے کہ آدمی ایک بار پھر حاضر ہوا، اور
ہاتھ جوڑ کر التجا کرنے لگا: ''میرے مالک!
عورت خوشی دینے سے زیادہ مجھے مصیبت میں گرفتار رکھتی ہے
مجھے اس سے نجات دلائیے''
برہما نے جھنجھلاکر کہا:''چلو اپنا راستالو، اور نباہ کی حتّٰی المقدور کوشش کرو''
آدمی نے گڑگڑا کر عرض کی: ''اے میرے مالک! میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتا''
برہما نے جواب دیا:''مگر تم اس کے بغیر بھی زندہ نہیں رہ سکتے''
پس مرد اور عورت کے ساتھ دنیا کا آغاز ہوگیا اور اُن کے سبب
محبت و نفرت، رشک و رقابت، رنج و راحت، وفاداری و بے وفائی اور
رومان کی سیاہ کاری کا دور دورہ ہوگیا

میں خواہ ایک ہی موضوع پر باربار تحقیق کروں
اُس کے نتیجے میں ایک نہ ایک نئی کہانی ہی سامنے آتی ہے :
چار ارب برس قبل زندگی کا آغاز ہوا
ساٹھ ہزار برس متواتر بارشوں کے باعث
کرۂِ ارض کا درجۂِ حرارت کم ہوتا ہوا موجودہ ماحول تک پہنچ کر ٹھہر گیا
آتش فشاں لاوا جما تو زمین مختلف جغرافیائی خطّوں میں تقسیم ہوتی چلی گئی
نشیبی خطّوں میں جھیلیں اور سمندر وقت کے ساتھ ساتھ اپنی حدود کا تعین کرتے رہے
جہاں جہاں زندگی کی ابتدا ہوئی ' وہاں آبی نباتات نے فضا تشکیل دی
پھر تیرتی ہوئی مخلوق آہستہ آہستہ خشکی تک پہنچ کر
رینگنے' چلنے پھرنے' چوکڑیاں بھرنے اور اُڑنے لگی
برِّ اعظم ایک دوسرے سے ٹکراتے اور سرکتے رہے
تب زمینی فضا میں آکسیجن عنقا تھی
تب کائنات کی تابکاری بلاروک ٹوک زمین پر آکر اصل توانائی کی طرح
مختلف کیمیائی مادوں کو آپس میں ملا کر پیچیدہ کلاں سالمے بناتی تھی' جو
اپنے آپ کو دو بالکل ایک جیسے حصّوں میں تقسیم کرنے کی
زبردست اور حیرت انگیز صلاحیّت رکھتے تھے
تب زندگی کے آثار مکمل ہوئے اور ارتقا کا طویل عمل شروع ہوگیا
پہلے پہل یک خلوی نامیے کا ایک پیچیدہ تر کثیر الخلوی نامیے کے ساتھ انسلاک ہوا
اور پھر نباتات کی ضیائی تالیف سے آکسیجن بننے کے بعد
کوئی نئی زندگی وجود پذیر نہیں ہوسکتی تھی' حتّٰی کہ
کوئی نیا جرثومہ یا وائرس بھی جنم نہیں لے سکتا تھا
فضا نے ایسے حیوانوں کی نشوونما کو موقع فراہم کردیا ' جو
پھیپھڑوں کے ذریعے سانس لے سکتے تھے
سبھی کو ضرررساں کائناتی تاب کاری کے خلاف حفاظتی چھت مل گئی
دن بہ دن انسانی دماغ بھی نسبتاً بڑا ہونے لگا
) میں جس موضوع کو پسند کروں' اُس پر تحقیق کرتا ہوں' اور
جس مواد کو ضروری خیال کروں' اُسے خلق کرتا ہوں
زن و مرد خود کو مخلوق کہلوانا پسند کرتے رہے ہیں
کبھی فقط حیوان' کبھی حیوانِ ناطق' کبھی سماجی حیوان
کبھی اخلاقی حیوان' کبھی زرعی حیوان' کبھی صنعتی حیوان'
کبھی تکنیکی حیوان' کبھی سائنسی حیوان اور کبھی اشرف المخلوقات
اسی لیے سب سے بہتر خلاق کی تلاش ہمیشہ سب سے بڑا مسئلہ رہی ہے
میں جیسا چاہوں' وہی کیلنڈر نافذالعمل کرسکتا ہوں
میری طرح جو بھی چاہے کرۂِ ارض کے بننے یا انسان کے معرضِ وجود میں آنے کا پتا پاسکتا ہے
میرے ذہن سے خیالات اور حقائق کا جھرنا یوں پھوٹتا ہے' جیسے
شمسی آندھی سورج کی مقناطیسی لہروں کے گرد دائرے میں گھومتی ہے' اور

خلا میں موجوں کی صورت بہت دور تک بہتی چلی جاتی ہے
میں بے تُکی روایات اور اساطیر کے انبار میں سے
اپنی تحقیق و تخلیق کی راہ ہموار کرچکا ہوں‘ یعنی
خواہ کوئی آواگون یا تناسخ پر ہی کیوں نہ یقین رکھتا ہو‘ تاہم
ہمیں یہ ز ندگی صرف ایک ہی مرتبہ ملتی ہے‘ اور
ہم دوبارہ کبھی زندگی کی طرف لوٹ کر نہیں آسکیں گے
بہ ہر حال یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اب ہم زندہ ہیں
تاکہ ایک دوسرے سے غیر مشروط محبت کر سکیں) (اظہر غوری: اساطیر)(۱۴(

تمام مذاہب کی ابتدا ‘عقلی و استدلالی سطح سے ہی ہوئی۔ فلسفہ بھی اسی بات پر آمادگی ظاہر کرتا ہے کہ مذہب کی ابتدا بہ ذاتِ خود ایک عقلی سرگرمی تھی۔ عہدِ قدیم کا انسان جیسے جیسے اس کائنات کے لوازمات سے سامنا کرتا چلا گیا ویسے ہی ویسے ان کی تفہیم کی سعی بھی کرتا چلا گیا۔ سب سے بنیادی احساس جو اوّلین انسان کے ذہن میں جا گزیں ہوا وہ خوف کا احساس تھا کیوں کہ اُسے اپنا ہم جنس کہیں دور دور تک دکھائی نہ دیتا تھا۔ پھر جنگلی درندے ‘جو موت کی صورت اُسے تلاش کرتے پھرتے تھے۔ آسمان ایک مصیبت کی صورت کبھی آگ برساتا اور کبھی جل تھل کر دیتا۔ کبھی سورج کی حِدّت جھلسا دیتی تو کبھی اس کی غیر موجودگی خوف میں مبتلا کر دیتی۔ فلاسفہ کے مطابق‘ ان میں سے جو زیادہ عاقل و بالغ افراد تھے انھوں نے افراد کے اس خوف کو مثبت سمت دے کر معبود کا تصور پیش کیا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو تمام افراد خوف میں مبتلا ہو کر ایک دوسرے کو چیر پھاڑ دیتے تا ہم معبود کے تصور نے ان لوگوں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعلق کا احساس پیدا کیا اور انسان نے اخلاقی اقدار کو رائج کرتے ہوئے پہلا با قاعدہ انسانی معاشرہ تشکیل دیا۔

دنیا کے کسی بھی مذہب کو دیکھ لیں‘ اُس کا تعلق کثرت پرستی سے ہو یا وحدت پرستی سے‘ وہ بتوں کو پوجنے والے ہوں یا آگ کو۔ وہ ایک خُدا پر یقین رکھیں یا ایک سے زیادہ خُدائوں پر۔ تمام مذاہب کے پیروکار اس معاملے میں کتنے ہی متنوع کیوں نہ ہوں ‘ تاہم مذہبی عقائد کی بنیاد پرہم انھیں دو بنیادی گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

الف۔ وحدت الوجودی عقائد
ب۔ وحدت الشہودی عقائد

یہ دونوں فلسفے بہ ذاتِ خود اپنے اندر اتنی وسعت اور گہرائی و گیرائی رکھتے ہیں کہ ان کے دائرۂ کار میں رہتے ہوئے تمام مذاہب کی توضیح و تشریح کسی نہ کسی حوالے سے کی جا سکتی ہے۔ عصرِ حاضر کے مذاہب پر اگر نظر دوڑائی جائے تو پتا چلتا ہے کہ ان مذاہب نے ان میں سے کسی ایک یا دونوں فلسفوں کو اپنا راہ نما بنا کر کائنات کی تشریح و توضیح کی کوششیں کی ہیں۔انہی کوششوں کے طفیل جدید علم الکلام بھی پیدا ہوا جس کی بہ دولت تمام مذاہبِ عالم اپنے اپنے مذہبی افکار و نظریات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے اُس کی حقانیت کا دعواکرتے ہیں۔

تمام مذاہب میں خدا کا عقیدہ ایک بنیادی عقیدے کی حیثیت رکھتا ہےکسی بھی مذہب میں انسان کا مقام‘ اس کی تخلیق‘ زمان و مکان کے تصورات اور زندگی گزارنے کے دیگر اصول و ضوابط کا بنیادی ربط اسی ایک عقیدے سے منسلک ہے کیونکہ یہی عقیدہ زندگی گزارنے اور سمجھنے کے عوامل کی توضیح کرتا ہے۔ اگر ہم مذاہبِ عالم پر غور کریں تو

ہمیں تین سامی مذاہب یعنی یہودیت‘ عیسائیت اور اسلام میں کسی حد تک ملتے جلتے تاثرات دکھائی پڑتے ہیننیز غیر سامی مذاہب ‘جن میں ہندومت سب سے قدیم مذہب کا درجہ رکھتا ہے‘ بھی اس سلسلے میں اپنے مخصوص نقطۂِ نظر کی تبلیغ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر ہم تخلیقِ کائنات کے سوال پر غور کریں تو یہودیت کے مطابق خدا نے ہماری اس کائنات کی تخلیق چھے دنوں میں کی اور پھر ساتواں دن آرام کے لیے مقرر فرمایا۔ یہی نظریہ ہمیں عیسائیت میں بھی دکھائی دیتا ہے ۔ عہد نامہ جدید کے مطابق خدا نے پہلے دن زمین و آسمان ‘ دوسرے دن صبح و شام‘ تیسرے دن خشکی اور تری (زمین اور سمندر) اور پودے‘ چوتھے دن چاند‘ سورج اور ستارے‘ پانچویں دن جانور (پرندے اور آبی جانور) اور چھٹے دن خشکی کے جانور اور انسان پیدا کیے ۔ ساتویں دن خدا نے آرام کیا اور انسان کو تمام دیگر مخلوقات پر حکم رانی عطا فرمائی۔ اسی سلسلے میں تورات ہمیں بتاتی ہے کہ خدا نے ابتدا میں زمین و آسمان کو پیدا کیا۔ اور زمین ویران اور سنسان تھی اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا اور خدا کی روح پانی کی سطح پر جنبش کرتی تھی۔۔ اور خدا نے روشنی کو تاریکی سے جُدا کیا۔۔ سو پہلا دن ہوا۔ اور خدا نے کہا کہ پانیوں کے درمیان فضا ہو تاکہ پانی پانی سے جدا ہو جائے ‘ پس خدا نے فضا کو بنایا اور فضا کے نیچے کے پانی کو فضا کے اوپر کے پانی سے جدا کیا۔ ۔۔سو دوسرا دن ہوا۔ اور خدا نے کہا کہ آسمان کے نیچے کا پانی ایک جگہ جمع ہو کہ خشکی نظر آئے اور ایسا ہی ہوا۔ اور خدا نے خشکی کو زمین کہا اور جو پانی جمع ہوگیا تھا اُس کو سمندر ۔۔۔اور خدا نے کہا کہ زمین گھاس اور بیج دار بوٹیوں کو اور پھل دار درختوں کو جو اپنی اپنی جنس کے موافق پھلیں اور جو زمین پر اپنے آپ ہی بیج میں رکھیں اُگائے اور ایسا ہی ہوا۔۔ سو تیسرا دن ہوا۔ اور خدا نے کہا کہ فلک پر نیّر ہوں کہ دن کو رات سے الگ کریں اور وہ نشانوں اور زمانوں اوردنوں اور برسوں کے امتیاز کے لیے ہوں۔ اور وہ فلک پر‘ اَنوار کے لیے ہوں کہ زمین پر روشنی ڈالیں اور ایسا ہی ہوا ۔ سو خدا نے دو بڑے نیّر بنائے۔ ایک نیّرِ اکبر ‘کہ دن پر حُکم کرے اور ایک نیّرِ اصغر کہ رات پر حُکم کرے اور اُس نے ستاروں کو بھی بنایا۔ اور خدا نے اُن کو فلک پر رکھا کہ زمین پر روشنی ڈالیں۔ اور دن پر اور رات پر حُکم کریں اور اُجالے کو اندھیرے سے جُدا کریں اور خُدا نے دیکھا کہ اچھّا ہے۔ اور شام ہوئی اور صُبح ہوئی ۔ سو چوتھا دن ہوا۔ ۔۔ اور خُدا نے بڑے بڑے دریائی جان ورونکو اور ہر قسم کے جان دار کو جو پانی سے بہ کثرت پیدا ہوئے تھے اُن کی جنس کے موافق پیدا کیا ۔۔۔ اور شام ہوئی اور صُبح ہوئی ۔ سو پانچواں دن ہوا۔۔ اور خُدا نے جنگلی جان وروں اور چوپایوں کو ان کی جنس کے موافق اور زمین کے رینگنے والے جان داروں کو اُن کی جنس کے موافق بنایا اور خُدا نے دیکھا کہ اچھّا ہے۔ پھر خُدا نے کہا کہ ہم انسان کو اپنی صورت پر اپنی شبیہ کی مانند بنائیں اور وہ سمندر کی مچھلیوں اور آسمان کے پرندوں اور چوپایوں اور تمام زمین اور سب جان داروں پر جو زمین پر رینگتے ہیں اختیار رکھیں۔۔ اور خُدا نے سب پر جو اُس نے بنایا تھا نظر کی اور دیکھا کہ بہت اچھّا ہے اور شام ہوئی اور صُبح ہوئی ۔ سو چھٹا دن ہوا۔ سو آسمان اور زمین اور اُن کے کُل لشکر کا بنانا ختم ہوا ۔ اور خُدا نے اپنے کام کو جسے وہ کرتا تھا ساتویں دن ختم کیا اور اپنے سارے کام سے جسے وہ کر رہا تھا ساتویں دن فارغ ہوا۔ اور خُدا نے ساتویں دن کو برکت دی اور اُسے مقدس ٹھہرایا کیوں کہ اُس میں خُدا ساری کائنات سے جسے اُس نے پیدا کیا اور فارغ ہوا۔(۱۵(

جدید اردو نظم میں اسی کا اظہار دیکھیں۔

ابتدا میں کلام تھا
اور کلام خدا کے ساتھ تھا
اور کلام خدا تھا
ایک آدمی یوحنا نام آ موجود ہوا
جو خدا کی طرف سے بھیجا گیا تھا
یہ گواہی کے لیے آیا
کہ نور کی گواہی دے
تاکہ سب اس کے وسیلہ سے ایمان لائیں
وہ خود تو نور نہ تھا
مگر نور کی گواہی دینے آیا تھا
حقیقی نور
جوہر آدمی کو روشن کرتا ہے
دنیا میں آنے کو تھا (مبارک احمد:ابتدائیہ)(۱۶)

دیگر مذاہب کی طرح اسلام بھی تخلیقِ کائنات بارے اپنے تصورات رکھتا ہے اور یہودیت سے تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اس نظریے کی تبلیغ کرتا دکھائی دیتا ہے یعنی:

۱۔ یہ کائنات چھے دن میں تخلیق ہوئی لیکن رب تھکنے والا نہیں ہے جو ساتویں دن آرام کرے۔
۲۔ خدا کے نزدیک ایک دن ایک ہزار سال، دس ہزار سال، پچاس ہزار سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ کو محیط ہو سکتا ہے۔

اس سلسلے میں قرآن کا فرمان ہے:
ثم استوٰی ال السماء وھی دخان۔
ترجمہ: پھر اللہ تعالیٰ نے آسمان (بنانے) کی طرف توجہ فرمائی اور وہ (اس وقت) دھواں سا تھا۔
(سورۃ حٰم السجدہ ، آیت نمبر ۱۱)
پھر مزید کہا:
فقضھن سبع سموات فی یومین۔
ترجمہ: پھر آسمان (کے سیاروں اور ستاروں) کو دو ادوار میں بنایا اور اسے سات طبقوں میں تقسیم کیا۔
(سورۃ حٰم السجدہ ، آیت نمبر ۱۲)
اس سے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا:
واوحی فی کل سماء امرھا و زینا السماء الدنیا بمصابیح و حفظا۔
ترجمہ: (آسمانوں کو دو ادوار میں بنانے کے بعد) جو کچھ ان میں رونما ہونا تھا اس کی طاقت پیدا کردی اور نیچے والے آسمان کو ستاروں سے زینت دی اور اسے حفاظت کے لیے بنایا۔
(سورۃ حٰم السجدہ ، آیت نمبر ۱۲)
جہاں تک تخلیقِ انسان اور دیگر جانداروں کی تخلیق کی بات ہے اس سلسلے میں قرآن کا یہ قول بنیادی اہمیت رکھتا ہے:

و جعلنا من السماء کل شئی حی۔
ترجمہ: اور ہم نے ہر چیز کو پانی میں زندگی دی۔
)سورۃ الانبیا آیت نمبر ۳۰(
اولم یرالذین کفرو ان السموت والارض کانتا رتقا ففذقنھما و جعلنا من الماء کل حی
)القرآن‘ آیت۳۰‘ سورۃ ۲۱(
کہکشائوں کی تخلیق فضا میں پھیلی ہوئی گیسوں کے انجماد سے ہوئی۔
ثم استوی السماء و ھی دخان فقال لھا و للارض انتیا او طوعا او کرھا قالتا اتینا طابعین
)القرآن: آیت ۴۱‘ سورۃ ۱۱(
چاند کی روشنی اپنی نہیں بل کہ منعکس شدہ ہے:
تبارک الذی جعل فی السماء بروجا وجعلا فیھا سراجا وقمرا منیرا
)القرآن: آیت ۶۱‘ سورۃ ۲۵(
الم تروکیف خلق اللہ سبع سموت طباقا و جعل القمر فیھن نورا وجعل الشمس سراجا
)القرآن: آیت ۱۵۔۱۶‘ سورۃ ۷۱(
سورج کے گرد سیاروں کی مخصوص مداروں میں حرکت:
وھوالذی خلق الیل والنھارو الشمس والقمرکل فی فلک یسبحون
)القرآن: آیت ۳۳‘ سورۃ ۲۱(
چاند اور سورج کی الگ الگ مداروں میں حرکت:
لاالشمس ینبغی لھا ان تدرک القمر ولا الیل سابق النھار و کل فی فلک یسبحون
)القرآن: آیت ۴۰‘ سوۃ ۳۶(

سکھ ازم میں تخلیقِ کائنات کے حوالے سے پیش کاری کو جپ جی صاحب کے ایک دوہے میں یوں بیان کیا گیا ہے

’’کونڑ سُوویلا؟ وکھت کونڑ؟‘ کونڑ تھتی؟‘ کونڑ وار؟
کونڑ سی رُتی؟‘ ماہ کونڑ‘ جِت ہووا آکار
ویل نہ پایا پنڈتی جے ہووے لیکھو پُرانڑو
وکھت نہ پائیو کادیا جے لکھنی لیکھو کوانڑو‘‘

)جپ جی صاحب۔ گرو نانک دیو(

)ترجمہ: کون سا مبارک وقت‘ دن‘ مہینا‘ تاریخ‘ سال اور موسم تھا جب تشکیلِ کائنات ہوئی۔ پنڈت کو بھید نہ ملا کہ پُران میں لکھ دیتا۔ قاضی کو وقت کی خبر نہ ہوئی کہ قرآن [کی تفسیر] میں جوڑ دیتا(

ہندوازم میں تخلیقِ کائنات کے حوالے سے ہندودیومالا کے چار بنیادی اصول یہ ہیں۔

۱۔ کائنات برہما (وجودِ مطلق) میں سے نکلی ہے اور فنا ہوکر پھر اُس میں شامل ہو جائے گی۔
۲۔ مادہ غیر حقیقی ہے اور ظاہری کثرت ہماری نظروں کا دھوکا ہے۔
۳۔ برائی کائنات کے خمیر میں شامل ہے جو آواگون ‘ سنسار چکر اور انسان کے دکھوں کا باعث ہے۔
۴۔ انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ روح کو مادے کی آلائش سے پاک کر کے پھر سے برہما میں شامل کر دیا جائے۔

ہندو ازم کی تثلیث برہما (قادرِ مطلق)، وشنو (زندگی کا دیوتا) اور شیو (موت کا دیوتا) پر مشتمل ہے۔ یہاں یہ امر بھی زیرِ نظر رہے کہ کالی ماتا جو کہ شیو کی بیوی ہے وہ بھی مختلف حوالے سے اس تثلیث کے اہم اجزا میں سے ہے۔ ہندوئوں کی مذہبی کتب میں وید، اپن شد، پُران اور منوسمرتی اہمیت کی حامل گردانی جاتی ہیں، جن میں ویدوں کا مقام سب سے بلند ہے۔ ویدوں کے حوالے سے رائے بہادر پیارے لال آشوب لکھتے ہیں:

''ان کتابوں میں یہ لکھاہے کہ خُدا ایک ہے اور سب سے بڑا ہے اور کُل جہان اسی نے پیدا کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ہوا، آگ، پانی، زمین، سورج، چاند، ستارے اور بعض نیکیاں مثلاً انصاف، حکمت، سب کے سب دیوتا ہیں اور ان کی پوجا کرنے سے بہت فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔''(۱۷(

اسی تناظر میں منو مہاراج کے بہ قول جب خُدا نے اپنی ذات سے دُنیا کے پیدا کرنے کا ارداہ کیا تو پہلے اُس نے پانی کو پیدا کیا اور اُس میں ایک بیج ڈالا جو تھوڑے عرصے کے بعد انڈے کی صورت میں بدل گیا، اس انڈے میں سے برہما جی نکلے اور انھوں نے آدھے جسم کو نر اور آدھے جسم کو مادہ بنایا اور مادہ حصے سے براٹ (جسم میں پڑی ہوئی عام روح) کو پیدا کیا اور براٹ کی تپسیا کے سبب سے منو جی پیدا ہوئے اور وہ منو جی میں ہی ہوں جس کی پیدایش اسی طرح ہوئی ہے اور میرے سبب سے زمین، آسمان، دیوتا، انسان اور تمام چیزیں ظاہر ہوئی ہیں۔(۱۸(

اسی بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''دھرم شاستر اور پُرانوں کے موافق تمام ہندو اس بات کو مانتے ہیں کہ دنیا بار بار پیدا ہو کر فنا ہوتی ہے اور اس امر کا ذکر وشن پُران میں اس طرح پر لکھا ہے کہ آدمیوں کا ایک سال دیوتائوں کے ایک دن کے برابر ہوتا ہے اور دیوتائوں کے بارہ ہزار سال کے چار جگ ہوتے ہیں، جن کے نام ست جگ، ترتیا، دواپر اور کل جگ ہیں، چناں چہ اب اس ۱۲ ہزار سال کے عرصے میں تین جگ گزر چکے ہیں اور کل جگ موجود ہے۔ ایسے ایسے ہزار زمانے یعنی چار ارب تیس کروڑ سال برہما جی کے ایک دن کے برابر ہوتے ہیں اور اس عرصے میں چودہ منو جی پیدا ہوتے ہیں اور ہر ایک منو جی کے زمانے میں بعض دیوتا فنا ہوتے ہیں اور پھر پیدا ہوجاتے ہیں۔ جب برہما جی کا بھی ایک دن گزر چُکتا ہے تو سارا جہان فنا ہو جاتا ہے اور رات بھر فنا کی حالت میں رہ کر صُبح کو پھر پیدا ہوتا ہے اور برہما جی اپنے ہی برسوں کے حساب سے سو برس جیتے ہیں۔ ان کے مرنے کے بعد ایک بڑی قیامت آتی ہے اور تمام دیوتا اور انسان اور حیوان سب کے سب پرم آتما میں مل جاتے ہیں۔''(۱۹(

ہندو فلسفہ میں تخلیقِ کائنات کے ساتھ ساتھ دیگر مظاہرِ قدرت کو بھی مذہبی حوالے سے بیان کرنے کا اندازملتا ہے۔ ان میں خصوصی طور پر ہماری زمین اور اس کے متعلقات کا بھی ذکر ملتا ہے۔ مثلاً ہندوئوں کے مطابق بعض پُرانوں میں لکھا ہے کہ شیش ناگ نامی ایک سانپ ہے، زمین اُس کے پھن پر ٹھہری ہوئی ہے اور جب وہ سر جھُکاتا ہے تو زمین میں بھونچال آتا ہے۔ بعض میں یہ لکھا ہے کہ زمین ایک بیل کے سینگ پر ٹھہری ہوئی ہے اور جب وہ تھک کر اپنا بوجھ ایک سینگ سے دوسرے سینگ پر بدلتا ہے تو زلزلہ پیدا ہوتا ہے۔(۲۰)انہی پُرانوں میں دیگر کئی عوامل کا ذکر بھی ملتا ہے جن کا تعلق کائنات کے ہمارے حوالے سے جزوِ اہم یعنی زمین و آسمان وغیرہ سے ہے۔ ان عوامل کی توجیحات مختلف دیو مالائی قصوں کے حوالے سے بیان کی گئی ہیں۔ مثلاً عقیدہ تثلیث کے عناصر میں سے ایک اہم

’’وشنو ‘‘ ہیں۔ پُرانوں کے مطابق وشنو مہاراج دنیا میں روپ بدل کر آتے ہیں جنھیں اوتار کہا جاتا ہے۔ یہ اوتار بھی ہندوئوں کے ہاں قابلِ عبادت ہیں۔ پُرانوں کے مطابق اب تک وشنو کے نو اوتار آچکے ہیں ۔ ہر ایک اوتار سے متعلق ایک داستان ہندو دیو مالا میں ملتی ہے اور یہ داستانیں ان کے مذہبی افکار اور عبادات پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ انہی دیو مالائی کرداروں سے ہندوئوں کے کائناتی نظریات بھی منسلک ہیں جن پر ہندو فلسفہ کھڑا ہے۔ لہٰذا ان کا مختصر تعارف بھی یہاں بے جا نہ ہوگاپہلی دفعہ انھوں نے مچھلی کا اوتار لے کر ویدوں کو ایک راچھس سے چھُڑایا‘ پھر باراہ یعنی سئور بن کر دنیا کو ایک اُسر سے جو اُس کو سمندر میں لے جاتا تھا‘ بچایا‘ اُس کے بعد کچھوے کی صورت ہو کر مندراچل پہاڑ کو اپنی پیٹھ پر سہارا دیا اور دیووں اور دیوتائوں نے اس پہاڑ کو رئی بنا کر اس کے گردایک بڑا سانپ رسی کے طور پر ڈالا اور اسی کچھوے کے سہارے سے سمندر کو پہاڑ سے خوب بلویا کہ اس میں سے ۱۴ رتن نکل پڑے اور یہ سب رتن دیوتائوں کو بانٹ دیے گئے۔(۲۱)پھر اس کے بعد ’’نر سنگھ‘‘(انسان اور شیر کے اتحاد سے بنی ایک صورت ہے) کا اوتار لیا۔ اور اپنے ایک بھگت کو اُس کے باپ سے بچانے کے لیے اُس کے باپ کو مار ڈالا۔ پانچویں بار ایک برہمن کا روپ لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ راجہ بل نامی ایک بادشاہ نے اپنی عبادت‘ ریاضت اور تپسیا کے زور پر راجہ اِندر سے اُس کا تمام اقتدار چھین لیا۔ (ہندوئوں کے نزدیک دیوتائوں کے تین استھان یعنی جائے رہایش ہیں‘ آسمان‘ زمین اور خلا۔ اندر دیوتا کا تعلق خلا میں رہنے والے دیوتائوں سے ہے۔) راجہ اندر نے وشنو سے درخواست کی کہ اگرچہ زمین و آسمان میرے ہاتھوں سے جا چُکا تاہم اب میرا استھان بھی خطرے میں ہے تو اُسے بچانے کے لیے کچھ کیجیے۔ ایسے میں وشنو نے ایک بونے برہمن کا روپ دھار ا اور راجہ بل کے دربار میں جاکر اُسے دا دیتے ہوئے اُس سے دان مانگا۔ راجہ مُنھ مانگا دان دینے پر آمادہ ہو ا تو وشنو نے خواہش ظاہر کی کہ جتنی زمین اُس کے تین قدموں میں آئے وہ اُسے دے دی جائے۔ راجہ نے حامی بھرلی۔ جس پر

’’برہمن نے پہلے قدم میں ساری زمین اور دوسرے قدم میں آسمان کو لے لیا۔ جب تیسرا قدم کے واسطے کوئی جگہ باقی نہ رہی تو راجہ نے اپنا جسم اس کے آگے ڈال دیا اور کہا کہ اب کی دفعہ میں خود موجود ہوں مگر وشن جی نے رحم کھاکر اُس کی جان بچا دی۔‘‘(۲۲(

چھٹی بار پُرس رام کی صورت اوتار لیا اور چھتریوں کو تباہ و برباد کیا۔ ساتویں بار رام چندر کا اوتار لے کر راون کو مارا۔ آٹھویں بار وشن جی کے اُسروں کو مارنے کے واسطے بُدھ کا اوتار لیا اور نویں بار بل رام بن کر دُنیا کو ظالموں کے ظُلم سے بچایا۔

وزیر حسن عابدی ’’شلوکِ تخلیق‘‘ کے ترجمے میں تمام بنیادی مباحث کو سمیٹتے ہیں۔ اس شلوک کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے:

’’نہ عدم کا نام و نشان تھا‘ نہ وجود ہی کا وجود تھا
نہ فضا نہ بادِ صبا کہیں‘ نہ فلک ہی سر بسجود تھا
یہ تمام عالمِ رنگ و جو ازل میں ورطہئِ آب تھا
تو ذرا بتا دے کوئی بھلا کہ یہ زیرِ نقاب تھا
نہ تو موت ہی تھی مکیں یہاں نہ تو زندگیِ دوام تھی
نہ تو صُبح تھی نہ تھی دو پہر نہ تو رات تھی نہ تو شام تھی
وہی ’’ایک ذات‘‘ تھی اور بس‘ وہی ایک نفس سو بے نفس

نہ کوئی عیاں نہ کوئی نہاں‘ کوئی شے نہ پیش نہ کوئی پس
ابھی تیرگی کے طبق تھے گم‘ کہیں ظلمتوں کے ہجوم میں
من و تو کا فرق نہ تھا کوئی‘ ابھی بن سکی تھیں نہ صورتیں
نہ بسیط تھی یہ خلا ابھی جو خود اپنے بطن میں تھی نہاں
کہ وہ ’’ایک ذات‘‘ ہی دفعتاً ہوئی اپنے سوز سے خود عیاں
تب ’’اس ایک‘‘ کو ہوئی آرزو‘ یہی ابتدا کی تھی ابتدا
اسی آرزو سے عیاں ہوا عمل اور فکر کا سلسلہ
یہ قیاس اہلِ نظر کا ہے کہ جو کشف و کیف کے زور سے
عدم و وجود کے درمیان یہی ارتباط سمجھ سکے
وہ ہے کون یاں جو یہ کہ سکے کہ ہے کائنات کی اصل کیا؟
جسے ہو خبر کہ کہاں پہ کب ہوئی نظمِ دہر کی ابتدا
یہ فلک کے رب جو ہیں سب کے سب‘ انھیں علم ہو تو کہاں سے ہو
کہ ازل میں یہ تو کہیں نہ تھے‘ ہوئے خلق یہ بھی تو بعد کو
کوئی آج تک نہ سمجھ سکا کہ یہ بزمِ کون و مکان ہے کیا
کسی رب نے خلق اسے کیا کہ وجود اس کا سدا سے تھا
وہی جانتا ہے یہ راز جو کہ فلک سے سب پہ کرے نظر
کچھ عجب نہیں کہ اس علیم اور بصیر کو بھی نہ ہو خبر‘‘(۳۲(

ہندو عقائد میں جہاں ہزاروں دیوی دیوتائوں کا ذکر ہے اُن میں صفت تخلیق کے حوالے سے برہما کو فوقیت حاصل ہے۔ تاہم تخلیق ہی اُن کے نزدیک جوہرِ اصل ہے لہٰذا اُن کے ہاں لنگ اور یونی کی پوجا کا بھی رُجحان بہت سے فرقوں میں پایا جاتا ہے۔ کیوں کہ خوراک کی پیدایش کے حوالے سے دھرتی فصل پیدا کرتی ہے اور سورج (سوریا دیو) کی بہ دولت پیدا کرتی ہے۔ لہٰذا ان کی صفتِ تخلیق کے حوالے سے بھی بہت کچھ کہا گیا ہے۔ ایسی ہی ایک دُعا میں دھرتی کے تخلیقی جوہر کو نمایاں کرتے ہوئے اُس سے خوش حالی کی پرارتھنا کی گئی ہے۔ دُعا کُچھ یوں ہے:

’’دھرتی ماتا‘ تجھ سے پیدا
انسانوں کی لاکھوں نسلیں
الگ الگ ہیں جن کے عقیدے
الگ رواج اور الگ زبانیں
میرے لیے بھی جاری کردے
دھن دولت کی ہزاروں نہریں
جیسے گائے کے تھن سے بہتی
دودھ کی میٹھی میٹھی دھاریں‘‘(۲۴(

ہندوئوں کے ہاں تخلیق کے متنوع فلسفے پائے جاتے ہیں اور ہندو عقیدہ کے لوگ ان تمام پر ہی یقین رکھتے ہیں اور اس کے مطابق ہی عبادت و ریاضت کرتے ہیں۔ تاہم عمومی طور پر وہ کسی ایک ہی معبود کو پوجتے ہیں ‘ اُسی سے آرزو براری کے لیے رجوع کرتے ہیں۔ لیکن تمام دیوتائوں کا احترام لازم ہے۔ بسا اوقات کسی خاص مقصد کے حصول کے لیے خاص دیوی دیوتا کی پوجا بھی اُن کے ہاں مروّج ہے۔ ہندو مت کے مطابق:

’’عالم میں ہر شے کی اصل پر کرتی ہی ہے۔ وہ ہر چیز کے اندر موجود ہے لیکن خود اس کی کوئی شکل نہیں۔ اس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا‘ نہ عروج نہ زوال۔ اس کے تین گُن (مزاج یا صفات) ہیں۔

)۱(ست یعنی جوہر نمود جس کی بنیاد پر کوئی شے عقل سے پہچانی جاتی ہے اور دوسری چیزوں سے اس کا فرق
سمجھ میں آتا ہے۔

)۲(رجس یعنی توانائی یا قوت عمل جس کی وجہ سے چیزیں حرکت میں آتی ہیں۔

)۳(تمس یعنی جمود یا حجم جو کسی شے کو حرکت کرنے سے روکتا ہے۔‘‘(۲۵(

یہ موجودات ازلی‘ ہمیشہ ملتے‘ الگ ہوتے اور پھر ملتے رہتے ہیں۔ مختلف مقداروں میں ملنے سے مختلف صفاتی شکلیں ظاہر ہوتی ہیں۔ گُن کبھی ایک دوسرے میں ضم نہیں ہوتے۔ کسی زمانے میں ان گُنوں کے درمیان ایک طرح کا توازن تھا لیکن پُرش کا سایہ پڑنے پر اُن میں حرکت پیدا ہوئی اور آفاقی ارتقا کا عمل شروع ہوا۔

اسی طرح چین‘ یونان‘ بابل اور دیگر تمام تہاذیب کے بھی اپنے اپنے نظریات ہیں۔ ان کے اساطیری حوالے ظاہر کرتے ہیں کہ بنیادی طور پر وہ انھی تصوّرات میں کسی ایک یا زیادہ پر یقین رکھتے ہیں جن کا ما قبل بیان کیا جاچکا ہے۔ اور ان کے کرداروں کے ناموں میں ہی فرق ہے ‘ خصائص ایک سے ہی ہیں۔

کائنات فہمی کا اگلا مرحلہ انسان کی سائنسی ترقی کی بہ دولت سامنے آتا ہے۔ مشہور یونانی فلسفی سقراط روح کی اصلاح و تشکیل کو سب سے مقدم فریضہ جانتا ہے۔ ڈیمو قراطیس کے نزدیک ہمارے اجسام جواہر کا مجموعہ ہیں اور روح بھی جواہرِ لطیف سے معرضِ وجود میں آتی ہے اور انہی جواہر کا بکھراؤ موت ہے۔ نیز وہ حیات بعد از موت کا بھی قائل نہیں۔ افلاطون خدا کو تصورِ خیر اور روح کو حقیقی شے اور زمان و مکان سے ماورا قرار دیتا ہے۔ فلاطینوس خدا کو لامحدود قرار دیتے ہوئے روح کو دو درجات میں تقسیم کرتا ہے۔ پہلا حصہ بلند تر ہے جو روح سے منسلک ہے اور باعثِ خیر ہے جب کہ دوسرا حصہ زیریں ہے جو مادے سے تعلق رکھتا ہے اور شر اور فساد کا باعث ہے۔ ارسطو بھی اس سے ملتے جُلتے خیالات پیش کرتا ہے اور خدا کو غیر متحرّک محرّک مانتا ہے‘ جو حقیقی ہے لیکن موجود نہیں ۔ وہ غیر شخصی ہے۔ نیز روح کے دو حصے ہیں ‘ بلند حصہ عقلی اور پست حصہ غیر عقلی ہے۔ ابیقور کا کہنا ہے کہ کاروبارِ حیات میں اور کاروبارِ کائنات میں کسی حکیم یا دانا ہستی کی مشیّت کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ فیثا غورث جسم کو روح کا مقبرہ قرار دیتا ہے۔ یہی عوامل شہزاد احمد کے ہاں دیکھیے:

میرے کانوں میں
عزیزوں کے بلکنے کی صدائیں آرہی ہیں
اور میں ان کے قریں موجود ہوں
وہ سمجھتے ہیں
کہ اب‘ ہم میںہے بے حد فاصلہ
اور میں اب تک یہیں موجود ہوں
میں کہ ان کی ساری باتیں سُن رہا ہوں
--- اور نہیں موجود ہوں!   (شہزاد احمد:جسم سے باہر نکل آیا ہوں میں)(۲۶(

اگر ہم ایک قدم آگے بڑھائیں تو ہمارا سامنا فلسفہ اور سائنس سے ہوتا ہے اور ان کے کائنات کی تخلیق کا اپنا ایک الگ الگ نظریہ ہے۔ فیلسوفوں نے تو اسے اپنے مشاہدات کی روشنی میں بیان کرنے کی سعی کی لیکن سائنس نے تجربات کو بھی اس کی ہم راہی کا شرف بخشتے ہوئے نہ صرف کائنات کی تخلیق کے نظریات پیش کیے بل کہ انھیں عملی صورت میں تجرباتی سطح پر آزمانے کی سعی بھی کی اور کسی نہ کسی حد تک حقائق کی نقاب کشائی بھی کی۔

''گریک مائی تھالوجی نے آج تک کسی بھی دور میں عقیدے کا روپ نہیں دھارا بل کہ مسائل حیات کے طور پر آج تک چلی آرہی ہے جو موجودہ وقت میں فلسفے' نفسیات اور سائنس کی صورت میں موجود ہے۔''(۲۷(

انسان کائنات کا مرکز ہے۔ اور مذہب افرادِ معاشرہ کے ہاں ایک بنیادی اہمیت کا حامل عنصر ہے لہٰذا اگر ہم یہاں مذہب کی ابتدا اور ترویج و ارتقاکے بارے میں بھی مختلف مکاتیبِ فکر کے نظریات کو سامنے رکھیں تو کائنات فہمی کے عمل میں ہمارے لیے انسانی رویوں کو سمجھنے میں کافی آسانی پید اہوگی۔مختلف فلسفیوں نے اس سلسلے میں مختلف انداز میں سوچ کی پرواز کی وضاحت کی ہے۔عمومی طور پر فلسفیوں کے ہاں مذہب' انسانی عقل و شعور کی بہ تدریج ترقی و ارتقا کی بہ دولت اشکال بدلتے ہوئے عصرِ حاضر کی صورت حال سے دو چار ہوا ۔ اُن کے ہاں بنیادی طور پر مذہب ترقی و ارتقا کے جن جن مراحل سے گزرا اُن میں سے سب سے پہلا مرحلہ روحوں کے مذہب کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ یہی وہ عقیدہ تھا جس نے بعد میں خُدا کا تصور پیش کیا اور اُسے ترقی دی۔ ایک وقت تھا جب یہ سمجھ لیا گیا کی یہ ہماری زمین کائنات کا مرکز ہے اور باقی تمام سیارگان اس کے گرد گھومتے ہیں لیکن مزید تحقیق سے یہ بات غلط ثابت ہوئی اور پتا چلا کہ یہ ہماری زمین مرکزِ کائنات ہرگز نہیں ہے بل کہ یہ بھی دوسرے کروڑوں سیارونکی طرح اپنے ایک محور کے گرد گھوم رہی ہے اور مرکزِ کائنات کا کہیں دور دور تک کچھ پتا نہیں۔(۲۸)زمین کو مرکزِ کائنات سمجھنے کی ابتدا فلاسفہ کے ہاں ملتی ہیں جنھوں نے اپنے وقت تک قابلِ مشاہدہ اشیا و عوامل میں ہماری زمین' سورج' چاند' ستاروں اور آسمان وغیرہ کو ہی دیکھا تھا۔ اس سے باہر کی دنیا اور اشیا ان کی پہنچ سے باہر تھیں۔تاہم زمان و مکان کے مباحث بھی فلسفہ میں ہمیشہ اہمیت کے حامل رہے۔وقت کے بارے میں درج ذیل رویہ اگرچہ سائنسی ہے تاہم تقریباً تمام مذاہب اور فلسفہ کا نظریہ بھی یہی ہے کہ:

''وقت ایک ایسی مفروضہ اکائی ہے جس کے بارے میں کم و بیش متفقہ رائے یہ ہے کہ وقت اور جمود ایک دوسرے کی ضد ہیں۔''(۲۹(

''وقت کا تصور انسانی شعور کا پرتو ہے لیکن کائناتی حوالے سے وقت کوئی چیز نہیں ہے۔''(۳۰(

فلسفیانہ فکر کے مطابق کائناتی حوالے سے دیکھا جائے تو وقت نہ کوئی ماہیت ہے اور نہ ہی کوئی کیفیت ہے۔ وقت نہ کوئی متحرک چیز ہے' نہ کوئی جامد چیز ہے اور نہ ہی Abstractہے--- انسان نے روشنی اور تاریکی کے تواتر کو وقت کا نام دیا تھا اور اسے متحرک خیال کیا۔(۳۱)خلا موجود ہے اور جمود کی حالت میں ہے۔ مادہ موجود ہے اور حرکت پذیر ہے۔ ستارے اور سیارے ٹوٹتے اور بنتے رہتے ہیں۔ زندگی مادے کی ارتقائی شکل ہے اور انسانی شعور کے مطابق انسان کی اپنی ذات زندگی کا بہترین نمونہ ہے۔ مادے کا زندگی

کی کسی بھی قسم میں وجود میں آنا اور پھر عدم وجود میں چلے جانا ہی موت و حیات کا تصور پیش کرتا ہے حالانکہ کائناتی حوالے سے دیکھا جائے تو موت کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ صرف مادے کی ہیئت تبدیل ہونے کا عمل ہے۔ مادے کا حرارت اور عدم حرارت سے اثر پذیری کا عمل وقت کی قید سے آزاد ہے۔ حرارت نے مادے کو مختلف حالتوں میں بدل دیا ہوا ہے۔ زمین کے پیٹ میں مادہ حرارت کی وجہ سے سیال حالت میں رہتا ہے۔ زمین کی سطح پر حرارت کم ہے ۔ حرارت کے علاوہ اور کئی عناصر کے فطری طور پر اثر انداز ہونے کی وجہ سے مادے کی ہئیت تبدیل ہوتی ہے۔ انسانی شعور جو کہ مادے کی ہی ارتقاپذیری کا نتیجہ ہے نے یہ معلوم کیا کہ مادہ کسی خاص درجہ حرارت میں رہے تو زندگی جنم لیتی ہے اور اگر یہی حرارت زیادہ یا کم ہو جائے تو زندگی پھر مادے کی شکل اختیار کر لیتی ہے جو کہ اصولی طور پر کسی نہ کسی حوالے سے زندگی کا حصہ ہی رہتا ہے اور یہ عمل مسلسل ہو رہا ہے۔ اس عمل کے اندر انسان کا تصورِ فنا نہیں ملتا۔ اس لیے موت کوئی چیز نہیں اور چوں کہ خلا کے اندر فطری عمل کے تحت جس کی محرک حرارت ہے' مادہ اپنی ہیئت بدل رہا ہے۔(۳۲)

''جب ایک دیوقامت ستارہ اپنے نیوکلئیر ایندھن کو جلا کر ختم کردے تو حرارت ختم ہونے پر وہ سکڑ جائے گا۔ سپیس ٹائم کا یہ بگاڑ اس قدر بڑھ جائے گا کہ ایک بلیک ہول وجود میں آئے گا جس میں سے روشنی فرار نہیں ہو سکتی۔ بلیک ہول کے اندر وقت کا خاتمہ ہو جائے گا۔''(۳۳)

''ہم میں سے زیادہ تر لوگ اس بات کو بس یونہی مان لیتے ہیں کہ ہماری سپیس کی تین جہتیں ہیں۔ لیکن سٹرنگ تھیوری کے مطابق ایسا نہیں ہے' جو دعوا کرتی ہے کہ ہماری کائنات نظر آنے والی جہتوں سے کہیں زیادہ جہتیں رکھتی ہے۔''(۳۴)

جدید سائنس کا جہات کے بارے میں یہ رویّہ انسان کی سمجھ سے بھی ماورا ہے اور اس کے لیے کھلی آنکھوں کی ضرورت ہے جو ہمارے احساسات کو حقیقت کی سطح پر پرکھ سکے۔ایسے ہی رویّے بارے نصیر احمد ناصر لکھتے ہیں:

خواب دیکھنے کے لیے
نیندوں کی نہیں آنکھوں کی ضرورت ہوتی ہے

لیکن محبت کی کوئی عمر نہیں ہوتی
یہ تو ایک نامعلوم انت سے
دوسرے نامعلوم انت تک موجود ہے
ہم جہاں سے اسے دریافت کرتے ہیں
وہیں پر اپنی حد مقرر کرلیتے ہیں (نصیر احمد ناصر:خواب اور محبت کی کوئی عمر نہیں ہوتی)(۳۵)

مختصراً سائنس کے مطابق کائنات کی تخلیق اور اس میں جان داروں کی تخلیق کے بارے یہ کہا جا سکتا ہے کہ بگ بینگ سے ذرا پہلے تک کائنات میں ایک شدید پھیلائو تھا۔ جس نے چند ہی سیکنڈ بعد اپنی رفتار میں اچانک سے بہت زیادہ کمی کردی۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مشہور ماہرِ طبیعات وین برگ کہتے ہیں

''ہمارے زیرِ مشاہدہ تمام کائنات ایک ایسی فضا کے پھیلنے سے وجود میں آئی جس کے تمام نقطے پھولنے کے دور (Inflation Period) سے پہلے ایک دوسرے کے ساتھ علّت (Causality) کے تعلق میں بندھے ہوئے تھے۔ جب پھولنے کا دور ختم ہوا تو وہ بہ رشتہ علّت باہم منسلک تھے۔ آنے والے واقعات کی ترتیب پھولنے کا عمل شروع ہونے سے پہلے متعین ہو چکی تھی۔''(۳۶)

الغرض بگ بینگ سے پہلے کے حالات نے بعد کے حالات کا رُخ متعیّن کرتے ہوئے اسے ایک مخصوص انداز اور ترتیب عطا کردی جس کی بہ دولت تخلیق کا عمل مکمل ہوا۔ آج سائنس دان بعد کے ان مراحل کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ اور ہم آسانی کی خاطر اسے اگر کچھ اہم ادوار میں تقسیم کریں تو یہ کہ سکتے ہینکہ پہلے مرحلے میں بگ بینگ کے بعد ابتدائی ۴۳-(۱۰) سیکنڈز میں کائناتی مادے کا درجہ حرارت ۳۳ (۱۰) تک جا پہنچا تھا۔ جب کہ دوسرے مرحلے میں ۳۳-(۱۰) سیکنڈ تک اس توانائی سے مادہ تشکیل پذیر ہوا۔ اسی ابتدائی دورانیے میں وہ مادہ پیدا ہوا جس نے تمام کائنات کے جان دار اور بے جان اجسام کی تخلیق میں حصہ لیا۔ بعد ازاں یہ مادہ' کثیف مادۂ حیات کی صورت اختیار کر گیا۔ پھر اس مادے کی کثافت میں کمی ہونی شروع ہوئی اور الیکٹران اور پروٹان پیدا ہوئے۔ پھر بگ بینگ کے بعد کے ابتدائی ۱۰۰ سیکنڈ سے ۳۰ منٹ تک کے دورانیے میں ہیلیم جیسی گیسیں پیدا ہوئیں۔ آج سائنس تجرباتی بنیادوں پر ان مراحل کو کافی حد تک ثابت کر چکی ہے۔ اگلا مرحلہ ۳۰ منٹ سے شروع ہوکر تقریباً ایک ارب سال کو محیط ہے۔ اس کے اختتام تک آتے آتے ہیلیم کے ساتھ ساتھ ہائیڈروجن بھی معرضِ وجود میں آچکی تھی جب کہ مادۂ حیات مسلسل سرد ہوتا چلا گیا تھا۔ آخری دور ۳ لاکھ سال سے تقریباً ۲۰ ارب سال کو محیط ہے۔ اس دور کی ابتدا میں ایٹم نمود پذیر ہو چکے تھے ۔ اسی دورانیے میں کئی دیگر ستارے اور کہکشائیں وجود میں آئیں اور کئی نے پھٹ کر سپرنووا کی شکل اختیار کر لی۔ بہ قول نیاز احمد صوفی

''ہماری کائنات اور ہم نے اسی سپرنووا سے استفادہ کیا اور طویل عمر والی کہکشائیں متشکل ہونے لگیں۔ ہماری کائنات نے خلا کو مرصع کر دیا۔''(۳۷)

یہی وہ نظریات تھے جنھوں نے تخلیقِ کائنات کے ساتھ ساتھ وجودِ خدا کے مباحث کو بھی سائنس کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا اور اس بات کی وضاحت کی کہ کائنات کی ابتدا محض ایک اولین نقطہ سے ہوئی۔

''۱۹۲۹ء میں ایڈون ہبل نے ایک نشانِ منزل دریافت کیا کہ کائنات میں جدھر بھی نظر ڈالیں ہم دیکھتے ہیں کہ کہکشائیں اور ستارے ہم سے اور ایک دوسرے سے دور ہٹ رہے ہیں یا دوسرے الفاظ میں کائنات پھیل رہی ہے۔ اس مشاہدے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انتہائی زمانہ بعید میں اور شاید اب سے پندرہ سے بیس ارب سال پہلے ساری کہکشائیں اور ستارے ایک دوسرے سے انتہائی قریب بل کہ ایک نقطہ پر مرکوز تھے اور ان کی کثافت اور گنجان پن ایک لا نہایت خفیف ترین نقطہ تھا جس کو اب سینگولے ریٹی (SINGULARITY) کہا جاتا ہے۔ اس دریافت نے کائنات کی پیدایش کو خیالی تیر تُکوں سے نکال کر سائنس کے دائرۂ اثر میں لا کھڑا کیا ہے۔ اگر کائنات پھیل رہی ہے تو اس کی لازمی طبیعاتی وجوہ ہیں کہ اس کا ایک نقطۂ آغاز ہو۔''(۳۸)

انسان نے روزِ اوّل سے ہی کائنات کی پُر اسراریت کو سمجھنے اور اس راز کی پردہ کُشائی کی کوشش کی ہے۔ انسان کا علم بھی محدود تھا اور اس کے ذرائع بھی۔ اپنی محدود حدِ

تجربہ و علم کو استعمال میں لاتے ہوئے اس نے کائنات کی تفہیم کی کوشش کی ہے۔ اوّلین انسان کی اسی علمی و عقلی تحدید نے بہت زیادہ آگے نہیں بڑھنے دیا۔ وہ توہمات میں الجھ کر رہ گیا۔ سائنس، جو آج کے عہد کا سب سے بڑا اور قابلِ یقین علم سمجھا جاتا ہے، ابتداً انسان نے اسے فلسفہ کی صورت میں اپنایا تھا۔ ہر فرد جو اپنی جگہ تفکر کرتا ہے وہ ایک فلسفی کی طرح ہی چیزوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاہم باقاعدہ طور پر اس کائنات اور اس کے لوازمات کو سوچنے سمجھنے کی عقلی سطح پر طرح ڈالنے والوں میں اہلِ ہندو یونان کا سب سے بڑا کردار ہے۔ خصوصاً اہلِ یونان نے جس انداز میں عقل کو راہ نما بناکر اس راستے کی حاشیہ پیمائی کی، وہ انتہائی قابلِ تعریف امر ہے۔

دیگر تمام افراد کی طرح شروع میں اہلِ یونان بھی زمین کو کائنات کا مرکز سمجھتے تھے اور اسے کسی گول پلیٹ کی شکل کا مانتے تھے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کا فہم و ادراک اور ان کے مروّجہ آلات انھیں صرف اس زمین سے متعلق ہی معلومات فراہم کرسکتے تھے۔ نیز اس وقت تک کی تمام اصلاحی تحاریک اور مذاہب نے بھی اسی زمین کو ہی کائناتِ کُل اور اس کے سب سے اہم مقام کے طور پراس کی پیش کش کی تھی۔ تاہم یونانیوں نے سب سے پہلے اس سلسلے میں عقلی انداز میں غوروفکر اور سوچ بچار کی باقاعدہ اور با ضابطہ کوششیں کیں۔ ان افراد میں ارسطو وہ پہلا شخص تھا جس نے کائنات فہمی کے پُرانے تناظرات کو کُچھ حد تک بدلنے کی سعی کی۔ اُس نے مرکزِ کائنات توزمین کو ہی قرار دیا تاہم اُس نے اسے گول پلیٹ کی بجائے گول گیند کی صورت قرار دیا۔

''ارسطو سمجھتا تھا کہ زمین ساکت ہے اور سورج، چاند، ستارے اور سیارے زمین کے گرد گول مداروں میں گھوم رہے ہیں۔ اس کا یہ اعتقاد اس لیے تھا کہ وہ باطنی طور پر یہ محسوس کرتا تھا کہ زمین کائنات کا مرکز ہے اور دائرے میں حرکت مکمل ترین اور بہترین ہے۔''(۳۹)

متقدمین کی طرح ارسطوکے افکار کے مطابق بھی زمین غیر متحرک ہی تھی۔ بعد ازاں پہلی صدی عیسوی میں بطلیموس نے ''مکمل کائناتی ماڈل'' پیش کیایہ ماڈل ایک لمبے عرصے تک اپنے تمام تر سقائم کے باوجود راج کرتا رہا۔ اس ماڈل میں بھی مرکزی حیثیت زمین کو ہی حاصل تھی جب کہ اس کے گرد آٹھ ہم مرکز کُرّوں کے ذریعے اس وقت تک جانے گئے اجرامِ فلکی یعنی چاند، سورج، عطارد، زہرہ، مریخ،مشتری، زحل اور غیر متحرک ستاروں کو ظاہر کیا گیا تھا۔ آخری کرہ میں ستاروں کا مقام گردانا گیا تھا اور اس کے بعد کا تمام تر علاقہ معلومہ انسانی علم سے ماورا قرار دیا گیا تھا۔ کیوں کہ یہ غیر معلوم علاقہ مذاہب خصوصاً عیسائیت کے افکار کی باز گشت اورتفہیم کو ممکن بناتا تھا، جیسا کہ جنت اور جہنم کا نظریہ، لہٰذا اس نظریہ کو اہلِ انجیل نے بھی بہ صد اشتیاق قبول کیا اوراہلِ کلیسا کی ان نظریات سے یہی عقیدت بعد میں ان افکارکے تسلسل کے لیے موت ثابت ہوئی کیوں کہ مذہبی مدرکات میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کوہمیشہ نا پسندیدہ قرار دیا جاتا رہا ہے۔بطلیموسی ماڈل نے اجرامِ فلکی کے مقامات کی صحیح پیش گوئی کرنے کے لیے معقول حد تک درست نظام فراہم کیا، لیکن ان مقامات کی ٹھیک پیش گوئی کرنے کے لیے بطلیموس کو یہ فرض کرنا پڑا کہ چاند ایک ایسے راستے پر چلتا ہے جو اسے عام حالات کے مقابلے میں، بعض اوقات زمین سے دوگنا قریب کر دیتا ہے۔(۴۰)ایک لمبے عرصے تک انھی افکار کی ہی باز گشت سنائی دیتی رہی تاہم کسی صورت بھی عملی تجربات کے لیے راستے کھُلتے دکھائی نہ دیے۔ اولاً تو

انسان کا علم محدود تھا ثانیاً اُس کے افکار کیوں کہ مذہبی افکار سے متصادم تھے لہٰذا اُن کی پیش کاری کوئی کارِآسان نہ تھی۔پولینڈ کا ایک پادری نکولس کوپرنیکس وہ فرد تھا جس نے ۱۵۱۴ء میں اس عقلی جمود کو توڑا اور جدید طبیعیات کے لیے راستے کھولے۔ تاہم اس نے بھی اپنا کائناتی ماڈل کھُل کر اپنے نام سے پیش کرنے کی ہمت نہ کی۔ اس ماڈل کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں سورج کو معلومہ کائنات کا مرکز قرار دیا گیا۔ اُسے ساکن قرار دیتے ہوئے دیگر اجرام یعنی زمین سمیت دیگر سیاروں‘ ستاروں اور چاند وغیرہ کو اُس کے گرد مکمل دائروی راستوں میں متحرّک دکھایا گیا۔

تقریباً ایک صدی بعد ۱۶۰۹ء میں دو ماہرینِ فلکیات ‘ جرمنی کے جوہانس کیپلر اور اٹلی کے گلیلیونے اپنے اپنے تجربات کے نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے سرِ عام کوپرنیکس کے افکار کی قبولیت اور تشہیر کا کام کیا۔ کیپلر نے جب مشتری کے چاندوں کو متحرک دیکھا تواُسے کوپرنیکس کے ماڈل میں خامی دکھائی دی ۔ اسی لیے اُس نے ان مداروں کو گول کی بجائے جب بیضوی قرار دیا تو بہت سی مُشکلات دور ہو گئیں۔ نیز یہیں پر اس نظریے کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا کہ مقناطیسی قوت ان اجسام کو اس انداز میں گھومنے پر مجبور کرتی ہے۔ تاہم ان شکوک کے رفع ہونے میں بھی تقریباً پون صدی کا وقت لگا جب ۱۶۸۷ء میں آئزک نیوٹن نے قوانینِ حرکت اور قوتِ ثقل کی وضاحت کرتے ہوئے ان شکوک کا قلع قمع کیا ۔ لیکن اس نے ایک نئے مسئلے کو جنم دیایعنی اگر یہ قوتِ ثقل اور قوتِ تجاذبہ تمام کائناتی اجسام کے درمیان ہے تو پھر ستاروں کو بھی آپس میں ایک دوسرے کی طرف کشش کرتے ہوئے ایک مقام پر یک جا ہو جانا چاہیے۔ لیکن یہ بات عمومی مشاہدات کے خلاف تھی۔ اس کے لیے اُس نے اپنے طور پر لا محدودیت اور محدودیت کے رشتوں سے اس کی وضاحت کرنے کی سعی کی۔

کائناتی تفہیم کے اس مرحلے میں اہم پیش رفت اُس وقت ہوئی جب اس کائنات کو مستقل بالذات ماننے سے انکار کیا گیا۔ مذاہب کے نظریات میں کائنات کو عمومی طور پر مستقل بالذات قرار دیا گیا تھا اور اس کے پھیلائو یا سکڑائو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بل کہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ کائنات ماضی کے کسی لمحے میں یوں ہی پیدا ہو ئی جیسے ہمیں آج دکھائی دیتی ہے۔ ۱۹۲۹ء میں ایڈون ہبل کے مشاہدات اور ان سے متعلقہ نتائج نے سائنس‘ فلکیات اور کائنات سے متعلق نظریات کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ اُس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ کائنات بہ تدریج پھیل رہی ہے ۔ لہٰذا اگر ہم تاریخ کے پہیے کو واپس گھمائیں تو ہمیں یہ کائنات سکڑتی ہوئی دکھائی دے گی۔ اگر سکڑائو کا یہ مرحلہ جاری رہے تو پھر آخر ایک مقام آئے گا جب کائنات کا یہ تمام تر مادہ اور توانائی ایک نقطہ میں مرکوز ہو جائے گی۔ اور یہی ابتدائی نقطہ کا پھیلائو سائنس میںBIG BANG کہلایا۔ بگ بینگ یا عظیم دھماکا کے نظریے نے کُچھ حد تک تو اس بات کی وضاحت کی کہ مُمکن ہے کہ کسی غیر معمولی شخصیت نے کائنات کے تمام مادہ کو اس صورتِ حال سے دو چار کیا ہو لیکن اس سے ایک نئے سوال نے جنم لیا کہ کب اور کیوں؟ لہٰذا یہاں ہمیں وقت کی ابتدا و انتہا کے لیے نئے افکار سے واسطہ پڑتا ہے۔جیسا کہ کارل پوپر کہتے ہیں کہ

’’ہر انفرادی واقعہ کسی کائناتی قانون کے تحت رونما ہوتا ہے۔یہ درست ہے کہ ہم انفرادی واقعات سے کسی قانون کی صداقت کا استنباط نہیں کرسکتے۔ لیکن اگر کوئی انفرادی

واقعہ کسی مزعون قانون کے خلاف نظر آئے تو وہ اس قانون کو غلط ثابت کرنے کے لیے کافی ہوگا۔‘‘(۴۱)
انہی سوالات نے زمان و مکان کے نئے مباحث پیدا کیے۔
’’جب ۱۹۱۵ء میں آئن سٹائن نے عمومی نظریہ اضافت پیش کیا تو اسے بھی کائنات کے ساکن ہونے پر پورا یقین تھا۔ لہٰذا اس نے اپنے نظریے کو ساکن کائنات کے تصور سے ہم آہنگ بنانے کے لیے اپنی مساواتوں میں ایک کائناتی مستقل کا اضافہ بھی کر دیا۔ یہ نئی ضد ثقل (Antigravity)قوت تھی جو دیگر قوتوں کے برخلاف کسی مخصوص ماخذ سے پیدا نہیں ہوتی تھی بل کہ زمان و مکان (Space-Time)ہی کے تانے بانے کا ایک حصہ تھی۔اسی کائناتی مستقل کی وجہ سے زمان و مکان میں پھیلائو کی ایک فطری صلاحیت پیدا ہوگئی جو بالکل اتنی ہی تھی کہ کائنات میں موجود سارے مادے سے پیدا ہونے والی کششِ ثقل کا اثر زائل کردے تاکہ نتیجتاً ایک ساکن کائنات حاصل ہو۔‘‘(۴۲)

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بعد میں آئن سٹائن نے اس کائناتی مستقل کی شمولیت کو اپنی سب سے بڑی غلطی قرار دیا۔ بعد ازاں فرائڈ مین کے افکار نے کائنات کی یک سانیت کا نظریہ پیش کیا کہ کہیں سے بھی دیکھا جائے ‘ یہ کائنات ایک ہی جیسی نظر آتی ہے۔ اسی دوران ۱۹۶۵ء میں دو امریکی ماہرینِ طبیعیات پینزیاس اور رابرٹ ولسن نے مائکروویو انٹینا پر کام کرتے ہوئے زیرِ مشاہدہ آوازوں کے ساتھ غیر ضروری آوازوں کا بھی مشاہدہ کیا جسے تمام تر احتیاط کے باوجود ختم نہ کیا جا سکا تو انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ
’’صوتی توانائی کی) یہ لہریں نظامِ شمسی کے بھی باہر سے آرہی تھیں اور یہ کہ ان کا ماخذ ہماری کہکشاں سے بھی دور کہیں واقع تھا۔۔۔ چوں کہ یہ ہر سمت میں ایک جیسی ہی نظر آتی ہیں لہٰذا کائنات بھی ہر سمت میں یکساں ہے۔‘‘(۴۳)

بعد ازاں فرائڈ مین کے انھی نظریات نے بگ بینگ کی طرف اشارات دیے جو کہ کائنات میں کسی نقطۂِ وحدانی کی موجودگی کا یقین دلاتا ہے۔ نیز یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اگر بگ بینگ سے پہلے کچھ ہوا بھی تھا تو اس کا مشاہدہ ہمارے اختیار سے باہر ہے۔ وہیں ۱۹۴۸ء میں ہرمن بونڈی اور تھامس گولڈ نے یہ نظریہ بھی پیش کیا کہ جیسے جیسے کہکشائیں ایک دوسرے سے دور ہوتی چلی جاتی ہیں تو ان کے درمیان خالی جگہ میں پھر سے نئی کہکشائیں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ان خالی جگہوں میں مادہ خود بہ خود ایک تسلسل کے ساتھ پیدا ہوتا رہتا ہے۔ تاہم ۱۹۶۳ء میں دو سوویت سائنس دانوں ایوجینی لفشنر اور آئزک خالا تنیکوف نے اس سے مختلف جہت اپناتے ہوئے یہ نظریہ پیش کیا کہ ایسا ہرگز نہیں ہوا ہوگا کہ بگ بینگ وحدانیت کی صورت میں کہکشائیں کسی ایک نقطے پر یکجا ہوئی ہوں تاہم وہ ایک دوسرے کے بہت قریب ضرور رہی ہوں گی۔

کہکشائوں اور ستاروں کی تشکیل کے اسی نظریے کے مطابق ایک ہندوستانی ماہرِ طبیعیات چندر شیکھر نے کائنات کے سکڑائو کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اگر کسی ستارے کی کمیت ایک خاص حد سے کم ہوجائے تو اس کے حجم میں کمی واقع ہونا شروع ہو جاتی ہے اور آخر کار وہ سفید بونے (White Dwarf) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اسی نظریے نے مزید آگے کی حاشیہ پیمائی کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ کسی ستارے کی ایسی حالت بھی ممکن ہے جب وہ اپنی اندرونی کشش کی بہ دولت مزید سکڑتے ہوئے لا متناہی کثافت کے ایک نقطے پر مرکوز ہو جائے۔ اس حالت میں اس سے روشنی باہر خارج ہونے کی بجائے

اندر کی طرف ہی مرکوز ہو جاتی ہے ۔ لہٰذا ہم اس لا متناہی کثیف نقطے کو دیکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اسی کثیف مادے کو بلیک ہول کانام دیاگیا' جس کی اندرونی کشش اتنی شدید ہوتی ہے کہ اس کے دائرۂ اثر میں آنے والی ہر چیز اس کی طرف کھنچتے ہوئے آخر کار فنا سے دو چار ہو جاتی ہے۔ اگرچہ بلیک ہولز کو آج تک دیکھا نہیں جا سکا تاہم اس بات کے واضح ثبوت ملے ہیں کہ بلیک ہولز سے ذرّات کا اخراج بھی نپے تُلے انداز میں ہو رہا ہے۔ جن سے حاصل شُدہ طیف بلیک ہولز کی موجودگی کا یقین دلاتا ہے۔

مزید برآں یہ بھی سامنے آیا کہ بلیک ہولز سے اگر کوئی منفی توانائی والا مجازی ذرّہ ٹکرائے تو وہ حقیقی ذرّے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ نیز یہ کہ بلیک ہول کی کمیت جتنی کم ہوگی' اس کا درجۂ حرارت اتنا ہی زیادہ ہوگا جس سے پیدا ہونے والے شدید دباؤ کی وجہ سے یہ بلیک ہولز پھٹتے ہیں اور نئے ستاروں اور کہکشاؤں کی تخلیق کا باعث بنتے ہیں۔

سائنس دانوں کا ماننا ہے کہ وقت کی ابتدا بھی بگ بینگ کے ساتھ ہی ہوئی۔ اسی بات کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر محمود علی کا کہنا ہے کہ بگ بینگ سے جس طرح فضا پیدا ہوئی اسی طرح وقت کا آغاز بھی ہوا۔(۴۴)بگ بینگ کے نتیجے میں جب یہ کائنات تخلیق ہوئی تو ابتداً پہلے ایک منٹ تک مسلسل پھیلائو کی کیفیت میں رہی جو پھر سست پڑ گئی اگر پھر سے کائنات کا پھیلائو رُک جائے تو حالات کا تناظر کچھ یوں ہوگا:

''اگر کائنات کا پھیلائو رُک جائے اور کششِ ثقل کے زیرِ اثر کائنات پچک کر پہلے کی طرح انتہائی ممکنہ حد تک بھنچا ہوا اور گرم نقطہ متشکل ہو' تو یہ عمل عظیم بھنچائو BIG) (CRUNCHکہلائے گا۔ اگر پوری کائنات نہ بھنچے تو بھی جگہ جگہ مقامی طور پر بھنچاؤ سے بلیک ہول پیدا ہو کر سنگو لے ریٹیز بن جائیں گیں۔''(۴۵(

کلاسیکی نظریاتِ ثقل کے مطابق کائنات کا برتائو دو طرح کا ہو سکتا ہے یعنی یا تو وہ لامتناہی وقت سے موجود ہے یا وقت کے کسی متناہی مقام سے پیدا ہوئی ہو۔ تاہم کوانٹم نظریہ ثقل کے مطابق زمان و مکان کی کوئی حد نہیں ہے۔

String Theories''کے تحت یہ تصور کیا جاتا ہے کہ کائنات کے بنیادی اجسام ذرّات نہیں جو خلا میں کسی خاص نقطے پر ہوتے ہیں۔ ان کے برعکس' کائنات کے بنیادی ترین اجسام دراصل ایسے ریشے یا تار ہیں جن میں صرف اور صرف لمبائی ہے' باقی کوئی جہت(Dimension)نہیں۔ یہ تار حلقوں کی شکل میں ہوتے ہیں۔ یعنی کائنات دراصل ایسے بنیادی ترین اجسام سے مل کر بنی ہے جو لا متناہی پیمانے جتنے باریک تاروں والے حلقوں پر مشتمل ہیں''(۴۶(

کائناتی تفہیم کے یہ جدید ترین سائنسی نظریات ہیں۔ اگر ہم سائنس کے مقابل ادبی ترجیحات کا مطالعہ کریں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ تجسس انسان کی سرشت میں شامل ہے۔ روزِ اوّل سے ہی انسان نے اپنے گردوپیش کو سمجھنے اور بیان کرنے کی کوششیں کی ہیںاور انھی کوششوں کے طفیل ادب تخلیق ہوا۔ادب بڑی سطح پر زندگی کا بیانیہ ہے۔ادب مبنی بر حقیقت ہوتا ہے مگر حقیقت نہیں' یہ امکانات کا نام ہے۔بڑے ادیب کی پہچان یہ ہے کہ وہ ذات کو کائنات سے ملاتا ہے۔کائنات ایک عظیم مُعما ہے' جسے ہر عہد کے انسان نے سمجھنے اور حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاعری ہو یا فلسفہ' مذہب ہو یا سائنس' سارے علوم نہ صرف کائنات کے اندر سے برآمد ہوئے بل کہ ان علوم نے ہمیشہ کائنات کو سمجھنے کی قابلِ قدر کوششیں کی ہیں۔کائنات کی نیرنگیاں' اس کی وُسعتیں اور خوب صورتیاں ' انسان کو ہمیشہ سے

اپنے سحر میں جکڑے ہوئے ہیں۔ انسان‘ جو اس عظیم و قدیم کائنات کے روبرو اچانک آن کھڑا ہواتھا۔ ڈرا ڈرا اور سہما سہما ابتدائی انسان _____شروع میں وہ ہر بڑی شے سے ڈر جاتا اور اسے دیوتا کا درجہ دے کر اُس کے سامنے سجدہ ریز ہوجاتا۔ انہی مظاہرِفطرت کو سمجھنے کی ابتدائی کوششوں کے دوران میں ہی دیو مالائی ادب‘مختلف مذاہب‘ شاعری‘ فنون اور سائنس نے جنم لیا۔ وہ جیسے جیسے دماغی طور پر بالغ نظر ہوتا چلا گیا اسی طرح اُس نے انسان‘ کائنات اور خُدا کی تکون کو سمجھنے کے لیے بہتر نظریے ایجاد کر لیے۔اور ان نظریات کی باز گشت شاعری میں بھی دکھائی دینے لگے۔

ایک محرابِ ازل ہے جس میں
کتنی صدیوں سے کھڑے ہیں ہم تم
ہاتھ پھیلائے ہوئے سوئے فلک تکتے ہوئے
منتظر ہیں کہ صدا آئے گی
آسمانوں پہ مگر کوئی نہیں ہے شاید
آسمانوں کا مکیں اور کہیں ہے شاید
یا فقط یہ بھی کوئی حسنِ یقیں ہے شاید
کب تلک حسرتِ پائندہ کا افسوس کریں
کیوں نہ دیوارِ ازل ہی کو زمیں بوس کریں
اپنی تصویر سے باہر نکلیں
اپنی آواز کا چہرہ دیکھیں
لوگ کہتے ہیں‘ زمیں اور فلک سے بھی پرے
ایک رستہ ہے جہاں
نقشِ قدم گونجتے ہیں)شاہین مفتی: ایک اور جنم)(۴۷(

کائناتی تکوین کا ایک اور اہم کردا رخدا ہے۔ خدا کا عقیدہ مذاہب کی پیداوار ہے۔ جن میں سے قدیم ترین عقیدہ ارواح پرستی کی صورت میں سامنے آیا۔ اور علی عباس جلال پوری کے مطابق مذاہبِ عالمی کی بنیاد بھی روح کے بقا کے تصوّر پر رکھیّ گئی ہے۔(۴۸)جب کہ سگمنڈ فرائڈ کے مطابق خدا کے عقیدے میں نفسیاتی طور پر بزرگ باپ کے خیال کی پروجیکشن (Projection) نظر آتی ہے۔(۴۹)ٹامس گولڈ سٹائین رقم طراز ہیں کہ

’’تہذیب کے آغاز ہی میں جغرافیائی خیالات اس وقت کے مروجہ مظاہر پرستی کے تصورات کا حصہ تھے جو یہ بتاتے ہیں کہ اوائلی تہذیبیناپنی اپنی جائے سکونت میں خود کو ان ارواح میں محصور سمجھتی تھیں۔اور یہ ارواح دراصل نیچر کی ہی قوتیں تھیں۔‘‘(۵۰(

اُس خدا کے وجود پر آج کا شاعر جب غور کرتا ہے تو اُسے اولین انسان کی سوچ کچھ یوں دکھائی دیتی ہے۔

سب کواکب اب اسے لگتے ہیں کچھ کچھ اور سے
چشمِ حیرت
یہ تماشا دیکھتی ہے غور سے
اک ہجومِ بے نوا بازار میں ٹھہرا ہوا
اک صدائے الاماں دربار سے اٹھتی ہوئی
اک نگاہِ منتظر دیوار سے تکتی ہوئی

اک خدائے لم یزل افلاک پر بیٹھا ہوا)شاہین مفتی: ایک اور لینڈ سکیپ)(۵۱(

انسانی اور کائناتی حوالے سے اس خُدائی تصور میں ارواح پرستی کے ضمن میں اجداد پرستی، مظاہر پرست کے ضمن میں سورج، چاند، سیارے، ستارے، پہاڑ، درخت، جان ور، آگ، پانی، ہوا، مٹّی، جنسی اعضا اور دیوی دیوتا بھی شامل رہے ہیں۔ قدیم افریقی مذاہب میں اجداد پرستی کی صورت میں خدا کا تصور موجود رہا۔ آسٹریلیا کے جنگلی باشندے''بائی'' بہ معنی بنانے والا کے عنوان سے خُدا کو مانتے تھے، جو ایک بوڑھا شخص ظاہر کیا جاتا تھا۔ پہلے وہ زمین پر رہتا تھا لیکن پھر آسمان پر اور پھر اس سے بھی پرے کہیں چلا گیا ۔مالینیشیا کے لوگ بھی ارواح پرست ہیں۔ پالی نیشیا کے لوگوں کا خاص معبود ''تاروآن'' ہے، جو خالق کا درجہ رکھتا ہے۔اوجی، اشانتی اور یوروباأور گولڈ کوسٹ نیگرو لوگ آسمانی خدا پر یقین رکھتے ہیں۔آکرا کا سب سے بڑا دیوتا ''جونگ ما''(بارش کا دیوتا)، دِنکا کا ''ڈینگ ڈٹ'' (عظیم بارش) ہے۔داھومی، ''سورج ''اور ایبو لوگ ''تشوکو'' کو مانتے ہیں۔

قدیم عراقی تہذیب میں بڑے دیوتائوں میں ''انو'' آسمان دیوتا ''اینلل'' (فضا اورزمین کا دیوتا)، ''ایا'' (پانی کا دیوتا) شامل ہیں۔اس کے علاوہ عشتار دیوی کو اہمیت حاصل ہے۔ مصری تہذیب میں بیل، باز، گدھا، گیڈر، گبریلا، لق لق، مگرمچھ، گائے، بلّی، گدھ، سانپ، بچھو اور شیرنی کو مختلف ناموں سے پوجا جاتا رہا۔ یہ لوگ بادشاہ پرستی،حیات بعد ممات اور جادو ٹونے کے بھی تھے۔ ان کے سب سے بڑا دیوتا ئوں میں ''امن را'' (زرخیزی، بارآوری، جنگ، سورج، دریائے نیل کا دیوتا اور دیوتائوں کا بادشاہ) اور پتاح (مصری عقیدے کے مطابق اس نے ہتھوڑے سے پیٹ کر لوہے کا آسمان بنایا) شامل ہیں۔ حطی اور فنیقی لوگ بعض مستشرقین کے خیال میں پہلے مؤحد تھے اور ایک ہی قوّت کے پیروکار تھے جسے ایل (اعلا)، رام یارمن (بلند)، لعل (آقا) اور میلیک یا مولخ (بادشا) کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ لوگ بھی استارتہ (عشتار) کی پوجا کے قائل تھے۔ کریٹ کے لوگ بھی ظواہر پرست تھے۔ اسی طرح یونانی لوگوں کی اساطیر ان کے دیوتائوں کے ناموں سے بھری پڑی ہیں جن میں ڈایونیس(جنس اور شراب کا دیوتا)، ہرمیز(لنگ پوجا اور تجارت کا دیوتا)، ایفروڈائٹی(حسن اور بارآوری کی دیوی)، زیوس(آسمان کا دیوتا)، ہیر(شادی کا دیوتا)، پوزیڈان (پانی کا دیوتا) ، ڈیمیٹر(اناج دیوتا)، اپولن (قانون کا دیوتا)، آرٹیمس (شکار کی دیوی)، ایتھینی (عقل کی دیوی)، ہیفائسٹس(صنعت و حرفت کا دیوتا)، اریز (جنگ کا دیوتا)، اہم ہیں اس کے علاوہ بھی ان کے ہاں ڈھیروں دیوی دیوتائوں کے نام اور اُن سے متعلقہ اساطیر ملتی ہیں۔قدیم امریکی بھی سورج کو سب سے بڑا دیوتا مانتے تھے۔

یہاں تک ہم دیکھتے ہیں کہ معبود کا کوئی خالص تصور سامنے نہیں آتا بل کہ اپنی ذہنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے لوگ انفرادی اور اجتماعی سطح پر اپنا معبود تراشتے رہے۔ وہ مذاہب جن میں خدا کے وجود اور اس کے کام کرنے کے طریقۂِ کار اور اس کے کائنات اور انسان سے تعلقات پر مباحث ملتے ہیں ان میں ہندومت، بدھ مت، جین مت، سکھ مت،تائو مت، شنٹومت، زرتشت غیرسامی مذاہب میں اوریہودیت، عیسائیت،اسلام سامی مذاہب میں اہمیت کے حامل ہیں۔ کوشش کی جائے گی کہ مختصر ترین الفاظ میں ان مذاہب کا خدا کے بارے نظریہ یہاں پیش کردیا جائے۔

یوں تم ہندو مت میں بہت سے دیوی دیوتائوں کو پوجا جاتا ہے لیکن ان میں سب سے اہم نظریہ تری مورتی کی صورت میں اجاگر ہوتا ہے۔ یہ تثلیث برہما، وشنو اور شیوا کی صورت

میں جلوہ گر ہے۔ وہ انھیں ایک ہی خدا کی تین صورتیں مانتے ہیں۔ بہ حیثیت خالق کے وہ برہما ہے۔ بہ حیثیت پروردگار (پالنے والے) کے وہ وشنو ہے اور نہ حیثیت قہار یعنی دنیا کے مٹانے والے کے وہ شیو ہے۔ یہ تینوں الگ الگ دیوتا نہیں ہیں بل کہ ایک ہیں اس لیے کبھی کبھی ان کا مجسمہ یوں بنایا جاتا ہے کہ ایک ہی انسان کے جسم پر تین سر لگادیے جاتے ہیں۔ اس بت کو تری مورتی کہا جاتا ہے۔(۵۲)اس کے علاوہ کالی ماتا' لکشمی دیوی یا شیراں والی بھی ایک اہم دیوی ہے۔ بسا اوقات اُسے بھی تثلیث میں شامل کیا جاتا ہے کیوں کہ برہما پوجا اب یوں مروّج نہیں ہے۔ ہندوئوں کا کائنات کی تخلیق کا نظریہ برہما کے گرد گھومتا ہے۔ ہندو نظریات کے مطابق برہما ایک لمبے عرصے تک سوتا ہے اور اس دوران کائنات کی تخلیق کا خواب دیکھتا ہے۔ وہ خواب سے جاگتا ہے تو پھر موجودہ کائنات کو تباہ و برباد کردیتا ہے اور خواب کے مطابق نئی دنیا تشکیل کرتا ہے۔ ہندوئوں کا عقیدۂ تناسخ بھی کائناتی تفکر کے حوالے سے اہم کڑی ہے۔ کیوں کہ تمام اشیا برہما کے وجود سے پیدا ہوئی ہیں لہٰذا انھیں واپس اسی کی طرف پلٹنا ہے۔ اس چکر میں وہ پھنسے رہتے ہیں اور جون بدلتے رہتے ہیں تا وقتیکہ وہ اپنی منزل کو پالیں۔ ہندوئوں کے ذات پات کے نظام کے پیچھے بھی دراصل یہی وید انتی فلسفہ ہے۔ ہندوئوں کے مطابق وقت ایک دائروی چکر میں گھومتا ہے۔عصرِ حاضر میں تخلیقِ کائنات کے اس نظریہ کو جدید سائنسی نظریات کے قریب ترین مانا جاتا ہے۔

بدھ مت کے پیروکاروں کے ہاں باقاعدہ خدا کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ اس کی بجائے انسان کے لیے اس دنیا کو دکھوں کا گھر قرار دیا گیا ہے۔ ان دکھوں سے نجات ہی انسان کا ماحصل ہے اور اس کے لیے وہ اپنی ذات میں گم ہوکر رفعت و بلندی حاصل کرتا ہے۔ کچھ ایسے ہی نظریات جینیوں کے ہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک کائنات خود ازل سے وجود میں آئی ہے اور اسے اسی طرح ابد کی طرف جانا ہے۔ انسان اس سلسلے میں ایک بے حیثیت کڑی کی صورت رکھتا ہے۔

زرتشتوں کے ہاں بھی ابتدا میں ایک ہی خدا کا تصور تھا جو بعد ازاں نیکی اور برائی کے رب کی دو صورتوں میں تقسیم ہوگیا۔ یزداں اور اہرمن ان کے ہاں دو ایسے خدائوں کی صورت سامنے آتے ہیں جو ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ اور آخر فتح حق کی ہوتی ہے۔ تائو مت اور شنٹو مت کے پیروکاروں کے ہاں بھی ایسے ہی تناظرات سامنے آتے ہیں کہ خدا کی وحدت سے اس کی ثنویت کی صورت نکالی گئی ہے۔

سامی مذاہب میں یہودی' یہووا کو سب سے بڑا خدا مانتے ہیں۔ وہ خالق و مالک کے رتبے پر فائز ہے اور اس کی اتباع ہی کامیابی کی ضامن ہے۔ شیطان اس کی ضد ہے جس کی پیروی گم راہی اور جہنم کی طرف لے جاتی ہے۔ عیسائیت کے نظریات کے مطابق بھی خدا ایک تثلیث کا نام ہے جو کہ خدا' بیٹا اور روح القدس پر مشتمل ہے۔ اس نظریہ کی بارہا مختلف حوالوں سے پیش کش کی گئی لیکن کوئی قابلِ قبول نتیجہ سامنے نہیں آسکا۔ مختصر ترین اور قابلِ سمجھ الفاظ میں یہ نظریہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ خدا ازل سے تھا اور اس کے ساتھ اس کا کلام تھا۔ یہی کلام بعد ازاں بیٹے کی صورت میں متشکل ہوا اور روح القدس ان دونوں اقانیم کے درمیان رابطے کا نام ہے۔ اسلامی نظریہ کے مطابق اللہ تعالیٰ ایک خالق ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا۔ وہی اس کے تمام تر نظام کو چلانے والا اور اکیلا ہے۔ وہ تب سے ہے جب کچھ نہیں تھا اور تب بھی ہوگا جب کچھ نہیں ہوگا۔ وہ عقل سے ماورا ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے مختلف خصوصیات اس کے صفاتی ناموں کی صورت میں سامنے آتی ہیں جو کہ اُس

کے خصائص کو بیان کرتے ہیں۔ شیطان اس کی ضد ہے جو برائی پر آمادہ اور اللہ تعالیٰ کے بتائے راستے سے گم راہ کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنا پیغام انبیا کے ذریعے انسانوں تک پہنچاتا ہے' جن میں آخری نبی حضرت محمدؐ ہیں۔اُسی نے پہلے انسان حضرت آدمؑ کو پیدا کیا اور وہ مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے ۔ روزِ قیامت سب کو اس کے سامنے اپنے اپنے اعمال کا حساب دینا ہے جس کے بدلے میں انھیں جنت یا جہنم میں بھیجا جائے گا۔

انسان کو مخلوق سمجھا جائے تو بھی وہ تمام تر دیگر مخلوقات سے برتر ہے اور اس کے مقام اور مقاصد کی تشہیر میں تمام تر مذاہب نے حصّہ ڈالا ہے ۔ ہندومت' جس کا شمار قدیم ترین مذاہب میں ہوتا ہے' کے مطابق کیوں کہ انسان برہما کی روح سے بچھڑا ہوا ٹکڑا ہے تو وہ تمام دیگر مخلوقات پر افضل ہے اور اسلام کے مطابق بھی وہ نیابتِ الٰہی کے منصب پر فائز ہونے کی وجہ سے فضیلت کا حامل ہے۔ عیسائیت کے مطابق خدا کے بیٹے نے ' جو کہ تین بنیادی اقانیم میں سے ایک ہے' انسانی صورت میں ظہور کیا تو یہ بھی انسان کی فضیلت کی دلیل ہے۔یہودیت کے مطابق انسان روحانیت اور حیوانیت کے بیچ کی اک کڑی ہے یعنی وہ حیوانیت سے کچھ اوپر اور روحانیت سے کچھ نیچے کے مقام پر ہے۔مذاہب کے اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے ڈاکٹر طارق ہاشمی رقم طراز ہیںکہ

''انسان کے بارے میں کائناتِ اصغر(Microcosmos) کا تصوّر ہمیں مذاہب اور فلسفوں میں نظر آتا ہے۔اس اعتبار سے انسان دراصل دو دنیائوں میں زندہ ہے۔ ایک اس کی داخلی دنیا اور ایک خارجی دنیا(Macrocosmos)۔ فلسفیوں نے وجودِ انسانی(Microcosmos)کوکائناتِ اکبر(Macrocosmos) کاایک عکس قرار دیا ہے کہ انسانی وجود میں ویسے ہی تغیرات اور انقلابات رونما ہوتے ہیںکہ جیسے اس کے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات مینظاہر ہوتے ہیں۔''(۵۳(

رابرٹ بریفالٹ کے مطابق حقیقت میں ابتدائی انسان کی نقالیت کا تعلق مذہب کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسے کوئی بندر کرتب دکھا دکھا کر نقالیّت کا اظہار کرے یا بھیڑیں کسی جھاڑی کے رخنے میں سے کودتی چلی جائیں۔(۵۴) کائنات میں انسان کے مقام اور اس کی تفہیم کے لیے عموماً اُسے دو حوالے سے دیکھا جاتا ہے ۔یہ دو حوالے ہی کائنات میں اس کے کردار ومقام کا تعین کرتے ہیں'یعنی مذاہب اور فلسفہ وسائنس۔ بدھ مت کے علاوہ تمام مذاہب میں خدا کا تصوّر موجود ہے جو کہ خالق ہے۔تمام مذاہب کے مطابق انسان دو حصّوں سے تکمیل حاصل کرتا ہے' جسم اور روح۔ سائنسی حوالہ انسان کے جسمانی پہلو پر بات کرتا ہے اور مذہبی پہلو اس کی روح کی۔ بدھ مت میں خدا کا تصوّر موجود نہیں ہے لیکن عظمتِ انسانی ان کے نزدیک کامیابی کا معیار ہے کہ انسانی عظمت کا احترام کیا جائے اور اسے تکلیف نہ پہنچائی جائے۔

سامی مذاہب کی اساطیر میں تھوڑا بہت فرق ضرور ہے لیکن بنیادی گناہ کا فلسفہ سب کے ہاں مروّج ہیں۔ وہ گناہ جو حضرت آدمؑ سے سرزد ہوا اور اس کی پاداش میں اُنھیں حقائق کی دُنیا سے نکال کر اس زمین کی زینت بنایا گیا۔ اب اس گناہ کے ہرجانے کے طور پر وہ اس دنیا میں موجود ہے اور اپنی اصل تک لوٹ جانا ہی اُس کا معیار ہے۔ عیسائیت کے مطابق کیوں کہ حضرت عیسیٰؑ اپنی جان دے کر اُس انسانی گناہ کا کفارہ ادا کرچکے ہیں لہٰذا اُن کی تعلیمات پر یقین لانے اور پادری کے سامنے اعترافِ گناہ سے انسان تمام گناہوں سے پاک اور

منزّہ ہوجاتا ہے۔ اسلام کا نظریہ اس گناہ کو صرف حضرت آدمؑ و حضرت حوّاؑ تک ہی رکھتا ہے اور عام انسان کو عظمت و بزرگی کے مقام پر فائز کرتا ہے جیسا کہ قرآنِ مجید میں بیان ہے کہ

لقد خلقناالانسان فی احسن تقویم

لقد کرمنا بنی اٰدم

اسی فضیلت کی بہ دولت اللہ نے فرشتوں کو آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا اور انکار کی صورت میں اُسے مردود قرار دیا گیا۔ یہ انسان کی خدائی نیابت اور اشرف المخلوقات ہونے کا بیان ہے۔ پھر نیابت کے اس درجہ پر لانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی امانت یعنی قرآنِ مجید اُسے عطا کیا‘ جس کے بارے میں قرآنِ مجید میں بیان ملتا ہے کہ اللہ نے اپنی اس امانت کو زمین‘ آسمان‘ پہاڑوں وغیر ہ پر نازل کیا تو ان سب نے قبول کرنے سے انکار کردیا اور انسان نے قبول کرلیا۔ اسی بہ دولت وہ امین قرار پایا اور روزِ آخرت جواب پُرسی بھی اُسی سے کی جائے گی۔یہ ارضی زندگی اُس کی آزمایش ہے لیکن اُس کے لیے توبہ کا دروازہ ہمیشہ کھُلا رہتا ہے۔ وہ جب چاہے اپنے خالق کی طرف رجوع کرسکتا ہے۔

دنیا میں انسان پر دو طرح کے فرائض عاید ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں دوسروں کے اُس پر دو طرح کے حقوق ہیں۔ ایک حقوق اللہ اور دوسرے حقوق العباد۔ حقوق اللہ سے مراد یہ ہے کہ رب کے حقوق پورے کیے جائیں۔ اُس کی عبادت کی جائے اور حقوق العباد سے مُراد اپنے جیسے انسانوں کے ساتھ معیاری برتائو کرنا ہے۔ فضیلتِ انسانی کے معیار کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ حقوق اللہ پر حقوق العباد کو فوقیت دی گئی ہے۔دوسری طرف انسان ایک گوناگوں کیفیت کا شکار ہے۔ وہ سراپا خیر بھی ہے اور سراپا شربھی۔ خیرو شر کی آویزش ہی اس کائنات کے نظام کو چلارہی ہے اور انسان اس آویزش کا ایک اہم کردار ہے۔

اسلام کے حقوق العباد کے نظریے کی طرح سکھوں کے ہاں بھی بھلائی کا پرچار موجود ہے۔ اُن کے نزدیک بھی انسانی کامیابی کا راز یہ ہے کہ فرد ‘ دوسرے افراد کی سیوا یا خدمت کرے۔ کیوں کہ سیوا ہی وہ مظہر ہے جو اُسے اس دُنیا میں بھی کامیاب کرواسکتی ہے اور اگلی دُنیا میں بھی۔ جب کہ اس سے صرفِ نظر اُس کے لیے ناکامی کا پیش خیمہ ہے۔ قدیم ترین غیرسامی مذاہب میں ہندومت کا نظریہ ہے۔ اُس کے مطابق بھی انسان آزمائش میں گھرا ہوا ہے لیکن وہ ایک بلند تر مقام کا حق دار ہے کیوں کہ وہ خود برہما کے وجود سے پیدا ہوا۔ تمام تر مخلوقات میں انسان افضل ترین مخلوق ہے۔ سانکھیہ نظامِ فکر کے برعکس ویدانتی مکتبۂ فکر وحدانیت پرست ہے اور صرف ایک اکائی پر یقین رکھتا ہے۔ اس اکائی کو خدا یا برہما کہا جاسکتا ہے۔(۵۵)اُن کے جنم چکر اور ذات پات کا نظریہ بھی اسی امر کی طرف غمازی کرتا ہے کہ انسان افضل ترین مخلوق ہے اور انسانوں میں برہمن افضل ترین مخلوق ہے جو کہ اپنی حقیقت سے ملنے کے قریب ہے اور قابلِ صد احترا م ہے۔ بدھوں کے ہاں انسان کا خدا سے کوئی رابطہ نہیں ہے بل کہ انسان خود میں ہی کامل و اکمل صورت اختیار کرسکتا ہے اور اُس کی ریاضت اس منزل تک پہنچنے کا راستا ہے۔افریقی مذاہب میں بھی انسان خدا کا پرورده ہے اور اُسے خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

مذاہب کے بعدفلسفہ اور سائنس کے نظریات ہیں۔ یہ نظریات انسانی زندگی کے روحانی نہیں بل کہ مادی پہلو کے عکّاس ہیں۔ ان کے نزدیک انسان مادی اجزا پر مشتمل ایک مخلوق ہے جو ارتقائی مراحل کی بہ دولت اس مقام تک پہنچی اور اسی طرح اُسے موت سے ہم کنار

ہوتا ہے۔ ان نظریات کی پہلی صدائیں ہمیں یونانی فلسفیوں کے ہاں سنائی دیتی ہیں۔ مادیت پسندی کے اس نظریے کی اولین اینٹ مشہور یونانی فلسفی ڈیموقراطیس نے رکھی جس کا خیال ہے کہ انسان بھی دیگر مخلوقات کی طرح چار عناصر آگ' مٹّی' پانی اور ہوا کا مرکب ہے۔ ان اجزا کا بکھر جانا ہی درحقیقت موت ہے جیسا کہ چکبست نے کہا کہ

؂زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے ' انھی اجزا کا پریشاں ہونا

مادیت پرستوں کے نزدیک یہ کائنات ایک خودکار مشین کی طرح ہے جس میں انسان ایک کل پُرزے کی طرح اپنا کام کرتا ہے۔ اُس کی اپنی کوئی اصل نہیں ہے۔ اُس کی ذمہّ داری بس اتنی ہی ہے کہ وہ اس چلتی ہوئی مشین میں اپنا کام کرتا چلا جائے۔ مادیت پرست عموماً روح کے انکاری ہیں اور وجود کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کے ہاں ایسے نظریات بھی ملتے ہیں جن میں جسم کے ساتھ ساتھ روح کو بھی مانا تو گیا لیکن جسم کو روح پر فوقیت دی گئی۔ اس کے برعکس افلاطون روح کا قائل ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی فوقیت و برتری کو بھی قبول کرتا ہے۔اُس کے نزدیک انسانی روح غیر فانی ہے لیکن فانی جسم میں قید ہے۔ مادیت پرستوں کے برعکس وہ روح کو انسان کا جوہرِ اصلی قرار دیتا ہے اور اس کی ترقی کے لیے کوشاں رہنے کی تعلیم دیتا ہے۔

کچھ فلسفیوں کے نزدیک عالمِ موجود ہی عالمِ حقیقی ہے۔ کیوں کہ انسان بھی ان موجودات کا حصّہ ہے لہٰذا وہی حقیقت ہے۔ یہ نظریات خُدا کے خالق ہونے پر بھی تشکیک کا اظہار کرتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نئے علوم سامنے آتے چلے گئے اور انسان نے کائناتی تفہیم کی اپنی استطاعت کے مطابق بہتر کوششیں کی۔ فلسفہ کے آنے سے سمجھنے کے معیارات خدائی حدود سے نکل کر انسانی اختیار میں آگئے۔ فلاسفہ کے مختلف النوع نظریات سامنے آنے لگے۔ اہم فلاسفہ میں ایک نام کانٹ کا ہے۔ کانٹ کے خیال میںزمان و مکان کی دنیا جسے سائنس اہمیت دیتی ہے' محض ظواہر پر مشتمل ہے۔ حقیقی عالم اس سے ماورا ہے۔ وہ کائنات کو بھی اہم سمجھتا ہے اور اس میں موجود انسان کو بھی۔

جہاں تک ہیگل کا تعلق ہے تو اس کے نزدیک انسان اور کائنات دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ کائنات بے معنی نہیں ہے اس لیے انسان کے لیے اجنبی نہیں ہے ۔ انسان اس کائنات کے کارخانے کا ایک ایسا پرزہ ہے ' جو کائنات کی اس اپنائیت کے ساتھ چلتا ہوا اسے اس کے مقاصد کی تکمیل کی طرف لے جاتا ہے۔جب کہ مثالیت پسندوں کے نزدیک انسان باشعور اور کائنات کا مرکز ہے۔ وہ کائنات کو اپنے انداز میں اپنی عقل و فہم کے مطابق بدلنے کی سعی کرتا ہے اور کائناتی حوالے سے ایک متحرک کردار نبھاتا ہے۔

نو فلاطونی فلسفی فلاطینوس کے مطابق روح اور مادہ دونوں ذاتِ احد سے نازل ہوتے ہیں لیکن روح کا مادہ کی طرف مائل ہونا اسے روحِ سفلی بنادیتا ہے۔اور انسان کا مقام یہ ہے کہ روح کی طرف توجہ دیتے ہوئے خود کو رفعت کی طرف مائل کرے۔یونانی کتب کے عربی میں ترجمے سے نوفلاطونی افکار نے مسلمان فلاسفروں پر گہرے اثرات ڈالے اور وحدت الوجودی افکار کی گونج الجیلی اور محمد ابنِ عربی کے نظریات کی صورت سنائی دینے لگی۔ اس فلسفہ نے تمام مسلم صوفیوں کو شدید طور پر متاثر کیا۔ ہندومت سے مسلم فلسفہ کی یک

سانیت کی وجہ بھی وحدت الوجودی نظریہ بنا۔اس نظریے کے مطابق بھی آواگون کی طرح روحِ انسان روحِ ازل سے ملنے کے لیے بے قرار رہتی ہے۔

آکاش کی سرحد سے پرے تیرا نگر تھا
صدیوں کا سفر تھا
میں ذرّۂ آوارہ تھا اور محوِ سفر تھا
صدیوں کا سفر تھا
وہ ساعتِ گم گشتہ کہ میں خود سے نہاں تھا
کیا جانیے کہاں تھا (رشید قیصرانی: صدیوں کا سفر)(۵۶)

فلسفۂ تجربیت کے ماننے والوں میں سے ہیوم اور جان لاک روح کے وجود سے انکار کرتے ہیں ۔ جب کہ فلسفۂ ارادیت کے پیروکاروں میں سے شوپنہار کے مطابق آرزوئیں انسان کو دکھ اور تکلیف دیتی ہیں۔ خواہشات پوری ہوں تو بھی دُکھ ہے نہ ہوں پوری تو بھی دُکھ ہی ان کا حاصل ہے۔ کائنات کے انسانی کردار کے بارے میں نطشے نے خُدا کی موت کا اعلان کیا اور فوق الانسان کا تصوّر پیش کیا۔ تاہم اس کا کہنا یہ بھی تھا کہ ابھی فوق الانسان وجود میں نہیں آیا ۔ ہم اُس کے پیش رو ہیں ۔

پھر اس کے بعد اہم نام ڈارون کا آتا ہے جو انسان کو دیگر حیوانات کی طرح ایک ارتقائی عمل میں کامیابی حاصل کر لینے والے جان دار کے طور پر دیکھتا ہے۔ ایسا جان دار جس نے دیگر جان داروں کی نسبت اپنے ماحول سے بہتر مطابقت پیدا کی اور دوڑ میں دیگر جان داروں سے آگے نکل گیا۔ ڈارون کا یہ نظریہ انسان سے اس مقام کو چھین لیتا ہے جو مذاہب نے اُسے عطا کیا ہے۔

انسانی حوالے سے ایک اور بڑا فلسفہ جس نے پوری دنیا کو شدید طور پر متاثر کیا کارل مارکس کا ہے۔ کارل مارکس بھی جسم اور روح دونوں کا قائل ہے لیکن وہ یہ سمجھتا ہے کہ روح سے مادہ زیادہ اہم ہے ۔ اس کے افکار نے معاشی اصولوں کی صورت میں پہچان پائی اور دنیا کے کئی ممالک میں انقلاب کی نوید لے کر آیا۔ مارکس اس بات کا قائل ہے کہ انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے جسم کی بہتری کے لیے کوشش کرے۔

جدید ترین فلسفوں میں وجودیت کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اس فلسفے کے مطابق وجود ' جوہر پر مقدم ہے۔ مکان اور معمار کی مثال اس پر بہترین انداز میں پوری اترتی ہے۔ جیسے ایک معمار ایک مکان بنانے کے لیے اپنی صلاحیتوں کو بھرپور طور پر استعمال کرتا ہے لیکن اس مکان کی تکمیل کے بعد ایک دوسرے مکان کی تعمیر کی طرف چل پڑتا ہے۔ یہ اس کا وجود ہے جو اس سے ایسا کرواتا ہے۔ اسی فلسفہ کا ایک اہم مبلغ سارتر ہے۔ سارتر کے نزدیک انسان آزاد پیدا ہوا لیکن جکڑا ہوا ہے۔انسان کائنات میں بے بس اور تنہا ہے اور اُسے نہ ابتدا کی خبر ہے نہ راستے کی اور نہ منزل کی۔ وہ بس اس کائنات میں یوں ہی سرگرداں ہے۔

لیکن انسان اتنی گنجلک شے ہے کہ شاعر کہتا ہے کہ

میں ستاروں اور درختوں کی خاموشی کو سمجھ سکتا ہوں
میں انسانوں کی باتیں سمجھنے سے قاصر ہوں (زاہد ڈار) (۵۷)

زبان کی ایجاد کے بعد شاعری کی ایجاد انسان کا عظیم ترین کارنامہ ہے۔ کاہن ہوں یا جادوگر' مذہبی پیشوا ہوں یا تخلیق کار' شاعری سب کے لیے ہمیشہ کارآمد رہی ہے۔ اس لیے

کائنات کو سمجھنے کے ابتدائی نظریات سے لے کر سائنس کے جدید ترین نظریات کی پیش کش اردو نظم میں نہایت شان دار طریقے سے سامنے آتی ہے۔
نثار اکبر آبادی شعر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

’’شعر لفظ شعور سے نکلا ہے ۔ جس کے معنی کسی چیز کے جاننے پہچاننے اور واقفیت کے ہیں۔ لیکن اصطلاحاً شعر اس کلام موزوں کو کہتے ہیں جو قصداً کہا جائے۔ یہ کلامِ موزوں جذبات اور احساسات کے تابع ہوتا ہے۔ اور کسی واقعے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔۔۔ دراصل شعر ایک قسم کی لفظی مصوری ہے۔ یعنی مصور برش اور رنگ سے ظاہر کی تصویر بناتا ہے اور شاعر جذبات اور باطنی احساسات کی تصویر مناسب الفاظ میں کھینچتا ہے۔‘‘(۵۸)

جب کہ محمد ہادی حسین کے بہ قول:

’’شاعری کی روح جو مختلف مضامین کے مادے کو الفاظ کے مختلف ہئیتی قالبوں میں ڈھال کر اُن کو جلوہ گر کرتی ہے‘ اسے فنِ شاعری بھی کہتے ہیں‘ عملِ شعر گوئی بھی‘ شعر بھی اور شعریت بھی۔‘‘(۵۹)

گویا شاعری ایک شاعر کا وہ فکری اثاثہ ہے جو وہ اپنی تہذیب اور گردو پیش کے عناصر سے حاصل کرتا ہے۔ شاعر کیوں کہ معاشرے کا ایک حساس فرد ہوتا ہے لہٰذا‘ وہ اپنے گردو پیش ہونے والی تبدیلیوں سے زیادہ متاثر ہوتا ہے اور پھر اپنی جودتِ طبع کے مطابق انھیں بیان کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اگرچہ زبان اور سلیقۂ بیان شاعر کا اپنا ہوتا ہے تاہم اس کا علم و ادراک اپنے ماحول اور ذہنی میلا ن کا پروردہ ہوتا ہے۔ بہ قول کوثر مظہری:

’’ادیب یا شاعر جو کچھ بھی سوچتا ہے اور اپنے دائرۂ فکر میں جو خاکہ بھی تیار کرتا ہے اس میں معاشرہ کے تہذیبی و ثقافتی عناصر کی کارفرمائی لازمی طور پر ہوتی ہے۔‘‘(۶۰)

شاعر ہمیشہ اپنے قبیلے اور قوم کا دل اور زبان بنا رہا ‘ اسی لیے لوگ ہر موقعے پر اسی کی طرف دیکھتے تھے۔چناں چہ دنیا بھر کے شاعروں نے کائنات کو اپنے انداز سے سمجھنے اور شاعری میں پیش کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ سائنس دان کی نسبت شاعر پہلے سے موجود دنیا کو بہتر کرنے کی بجائے متبادل دنیا کا خواب بھی دیکھتا ہے۔ اور یہی چیز اسے سائنس دان پر فوقیت دیتی ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر وزیر آغا کا کہنا ہے:

’’کسی زبان کی شاعری کا مطالعہ اس بات کا متقاضی ہے کہ پہلے اُس تہذیبی اور ثقافتی پس منظر کا جائزہ لیا جائے جس میں اُس زبان اور اُس کی شاعری نے جنم لیا۔ لیکن یہ پس منظر کسی سادہ ورق کی طرح ایک ہموار سطح کو پیش نہیں کرتا‘ یہ دو مختلف سطحوں کے امتزاج سے متشکل ہوتا ہے۔ اس کی پہلی سطح دھرتی کی تاریخ کا ایک آئینہ ہے‘ یعنی یہ سطح دھرتی کے اصل باشندوں اور باہر سے آنے والے قبائل کی باہمی آویزش سے اپنے لیے ایک خاص رنگ مستعار لیتی ہے‘ دوسری سطح داخلی اور تہذیبی تصادم کو اُجاگر کرتی ہے اور زمین کے اوصاف کے علاوہ آسمان کے اوصاف کو بھی پیش کردیتی ہے: ان دونوں سطحوں کے امتزاج ہی سے کسی مُلک کا وہ ثقافتی اور تہذیبی پس منظر مرتب ہوتا ہے جو اُس کی زبان اور شاعری پر گہرے اثرات مُرتسم کرتا ہے۔‘‘(۶۱)

اس تہذیبی تناظر میں جب شاعر کائنات کو دیکھتا ہے تو اس کے تخیل کا پرندہ مائل بہ پرواز ہوتا ہے۔ کائنات کے اسرار اُس کی توّجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہیں اور وہ یہ ایک بنیادی سوچ اپناتا ہے کہ

آغاز اور انجام سے بے خبر
کہانی ہوتی رہی
وقت کے سمندر میں
کتنے ہی جزیرے ڈوب گئے
کتنے ہی جہاز غرق ہوگئے
فطرت کے کارخانے میں
انسان کے خوابوں اور خیالوں سے بے نیاز
تخلیق اور تخریب کا سلسلہ جاری ہے)زاہد ڈار)(۶۲(

شاعر کی سوچ اُسے کائنات کے متعلقات میں انسان اور اس کی زندگی کے مختلف امور کی طرف کھینچ لے جاتی ہے۔ یہ امر اُس کے ذہن میں مختلف کائناتی سوالات کو جنم دیتا ہے اور وہ ان کی تفہیم کی کوشش کرتا ہے۔ ہماری کلاسیکی اردو شاعری میں بھی آسمان کو تقدیر کے معانی میں ہمیشہ ایک ایسے دشمن کی صورت میں پیش کیا گیا ہے جو ہمہ دم ہماری خوشیاں اُچک لینے کو بے تاب و بے قرار دکھائی دیتا ہے۔آسمان کی اسی بے نیازی کو بیان کرتے ہوئے زاہد ڈار لکھتے ہیں:

دکھ اور اذیت اور بے بسی کہاں سے آتے ہیں
انسان پر ظلم کون کرتا ہے؟
پانی کا بہائو تیز ہے
لیکن پانی سوچ نہیں سکتا
ہوائیں اندھی ہیں
سورج بے نیاز ہے
ہمارا اس کائنات میں کوئی دوست نہیں
کوئی دشمن نہیں
ہمارے سوا۔)زاہد ڈار)(۶۳(

جو چند بنیادی سوالات جدید اردو نظم کے شعرا کو پریشانِ خاطر رکھتے ہیں ان میں زندگی کی حقیقت بھی شامل ہے کہ وہ کسی طور اس زندگی کی اصل صورت تک پہنچ پائے۔

لفظوں کا سلسلہ ہے
یادوں کا سلسلہ ہے
یہ زندگی ہماری
خوابوں کا سلسلہ ہے)زاہد ڈار)(۶۴(

عقل و ادراک انسان کی تخصیصی صلاحیت ہے۔ وہ کائنات کی تفہیم کا سفر اپنی ذات پر غور سے شروع کرتا ہے اور لمحہ بہ لمحہ کائنات کے اسرار کی پردہ کشائی کرتا چلا جاتا ہے۔ جدید اردو نظم کا شاعر یہ سمجھتا ہے کہ ازل سے ہی اُسے یہ قوّت عطا کی گئی کہ وہ کائنات کے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھائے۔

میں جب آیا تو بے رنگ تھی تصویرِ حیات
فاش کرسکتا تھا اسرار و رموزِ فطرت)یوسف ظفر:زندان)(۶۵(

لیکن مختلف علوم کے بدلتے ہوئے تناظرات اُسے ہر لمحہ کسی نہ کسی نئی سوچ ‘ نئے انداز سے آشنا کیے چلے جاتے ہیں۔ اپنے آپ پر غور جہاں اُسے مختلف نتائج تک پہنچاتا ہے ‘

وہیں اُسے اُلجھائو میں بھی پھنسا دیتا ہے کہ بہت سی چیزیں ابھی بھی اُس کی پہنچ سے باہر ہیں ۔ وہ خود کو دیواروں میں محصور ایک بُت کی صورت محسوس کرتا ہے۔

یہ بت وہی بت اب اپنے دیوارو در میں محصور سوچتا ہے
کہ اب یہ دروازہ کب کھلے گا!
مگر!--- یہ دروازہ کب کھلے گا!! (یوسف ظفر:ارماں)(۶۶)

کچھ لوگوں کے نزدیک سائنس کی ترقی و ترویج نے ادب‘ اور بالخصوص شاعری کے راستے مسدود کرتے ہوئے اسے بے معنی بنا دیا ہے۔ اور اب شاعری کی کوئی گنجایش نہیں کہ زمانہ تخیل کا نہیں بل کہ حقیقت کا پیرو ہے۔ اس کی تردید کرتے ہوئے پروفیسر عبدالرئوف نوشہری رقم طراز ہیں:

’’یہ حقیقت قطعاً بے بنیاد ہے کہ سائنس دانوں کے اشیا کی حقیقت و ماہیت کے انکشاف کردینے کے بعد ادیبوں اور شاعروں کی دنیا سکڑ جاتی ہے۔ اس کے برعکس ان کے لیے ان انکشافات سے ادب اور شاعری کا میدان اوروسیع ہوجاتا ہے۔‘‘(۶۷)

اسی بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ

’’سائنس اور ادب سے انسان کا رشتہ ابتدائے آفرینش سے قائم ہے۔ اپنی مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر سائنس کو کام میں لاتا رہا ہے اور جذبات و احساسات کے اظہار کے لیے ادب اور شاعری کا سہارا لیتا رہا ہے۔‘‘(۶۸)

ابتدائی شاعروں نے کائنات کو سمجھنے کی جو کوششیں کی وہ اگرچہ آج بچکانہ معلوم ہوتی ہیں‘ مگر ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر کی فکری اُڑان سائنس دانوں کے مقابلے میں ہمیشہ آگے آگے رہی ہے اور بہت سے اہم کارنامے جو سائنس دانوں نے انجام دیے اُن کی پیش قیاسی شاعروں نے ہی کی تھی۔ آج سائنس ‘ شاعر کی نسبت کائنات کو زیادہ بہتر طور پر سمجھنے کے قابل ہو چکی ہے۔ اس نے کائنات کے بہت سے سربستہ رازوں سے پردہ اُٹھایا ہے۔ پُرانے تصورات ماضی کی گرد کا حصہ بن چکے ہیں۔ کائنات کو سمجھنے کی زیادہ بہتر کوششیں کی جا رہی ہیں۔ کائنات کی تفہیم کے حوالے سے سامنے آنے والی کاوشوں پر آج کا شاعر حیرت زدہ ہے۔ اور اس حیرت اور تفکر کو وہ کمال ہنر مندی سے اپنی نظم میں ڈھال رہا ہے۔زیرِ نظر مقالے کا بنیادی نکتہ بھی یہی ہے کہ سائنس مظاہرِ فطرت کے سربستہ رازوں سے کیسے پردہ اُٹھا رہی ہے اور ہمارے نظم نگار شاعر ان کاوشوں کو شعروسخن کا حصہ کیسے بنا رہے ہیں۔

اس سلسلے میں ہمارا واسطہ اس زمین سے بھی پڑتا ہے۔ یہ زمین جو ہمارے خوابوں کا مسکن ہے یہ زوال پر آمادہ ہے۔ شاید یہ تخلیق کے مرحلے کے بعد اُسی تخریب کے راستے پر واپس چل رہی ہے ‘ جہاںیہ آج کے دور تک پہنچ پائی تھی۔

یہ دھرتی نیند کے عالم میں ہے
ممکن ہے الٹے پانو واپس آرہی ہو
یا کسی ایسی طرف کو جارہی ہو!
جس طرف کوئی نہیں جاتا (شہزاد احمد:ابھی سورج نہیں نکلا)(۶۹)

پھر شاعر کو اپنی پہچان کا مرحلہ درپیش آتا ہے اور وقت اُسے ایک برتر قوّت کی صورت میں محسوس ہوتا ہے جس کے ہونے سے سب کا ہونا ہے۔ اسی لیے اُس کی پُکار کی آواز یوں آتی ہے:

المدد کہہ بھی دیا تو فائدہ؟
لامکاں کی وسعتوں میں ہم کو پہچانے گا کون
کشتیِ جاں ڈوبتی ہے
وقت کے گرداب میں)شاہین مفتی: جلسہ گاہ میں)(۷۰(
وہ خود کو زمین کے چہرے پہ کھینچا ایک نقش سمجھتا ہے۔
کاغذ پہ کھینچے سرسری خاکے کی صورت
نقش ہوں چہرہ نہیں' جملہ بھی ماضی حال کے
صیغے سے مستثنٰی عبارت ہے)عبدالرشید: کیا ہے کچھ پتا چلتا نہیں)(۷۱(

انسان' جو اس دُنیا میں خود کو ہی سب کچھ سمجھتا ہے' حقیقت میں اس وسیع کائنات کے آگے کچھ بھی نہیں ہے۔ مختلف اجرامِ فلکی اُس کی بے مائیگی پر ہنستے ہیں کیوں کہ ہماری زندگی کی یہ جل ترنگ کسی بھی لمحہ خاموشی کا روپ دھار سکتی ہے۔

بام و در خامشی کے بوجھ سے چور
آسمانوں سے جوئے درد رواں
چاند کا دکھ بھرا فسانۂ نور
شاہراہوں کی خاک میں غلطاں
خواب گاہوں میں نیم تاریکی
مضمحل لے رُبابِ ہستی کی
ہلکے ہلکے سروں میں نوحہ کناں)فیض احمد فیض: ایک منظر)(۷۲(

شاعری شعور سے کی گئی بات ہے۔ یہ شعور 'شاعر کے کائناتی تفکر کا غماز ہوتا ہے اس میں جذبے کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ شاعری صرف بیانیہ نہیں ہے بل کہ اثر پذیری بھی اس کے بنیادی لوازمات میں سے ایک ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بے نہ ہوگا کہ شاعری کسی بھی شاعر کی تفہیمِ کائنات کی کوششوں اور اس کے جذبات کے پرُاثر بیانیے کا نام ہے۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ حُسن شاعری کے مقام کی بنیادی دلیل ہے۔ڈاکٹر سعید احمد اپنے مقالہ بعنوان ''اردو شعرا کا سائنسی شعور''میں ارسطو کے شعری نظریات پر بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ ارسطو کے نزدیک شاعر افراد کے افعال اور جذبات کو ایسے طریقے پر بیان کرتا ہے کہ وہ عمومی اور آفاقی بن جاتے ہیں۔ اس لیے شاعری کو تاریخ پر تفوق حاصل ہے۔(۷۳)افلاطون کے نظریۂ الہام کی بنیاد اس کا تصورِ شاعری ہے۔ کیوں کہ اُس کے نزدیک شاعر ایک ایسا فرد ہے جو خیالات کی دنیا میں رہتا ہے۔ وہ خود کچھ نہیں کہتا بل کہ دیوی ' دیوتا اُس پر افکار کو القا کرتے ہیں۔ وہ صرف اور صرف افکار و نظریات کا بیان کرنے والا ہے نہ کہ سوچنے والا۔ اپنے اسی رویّے کی بہ دولت وہ شاعر کو مثالی ریاست کے قابل نہیں سمجھتا۔ اُس کے نزدیک شاعر نہ صرف یہ کہ الہامی گفت گو کرتے ہیں بل کہ اُن کے عمومی افکار نوجوان نسل کے بگاڑ کا باعث بھی بن سکتے ہیں۔ اسی لیے اُس نے کہا:

''آرٹ انسانی فطرت کے جذباتی اور ہیجانی پہلو کی نمائندگی کرتا ہے۔''(۷۴(

اور یہ پہلو ہمارے احساسات سے متعلق ہوتا ہے۔ یہی حال کائنات کا بھی ہے کہ یہ ہمارے احساسات سے متعلق ہے۔ ہم اپنے مخصوص دینی یا تہذیبی تناظر میں جو کچھ دیکھتے

ہیں ہمیں ویسی ہی کائنات اپنے گرد دکھائی دیتی ہے۔ گویا حقیقت شکل کی نہیں بل کہ دیکھنے والے کی محتاج ہوتی ہے۔

بہتے پانی کی کوئی شکل نہیں ہوتی
شکلیں ہماری آنکھ میں ہوتی ہیں)نصیر احمد ناصر:خواب اور محبت کی کوئی عمر نہیں ہوتی)(۷۵(

اور انہی احساسات کی بہ دولت ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہماری معلومہ کائنات ہمارے لیے ناکافی ہے۔ ہمیں اس کی حدود سے باہر نکلنا ہوگا۔ انسان اس معلوم دنیا کو تباہی کے حوالے کررہا ہے لہٰذا انسانی بقا کے لیے لازم ہے کہ ہم ایک نئی دُنیا کی تلاش میں نکلیں۔ ایک ایسی دُنیا جہاں معراجِ انسانیت ' احساسِ انسانیت کی صورت ہاتھ آئے۔ یہی خواب جدید اردو نظم کا شاعر بھی دیکھتا ہے۔

نجات کے لیے
ہمیں پھر سے
ایک طویل خواب ترتیب دینا ہوگا!! (نصیر احمد ناصر:نئے گوتم کا اپدیش)(۷۶(

شاعری کابنیادی تعلق تخیل سے ہے۔اس لیے شاعر عام افراد کی نسبت اپنا زیادہ وقت تفکر میں گزارتا ہے۔اور اس کی فکر کا مرکزی نکتہ انسان' کائنات اور خُدا ہیں۔وہ ذہنی بلوغت کے ابتدائی دنوں سے ہی کائناتی تفہیم کے اہم ترین سوالات پر غور کرتا رہا ہے۔اس مقالے میںبنیادی طور پر ہم تصورِ کائنات اور اس کی ترویج و ارتقا کے لیے ادب' مذہب' فلسفہ اور سائنس کے حوالے سے سامنے آنے والے مختلف نظریات اور سوالات کا جائزہ جدید اُردو نظم کے تناظر میں لیں گے۔یہ بات زیرِ نظر رہنا انتہائی ضروری ہے کہ شاعری ہو یا سائنس ' دونوں کا بنیادی مقصد کسی ایجاد ' دریافت یا اختراع کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔جیسے

ایک بے تھاہ کھائی
اور سوالیہ ہُک سے لٹکی ہوئی کائنات
نادیدہ پانیوں پر تیرتی ہوئی
بہت سی لاکلامی' بہت سا کلام
الاپ... اور معدوم ہوجانے کی اذیت...
دور ... کسی لامکاں کے بے جہت کبودی گوشے میں
کوئی اپنی غیر مرئی انگلیوں سے
پیانو کو چھیڑتا ہے
اور کہیں بہت قریب سے
ساکت اور بے آواز آسمانی گیت سنائی دے رہا ہے)نصیر احمد ناصر:کائنات کا آخری گیت)(۷۷(

زمانۂ قدیم سے عصرِ حاضر تک ہمیں جتنے بھی فکری و فلسفیانہ مباحث ملتے ہیں ان سب میں عمومی طور پر ادب اور خصوصی طور پر شاعری پر بحث کی گئی ہے۔ کیوں کہ شاعری ابتدا سے ہی انسان کے ہم راہ رہی ہے اور کسی نہ کسی صورت جذباتی یا نفسیاتی سطح پر انسان کو متاثر ضرور کرتی رہی ہے۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ہادی حسین ' شیلے کے نظریہ شعریت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

’’شاعر ایک بالا تر فہم‘ الہام‘ کے مفسر ہوتے ہیں‘ ان دور دراز سایوں کے آئینے ہوتے ہیں جو مستقبل حال پر ڈالتا ہے‘ وہ الفاظ ہوتے ہیں جو ایسی چیزوں کا اظہار کرتے ہیں جنھیں وہ خود نہیں سمجھتے‘ وہ جنگی نقارے ہوتے ہیں جو خود جنگ جوئی کے جذبے سے معرا ہوتے ہیں‘ وہ محرک ہوتے ہیں جو بغیر ہلے دنیا کو ہلا دیتے ہیں۔ شاعر دنیا کے وہ قانون ساز ہیں جن کا اعتراف نہیں کیا گیا۔‘‘(۷۸(

ڈاکٹر سعید احمد مغربی فلسفہ کے نظریاتِ شعر پر بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالتے ہیں:

’’ڈرائیڈن شاعری کونفسِ انسانی کی دل کش اور فرحت بخش تصویر قرار دیتا ہے۔ جانسن شاعری کو نفسِ عامہ انسانی کی بازگوئی یا باز آفرینی قرار دیتا ہے۔ ورڈورتھ کے نزدیک شاعری انسان اور فطرت میں ہم آہنگی کا نام ہے۔‘‘(۷۹(

کائنات سے اسی ہم آہنگی کی تلاش میں شاعر ہمیشہ سرگرمِ عمل رہتا ہے۔ لیکن اُس کی قوّتِ متخیلہ اُسے کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتی۔ اُسے انسانی مزاج کی تغیرپسندی کشاں کشاں لیے پھرتی ہے۔ اپنی ذات کے اسی احساس کو وہ یوں بیان کرتا ہے:

سنے کوئی مری غربت کی داستاں مجھ سے
بھلایا قصۂ پیمانِ اولیں میں نے
لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنت میں
پیا شعور کا جب جامِ آتشیں میں نے
رہی حقیقتِ عالم کی جستجو مجھ کو
دکھایا اوجِ خیالِ فلک نشیں میں نے
ملا مزاج تغیر پسند کچھ ایسا
کیا قرا ر نہ زیرِ فلک کہیں میں نے)اقبال: سرگزشتِ آدم)(۸۰(

تخیلاتی دنیا کا باسی‘ یہ شاعر‘ اپنی متاعِ کُل کو کھونے سے ڈرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کائنات کی طرح اُس کا فکری پہلو بھی بے انت ہے۔ یہ ایک سمندر کی طرح ہے جس میں ہمارا تخیل نائو کی صورت ہمیں قدم بہ قدم آگے بڑھاتا ہے۔ کائناتی تخیل میں شاعر کا حاصل ہی یہی ہے کہ وہ آگے بڑھنے کی لگن سے بھرپور رہتا ہے۔

لیکن شاعری اور زندگی دونوں ہی
زمین کے کناروں سے الگ ہوجانے والے
سمندروں کی طرح بے کنار ہیں
ان میں اترنے کے لیے
جسم کو نائو بنانا ضروری ہے
نائو کاغذ کی ہو یا کچی مٹّی کی
سفر کی پہلی شرط ہے)نصیر احمد ناصر: کاغذ کی تنہائی)(۸۱(

اس سفر میں جسم اور احساس کی نائو اُس کے ہم راہ ہوتی ہے اور اس کی انفرادیت اُس کا فکری پہلو ہے۔ اسی فکری پہلو اور انفرادیت کو جابر علی سید جدیدیت کا نام دیتے ہیں۔(۸۲)جب کہ ڈاکٹر شازیہ عنبرین کے نزدیک‘ جدیدیت ‘ روایت سے بغاوت کا نام ہے‘ لیکن روایت اٹل اصولِ زندگی ہے۔ روایت کچھ عرصے کے جمود کے بعد نئی زندگی بل کہ جدیدیت کے لباس میں اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔جس سے زندگی اپنی مجموعی صورت میں متاثر ہوتی

ہے(۸۳)۔ اور کیونکہ شاعر بھی معاشرے کا ایک حساس فرد ہے لہٰذاا یہ اثرات اُس کے انداز و افکار پر بھی گہرا اثر ڈالتے ہیں۔

سائنس بنیادی طور پر تجربات و مشاہدات سے اخذ شدہ علم ہے۔ اس کی رسائی صرف اور صرف ان عناصر تک ہے جنھیں تجربات کی کسوٹی پر' پرکھا جا سکے۔ وہ تمام تر عوامل جن کا تعلق جذبات و احساسات سے ہو لیکن انھیں تجربہ کے ذریعے اثبات یا استرداد کا حامل نہ ٹھہرایا جا سکے سائنس کی پہنچ سے باہر ہیں۔ اسی لیے دماغ بھی اُس کی دست رس سے باہر ہے کیوں کہ

''ذہن کوئی بیرونی چیز نہیں ہے جو باہر سے جسم کے اندر اخل ہوتا ہے بل کہ جسم کے ایک ارتقائی عمل کا نام ذہن ہے۔''(۸۴(

سائنس کو ہم بہ حیثیت علم آج جو درجہ دیتے ہیں ' زما نۂ قدیم میں وہ مقام فلسفے کو حاصل تھا۔ فلسفہ مباحث کے علم کا نام تھا۔ انسان نے روزِ اوّل سے ہی اپنے گردوپیش پر غوروخوض کرنے کا عمل جاری رکھا ہے۔ ابتدا سے ہی اس نے اپنے اردگرد موجود مظاہرِ فطرت کو جاننے اور تسخیر کرنے کی سعی کی ہے اور اس کام کے لیے اس نے خدائی عطا یعنی عقل اور تفکر کو اپنا راہ نما بنایا ہے۔ سائنس سے پہلے انسان نے عوامل اور ان کی توجیحات کو سمجھنے کے لیے اپنے سابقہ علم اور تجربات و مشاہدات کو سامنے رکھتے ہوئے اشیا کے اسباب و علل پر مباحث کیے ہیں۔ یہ بنیادی مباحث ہمیشہ سے انسان کی عقل و خرد کے رہبر رہے ہیں۔ اس کی بنیاد اٹھنے سے فلسفہ نے بہ حیثیت ایک علم کے اپنی اہمیت منوائی۔ زندگی' ادب' مذاہب اور انسانی زندگی کے دیگر لوازمات اس سلسلے میں زیرِ بحث رہے۔ فلسفہ ہی وہ علم تھا جس نے سب سے پہلے عقلی بنیادوں پر اشیا کو سمجھنے کی سعی کی۔

''چھٹی صدی قبل مسیح تک یونان میں ایسے لوگ سامنے آچکے تھے جو خود کو فلسفی کہتے تھے اور قدرت کے حقائق کی توضیح دیو مالائی قصوں کے بغیر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔''(۸۵(

فلسفیانہ بنیادوں کو مضبوط ومستحکم کرنے میں یونانی اور عرب علما نے اہم کردار ادا کیا اور فلسفہ تمام علوم میں سب سے اعلاو ارفع مقام کا حامل گردانا جاتا رہا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فلسفہ سے نئے علوم نے جنم لینا شروع کیا۔جیسے جیسے انسان بالغ نظر ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے وہ نئے افکار و نظریات کو اپنانے کے ساتھ ساتھ مختلف النوع علوم و فنون کو بھی ان کے خصائص کے حوالے سے مختلف زمروں میں تقسیم کرتا چلا جاتا ہے۔کہیں اس تقسیم کی وجہ علم کی نوعیت بنتی ہے اور کہیں طریقۂِ کار۔ جہاں تک سائنس اور شاعری کا تعلق ہے تو ان میں بنیادی فرق طریقۂِ کار کا ہی ہے۔ قدیم فلسفیوں کے ہاں ادب پر بھی مباحث ملتے ہیں اور سائنس پر بھی۔ اُن کے ہاں ہر وہ شے زیرِ بحث رہی ہے جس کا تعلق کسی نہ کسی صورت انسانی زندگی سے رہا ہو۔ تاہم عصرِ حاضر کے انسان اس بات پر متفق دکھائی دیتے ہیں کہ عقل و خرد نے سب سے پہلے انسان کی ذہنی گتھیوں کو سُلجھانے کی سعی کی' جس نے فلسفیانہ اندازِ نظر کو پروان چڑھایا۔

فلسفہ' ریاضی' سائنس اور علمِ فلکیات' زندگی اور کائنات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے مختلف طریقے ہیں۔ جب انسان نے سوچنا شروع کیا ہوگا اور اجرامِ فلکی کا جائزہ لینا شروع کیا ہوگا تو وہ آدمی' انسانی نسل میں سب سے پہلا فلسفی تھا۔ اس نے سورج

کو دیکھا ہوگا اور سورج کی گرمی سے خوف زدہ ہو کر اس کو اپنا خدا مان لیا ہوگا اور پھر سورج کا روز کا آنا جانا اس کے لیے معمّا بن گیا ہوگا اور قدرتی آفات و واقعات کو اس کی طرف سے غصے اور محبت کے مترادف جان لیا ہوگا لیکن اس کے باوجود وہ مزید سوچوں میں کھویا رہتا ہوگا یہی وجہ ہے کہ آج کا انسان بھی انھی سوچوں میں کھویا رہتا ہے کیوں کہ آخر وہ بھی تو اُسی کی نسل سے ہے۔ جیسے جیسے انسانی ذہن کی سوچ کا دائرہ وسیع ہوتا گیا ویسے ویسے زندگی اور کائنات کے بارے میں انسانی سوچ نے ایک مستقل شکل اختیار کرلی۔ فلاسفہ نے ریاضی کو جنم دیا اور اجرامِ فلکی کی نقل و حرکت کو سمجھنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس طرح بڑی کامیابیاں حاصل کیں اور علمِ فلکیات کی ایک شاخ وجود میں آگئی اور جب انسان نے مادے کے اجزا کا تجزیہ شروع کیا تو سائنس کے شعبے کا اجرا ہوا اور اس سائنس کے شعبے نے فلاسفر سے ذہن' ریاضی سے اعداد اور اجرامِ فلکی سے ان کی محوری گردشوں کا اصول حاصل کر کے اپنی لیبارٹری کی زینت بنا لیا۔

بعد ازاں تمام علوم اپنے اپنے مداروں میں رہتے ہوئے مختلف تبدیلیوں سے گزرے۔ انھی تبدیلیوں نے مستقبل میں ان کے مقام و مرتبہ کو متعین کیا۔ بنیادی طور پر فلسفہ بھی فکر ہے اور سائنس بھی۔تاہم جو بنیادی فرق انھیں ایک دوسرے سے جُدا کرتا ہے وہ تجرباتی پہلو ہے۔ سائنس کو بہ حیثیت ایک منفرد رویے کے اپنا نام بنائے ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا ہے۔ وہ تمام تر علوم و مباحث جن پر آج سائنس کی اجارہ داری ہے' ماضی میں ان سب کا تعلق فلسفہ سے رہا ہے۔ اسی تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے غیاث چوہدری کہتے ہیں:

''جن جن حالتوں میں آپ کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے اور آپ اس مسئلے پر غوروفکر کررہے ہیں' آپ کی اس سوچ کو فلسفیانہ اندازِ فکر کہا جاتا ہے۔ انسان کا کسی مسئلے پر غور کرنا فلسفہ ہے او ر اس سوچ کو عملی جامہ پہنانا سائنس ہے۔''(۸۶)

یہ بات فطری تقاضوں کے عین مطابق ہے کہ جب ایک ماں زیادہ بچے پیدا کرتی ہے تو ان بچوں کی تخلیق کی بہ دولت وہ اپنی فطری قوت و توانائی کو بہ تدریج ان میں منتقل کرتی چلی جاتی ہے۔ جس کا حتمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آخر کار وہ اپنی انھی تخلیقات کی بہ دولت خود فنا کے مقام کو پا لیتی ہے اور اپنی موت آپ مر جاتی ہے۔ یہی حال آج فلسفہ کا ہے۔ فلسفہ اپنے وقت کے اہم علوم میں سے تھا جس نے ہمیشہ انسان کے باطن میں اٹھنے والے تمام تر سوالات کو عقل کی کسوٹی پر حل کرنے کی سعی کی۔ وہ تمام تر افکار و توہمات جو انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے رہے' ان کی فکری و عقلی توجیح ہی فلسفہ کا بنیادی نقطۂ نظر تھا۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب تک علمِ انسانی اس قابل نہیں ہوا تھا کہ وہ اشیا و عوامل کو بھرپور طور پر تجربے کی کسوٹی پر پرکھ سکے۔ عصرِ حاضر میں ہونے والی ترقی نے انسان کو ایسے ایسے آلات بنانے میں کامیابی کی نوید سُنائی ہے جن کی بہ دولت آج وہ تقریباً ہر شے کو تجربے کی کسوٹی پر پرکھنے کے قابل ہو چکا ہے۔ وہ اشیا و عوامل جو اُس کی دست رس سے باہر ہیں' اُن کے بارے میں بھی آج کا انسان انتہائی پُر امید ہے کہ جلد ہی اُنھیں بھی تجربے سے پرکھنے کے قابل ہو جائے گا۔ سیاسیات' نفسیات' عمرانیات' منطق' الٰہیات' ریاضی' کیمیا' حیاتیات' طبیعیات جیسے علوم آج نہ صرف اپنی انفرادی حیثیت رکھتے ہیں بل کہ اتنی ہمہ گیری اختیار کر چُکے ہیں کہ ان میں سے بھی ہر علم سیکڑوں شاخوں پر مشتمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا بھر کی جامعات میں فلسفہ کے شعبے بندش کی طرف آمادہ ہیں۔ سید علی عباس جلال پوری اگرچہ اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ فلسفہ' آج بہ حیثیت ایک علم کے' اپنی

اہمیت اور پہچان کھو چُکا ہے ' تاہم اُن کے ذہن میں اُٹھنے والے سوالات ہی اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اب اس کا وہ مقام باقی نہیں رہا۔ اپنے ایک مضمون ''یہ کہ فلسفہ جاں بلب ہے'' کی ابتدا وہ اس انداز میں کرتے ہیں:

''آج کل بعض پڑھے لکھے حلقوں میں اس خیال کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ فلسفہ جاں بلب ہے۔ ایک ایک کر کے اس کے تمام شعبے مستقل علوم کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ ابتدا میں سیاسیات' نفسیات اور عمرانیات کو فلسفے میں شامل کیا جاتا تھا لیکن ہمارے زمانے میں انھیں فلسفے کے دائرہ اثر سے خارج کر دیا گیا ہے۔ بہ قول وِل ڈیورانٹ فلسفے کو شاہ لئیر کی طرح اس کی بیٹیوں نے سلطنت سے بے دخل کر کے اپنے گھر سے نکال باہر کیا ہے اور وہ بے سروسامانی کی حالت میں ادھر ادھر بھٹکتا پھر رہا ہے۔ لے دے کر الٰہیات رہ گئی تھی۔ جدید دور کے فلسفے نے اس سے بھی قطع نظر کر لی ہے کہ ذاتِ باری کا تصور فلسفے سے خارج کر دیا گیا ہے۔ الٰہیات کے ساتھ اکثر مابعد الطبیعیاتی مسائل' حیات بعد ممات' خیر و شر' روح ' ضمیر وغیرہ بھی خارج از بحث سمجھے جاتے ہیں۔ منطق اور فلسفہ کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ اب منطق کو برٹرنڈ رسل اور وائٹ ہیڈ نے ریاضی کی اساس پر از سرِ نو مرتب کرنے کی کوشش میں تجریدات کا گورکھ دھندا بنا دیا ہے۔ ان حالات میں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوگا کہ آخر فلسفے کے زندہ رہنے کا کیا جواز باقی ہے؟''(۸۷)

فلسفہ نے بعد ازاں مختلف سائنسی علوم کا روپ دھارا۔یہ تمام علوم انسانی تفکر کی بہ دولت کائنات کے اندر سے ہی برآمد ہوئے تھے۔ سائنس دیگر علوم سے کس طرح منفرد اور ممتاز ہے اس کا اندازہ پروفیسر محمود انور کی اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ:

''سائنس کائنات کی مادی حقیقتوں کے غیر جانب دار اور باقاعدہ مطالعہ سے حاصل شُدہ صداقتوں کا نام ہے جنھیں جچے تُلے الفاظ اور کُلیوں کی صورت میں یوں ترتیب دیا گیا ہو کہ ان کے باہمی تعلقات بالکل واضح ہوں۔''(۸۸)

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سائنس اور ادب میں بنیادی فرق ان کے طریقۂ کار کا ہی ہے۔ سائنسی طریقہ کار کے مدارج بیان کرتے ہوئے وہ مزید لکھتے ہیں کہ سائنس کا علم درج ذیل مراحل کے ذریعے تکمیل پذیر ہوتا ہے۔

۱۔ اشیا' مظاہراور واقعات کا مشاہدہ۔
۲۔ ان مشاہدات کی قسم بندی۔
۳۔ عقلی امتحان سے ایک یا زیادہ مفروضے۔
۴۔ ان مفروضوں کا تجربی امتحان۔
۵۔ اس کلیے یا قانون کی پھر تجربی آزمائش۔

انسان نہ صرف حیوانِ ناطق ہے بل کہ قدرت کی نیرنگیوں کا شاہد بھی ہے اور اُس پَر تحیّر کا شکار بھی۔ انسان کا تعلق خواہ کسی بھی مذہب' تہذیب یا زندگی کے کسی بھی شُعبے سے ہو' وہ ہمیشہ سوچ کے سمندر میں غوطہ زن رہا ہے۔ اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لیے اُس نے ہمیشہ مختلف علوم و فنون کو جنم دیا اور کائنات کی نیرنگیوں کو سمجھنے کے لیے ان علوم و فنون کا سہارابھی لیا ہے۔تمام علوم و فنون میں بنیادی دائرہ ادب کا دائرہ ہے۔ سائنس کو بہ حیثیت ایک منفرد رویے کے موجودہ مقام اپنائے زیادہ وقت نہیں گزرا۔ کیوں کہ وہ تمام مباحث جو آج سائنس کا حصہ ہیں' وہ آج سے کچھ عرصہ قبل تک فلسفہ کے بنیادی سوالات کا درجہ رکھتے تھے۔ ادب تمام دیگر علوم و فنون سے تعلق استوار رکھتا ہے۔ ادب دیگر علوم و

فنون سے اس لحاظ سے بھی منفرد و ممتاز ہے کہ وہ تمام فنون تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ وہ جب' جہاں اور جس علم کے دائرے کو چاہے 'توڑ کر اُس میں داخل ہو سکتا ہے اور جہاں سے چاہے باہر نکل سکتا ہے ۔ یہ کائنات اُس کی آنکھ کے تل اور ذہن کے ایک ادنیٰ سے خلیے میں سما جاتی ہے۔ اور اسی کا بیانیہ وہ ادب کی صورت میں کرتا ہے۔ ایک ادیب جتنا بڑا ہوگا اُس کی ادبی و فکری جہات بھی اتنی ہی وسیع اور متنوع ہوں گی۔ اُس کے لیے مذہب' فلسفہ' ریاضی' فلکیات' طبیعیات' مابعدالطبیعیات' سماجیات وغیرہ اپنے بڑے دائرے کی چھوٹی اکائیوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ گویا ادب کا تعلق کسی مخصوص علم یا فن سے نہیں بل کہ مکمل زندگی سے ہے۔

ہر فرد اپنی استعداد اور اہلیت کے مطابق کائنات پر غوروخوض کرتا ہے ۔ ادیب معاشرے کا حساس فرد ہونے کی بہ دولت عام افراد سے چند قدم آگے بڑھ کر تحیر کی اس دنیا میں زیادہ ڈوب جاتا ہے اور اپنا نقطۂ نظر بیان کرتا ہے۔ لہٰذا کسی بھی زبان کے ادب کی پیدایش کے ساتھ ہی اُس میں کائناتی عناصر ظہور پذیر ہونے لگتے ہیں۔

ادب اور سائنس کی سرحدیں ہمیشہ آپس میں ملتی ہیں۔ دونوں کے طریقۂ کار میں بے شک فرق سہی' مگردونوں کا مقصد ایک ہی ہے یعنی دریافت اور انکشاف۔ جدید نظم گو شُعرا کے ہاں ایک بدلا ہوا تصورِ کائنات سامنے آتا ہے۔ ادب کی سرحدیں آج محض لفظیات تک ہی محدود نہیں رہیں بل کہ پوری کائنات اور علومِ کائنات اُس کی حدود کا حصہ بن جاتے ہیں۔ یہ حقیقت اپنی جگہ اہم کہ ادب اپنی انفرادی جہت ہمیشہ برقرار رکھتا ہے۔ لیکن یہ دیگر علوم سے بھی ہمیشہ متعلق رہتا ہے۔ ہمارے ہاںسائنس' فلسفہ وغیرہ کے بارے میں عمومی طور پر ناقدین کے ہاں بُعد کا سماں دیکھنے میں آتا ہے۔لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک ادیب اپنی دور رس نگاہوں اور حساسیت کی بدولت جو انداز اپناتا ہے اور جس طرح سے کائنات اور اپنے تعلق کو جانچنے کی سعی کرتاہے' وہ اندازِ نظر بالکل سائنسی انداز جیسا ہے۔ انداز مختلف ہونے کے باوجود ' ادب' سائنس اور فلسفہ ایک ہی سمت میں رواں دواں ہیں۔ کیوں کہ اس سب کے لیے نگاہ کو ماضی سے پہلے اور مستقبل کے بعد کی ان دیکھی دنیائوں کی سیر کرنا پڑتی ہے۔

انھی ان دیکھی دنیائوں کی سیر کرانے میں سائنس اور ادب دونوں اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فلسفہ ' سائنس اورشاعری کو کبھی بھی ایک دوسرے سے جُدا کرنے کے باوجود ان پر مباحث میں بھی اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ جہاں سائنس کی بات چل رہی ہو ' انھی مباحث میں جب تک ادب پر بات نہ کی جائے تو بات نا مکمل اور ادھوری محسوس ہوتی ہے۔ کیوں کہ سائنس جسمانی سہولیات و ارتقا کی بات کرتی ہے اور ادب ذہنی ارتقا کی۔ اسی بات کو ڈاکٹر سید عبداللہ ' فلپ سڈنی کے حوالے سے جب شاعرکے حوالے سے متعارف کرواتے ہیں تو انھیں کہنا پڑتا ہے:

''شاعری ہی وہ فن ہے جس میں نقالی نہیں ۔ یا اگر ہے بھی تو کم سے کم ہے۔ فن کا اصل کام یہ ہے کہ وہ اختراع کی قوت سے جہانِ خوب تر کی تخلیق کرے یعنی اصل دنیا سے بہتر دنیا دے۔''(۸۹)

شاعری میں عمومی طور پر کسی نہ کسی سطح پر فطرت سے تعلق استوار کرنے کی سعی دکھائی دیتی ہے۔ اس ضمن میں ہمیں رومانوی شعرا اہمیت کے حامل دکھائی دیتے ہیں جنھوں نے ہمیشہ انسان کے باطن میں پوشیدہ افکار کو خوب صورت شاعری کی صورت میں پیش کیا۔ ان شعرا کے نظریاتِ شعر بھی دیگر علوم کے ساتھ شاعری کے تعلق کی وضاحت

کرتے ہیں۔ ورڈز ورتھ مغربی رومانوی شعرا میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اگر اُس کے نظریات پر غور کریں تو پتا چلتا ہے:

’’ہر چند کہ شاعر کے اندازِ بیان میں جذبے کی چاشنی یا آمیزش ہوتی ہے مگر اس کی روح وہی ہے جو سائنس کے اندر ہے۔‘‘(۹۰(

ایسا ہی انداز ہمیں جدید اردو نظم کے شعرا کے ہاں بھی دکھائی دیتا ہے۔ درج ذیل شعر کو دیکھیے کہ رومانیت کے تناظر میں کیا خوب صورت کائناتی بیانیہ ہے۔

تم آئیں
اور میری خاک سے اک خدا تخلیق کرلیا
لیکن تمھاری دعائوں کے پرندے
میری روح کے آسمان پر نہ اتر سکے)زاہد امروز: اس محبت کا کیا مصرف؟)(۹۱(

ڈاکٹر سعید احمد سائنس اور شاعری میں تعلق کی وضاحت ‘ مغربی فلسفیوں کے حوالے سے ‘کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کولرج اپنی تصنیفBIOGRAPHIA LITERARIA میں یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ شاعری زبان کے استعمال ہی کی ایک مخصوص صورت ہے اور شاعری کا مقصد مسرت کے علاوہ سچائیوں کا اظہار بھی ہے۔ البتہ شعری صداقتوں اور سائنسی سچائیوں کے مابین امتیاز موجود ہے۔شیلے کے نزدیک شاعری بہترین دماغوں اور دلوں کے مسرت سے بھرپور بہترین لمحوں کی روداد ہے۔ شاعری ایک یزدانی اور الوہی چیز ہے۔ شاعری علم و عرفان کو محیط ہے اور اس علم و عرفان کا مرکز بھی ہے۔ شاعری سائنس کو احاطہ کیے ہوئے ہے اور سائنس کے لیے مرجع بھی۔

ڈاکٹر عرش صدیقی کے حوالے سے وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’عام طور سے تخیل کو شاعروں سے مختص کردیا جاتا ہے جو سراسر غلط ہے۔ خواب دیکھنا بھی محض شاعر کا خاصہ نہیں ہے۔ فلسفی بھی‘ سائنس دان بھی اور دوسرے پیشہ ور افراد بھی خواب دیکھتے ہیں۔ تخیل فرد کو ماضی اور مستقبل میں دیکھنے کی اہلیت عطا کرتا ہے۔‘‘(۹۲(

ان تمام مباحث سے ڈاکٹر سعید احمد یہ نتیجہ نکالتے ہینکہ:

’’شاعری اور سائنس دونوں کا سرچشمہ شعور ہے۔ شاعری اور سائنس دونوں کے لغوی معنی علم اور جاننا کے ہیں ۔ انسانی ذہن شعور اور لاشعور میں بٹا ہوا ہے۔‘‘(۹۳(

یہاں یونانی اساطیر کا ذکر بے محل نہ ہوگا جس میں دیوی دیوتائوں کو مختلف خصائص سے بہرہ ور کرکے انھیں مختلف ذمہ داریاں تفویض کی گئی ہیں۔ ایسی ہی ایک کہانی ادب اور فطرت سے متعلق ہے۔ یونانیوں کے ہاں فطرت کی دیوی ڈیانا ہے اُسی کو فلسفہ یا سائنس کی دیوی بھی مانا جاتا ہے۔ جب کہ منروا ادب کی کی دیوی کا درجہ رکھتی ہے۔ ایک قدیم مصوّر نے ان دونوںکے تعلق کوبڑے خوب صورت اندازمیںپیش کیاہے۔ ڈیاناکووہ لوگ ایک کثیرالپستان(MULTI-BRESTED) عورت کے روپ میں ظاہر کرتے ہیں ۔ انھی اساطیر کے مطابق ڈیانا اور منروا دونوں بہنیں ہیں۔ مصوّر نے تصویر میں منروا کو ڈیانا کے وجود سے کپڑا سرکاتے ہوئے دکھایا ہے۔ گویا اس کی تفہیم یہ ہوگی کہ ادب اور سائنس دونوں ہی ایک دوسرے سے متعلق ہیں اور ادب سائنس کی عقدہ کشائی کا فریضہ سر انجام دیتا ہے۔

ایک ادیب اور سائنس دان میں تعلق کو بیان کرتے ہوئے اردو کے نام ور ادیب اشفاق احمد اپنی کتاب ''زاویہ'' میں توضیح کرتے ہیں کہ ہر حقیقت کے اندر ایک مزید حقیقتِ پنہاں ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت وہ ایک خوب صورت مثال سے کرتے ہیں کہ ابتدا سے ہی انسان کے معمولات میں کھیتی باڑی اور پھل دار درخت موجود رہے ہیں۔ انسان نے زمانۂ قدیم میں ہی اس بات کا ادراک کر لیا تھا کہ جب پھل' خود بہ خود درخت کی شاخوں کو چھوڑ دیتا ہے تو یہ دراصل ایک فطری اشارہ ہے کہ پھل پک چُکا ہے۔ انسان صدیوں تک اس علم سے فائدہ اٹھاتا رہا' تاہم جب یہی واقعہ ایک عام انسان کی بجائے ایک سائنس دان نیوٹن کے ساتھ پیش آیا تو اس نے اس حقیقت میں پنہاں ایک اور حقیقت کا سراغ لگاتے ہوئے کششِ ثقل دریافت کی۔ اسی طرح ہماری روز مرہ زندگی میں بہت سے عمومی حقائق بکھرے پڑے ہیں۔ ان کو خاص تناظر سے دیکھنا اور بیان کرنا سائنس دان اور ادیب دونوں کا کام ہے۔ یہ دونوں ہی اپنی ذہنی سعی اور تخیل کی بہ دولت حقیقتِ مدرّکہ تک رسائی کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ حقیقت نظروں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی پوشیدہ ہی رہتی ہے جب تک کہ اُسے ایک ایسا ذہن میسر نہ آجائے جو اُس کی عقدہ کشائی کرے۔ اسی بات کی شاعرانہ توضیح کرتے ہوئے سیف الدین سیف کہتے ہیں:

سیفؔ' اندازِ بیاں بات بدل دیتا ہے ورنہ
دنیا میں کوئی بات ' نئی بات نہیں ہے

اس حقیقت کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیے کہ تمام علوم میں تفکر بنیادی شرط ہے۔ کہاجاتا ہے کہ تشکیک سائنس کی بنیاد ہے اور مذہب اس کی ضد۔ لیکن یہ رویہ دراصل غلط فہمی پر مشتمل ہے کیوں کہ تمام مذاہب نے بھی کائنات کو سمجھنے پر زور دیا ہے۔ کسی بھی چیز کو جاننے کے لیے اُس پر شک کرنا ضروری ہے کیوں کہ شک ہی جُستجو پر آمادہ کرتا ہے اور حقیقتِ کُل تک رسائی فراہم کرتا ہے۔ ہر فرد اپنے اپنے انداز میں تفکر کرتا ہے۔ شاعر کا یہ تفکر اُس کی شاعری میں جگہ پاتا ہے اور سائنس دان کا تفکر کسی سائنسی کلیے کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال اپنے پہلے خطبے کی ابتدا میں رقم طراز ہیں:

''یہ عالم جس میں ہم رہتے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے اور ترکیب کیا؟ کیا اس کی ساخت میں کوئی دوامی عنصر موجود ہے؟ ہمیں اس سے کیا تعلق ہے اور ہمارا اس میں مقام کیا ہے؟ بہ اعتبار اس مقام کے ہمارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے؟ یہ وہ سوالات ہیں جو مذہب' فلسفہ اور اعلیٰ شاعری میں مشترک ہیں۔''(۹۴)

اسی طرح کوثر مظہری اس بات کے قائل دکھائی دیتے ہیں کہ ادب صرف اور صرف زندگی کا مشاہدہ نہیں کرتا بل کہ زندگی کی حقیقی تصویر بھی پیش کرتا ہے۔

''جب ادب اور زندگی میں رشتہ قائم ہوتا ہے توشعر یا نثرمیں زندگی کاعکس بخوبی نظر آتا ہے۔''(۹۵)

اسی بات کی ترجمانی ہمیں ڈاکٹر صلاح الدین درویش کے ہاں بھی دکھائی دیتی ہے۔ جس کا تفصیلی اظہار وہ اپنے ایک مضمون ''سائنس اور ادب'' میں کرتے ہوئے یہ نقطۂ نظر اپناتے ہیں کہ ادیب خارجی دنیا سے تعلقات کی بہ دولت اپنے ادب پاروں میں جگہ دیتا ہے اور اُن کی بہ دولت اپنے خارج کو متاثر کرتا ہے۔ جب کہ اُس کی ادبی تخلیق کا باعث وہی خارجی دنیا اور اُس کے عوامل ہوتے ہیں۔ عصرِ حاضر میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے اُسے

جس انداز میں متاثر کیا ہے‘ اُسی کے ردِ عمل کے طور پر ادیب نے بھی ادب کو تخلیق کیا ہے‘ اور کرب و خوشی کا اظہار بھی کیا ہے۔ وہ اس تمام بحث کو سمیٹتے ہوئے یہ نتیجہ نکالتے ہیں:

’’ادب اور سائنس کا تعلق آقا اور لونڈی کا نہیں ہے بل کہ برابری کی سطح پر دونوں ایک دوسرے کے انسان دوست کردار کو مضبوط بناتے ہیں‘ ادب سائنس کو انسانی بقا کے لیے ایک موثر قوت‘ رہنمائی اور بصیرت عطا کرتا ہے اور سائنس ادیب کو حقیقت شناس اور معاشرے کا ایک کار آمد فرد بناتی ہے۔ سائنس بالآخر ادب کے غیر حقیقی‘ غیر سائنسی‘ جامد اور تصوّراتی اور خرافاتی رجحانات کے بخیے ادھیڑ دیتی ہے اور ادب سائنس اور ٹیکنالوجی کے انسانیت کُش رُجحانات کے متوازی انسانی بقا کے لیے فکرِ صالح کی تشکیل کرتا ہے‘ یوں دونوں کے مقاصد کا جہاں ایک ہو جاتا ہے۔‘‘(۹۶)

سائنس اور ادب کے اسی تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے کین ولبر کا کہنا ہے کہ

’’اگر سائنس اپنی محدود تجربیت کو وسیع تجربیت کے لیے سرنگوں کرنا چاہتی ہے (جو وہ پہلے ہی کسی طریقے سے کرتی رہی ہے)‘ اور اگر مذہب اپنے جعلی اساطیری دعووں کو مستند روحانی تجربہ کی حمایت میں سرنگوں کر دیں (جسے اس کے بانیوں نے یکساں طور پر کسی طرح سے کیا تھا)‘ پھر اچانک‘ بہت اچانک‘ سائنس اور مذہب صدیوں پرانے دشمنوں کی بجائے زیادہ جڑواں برادران کی طرح نظر آنا شروع ہوجاتے ہیں۔‘‘(۹۷)

اس تمام تر بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کائنات کی تکوین انسان‘ خدا اور کائنات کے گرد گھومتی ہے‘ جسے مختلف علوم نے اپنے اپنے دائرے میں رہتے ہوئے بیان کرنے کی سعی کی ہے اور ان علوم کے نظریات سے اثر پذیر ہوکر یا ان علوم کو اثر انداز کرتے ہوئے کائنات کے طریقۂ کار پر جدید اردو نظم کے شعرا نے بھی قلم اٹھایا ہے۔ آئندہ ابواب میں ہمیں اس امر کا جائزہ لینا ہے کہ جدید اردو نظم کے شعرا نے مختلف علوم کے ان نظریات کو کس صورت میں پیش کیا ہے۔اور ان کے یہ نظریات کس حد تک قابلِ قبول ہیں یا ہو سکتے ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ کارل ساگان، کائنات، (مترجمہ: منصور سعید) لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۱ء، ص۱۸
۲۔ غیاث چوہدری: کائنات اور ہم‘ لاہور‘ ٹیکنیکل پبلشرز‘ ۱۹۹۴ء‘ ص ۵۸
۳۔ احمد سہیل: ساختیات (تاریخ‘ نظریہ اور تنقید)‘ ۱۹۹۹ء‘ نئی دہلی‘ ص ۱۶۳
۴۔ زکریا‘ خواجہ محمد (مرتب): انتخابِ زریں نظم‘ لاہور‘ سنگت پبلیشرز‘ ۲۰۰۷ء‘ ص ۳۰۸۔۳۰۹
۵۔ زاہد ڈار: تنہائی‘ لاہور‘ سنگِ میل پبلی کیشنز‘ ۱۹۸۸ء‘ ص ۱۶
۶۔ ایضاً‘ ص ۳۶

۷۔ علی عباس جلال پوری، سید: اقبال کا علم الکلام، لاہور، تخلیقات پبلشرز، ۲۰۱۳ء، ص ۹
۸۔ عہدی پوری، دین محمد شفیقی: فلسفۂ ہندو یونان، لاہور، مجلسِ ترقیِ ادب، ، ۲۰۱۰ء، ص۵
۹۔ مبارک احمد: کلیاتِ مبارک، لاہور، مبارک پبلشرز، ۱۹۹۹ء، ص ۲۲۱
۱۰۔ علی عباس جلال پوری، سید: خرد نامہ جلال پوری، لاہور، تخلیقات پبلشرز، ۲۰۱۳ء، ص۱۵۰
۱۱۔ شکیل الرحمٰن:اساطیر کی جمالیات، مدھوبن، ہریانہ، ۲۰۰۹ء،ص۱۵۔۱۴
۱۲۔ علی عباس جلال پوری، سید: رسومِ اقوام، لاہور، تخلیقات، ۲۰۱۳ء، ص۱۳
۱۳۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء، ص۶۸
۱۴۔ اظہر غوری: اظہر غوری کی نظمیں (غیر مشروط محبت) ،لاہور،ملٹی میڈیا افئیرز، ۲۰۰۰ء، ص۴۱۳۔۴۰۷
۱۵۔ خلاصۂ توریت مع زبور و صحائفِ انبیاء، لاہور، سکرپچر گفٹ مشن، س ن،ص ۷۔۵
۱۶۔ مبارک احمد: کلیاتِ مبارک، ص ۵۰
۱۷۔ پیارے لال، رائے بہادر: رسومِ ہند، لاہور، مجلسِ ترقیِ ادب، طباعت سوم، ۲۰۰۸ء، ص۱۸
۱۸۔ ایضاً، ص۱۹
۱۹۔ ایضاً، ص۲۴۔۲۳
۲۰۔ ایضاً، ص۲۴
۲۱۔ ایضاً، ص۲۵۔۲۴
۲۲۔ ایضاً، ص۲۶
۲۳۔ وزیر حسن عابدی: زمان و مکان، لاہور، ادارہ رُشنائی، س ن،ص ۱۸۔۱۷
۲۴۔ ایضاً، ص ۲۰
۲۵۔ ایضاً، ص ۲۴
۲۶۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ، ص۶۴
۲۷۔ غیاث چوہدری: کائنات اور ہم،ص ۶۶
۲۸۔ ایضاً، ص ۲۵
۲۹۔ ایضاً، ص ۶۷
۳۰۔ ایضاً، ص ۷۳
۳۱۔ ایضاً، ص ۵۸
۳۲۔ ایضاً، ص ۷۱
۳۳۔ سٹیفن ڈبلیو ہاکنگ: (مترجم، یاسر جواد) کائنات کی تاریخ، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۰ء، ص۲۵
۳۴۔ برائن گرین: (مترجم، یاسر جواد) نغمہ کائنات، اسلام آباد،مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۱ء، ص ۶
۳۵۔ نصیر احمد ناصر: تیسرے قدم کا خمیازہ، لاہور، سانجھ پبلیشرز، ۲۰۱۳ء، ص۲۷
۳۶۔ وین برگ: (مترجم، ارشد رازی) سائنسی نظریہ تخلیق کائنات، لاہور، نگارشات پبلشرز، ۲۰۰۹ء، ص۱۵۷

۳۷۔ نیاز احمد صوفی: ناتمام کائنات، لاہور، اردو سائنس بورڈ،۲۰۰۳ء، ص ۵۹
۳۸۔ محمود علی، ڈاکٹر:کائنات اور اس کے مظاہر، لاہور، اردو سائنس بورڈ، ۱۹۹۲ء، ص۱۴۶
۳۹۔ اسٹیفن ہاکنگ: (مترجم، طفیل ڈھانہ، پروفیسر)، لاہور، فکشن ہائوس، ۲۰۱۲ء، ص ۱۲
۴۰۔ ایضاً، ص ۱۳
۴۱۔ کارل پوپر: مترجم ڈاکٹر ساجد علی، سائنس اور تہذیب، لاہور، مشعل، ۱۹۹۷ء، ص۱۹
۴۲۔ اسٹیفن ہاکنگ: مترجم علیم احمد، کائنات کا مکمل ترین نظریہ، کراچی، فضلی سنز، ۲۰۰۶ء، ص ۲۳
۴۳۔ ایضاً، ص ۲۵۔۲۴
۴۴۔ محمود علی سڈنی، ڈاکٹر: فلسفہ، سائنس اور کائنات، لاہور، الفیصل ناشران و تاجران کتب، ۱۹۹۵ء، ص۶۳
۴۵۔ محمود علی، ڈاکٹر:کائنات اور اس کے مظاہر، ص۱۶۷
۴۶۔ اسٹیفن ہاکنگ: مترجم علیم احمد، کائنات کا مکمل ترین نظریہ، ص ۱۰۹
۴۷۔ شاہین مفتی: کنارہ کس نے دیکھا ہے، کراچی، اکادمی بازیافت، ۲۰۰۹ء، ص۳۴۰
۴۸۔ علی عباس جلال پوری: کائنات اور انسان، لاہور، تخلیقات، ۲۰۱۳ء، ص۱۳
۴۹۔ ارشد محمود: تصورِ خُدا، لاہور، فکشن ہائوس، ۲۰۱۲ء، ص۲۶
۵۰۔ جدید سائنس کا آغاز: ٹامس گولڈ سٹائین، مترجم رشید ملک، لاہور، مشعل، س ن، ص۲۰
۵۱۔ شاہین مفتی: کنارہ کس نے دیکھا ہے، ص۳۳۶
۵۲۔ نیاز فتح پوری، علامہ: خدا اور تصورِ خدا، لاہور، فکشن ہائوس، ۲۰۱۲ء، ص۱۰۷
۵۳۔ طارق ہاشمی: اردو نظم اور فرد کی جستجو،(غیر مطبوعہ)، ص۱۳
۵۴۔ رابرٹ بریفالٹ: تشکیلِ انسانیت، عبدالمجید سالک (مترجم)، لاہور، مجلسِ ترقیٔ ادب، ۱۹۹۴ء، ص۹۵
۵۵۔ بورس مور: مذاہبِ عالم کا انسائیکلوپیڈیا، یاسر جواد (مترجم)، لاہور، نگارشات پبلشرز، ۲۰۰۶ء، ص۱۹۴
۵۶۔ رشید قیصرانی: نظم مشمولہ جدید ادب، شمارہ نمبر ۱۶، جنوری تا جون ۲۰۱۱ء، جرمنی،، ص۲۰۲
۵۷۔ زاہد ڈار: تنہائی، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء،ص ۵۲
۵۸۔ نثار اکبر آبادی: شعر اور فنِ شعر، لاہور، جاسم پبلی کیشنز،۲۰۱۳ء، ص ۲۵
۵۹۔ ہادی حسین، محمد: شاعری اور تخیل، لاہور، مجلسِ ترقیِ ادب،۲۰۰۵ء، ص۱
۶۰۔ کوثر مظہری: جدید نظم: حالی سے میرا جی تک،مظہرپبلی کیشن، نئی دہلی ، نومبر۲۰۰۵ء،ص۲۳
۶۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر: اردو شاعری کا مزاج، لاہور، مجلسِ ترقیِ ادب،۲۰۰۸ء، ص ۱۵
۶۲۔ زاہد ڈار: تنہائی، ص ۶۰
۶۳۔ ایضاً، ص ۶۸
۶۴۔ ایضاً، ص ۱۱۹
۶۵۔ یوسف ظفر: کلیاتِ یوسف ظفر مرتبہ ڈاکٹر تصدق حسین راجا، اسلام آباد، روداد پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۴۶

۶۶۔ ایضاً، ص ۲۴۸
۶۷۔ عبدالرئوف نوشہروی، پروفیسر: سائنس اور مسائلِ امروز، کراچی، ایجوکیشنل پریس، ۱۹۸۲ء، ص۶۰
۶۸۔ ایضاً، ص۵۳۔۵۲
۶۹۔ شہزاد احمد:آنے والا کل، لاہور، ملٹی میڈیا افئیرز، ۲۰۰۵ء، ص۱۹۰
۷۰۔ شاہین مفتی: کنارہ کس نے دیکھا ہے، ص۳۳۱
۷۱۔ عبدالرشید: انی کنت من الظالمین، لاہور، سانجھ پبلشرز، ۲۰۱۱ء، ص ۷۵
۷۲۔ فیض احمد فیض:نسخہ ہائے وفا، لاہور، مکتبہ کارواں، س ن، ص۵۵
۷۳۔ سعید احمد، ڈاکٹر: اردو شعرا کا سائنسی شعور (غیر مطبوعہ مقالہ)، مخزونہ گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، فیصل آباد، ۲۰۱۲ء، ص۳
۷۴۔ علی عباس جلال پوری، سید: عام فکری مغالطے، لاہور، تخلیقات پبلشرز، ۲۰۱۳ء، ص ۱۶۸
۷۵۔ نصیر احمد ناصر: تیسرے قدم کا خمیازہ، ص۲۷
۷۶۔ ایضاً، ص۵۲
۷۷۔ ایضاً، ص۸۱
۷۸۔ ہادی حسین، ڈاکٹر: مغربی شعریات، لاہور، مجلسِ ترقیِ ادب، ۲۰۰۵ء،ص ۲۷
۷۹۔ سعید احمد، ڈاکٹر: اردو شعرا کا سائنسی شعور (غیر مطبوعہ مقالہ)، ص۵
۸۰۔ زکریا، خواجہ محمد(مرتب): انتخابِ زریں نظم، لاہور، سنگت پبلیشرز، ۲۰۰۷ء، ص ۹۹
۸۱۔ نصیر احمد ناصر: تیسرے قدم کا خمیازہ، ص۹۹
۸۲۔ جابر علی سید: استعارے کے چار شہر، شعری تنقید، بیکن بکس، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص۸۱
۸۳۔ شازیہ عنبرین، ڈاکٹر: ملتان میں جدید اردو نظم کی روایت، بیکن بکس ، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۱۵
۸۴۔ غیاث چوہدری: کائنات اور ہم، ص ۷۴
۸۵۔ فیضان اللہ خان (مئو لف): ہماری کائنات، لاہور، اردو سائنس بورڈ، ۱۹۹۶ء، ص ۱۱
۸۶۔ غیاث چوہدری: کائنات اور ہم، ص ۵۳
۸۷۔ علی عباس جلال پوری، سید: عام فکری مغالطے، ص ۴۳
۸۸۔ محمود انور، پروفیسر: جدید طبیعیات کاتعارف، لاہور، مجلسِ ترقیِ ادب،۱۹۶۵ء، ص۲
۸۹۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر: اشاراتِ تنقید، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۶۱
۹۰۔ ایضاً، ص ۸۳
۹۱۔ زاہد امروز: کائناتی گرد میں عریاں شام، لاہور، سانجھ پبلیشرز، ۲۰۱۳ء، ص ۹۹
۹۲۔ عرش صدیقی، ڈاکٹر: شعور، سائنسی شعور اور ہم، مشمولہ تکوین، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،۱۹۹۷ء، ص۸۰
۹۳۔ سعید احمد، ڈاکٹر: اردو شعرا کا سائنسی شعور (غیر مطبوعہ مقالہ)، ص۱۴
۹۴۔ تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ: محمد اقبال، ڈاکٹر، مترجم نذیر نیازی ، سید، لاہور، بزمِ اقبال، ۲۰۱۲ء، ص۳۷
۹۵۔ کوثر مظہری:جدید نظم: حالی سے میرا جی تک،ص۴۰

۹۶۔ صلاح الدین درویش، ڈاکٹر: انسان، کائنات اور سماج، لاہور، بیکن بُکس،۲۰۱۱ء، ص ۶۹۔۱۷۰
۹۷۔ کین ولبر: (مترجم امیر خان حکمت)، سائنس اور مذہب کا سنگم، کراچی، سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۳ء، ص ۱۹۶

باب دوم
جدید اردو نظم کا فکری ارتقا

اردو شاعری کی تاریخ تقریباً سات سو سال پُرانی ہے، جو کہ امیر خُسرو سے منسوب پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں سے لے کر ہائیکو جیسی جدید اصناف تک کے سفر کی کہانی ہے۔ دکنی عہد سے بیسویں صدی تک آتے آتے اردو شاعری نے کئی رو پ اختیار کیے۔کلاسیکی روایت میں غزل اور قصیدہ کے علاوہ سب شعری اصناف کو نظم ہی کہا جاتا ہے۔ روایتی نظم میں صنف اور موضوع لازم وملزوم ہیں۔روایتی نظم پابند نظم کہلاتی ہے۔ اس کی بنیادی خصوصیات میں قافیہ اور ردیف کا التزام، صنف و موضوع کی یک جائی اور پہلے مصرع کی پابندی لازم ہے۔بعد ازاں جب اس نے بغاوت کا رویہ اختیار کیا تو اس نے بہ تدریج مندرجہ ذیل مختلف ہئیتی شکلیں اختیار کیں:

* معرا نظم میں بحر اور ارکان کی پابندی قائم رہتی ہے، قافیہ و ردیف ختم ہو جاتے ہیں۔
* آزاد نظم میں بحر قائم رہتی ہے۔ ارکان کی پابندی اور قافیہ و ردیف ختم ہو جاتے ہیں ۔
* نثری نظم میں بحر بھی ختم ہوجاتی ہے۔

نظم اولین شعرا کے زمانے سے ہی کہی جا رہی ہے تاہم باقاعدہ نظم کہنے والوں میں اولین نام نظیر اکبر آبادی کا ہے۔ تاہم اس کے بعد ایک بڑا دورانیہ نظم سے دوری کا ہے۔ اس کے بعد اسمٰعیلؔ، اکبرؔ، چکبستؔ، اقبالؔ، سلیمؔ، سرورؔ جہاں آبادی، شوق قدوائی اور بے نظیر شاہ کے نام ممتاز ہیں۔ ان شعرا کے ہاں ایک نیا احساس اور فکر کا ایک نیا زاویہ ملتا ہے۔ پس منظری حوالے سے دیکھا جائے تو قرونِ وسطٰی تاریخی حوالے سے ۱۸۵۷ء میں ختم ہو جاتا ہے۔ اگر اس عہد پر غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ زراعت، جاگیرداری، بادشاہت، تصوف اور نو فلاطونیت اس عہد کے بنیادی خصائص ہیں اور ان کی بنیاد جذبہ، فطرت اور اجتماعیت پر ہے۔انسان کے بنیادی جذبات فطرت سے متعلق ہیں، تعقل بعد کا مرحلہ ہے۔ Urbanization تعقل کو اور تعقل نثر کو پیدا کرتا ہے۔ جذبہ شاعری کرواتا ہے اور تعقل نثر لکھواتا ہے۔لہٰذاجذبہ و فطرت کے مقام پر تحریر کم ہو جاتی ہے اور روایت پر انحصار ہوتا ہے۔ نیز یہ بات بھی اہم ہے کہ روایت سند کا درجہ رکھتی ہے۔

ان عناصر میں تصوف اور نوفلاطونیت بنیادی فکر ہیں جب کہ زراعت، جاگیرداری اور بادشاہت کردار ہیں۔ نوآبادیاتی نظام کے ڈیڑھ سو سالہ عہد اور اس کے بعد کے دورانیے میں انسان کا فطرت سے تعلق کم زور پڑتا چلا گیااور نظریات و احساسات میں تبدیلی رونما ہونے لگی جیسے زراعت، صنعت میں، بادشاہت اور جاگیرداری، جمہوریت میں، تصوف اور

فلاطونیت ‘ فلسفہ میں‘ جذبہ تعقل میں‘ فطرت‘ کلچر میں‘ اجتماعیت‘ فردیت میں اور روایت ‘ شخصی رائے میں تبدیل ہو گئی۔

سرسید روایت میں بغاوت کے حوالے سے پہلے فرد ہیں۔جنھوں نے ہمارے ہاں مروج ادبی کلیشوں کو نہ صرف خود توڑا بل کہ آنے والے ادب کی سمت نمائی بھی کی۔ اس سلسلے میں پہلی یورپی فکر Naturalism کی صورت میں اردو ادب میں در آئی۔سر سید کے زیرِ اثر تین اقدام نے قرونِ وسطیٰ سے فرار کا راستا اپنایا:

الف۔ انجمنِ پنجاب

ب۔ جدید نظم نگاری‘ کرنل ہالرائیڈ

ج۔ حالی کی مقدمہ شعروشاعری

مقدمہ شعرو شاعری نے ہماری اردو شاعری میں نئے مباحث کو جنم دیا جن کی بہ دولت اردو شاعری میں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ حالیؔ‘ سرسید تحریک کے زیرِ اثر اس ادبی تحریک کو قومی ترقی کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ ان دونوں بزرگوں کی تمام تر کاوشیں ایک ردِّ عمل کی حیثیت رکھتی تھیں جن میں سلبی پہلو نمایاں تھا نہ کہ مغربی ادبی رجحانات۔یہ تبدیلیاںافکارِ سرسید کے تحت اگلی نسل کو منتقل ہوئیں تو نئی نظم کا خمیر اٹھا۔ اگرچہ یہ تبدیلیاں بہ تدریج مختلف ادوار میں ظہور پذیر ہوئیں تاہم ان کے ارتقا کی پہلی اینٹ افکارِ سرسید کی صورت میں رکھی گئی۔ اس تحریک نے اردو شعر وادب کو بعض نئے تصورات دیے‘ جو درج ذیل ہیں:

۱۔ موضوع کا تسلسل ۲۔ موضوع کی وسعت

۳۔ شعرو ادب کا اخلاقی اور قومی مقاصد کے لیے استعمال

۴۔ مستعمل لفظی تراکیب‘ تلمیحات اور الفاظ کو مفہوم کے مروّج پیمانوں سے نکال کر معنویت کے نئے
دائرے تخلیق کرنا

ہئیت کے حوالے سے نظم کو عام طور پر تین اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے:

۱۔ پابند نظم ۲۔ نظم معرّا ۳۔ آزاد نظم

پابند نظم ایسی نظم کو کہا جاتا ہے جس کے لیے بحر ‘ وزن اور قافیہ و ردیف کی پابندی کی جاتی ہے البتہ موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ آغاز میں نظم کی یہی صورت مروّج رہی ہے مثلاً قصیدہ‘ مثنوی‘ مربّع ‘ ترکیب بند وغیرہ۔

’’بے قافگی‘ ‘ نظم معرّا کا امتیازی وصف ہے کہ اس میں شعرا نے قافیے کی قید سے آزادی چاہی ہے کیوں کہ قافیے کی پابندی شاعر کے تخیل اور ادائیگیِ مطلب میں رخنہ انداز ہوتی تھی ۔ یوں بے قافیہ شاعری کو نظم معرّا کا نام دیا گیا مگر اس میں بحر اور وزن کا التزام روا رہا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

’’حالیؔ کو بھی اندازہ تھا کہ قافیے کی قید ادائے مطلب میں خلل انداز ہوتی ہے۔۔۔ معرّی نظم مینبحر اور وزن کی پابندی کی جاتی ہے مگر قافیہ ضروری نہیں سمجھا جاتا۔‘‘(۱(

اس پر جامع تبصرہ کرتے ہوئے ابوالاعجاز حفیظ صدیقی رقم طراز ہیں:

’’قافیے سے نجات پانے کی خواہش نظم معرا کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی۔ ایسی نظموں میں قافیے کی پابندی نہیں ہوتی۔ قافیہ یا تو سرے سے ہوتا ہی نہیں اور اگر ہو تو کسی

معین روایتی نظام کا پابند نہیں ہوتا۔ البتہ قدیم اصنافِ سخن کی باقی دو پابندیاں نبھائی جاتی ہیں یعنی نظم ایک ہی وزن میں ہوتی ہے اور مصرعے برابر ہوتے ہیں۔‘‘(۲(

نظمِ معرّا کے حوالے سے جن شعرا کے اسما قابلِ ذکر ہیں ان میں شرر‘ اسماعیل میرٹھیؒ‘ تصدّق حسین خالد‘ آزاد کاکوروی اور نظم طباطبائی جیسے لوگوں کے نام آتے ہیں۔ مگر کچھ عرصے بعد شعراکو نظم معرا کے حوالے سے بھی ’’کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے‘‘ کے احساس کا سامنا کرنا پڑا ۔ جیسا کہ آل احمد سرور لکھتے ہیں:

’’معرا نظم قافیے کی قید سے آزاد ہونے کے باوجود خیال کے برابر قتلے کرنے پر مجبور تھی اور نئی نظر اور نئے احساس کے لیے اصل مسئلہ یہی خیال کی آزادی تھا۔‘‘(۳(

جب کہ اسی کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کہتے ہیں:

’’آزاد نظم میں نظم معرّی کی طرح مصرعوں کا برابر و یکساں ہونابھی ضروری نہیں۔ آزاد نظم میں نظم کی بنیاد ایک ہی بحر پر ہوتی ہے‘ مگر بحر کے ارکان کی تقسیم شاعر کی صواب دید پر ہوتی ہے۔ بعض اوقات ایک رکن دو مصرعوں میں منقسم ہوجاتا ہے‘ کوئی مصرع چھوٹا اور کوئی بڑا۔‘‘(۴(

اردو نظم نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بل کہ آزاد نظم میں ہئیت کے حوالے سے دیگر بہت سے تجربات بھی کیے گئے۔ انھی تجربات پر بحث کو سمیٹتے ہوئے ابوالاعجاز حفیظ صدیقی آزاد نظم کو درج ذیل تین اقسام میں منقسم کرتے ہیں:

’’الف ۔موزوں: ایسی نظمیں جن میں مصرعے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں لیکن پوری نظم قدیم اصناف کی طرح ایک مخصوص وزن کی پابند ہوتی ہے۔

ب۔ نیم موزوں:ایسی نظمیں جن میں مصرعے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں ۔ پوری نظم ایک عروضی نظام کی پابندی بھی نہیں کی جاتی۔ البتہ دو یا بعض اوقات دو سے زیادہ مماثل عروضی اوزان اس طرح استعمال کیے جاتے ہیں کہ وزن کی حِس تسکین پا سکے۔

ج۔ غیر موزوں: نظمِ آزاد کی تیسری صورت وہ ہے جس میں شعرا نے وزن سے یک سرچھٹکارا حاصل کرنا چاہا ہے۔ ایسی نظموں میں مصرعے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں۔ وزن سرے سے موجود ہی نہیں ہوتا۔ لفظوں کی ترتیب اور بندش سے شعر کا آہنگ حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔‘‘(۵(

لسانی حوالے سے اردو نظم کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

الف: غالب کی روایت: یہ روایت مفرس و معرب الفاظ کی حامل ہے‘ اسے بہ تدریج اپنانے والوں میں

اقبال‘ راشد اور اختر حسین جعفری کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

ب: میر کی روایت: اس روایت میں مقامیت کا رنگ نمایاں ہے۔ اسے اپنانے والوں میں

مختار صدیقی اور مجید امجد کے نام اہم ہیں۔

تکنیکی حوالے سے بھی جدید اردو نظم کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

الف: سیدھی: اس کا نمائندہ احسان دانش کو قرار دیا جا سکتا ہے

ب: پیچیدہ: اس کا نمائندہ مجید امجد کو قرار دیا جا سکتا ہے

اردو میں نظم کا باقاعدہ آغاز انجمنِ پنجاب سے ہوا۔ اردو نظم سے پیش تر غزل کی طرز پر ہی مثنوی‘ مرثیہ اور قصیدہ کی ہئیتی اور فکری سطح پر شاعری کی جاتی رہی ہے۔

اس کی شکل کسی بھی ہئیت کی پابند کیوں نہ رہی ہو‘ تاہم غزل کی صورت میں اس میں قافیہ‘ ردیف اور بحر کا خیال ضرور رکھا جاتا تھا اور ہئیتی اصولوں سے کسی طرح کا گریز بھی ناممکن اور نا پسندیدہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ یہ دورانیہ بھی چاہے مرثیہ کی صورت میں اظہار پذیر ہوا یا قصیدہ کی صورت میں ‘ تاہم اس میں بھی کائناتی تصورات کو کسی نہ کسی صورت میں ضرور پیش کیا گیا۔ کیوں کہ یہ عوامل مقالہ ہذٰا سے خصوصی تعلق رکھتے ہیںلہٰذا یہاں ان کو مختصراً بیان کر دینا یقینا غیر ضروری نہ ہوگا۔

ناقدینِ ادب‘ مرثیہ ‘ مثنوی اور قصیدے کی جدید صورت کو نظم کا نام دیتے ہیں۔ اس لیے یہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ان اصناف کا جائزہ لیتے ہوئے ان میں مذکور کائناتی شعور کو بھی واضح کرنے کی سعی کی جائے۔

مرثیہ ادب کی ایک قدیم صِنف ہے‘ جس میں واقعاتِ کربلاؔ کو منظوم انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے مرثیہ میں جو کائناتی شعور اجاگر ہوا ہے وہ سراسر مذہبی و تاریخی ہے جس میں خدا کی ذات کو بزرگ و برتر قرار دیتے ہوئے کائنات کے تمام مظاہر کو اس کی ذات کے تابع تصور کیا جاتا ہے۔ مرثیہ نگاروں کے یہاں میدانِ کربلا میں اگرچہ ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے لیکن چوں کہ یہ مشیتِ ایزدی تھی اس لیے اسے قبول کیے بنا چارہ بھی نہیں ہے۔ مثلاً انیس کے مرثیے کا یہ بند دیکھیے

گردوں پہ ناز کرتی تھی اُس دشت کی زمیں

کہتا تھا آسمانِ دہم چرخ ہفتمیں
پردے تھے رشکِ پردہ چشمانِ حورِ عین

تاروں سے تھا فلک اُسی خرمن کا خوشہ چیں
دیکھا جو نور چشمہ کیواں جناب پر

کیا کیا ہنسی ہے صبح گل آفتاب پر

)میر انیس)(۶(

مرثیہ نگاروں کے یہاں اگر اس صدمے سے سوال اٹھانے کا حوصلہ بھی پیدا ہوتا ہے تو وہ بارگاہِ خداوندی میں نہایت عجز و انکسار کے ساتھ اس واقعے کے حوالے سے سوال اٹھاتے نظر آتے ہیں۔ اس لیے مرثیہ نگاروں کے ہاں کائنات کا وہی تصور اور شعور مذکور ہے جو ان تک مختلف مذہبی حوالوں سے پہنچا ہے۔ انھوں نے کائنات کو سمجھنے کا بنیادی ذریعہ مذہبی خدا کے تصور کو بنایا ہے نا کہ سائنس یا فلسفہ کو۔یہاں یہ امر بھی زیرِ نظر رہے کہ فلسفۂ شہادت بھی خدا کی رضا جوئی کے تابع ہے اور مرثیے کا آخری حصّہ جو دُعا پر مشتمل ہے وہ بھی خدا کے حضور حاضری ہی ہے اور اُسی سے مناجات کی جاتی ہے اور یہ بھی ایک کائناتی پہلو ہے۔

اسی طرح قصیدہ نگاروں کے یہاں بھی کائنات اور مظاہر کائنات کے حوالے سے ایک بندھا ٹکا رجحان دیکھنے کو ملتا ہے۔ جس میں وہ خدا کی خالق کی حیثیت سے پہچان رکھتے ہیں اور اُسے ’’الوہاب‘‘ کی حیثیت دے کر اُس کی ذات سے دُعا کرتے نظر آتے ہیں۔ گویا ان کا تصورِ کائنات بھی مذہبی حوالوں اور خصوصاً اسلامی نظریے کا اظہار ہے جس میں خدا وہ

بزرگ و برتر ذات ہے جس سے قصیدہ نگار شعرا عمرِدوام اور لطفِ عام کی خواہش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح قصیدہ گو شعرا‘ اپنے ممدوح کو خدا کے نائب یا ظلّ اللہ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک خالصتاً مذہبی تصوّر ہے۔ایک قصیدے میں شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ‘ اکبر شاہ ثانی مرحوم کی یاد میں لکھتے ہیں:

تا زباں زد دہر میں ہو فلسفی کا یہ کلام

ہے افلاک لازم‘ نفی فخرق و التسام
تا خطِ محور پہ ہووے گرم گردشِ آفتاب

تا بہ قطبینِ فلک تک پہنچے دورِ صبح شام
سعد سیارہ ہوں سائر‘ تا سر ہفت آسماں

ہو ثوابت کا سپہر‘ ہشتمیں پر‘ ازدحام

(شیخ محمد ابراہیم ذوق)(۷)

انجم ثابت و سیار‘ سعادت سے بہم

یوں نظر آئے کہ جوں دشت و بغل‘ اہلِ وفاق
نجم نا ہید‘ لقب جس کا ہے‘ رقاصِ فلک

تھا چپ و راست‘ بہ آہنگِ رباب و عشاق
بدر تھا‘ پل میں قمر‘ پل میں نظر آتا ہلال

خدمتِ دائرہ داری میں تھا ہر رنگ سے طاق

(شیخ محمد ابراہیم ذوق)(۸)

اسی طرح سے مرزا محمد رفیع سوداؔ ستاروں کے حوالے سے بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ںہیں ستارے ہیں یہ بل کہ لوٹتا ہے اب

اُسی حسد سے انگاروں پہ چرخ لیل و نہار

(مرزا محمد رفیع سودا)(۹)

مثنوی کی صنف کے حوالے سے دیکھا جائے تو وہاں بھی شعرا کا کائناتی تصور محض مذہبی حکایتوں کی دین معلوم ہوتا ہے جن میں شاعر خدا کے حوالے سے اور مظاہر قدرت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے وہی نظریات اپناتے نظر آتے ہیں جوخالصتاً اسلامی نظریات ہیں یا ہند اسلامی ثقافت سے ماخوذ ہیں۔ درج ذیل اقتباسات ملاحظہ کریں:

ہے سزاوارِ ثنا وہ کردگار

جس کی وحدت سے ہے کثرت آشکار
گرچہ ہے سب کچھ اسی کا یہ ظہور

پر کیا جاتا نہیں سائے کو نور
نور اپنی جگہ ہے سایہ اپنی جگہ

نیک اور بد میں بھی فرق کرنا ہے بھلا
)میر حسن)(۱۰(

ہوتا ہے وہی جو خدا چاہے

مختار ہے جس طرح نباہے
)دیا شنکر نسیم)(۱۱(

بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے

پتّا کہیں حکم بن ہلا ہے
)دیا شنکر نسیم)(۱۲(

مثنوی سحر البیان میں حمدیہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

نہیں کوئی تیرا نہ ہوگا شریک

تیری ذات ہے وحدہ' لا شریک
)مثنوی سحرالبیان)(۱۳(

وہ نور ہے سب طرف جلوہ گر

اسی کے یہ ذرّے ہیں شمس و قمر
)مثنوی سحرالبیان)(۱۴(

نہیں اس سے خالی غرض کوئی شے

وہ کچھ شے نہیں ہے پر ہر اک شے میں ہے
)مثنوی سحرالبیان)(۱۵(

تامل سے کیجیے اگر غور کچھ

تو سب کچھ وہی ہے نہیں اور کچھ
)مثنوی سحرالبیان)(۱۶(

مثنویات میںابوالاثر حفیظؔ جالندھری کی ’’شاہ نامۂِ اسلام‘‘ کائناتی تصور کو واضح کرنے میں دیگر مثنویات سے قدرے بہتر دکھائی دیتی ہے۔ حفیظ جالندھری کی یہ مثنوی اگرچہ امتِ مسلمہ کی حالتِ زار کا بیان ہے مگر اس مثنوی کے ابتدائی حصّے میں انھوں نے روح' خدا' انسان اور کائنات کے تعلق کو درج ذیل انداز میں بیان کیا ہے۔

اسی نے ایک حرفِ کن سے پیدا کردیا عالم

کشاکش کی صدائے ہائو ہو سے بھر دیا عالم
وہی ہے کائنات اور اس کی مخلوقات کا خالق

نباتات و جمادات اور حیوانات کا خالق
اسی کے نور سے پر نور ہیں شمس و قمر تارے

وہی ثابت ہے جس کے گرد پھرتے ہیں یہ سیارے
(حفیظ جالندھری)(۱۷)
اگرچہ روح میں اک شور محشر خیز لایا تھا

اگرچہ شیشۂِ دل درد سے لبریز لایا تھا
اگرچہ روح میں موجود تھی لہروں کی طغیانی

رہا شرمندۂِ ساحل مرا ذوقِ تن آسانی
(حفیظ جالندھری)(۱۸)

اسلامی تاریخ اور نظریات کے تناظر میں وہ تخلیقِ آدم اور اس کی نیابت پر بھی بحث کرتے ہیں اور اس ضمن میں فرشتوں کے خدشات کو بھی بیان کرتے ہیں:

خدا نے حضرتِ آدم کو دنیا کی خلافت دی

جہاں میں اپنا نائب کرکے بھیجا یہ سعادت دی
یہی مخلوق تھی فردوس سے جس کو نکالا تھا

اسی نے دانۂِ گندم پرسب کچھ بیچ ڈالا تھا
بہ ظاہر اس تقرر سے نئے فتنوں کے ساماں تھے

زمین و آسماں، جن و ملائک سخت حیراں تھے
لگے سرگوشیاں کرنے کہ انساں ہے بہت سادہ

ادھر شیطان کا لشکر شرارت پر ہے آمادہ
یہ بے چارہ دوبارہ دامِ شیطاں میں نا آجائے

کہ دانہ کھا چکا ہے اب کہیں دھوکا نہ کھا جائے
(حفیظ جالندھری)(۱۹)

اسلامی فکر میں تخلیقِ کائنات کا ایک اور مقصد بھی بتایا گیا ہے اور وہ ہے حبیبِ خدا ﷺ کا دنیا میں جلوہ افروز ہونا۔ خدائے بزر گ و برتر کی ذات اپنے محبوب نبی محمدؐ کو بہ حیثیت آخری نبی اس دنیا میں بھیجنا چاہتی تھی ، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات تخلیق کی۔ اس مثنوی

کی رو سے روح الامین حضرت جبرائیل ؑ عالمِ بالا میں ہی اس حقیقت کی پردہ کشائی کرتے ہوئے یوں دکھائی دیتے ہیں:

دلِ مخلوق میں یوں راہ اندیشے نے جب پائی

تسلی کے لیے فوراً ندا جبریل کی آئی
نگاہِ غور سے دیکھو ذرا آدم کی پیشانی

نظر آتی نہیں کیا ایک خاص الخاص تابانی؟
یہی جلوہ ہے تخلیقِ جہاں کی علتِ عالی

اسی کی روشنی ہے دیدۂ ہستی کی بینائی
)حفیظ جالندھری)(۲۰(

جب یہ واقعاتی تسلسل آگے بڑھتا ہے تو کچھ ایسی صورت حال سامنے آتی ہے:
ہوا ابلیس اس کے سامنے جھکنے سے انکاری

یہی تھا امتیاز آدم کا جس سے جل گیا ناری
اسی کی ضد پہ اُس باغی کو ہیں ارکان شاہی کے

گیا ہے لے کے دنیا میں وہ منصوبے تباہی کے
یہ ظاہر ہے کہ شیطاں اب بڑی طاقت دکھائے گا

زمانے میں قیامت ڈھائے گا فتنے اٹھائے گا
یہ سچ ہے مدتوں اولادِ آدم راہ بھولے گی

وہاں ابلیس کی کھیتی بڑھے گی اور پھولے گی
وہ دن بھی آئے گا جب آخری اک سامنا ہوگا

حق و باطل میں گویا فیصلہ کن معرکہ ہوگا
مشیت ہے کہ آدم ہی کرے گا اس کو پست آخر

یہی اقبالِ پیشانی اسے دے گا شکست آخر
یہی وہ نور ہے جس سے زمانہ جگ مگائے گا

یہی آدم کا رتبہ عرشِ اعظم تک اٹھائے گا
فرشتے شانِ احمدؐ دیکھنے کو صبر کھو بیٹھے

زمیں پہ جھک پڑے تارے٬ ہمہ تن چشم ہو بیٹھے

)حفیظ جالندھری)(۲۱(

اور پھر اس کے بعد وہی کچھ ہوا جو آج تک اس دنیا میں ہوتا چلا آرہا ہے۔ نیکی و بدی اور حق و باطل کی اس معرکہ آرائی نے آج تک اس کرہ ِارض کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔

یہ جلوہ دیکھ کر ابلیس اپنے دل میں گھبرایا

حسد بن کر دل فرزندِ آدم میں اتر آیا
لڑائی ٹھن گئی نیکی بدی کی خانۂ دل میں

یہ پہلی جنگ تھی روئے زمیں پر حق و باطل میں

)حفیظ جالندھری)(۲۲(

گویا ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ نظم کی ابتدائی اشکال قصیدہ' مرثیہ'رباعی' شہرِآشوب اور مثنوی میں کائنات کے حوالے سے جو شعور ملتا ہے وہ اسلامی فصیلوں میں محدود ہے جسے ہند اسلامی تہذیبی شعور کہنا قدرے مناسب ہوگا۔ کیوں کہ اس زمانے تک سائنس کی رسائی عمومی ذہن تک آج کی صورت نہ تھی اسی لیے قدیم اصناف نظم کا شعور اس جدید سائنسی تصور سے کافی مختلف رہا ہے جو آج کل کی جدید نظم میں مذکور ہے۔

جہاں تک اندازِ بیاں کا تعلق ہے تو کسی بھی شاعر نے مثنوی میں ہئیت کی حد سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ مسلسل نظم کا تصوّر اردو اور فارسی میں پہلے بھی موجود تھا لیکن کچھ ایسی صورت تھی کہ عموماً ایک نظم کی ہئیت ہی اس کے موضوع کو متعین کرتی۔ روایتی نظم سے بغاوت کسی ایک مرحلے میں نہیں ہوئی بل کہ بہ تدریج اس کی فکری اڑان میں حائل رکاوٹیں ہٹتی چلی گئیں۔ اس باب میں سب سے پہلے قافیے سے آزادی حاصل کی گئی اور پھر بحر میں بھی تبدیلیاں کی گئیں۔ نظم کے فکری و فنی ارتقا کے حوالے سے اولین کاوشیں کرنے والوں میں مولانا محمد حسین آزادؔ' مولانا الطاف حسین حالیؔ اور کرنل ہالرائیڈ کے اسما قابلِ ذکر ہیں کہ

''نئے خیالات کے اقتضا' سرسید کی تحریک' کرنل ہالرائیڈ کی تائید اور خود اپنی اُفتادِ طبع سے مولانا محمد حسین آزادؔ نے اس جدید شاعری کا سنگِ بنیاد رکھا۔''(۲۳(

الطاف حسین حالیؔ نے اس حوالے سے مولانا محمد حسین آزادؔ کی معاونت کی اور اسماعیل میرٹھیؔ آزاد نظم کے قندیل بردار کی حیثیت سے آگے بڑھے۔ اس حوالے سے آزاد نے انجمنِ پنجاب میں ۱۹۔اپریل' ۱۹۷۴ء میں ایک لیکچر ''نظم اور کلامِ موزوں'' کے باب میں دیا۔ علاوہ ازیںآزادؔ نے ایک نظم ''شبِ قدر'' کے عنوان سے پڑھ کر بھی سُنائی' جسے لوگوں نے عمومی طور پر اور کرنل ہالرائیڈ نے خصوصی طور پر بے حد سراہا۔ اس کے بعد انجمنِ پنجاب کے رسالے میں مصر رام داس قابلؔ کی نظم ''ہولی'' شایع ہوئی جو آزاد کی ''شبِ قدر'' ہی کی طرح مثنوی کی طرز پر لکھی گئی تھی۔ کچھ عرصہ بعد انجمنِ پنجاب کی مشاعروں میں برسات' زمستان' امید' حبِ وطن' مروّت' قناعت' تہذیب اور اخلاق کے عنوان پر نظمیں پیش کی گئیں۔ بعد ازاں انجمن کو بوجوہ شاعری کا یہ سلسلہ بند کرنا پڑا 'تاہم اس دوران میں نئی نظم کا پودا اپنی جڑیں پکڑنے لگا تھا۔

فکری حوالے سے دیکھا جائے تو یہاں تک محض موضوعاتی نظمیں لکھنے کا رُجحان عام ہوا تھا جس کی ہئیت ابھی تک مثنوی ہی کی تھی۔ یہاں یہ امر بھی باعثِ دل چسپی ہے کہ

مولانا محمد حسین آزادؔ اور اسماعیل میرٹھیؔ نے خود بھی کبھی نئی ہئیت کا سوال نہیں اٹھایا تھا البتہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ حالی نے وزن اور قافیہ دونوں کو شعر کی ماہیت سے خارج قرار دیتے ہوئے نہ صرف یہ کہ سب سے پہلے ''بلینک ورس'' کا ذکر کیا ہے بل کہ دوسروں کو اس میں طبع آزمائی کرنے پر بھی اکسایا مگر خود یہ ہمت نہ کر سکے اور مقفّٰی شاعری ہی کرتے رہے۔ نظم کی ہئیت کے حوالے سے حالیؔ کے ایک شاگرد کیفیؔ منظرِ عام پر آتے ہیں۔ انھوں نے حالیؔ کے کہنے پر تو نہیں ' اپنی موزونیِ طبع سے مجبور ہوکر ایک مخصوص ہئیت ''مربّع'' کا استعمال کیا۔ انھوں نے ملکہ وکٹوریہ کی گولڈن جوبلی پر اُن کی کام یابی اور تہنیت کے لیے ایک نظم تحریر کی جس کے قوافی کی ترتیب ''ا'ب'ا'ب'' تھی اور یہ مربّع بند ہئیت میں تھی۔ فنّی حوالے سے یہ اردو ادب میں پہلی مثال ہے جو نظم کے مروّجہ سانچوں کو توڑتی نظر آتی ہے۔

دوسری طرف اولیت کا تاج نظم طباطبائیؔ کی ''گورِ غریباں''کے سر بھی جاتا ہے کہ اس سے پیش تر انگریزی تہذیب سے متاثر ہو کر بہت سے شعرا نے شاعری کی تھی مگر وہ انگریزی نظموں کے تراجم پر مشتمل تھی۔ ''گورِ غریباں'' بھی GREY کی ایک انگریزی نظم ELEGRYکا منظوم ترجمہ ہی تھی ' جسے عبدالحلیم شرر نے اپنے رسالے ''دل گداز'' میں شایع کیا۔ شرر نے نظم معرا کو رواج دینے کے لیے اپنا ایک منظوم ڈراما بھی رسالے میں شایع کیا۔ اس کے بعد مختلف شعرا کی نظمیں بھی اس رسالے میں شایع ہوئیں۔ شرر نے ہی ''نظمِ غیر مقفّٰی'' کے لیے مولوی عبدالحق کا تجویز کردہ '' نظمِ معرا'' کا لفظ رائج کیا۔

''نظمِ غیر مقفّٰی کو آیندہ سے ہم نظمِ معرّا لکھا کریں گے۔ ہمارے لائق اور معزز دوست جناب مولوی عبدالحق نے اس نظم کے لیے یہ نام تجویز کیا ہے جو ہمیں بہت پسند ہے۔''

رسالہ ''دل گداز'' میں ہی شرر نے ''مظلوم ورجینیا'' ڈراما اور گولڈ اسمتھ کی نظم کا ترجمہ ''اسیر بابل'' نظم معرا کی ہئیت میں شایع کیا۔ ''دل گداز'' کے بعد ۱۹۰۱ء سے مخزن نے نئی نظم کی تحریک کو پروان چڑھایا' جس میں مختلف شعرا نے نظموں کے بامحاورہ اور طبع زاد تراجم شایع کروائے۔ شائق قدوائی نے منظوم ڈراما ''قاسم و زہرا'' قیصر بھوپالی نے منظوم ڈراما ''کرشمۂ عشق'' اور علامہ محمد اقبالؔ نے بہت سی نظموں کے منظوم تراجم تخلیق کیے جو وقتاً فوقتاً مخزن کے اوراق کی زینت بنے اور اس کے بعد نظم نگاری کا سلسلہ چل نکلا جسے نذر محمد راشدؔ' میراجیؔ' فیض احمد فیضؔ اور دیگر نظم نگار شعرا نے نئے فکری اور ہئیتی حوالے سے منفرد صورت و سیرت عطا کی۔ نظمِ جدید میں شاعر اپنے باطن کی گہرائیوں میں ڈوب کرلطیف پیرائے میں انکشافِ ذات کرتا ہے۔گو یہ تجربہ اس کا انفرادی ہوتا ہے۔ لیکن اس کا مزاج اور پیکر اس کے ماحول کا دستِ نگر ہوتا ہے۔(۲۴(

جس طرح عبدالرحمٰن بجنوری کے اس فقرے کو کسی حوالے کی ضرورت نہیں کہ ہندوستان کی دو الہامی کتابیں ہیں اسی طرح یہ بات بھی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے کہ سرسید احمد خان'' مسدس حالی'' کو اپنا توشۂ آخرت قرار دیتے تھے۔ نظم کے باب میں قومی و ملّی جذبے کا آغاز کرنے والے مولانا الطاف حسین حالیؔ (۱۹۱۴ء-۱۸۳۷ء) اردو زبان میں جدید نظم کی بنیاد ڈالنے والوں کی معاونت کرتے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ مولانا حالیؔ نے انجمن پنجاب کے مشاعروں میں نظمیں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ نظم کے ہئیتی اور تکنیکی ستونوں کو بھی استحکام بخشنے کی کوششیں کیں۔ اس باب میں انھوں نے چند مثنویاں اور مسدس مدو جزرِ اسلام (۱۸۷۹ء) کو تخلیقی صورت عطا کی۔ مسدس حالی بلا شبہ وہ پہلی طویل اردو نظم

ہے جس کے آغاز میں مسلمانوں کی مذہبی‘ تہذیبی‘ اخلاقی اور علمی زندگی کا ارتقا مذکور ہے۔ اسے حالیؔ نے خاصے موثر انداز میں بیان کیا ہے اور مسلمانوں کو ان کے ماضی کا آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ ذرا نظم کے اس بند کو دیکھیے:

ہیں حفظِ صحت کے آئین سکھائے

سفر کے ہیں شوق ان کو دلائے
مفاد ان کو سوداگری کے سکھائے

اصول ان کو فرماں دہی کے بتائے
نشاں راہِ منزل کا اک اک دکھایا

بنی نوع کا ان کو رہبر بنایا

)الطاف حسین حالی)(۲۵(

ان اشعار سے ان کا ملی و قومی تصور بڑی واضح صورت میں سامنے آتا ہے کہ وہ اسلام کو نہ صرف زندگی کا صحیح راستا سمجھتے ہیں بل کہ مسلمان قوم کو بہ حیثیتِ مجموعی اس دنیا کا رہبر بھی مانتے ہیں۔ اور اس مقصد کے لیے وہ انھیں ان کے تاب ناک ماضی کی طرف مراجعت کرواتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی لیے بقول ابواللیث صدیقی:

’’مسدس حالی ایک تاریخی اور قومی نظم ہے ۔ بلکہ ایک حد تک اسے مسلمان قوم کا مرثیہ ہی کہنا چاہیے۔‘‘(۲۶(

حالیؔ کی یہ نظم ان کے قومی و ملی شعور کو اُجاگر کرنے میں بے مثال ہے کہ اس میں انھوں نے مسلمانوں کی حالتِ زار کا نقشا خاصے بے باک انداز میں کھینچا ہے۔ اس نظم کی مقصد غفلت میں پڑی قوم کو بیدار کرنا تھا کہ جو معاشی و اخلاقی اعتبار سے تنزلی کا شکارہو رہی تھی۔ اس لیے اس نظم میں ان تمام تر اخلاقی برائیوں کوبہ تفصیل بیان کیا گیا ہے جو عہدِ حالی کے مسلمانوں میں موجود تھیں۔ اس نظم سے حالیؔ نے مسلمانوں کے قلب میں احساسِ زیاں پیدا کرنا چاہا ہے تا کہ ان کی اصلاح ہو سکے۔

ادا کرچکی جب حق اپنا حکومت

رہی نہ اب اسلام کی اس کو حاجت
مگر حیف اے فخرِ آدم کی امت

ہوئی آدمیت بھی ساتھ اُس کے رُخصت
حکومت تھی گویا کہ اک جھول تم پر

کہ اڑتے ہی اس کے نکل آئے جوہر

)الطاف حسین حالی)(۲۷(

جب کہ ڈاکٹر رشید امجد حالی کی اس نظم کو ’’نئی نظم کا منشور‘‘ خیال کرتے ہیں۔(۲۸)مسدّس حالیؔ میں مسلمانوں کی تاریخ کو منظوم کیا گیا ہے۔ اس میں امتِ مسلمہ کے

ماضی و حال کو جس طرح پیش کیا گیا ہے وہ فکرِ حالی کے قومی و ملی شعور کا واضح ترجمان ہے۔ انھیں مسلمانوں کی ابتر حالت کا بہ خوبی اندازہ تھا اور وہ چاہتے تھے کہ یہ امت اپنی ابتری سے ہی اصلاح و ترقی کے سامان تلاش کرے ۔ ان کے لیے صرف یہی ایک خیال باعث تقویت تھا کہ کسی طرح ان کی پکار امت مسلمہ کے ہر فرد تک پہنچ جائے۔ اور مسدس کے اشعار ان کی اس فکرمندی کی ترجمانی کا فریضہ بھرپور طور پر ادا کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ عوام نے بھی حالی کی اس پکار کو سمجھا اور اس نظم کے معانی و مفاہیم نے مسلمانوں کو اپنی کج رویوں کا بھی احساس دلایا۔ حالی کی نظم اس زمانے میں خوب شہرت و مقبولیت حاصل کر چکی تھی۔ اس کی مقبولیت کے حوالے سے نذرمحمد راشد بجا طور پر لکھتے ہیں:

''حالیؔ نے اسلام کے عروج و زوال پر مبنی اپنی شہرہ آفاق مسدّس شائع کی۔ اس کتاب کو سبھی نے پسند کیا۔ کئی لوگوں نے اس کے کئی اشعار زبانی یاد کیے تاکہ انھیں روزمرہ کے فلسفیانہ اور ادبی مضامین میں قلم بند کیا جا سکے۔''(۲۹(

ایسا نہیں ہے کہ حالی کے فکر کا یہ قومی و ملی رجحان صرف مسدس میں ہی ظاہر ہوا بل کہ اس سے پیش تر حالی انجمن پنجاب کے مشاعروں میں چار نظمیں بہ عنوان ''برکھا رُت'' ''رحم و انصاف'' ''حُبِّ وطن'' اور ''نشاطِ اُمید'' بھی پیش کرچکے تھے اور ان نظموں میں بھی حالیؔ کے قومی‘ ملی اور اصلاحی فکر کے سوتے پھوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ بالخصوص ''حبِ وطن'' میں یہ فکری پہلو زیادہ واضح انداز میں منعکس ہوتا ہے۔ اس کے فکری پہلو پر بات کرتے ہوئے عتیق احمد کا کہنا ہے:

''مثنوی حبِ وطن‘ اگرچہ کوئی بہت طویل نظم نہیں ہے لیکن اس میں پہلی بار حالیؔ نے کھل کر اپنے فکرونظر کی بدلتی ہوئی نہج کو کھلے اظہار کی شکل دی ہے۔''(۳۰(

قدیم عہد میں اکبر الہٰ آبادی سے ہٹ کر ہماری تمام تر نظم صرف عشق‘ مدح اور ہجو کی صورت اختیار کیے ہوئے تھی ۔ اس کے علاوہ کوئی فکری پہلو عیاں نہ تھا۔ یقینا حالیؔ کی شاعری سے وہ فکری سوتے پھوٹے جنھوں نے اردو نظم کو نئی فکری جہات سے آشنا کیا ۔ حالیؔ نے جس طرح نظمِ جدید کی موضوعاتی توسیع کی اور نظم کو نئے معنوی پیرہن عطا کیے وہ حالی ہی کا امتیاز ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر انور سدید کا کہنا ہے:

''حالی نے اپنی نظموں میں صرف قدیم اور جدید رنگ کی ہنر مندانہ پیوندکاری ہی نہیں کی بل کہ موضوعات کی تبدیلی اور نئے خیالات سے اردو نظم کو جدیدیت کی ڈگر پر ڈال کر اسے نئی شاعری کا امتیازی نشان بھی بنادیا۔''(۳۱(

جب کہ جدیدشاعری کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے میرا جی لکھتے ہیں کہ

''جدید شاعری کے مفہوم کا تعلق صرف ہئیت کے انقلاب ہی سے نہیں ہے‘ جیسا کہ عام لوگ سمجھتے ہیں‘ بل کہ موضوع کا انتخاب اور شاعر کا انداز نظر کسی نظم کو جدید بناتے ہیں۔ اگر موضوع اچھوتا ہے تو نظم خود بہ خود جدید ہوسکتی ہے۔ اور اگر موضوع پرانا ہے‘ یا کم سے کم اچھوتا نہیں ‘ تو شاعر کا اندازِ نظر اسے جدید بنا سکتا ہے۔''(۳۲(

نظم کے موضوعاتی فکر میں قومی و ملی حوالونسے حالیؔ کے بعد دوسرا بڑا نام مولانا ظفر ؔ علی خان (۱۹۵۶ء۔۱۸۷۳ء) کا ہے۔ انھوں نے قومی و ملّی احساس کو شاعری کے حوالے سے اجاگرکرنے کے ساتھ ساتھ تحریکِ پاکستان کے ایک سرگرم رکن کے طور پر بھی کام کیا۔ بہ طور صحافی ''زمیندار'' اخبار کے ذریعے انھوں نے برِ صغیر کے مسلمانوں

کی ترجمانی کی اور اس حوالے سے انھیں قیدو بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔ ان کی شاعری میں بڑا حصہ نظم کا ہے اور اس حقیقت کے باوجود کہ ان کی شاعری ہنگامی و بحرانی حالات کی تخلیق تھی ‘ عمدہ نظم نگاری کا مرقع ہے اور عمدہ نظم نگاری کے جوہر اُن کے فن پاروں میں جا بجا محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ آل احمد سرور نے اپنے مضمون ’’نظم کی دنیا‘‘ میں بجا طور پر مولانا ظفرؔ علی خان کے بارے میں یہ رائے دی ہے:

’’ظفر علی خان اگر سیاست سے ذرا علیٰحدہ رہتے تو دوسرے اقبال ہو سکتے تھے۔‘‘(۳۳(

قومی و ملی تناظر میں ظفر علی خان کی نظموں کا مرکزومحور مقصدیت ہے۔ اُن کی شاعری عوامی حیثیت کی ترجمان اور اپنے حالات کی آئینہ دار ہے۔ اس حوالے سے اگر انھیں حالیؔ و شبلیؔ کی فکری توسیع قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔وہ ایک درد مندانہ دل کے مالک تھے۔ حساس طبع شاعر تھے۔ اس لیے انھیں مسلمانوں کی ابتر حالت کا شدت سے احساس تھا۔ جس کی وجہ سے اُن کے کلام پر اصلاح کا رنگ غالب تھا اوراُن کی یہ خواہش بھی تھی کہ تمام اہلِ قلم حضرات کو وقت کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے اپنا اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔ ان کی اسی مقصدیت کا اظہار ان کی نظموں میں نکھر کر سامنے آتا ہے۔ اسی تناظر میں ان کی نظم ’’چمنستان‘‘ ملاحظہ ہو :

وطن کو چمنستاں بنا کے چھوڑوں گا

اور اس کی صبح کو خنداں بنا کے چھوڑوں گا
ہر ایک وقت کے دارا کو اور سکندر کو

میں اپنے قصر کا درباں بنا کے چھوڑوں گا
میں نام لے کے محمدؐ کے زیر دستوں کا

حریفِ رستمِ رستاں بنا کے چھوڑوں گا
ادب نماز کے اوقات کا وہ سیکھے گی

میں کانگریس کو مسلماں بنا کے چھوڑوں گا
لہو شہید کا لوں گا ور اس کی سرخی سے

میں غازۂ رخِ ایماں بنا کے چھوڑوں گا
وہ مشکلیں جنھیں حل جبر کر نہیں سکتا

بہ زورِ صبر انھیں آساں بنا کے چھوڑوں گا

)مولانا ظفر علی خان)(۳۴(

مولانا ظفر علی خان کی شاعری ہنگامی حالات کی پروردہ ہونے کے باوصف ان تمام تر تاریخی حقائق کی آئینہ دار ہے جن سے ان کے عہد میں برِ صغیر کے عوام بالخصوص مسلمان گزرے۔مولانا ظفرؔ علی خان اور حسرتؔ موہانی نے اردو نظم میں سیاسی شعور داخل

کیا۔ آزادی‘ مزاحمت‘ مسلمانوں کے حقوق‘ الگ تشخّص‘ حکم رانوں کے مظالم ‘ سب اردونظم کا حصّہ بنے۔ اسی لیے عتیق احمد کا یہ بیان بڑا جان دار محسوس ہوتا ہے:

’’اگر مولانا کے کلام کو ذرا سا توجہ سے تاریخ وار مرتب کر لیا جائے تو ہماری جدوجہدِ آزادی کی ایک منظوم تاریخ بڑے جان دار انداز کی سامنے آسکتی ہے۔‘‘(۳۵)

تحریکِ آزادی کے حوالے سے ’مظالمِ پنجاب‘ جنرل اوڈوائر‘ جلیاں والا باغ کا حادثہ‘ تحریکِ ترکِ موالات‘ تحریکِ خلافت‘ ہجرت تحریک‘ واردھا سکیم‘ شُدھی سنگھٹن تحریک‘ وغیرہ جیسی نظمیں انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔شعروادب یہاں مقصود بالذات نہ رہے بل کہ ایک بلند تر مقصد کے حصول کا ذریعہ بن گئے۔ ان کی نظم ’’اسلام کی بجلی اور شدھی کا خرمن ‘‘ کے اشعار ملاحظہ ہوں:

چریں گے علف زاروں میں اب اسلام کے گلے

کہ بھردیں کفر کے ڈھوروں نے بھارت کی چراگاہیں
اجازت مل گئی ہے آریوں کو مالوی جی سے

کہ حلقہ ڈال دیں شدھی کا جس کے کان میں چاہیں
کسی عورت کو بہکایا‘ کسی بچے کو پھسلایا

دھرم ارتھ ان کو دیتا ہے اسی مطلب کی تنخواہیں

)مولانا ظفر علی خان)(۳۶(

مولانا کیوں کہ ایک صحافی تھے اس لیے ان کی نظموں میں سیاسی رنگ بھی بہت واضح انداز میں دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے اپنی ذات کو مسلم لیگ اور مسلمانوں کے لیے وقف کردیا تھا۔ مسلم لیگ کی پالیسیوں کی حمایت ’’زمیندار‘‘ کا اولین منشور ٹھہری۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کی ابتر صورت حال کی عکاسی انھوں نے کمال جرات سے کی۔ انھوں نے قیدوبند کی صعوبتیں برداشت کیں مگر حق گوئی پر کوئی سمجھوتا گوارانہ کیا۔ وہ اپنی نظم ’’یورپ کا بین الاقوامی قانون‘‘ میں لکھتے ہیں:

یورپ والو! تم تو سمجھتے ہی نہیں ہو انسان ہمیں

اور جو سمجھتے بھی ہو تو شاید جانتے ہو نادان ہمیں
عدل تمھارا زرِ مغرب جو ہے‘ ملمع مشرقی کو

کہہ نہ سکیں گے گو کچھ بھی زباں سے ‘ ہوگئے کان ہمیں
طبلِ غور بجا کر نازاں اپنے نام پر آپ ہوئے

آپ کو لمن الملک مبارک‘ علیھا فان ہمیں
آپ ہیں گورے ‘ ہم ہیں کالے آپ کو شاید یہ ہے خیال

چوں کہ ہے کالی‘ اس لیے پیاری ‘ ہونہیں سکتی جان ہمیں

)مولانا ظفر علی خان)(۳۷(

مولانا ظفر علی خان کا یہی احساسِ ملی انھیں ہمیشہ غیر ملکی سام راج سے برا فروختہ رکھتا تھا۔ قوم کا درد انھیں اپنی ذات سے ماورا کیے ہوئے تھا۔ پروفیسر ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی کی یہ رائے بڑی اہم ہے:

’’علی گڑھ سے تعلیم پانے کے باوجود (مولانا) ظفر علی خان مغرب اور مغربیت کے قائل نہ تھے۔‘‘(۳۸(

حکومتِ وقت کے خلاف بے باکانہ تنقید اور ان کے پرتشدّد روّیوں کی مخالفت کرنے والوں میں مولانا ظفر علی خان سب سے آگے تھے۔ ان کی بہت سی نظمیں حکومتِ وقت نے ضبط کیں‘ جو ان کی حق گوئی اور بے باکی پر دلالت کرتی تھیں۔ علاوہ ازیں مولانا ظفر علی خان نے سرمایہ دارانہ نظام کی بھی شدید انداز میں مذمت کی۔ ان کے خیال میں یہ نظام محنت کشوں کا خون چوستا ہے۔ حق داروں کو ان کے حق سے محروم کرتا ہے۔ اس لیے ان کے کلام میں مزدور کی عظمت کے حوالے سے بھی خیالات ملتے ہیں۔ ن م راشد مولانا ظفر علی خان کی شاعری کے قومی و ملی پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’ظفر علی خان کی شاعری کا ایک فکری نظام ضرورہے اور یہ فکری نظام ہندوستان کی موجودہ سیاسیات پر قائم ہے۔ ظفر علی خان کی تمام شاعری ہماری قوم کے سیاسی اور معاشرتی تجربات کا نفسی ردِ عمل ہے۔ ان کی شاعری ان قوّتوں پر ایک زہر خند ہے جو ہمارے قدیم سیاسی نظام کی تباہی کا باعث ہوئی ہیں یا جو ہماری معاشرت میں مزید افتراق کا باعث ہورہی ہیں۔‘‘(۳۹(

مولانا ظفر علی خان کا نام نظم کی موضوعاتی توسیع میں تو قابلِ ذکر ہے مگر ہئیتی تجربات کے حوالے سے ان کے یہاں کوئی قابلِ قدر مساعی نظر نہیں آتی۔ ان کی نظموں کا بیش تر حصہ مثنوی ہی کی طرز پر تخلیق ہوا ہے۔ ان کی شاعری میں قومی و ملی جذبات کی عکاسی اور ان کی اہمیت پر گفت گو کرتے ہوئے خواجہ محمد زکریا کہتے ہیں:

’’ظفر علی خان کی شاعری کا ایک بڑا حصہ ہنگامی ہے۔ وہ ہندوستان کے ایک پر آشوب دور کی تصویر ہے جو یک رُخی ہو سکتی ہے۔ لیکن چوں کہ مسلمانانِ ہند کے جذبات کی عکاس ہے اس لیے اپنے زمانے میں اسے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔‘‘(۴۰(

نظم کے باب میں اکبر الٰہ آبادی (۱۹۲۱ء ۔ ۱۸۴۵ء) ایک معتبر حوالے کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ اسی لیے نظم کے فکری ارتقا کو سمجھنے کے لیے ان کی شاعری کا مطالعہ بھی اہمیت کا حامل ہے۔ اکبر الٰہ آبادی کے یہاں جو موضوعات حاوی رہے ان میںانگریزی تہذیب و تمدن پر تنقید اور مقامی ثقافت ‘ جسے ہند اسلامی ثقافت کہنا زیادہ بہتر ہے‘ کی توصیف و حمایت اور اس تہذیب کو محفوظ بنانے کی خواہش زیادہ متوجہ کرنے والے تھے۔ اگر اکبرؔ کے خلاف لکھی جانے والی تنقید کو دیکھیں تو اکبرؔ ماضی کے اندھے مقلّد‘ مغرب کے نقاد‘ سائنس اور جدید ترقیات کے دشمن‘ مغرب اور مغربی تہذیب کے لائے ہوئے فیوض و برکات کے مخالف‘ ہندوستان کی ترقی و فلاح کی قوتوں کے نقاد اور زمانے کی ہوا کے برخلاف چلنے والے تھے ۔ اس حوالے سے اگر اکبرؔ کو مزاحمت کا پیش رو کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

یہ الزامات اپنی نوعیت میں شدید سہی مگر یہی وہ الزامات بھی ہیں جو اکبرؔ الٰہ آبادی کو ادب میں مزاحمت کا پیش رو بھی قرار دلواتے ہینکیوں کہ انھوں نے ’’چلو تم ادھر کو جدھر

کی ہوا ہو'' کی مخالفت کرتے ہوئے پورے اعتماد اور وثوق کے ساتھ اپنے روایت پرست ہونے کا اعتراف کیا۔علاوہ ازیں انھوں نے انگریزی تہذیب و تمدن اور اس کا پرچار کرنے والوں پر طنزوتنقید کے نشتر بھی برسائے۔ ان کے درج ذیل اشعار ان کی نظموں کے مزاج کو واضح کرتے ہیں:

مذہب کو لیاتو بحث میں سر ٹوٹا

چاہی اصلاح تو خدا چھوٹا

شکوہ ہم غیر کا کریں کیا اکبر

اپنوں ہی نے ہم کو ہر طرح لوٹا

)اکبر الہ آبادی)(۴۱(

علم و حکمت میں ہو اگر خواہشِ ''فیم''

سرکار کی نوکری کو ہرگز نہ کر ''ایم''

شادی نہ کر اپنی قبل تحصیلِ علوم

بت ہو کہ پری ہو ' خواہ ہو کوئی ''میم''

)اکبر الہ آبادی)(۴۲(

اکبرؔ نے جو تنقید انگریزوں پر کی 'دیکھا جائے تو وہ اتنی غلط بھی نہیں تھی کہ ان کے خیال میں ہندوستان میں انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ ' معاشی استحصال اور ظلم و ستم ہی کوبدحالی کی بنیادی وجہ گردانا جاتا ہے۔ اس لیے یہی عوامل ان کی نظموں میں اظہار کا موقع پاتے ہیں۔ انگریزوں کا یہی استحصالی اندازِ حکومت تاریخ کی کتابوں میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ اکبرؔ برطانیہ کی قائم کردہ عدالت کے ایک آلہ کار تھے۔ وہاں کام کرتے تھے۔ عدالت میں لائے جانے والے مقدمات اور ہر آن ہونے والے فیصلے ان کے روزمرہ مشاہدے کا حصہ تھے۔ ایسے میں ان کے ہاں مزاحمتی انداز اس صورت میں بھی جلوہ گر ہوتا دکھائی دیتا ہے کہ وہ اس نام نہاد انصاف کا تماشا براہِ راست روز اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔ اس لیے مغرب اور تہذیبِ مغرب کی مخالفت ان کا وطیرہ بن گئی۔ بہ قول ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا:

''افکارِ اکبرؔ کے بنیادی طور پر دو حصّے ہیں' پہلا حصّہ منفی ہے اور دوسرا مثبت۔ منفی اشعار وہ ہیں جن میں انھوں نے تیزی سے رائج ہوتے ہوئے بعض رجحانات کو ہدف بنایا اور مثبت حصہ وہ ہے جہاں انھوں نے بعض مٹتی ہوئی اقدار کے احیا کی کوشش کی ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط ہے کہ ان کے ہاں صرف تخریب کا جذبہ ہے' تعمیر کا نہیں۔''(۴۳(

سرسید احمد خان' اکبرؔ کے قلم کی زد پر رہے صرف اس لیے کہ وہ انگریزی تہذیب و تمدن کے مبلّغ اور انگریزی نظامِ تعلیم کے داعی تھے۔ اس لیے اکبر الٰہ آبادی نے ان کی ذات کو بھی ہدفِ تنقید بنایا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اس پر خاصا مفصل اظہارِ خیال کیا ہے۔

''اکبر الہٰ آبادی سرسید کے مخالفوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کو سرسید کے اس نظریہ سے اختلاف تھا کہ مسلمانوں کی ترقی مغربی علوم و فنون کے حاصل کرنے سے ہو سکتی

ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان علوم اور مغربی خیالات کے ساتھ الحاد اور لادینی کے اثرات بھی ہندوستان کے مسلمانوں تک پہنچ جائیں گے اور ان کی اپنی پہچان ختم ہوجائے گی۔ اکبرؔ کا خدشہ بے جا نہ تھا۔ بعد کے واقعات سے یہی ثابت ہوا کہ مسلمانوں نے تعلیمِ مغرب سے کم فائدہ اٹھایا اور اس کے مقابلہ میں تقلیدِ مغرب نے ان کو نقصان زیادہ پہنچایا۔ اسی لیے اکبرؔ جدید تعلیم اور مغربی طرزِ زندگی کے مخالف تھے۔ مذہب سے سرسید اور اکبرؔ دونوں کو لگائو تھا لیکن سر سید مذہب میں اجتہاد کے قائل تھے اور زمانہ کے حالات کے مطابق تبدیلیوں کے قائل تھے لیکن اکبرؔ اس معاملے میں قدامت پرست اور روایت پرست تھے۔''(۴۴)

لیکن اس حقیقت کو بھی نہیں جھٹلایا جا سکتا کہ نظم کی موضوعاتی توسیع کے حوالے سے اکبرؔ صرف تنقیدِ مغرب تک محدود نہ تھے بل کہ انھوں نے تو ہندوستان کی سیاسی تاریخ اور معاشرتی حالات کے تمام پہلوئوں کو بھی اصلاح طلب زاویوں سے جانچا۔ لہٰذا ایسے تمام ادارے، تمام سر بر آوردہ شخصیات، تمام تحاریک، تمام اہم واقعات جن کا تعلق کسی بھی طرح ہندوستان، اسلام یا حکومتِ برطانیہ سے تھا، اکبرؔکے قلم کی نوک پر رہے اور اکبرؔ نے قومیت کے جذبے سے سرشار ہوکر ان پر بے لاگ تنقید کی۔ اس تنقید کے لیے انھوں نے طنز کا حربہ اختیار کیا۔ اکبرؔ کو اردو کی طنزیہ شاعری کا امام بھی کہا گیا ہے کیوں کہ ان کے ہاں طنز کسی محدود و مقید تناظر کی بجائے تہذیب کی صورت حال سے جنم لیتا محسوس ہوتا ہے اور اپنے اسی طنز کے آلے سے وہ تہذیبی مسائل کے نبض شناس بھی محسوس ہوتے ہیں۔ اکبرؔ نے عقلیت اور منطق پسندی کے اس حد سے بڑھتے ہوئے رجحان کی مذّمت کی جس کے علم بردار سر سید احمد خان تھے۔ اُن کے نزدیک ہماری تہذیب کی جڑ مذہب میں تھی اور مذہب سے کٹ جانا ہمارے لیے تہذیبی موت کا درجہ رکھتا تھا۔اسی لیے وہ کہتے ہیں:

قولِ ملحد ہے کہ نیچر ہوگیا میرا معین

اور فلک کی ہے صدا واللہ خیرالماکرین
ہم خوشی سے یہ تماشا دیکھتے ہیں دہر کا

دیکھنا ہے کون سچ کہتا ہے دنیا یا کہ دین

(اکبر الہٰ آبادی)(۴۵)

دلادے ہم کو بھی صاحب سے لائیلٹی کا پروانہ

قیامت تک رہے سید ترے آنر کا افسانہ
اڈیٹر بول اٹھے دیکھ کر شبلی کے فوٹو کو

اسی کے دم سے اب زندہ ہے مشرق کا کتب خانہ
مبصّر کہہ رہے ہیں وضع ملت کے تغیر پر

بندھی یہ دُھن تو بس اب ہوچکا مسلم کا اترانا
بہت مشکل ہے نبھنا مشرق و مغرب کا یارانہ

اِدھر صورت فقیرانہ‘ اُدھر سامان شاہانہ
)اکبر الٰہ آبادی)(۴۶(

اکبرؔ اپنے فکری روّیے میں یقینا مزاحمت کے پیش رو ہیں تاہم ہئیتی سطح پر وہ مروّجہ روایت کے ہی پیرو کار رہے اور ان لگی بندھی شعری حدود سے تجاوز نہ کرسکے جو اُن کے عہد میں مروج تھیں۔

علامہ محمد اقبالؔ (۱۸۳۸ء۔۱۸۷۷ء) کی شاعری متنوع جہات کی حامل ہے۔ ان میں سے واضح فکری جہت اُن کے استفہام پر مشتمل ہے۔ اقبال ؔ کی شاعری کا غائر مطالعہ کیا جائے تو ان کے اٹھائے ہوئے سوال فکرِ انسانی کو دعوتِ تفکر دیتے ہیں۔ علامہ اقبال کے ان سوالات کے مخاطب بھی مختلف لوگ ہیں۔ کبھی وہ یہ سوالات خود اپنی ذات سے کرتے ہیں ‘ کہیں ان کے مخاطب مظاہرِ فطرت ہیں ‘ کہیں وہ دوسرے کرداروں سے مخاطب ہوتے ہیں تو کہیں خدا سے ہی سوال کر بیٹھتے ہیں۔ پھر خود ہی خدا کی طرف سے بھی انسان پر سوالات کی بوچھاڑ بھی جگہ جگہ دکھائی دیتی ہے۔

اقبالؔ کے مخاطب کی طرح ان کے سوالات کی نوعیت بھی متنوع ہے۔ کہیں تو سوالات ایسے ہیں کہ اقبالؔ ان کے جوابات کے متلاشی ہیں مگر کہیں یہ سوالات ایسے بھی ہیں جن کے جوابات اظہر من الشمس ہیں ۔ ایسے سوالات میں اقبال ؔ کا انداز استفسار اور یاددہانی کا ہے۔ یہ سوالات عام زندگی کے عام سے معمولات سے لے کر کائنات کی وسیع وبسیط پنہائیوں تک پر مشتمل ہیں۔ الغرض ان سوالات کے اندر بھی ایک نئی دُنیا اور اس کا نظام قائم ہے۔

اقبالؔ مختلف مظاہرِ فطرت کے حوالے سے جو سوالات اٹھاتے ہینوہ محض ان سے استفسار کا ایک انداز لیے ہوئے ہینجہاں وہ ان سے سوال کر کے ان کے رازوں کی عقدہ کشائی کرنا چاہتے ہیں۔مثلاً اقبالؔ نظم ’’گُلِ رنگین‘‘ میں پھول سے استفسار کرتے ہیں
ے سوزبانوں پر بھی خاموشی تجھے منظور ہے

راز وہ کیا ہے جو ترے سینے میں مستور ہے؟
)علامہ محمداقبال)(۴۷(

اقبالؔ پھول جیسے لطیف مظاہرِ قدرت میں مقید رازوں کو بھی جاننا چاہتے ہیں تو دوسری طرف انجم و کواکب بھی ان کے تفکر کا شکار بنتے ہیں۔ ان کے لیے یہ امر باعثِ حیرت ہے کہ ستارے ‘ جن کو قدرت نے اتنا اعلا مقام دیا ہے‘ حُسن کی دولت سے مالامال ہیں ‘ وہ بھی کسی نامعلوم خوف کا شکار نظر آتے ہیں۔ اقبالؔ کا یہ استفسار دراصل ستاروں کو ان کی ذات سے آشنا کروانے کا ایک انداز ہے۔ دیکھیے:

قمر کا خوف‘ کہ ہے خطرۂ سحر تجھ کو؟

مآلِ حُسن کی کیا مل گئی خبر تجھ کو؟
متاعِ نور کے لُٹ جانے کا ہے ڈر تجھ کو

ہے کیا ہراسِ فنا صورتِ شرر تجھ کو؟
زمیں سے دور دیا آسماں نے گھر تجھ کو

مثالِ ماہ اڑھائی قبائے زر تجھ کو
غضب ہے پھر بھی تری ننھی سی جان ڈرتی ہے

تمام رات تری کانپتے گزرتی ہے
)علامہ محمداقبال)(۴۸(

اسی طرح اقبالؔ چاند سے بھی دریافت کرتے ہیں کہ جو تیرے سینے میں داغ ہے ' کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ تو بھی عاشق ہو اور یہ داغ آرزو کا یا تمنا کا داغ ہو۔ مختلف مظاہرِ قدرت سے اقبالؔ کا یوں جستجو کرنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اقبالؔ کے فکر میں کس قدر گہرائی و گیرائی تھی۔ ان کے یہ سوال ان کی جستجو اور ان کے تجسس کو عیاں کرتے ہیں۔ نظم ''شعاعِ آفتاب'' میں اقبالؔ روشنی کی ایک کرن سے محوِ گفت گو ہیں اور اس سے سوال کرتے ہیں کہ آخر تیری اس ننھی سی جان میں کون سا اضطراب پنپ رہا ہے جو تجھے گھڑی بھر بھی چین لینے نہیں دیتا۔

یہ تڑپ ہے یا ازل سے تیری خو ہے؟ کیا ہے یہ؟

رقص ہے؟ آوارگی ہے؟ جستجو ہے؟ کیا ہے یہ؟
)علامہ محمداقبال)(۴۹(

اور پھر شعاع کا جواب بھی اک سوال کی صورت دھار کر سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔

ےتیرے مستوں میں کوئی جوئے ہشیاری بھی ہے؟

سونے والوں میں کسی کو ذوقِ بیداری بھی ہے؟
)علامہ محمداقبال)(۵۰(

گویا مظاہرِ قدرت سے کیے گئے سوالات کی اکثریت محض تجّسس کی ہے۔ اک ایسا تجّسس جو آخر تکمیل کو پہنچتا ہے اور اپنا جواب پا لیتا ہے۔ لیکن بہت سے سوالات ایسے بھی ہیں جو سوال کی سطح پر ہی رقصاں رہتے ہیں اور جواب سے ہم آغوش نہیں ہونے پاتے۔ ایسا ہی ایک معاملہ موت کا ہے۔ موت ایک تلخ حقیقت ہے اور مرنے کے بعد کے معاملات کو تمام مذاہب نے اگرچہ بہت حد تک بیان کیا ہے تاہم اس بیانیے کے باوصف یہ معاملات فکرِ انسانی سے بالاتر ہیں۔ اقبالؔ کے لیے بھی موت ایک معما ہے۔اس معمے کو حل کرنے کے لیے وہ ''خفتگانِ خاک سے استفسار'' کرتے نظر آتے ہیں۔ اور اسی استفسار میں وہ عالمِ برزخ ' جنت و دوزخ سب کا احوال جاننا چاہتے ہیں۔ یہ نظم طوالت کے باوجود اپنے استفہامیہ اسلوب کی بدولت لائقِ مطالعہ ہے۔

اے مئے غفلت کے سرمستو! کہاں رہتے ہو تم؟

کچھ کہو اُس دیس کی آخر جہاں رہتے ہو تم
وہ حیرت خانۂِ امروز و فردا ہے کوئی؟

اور پیکارِ عناصر کا تماشا ہے کوئی؟
آدمی واں بھی حصارِ غم میں ہے محصور کیا؟

اُس ولایت میں بھی ہے انساں کا دل مجبور کیا؟
واں بھی جل مرتا ہے سوزِ شمع پر پروانہ کیا؟

اُس چمن میں بھی گُل و بُلبل کا ہے افسانہ کیا؟
کیا وہاں بجلی بھی ہے ‘ دہقاں بھی ہے‘ خرمن بھی ہے؟

قافلے والے بھی ہیں ‘ اندیشہ رہزن بھی ہے؟
تنکے چنتے ہیں وہاں بھی آشیاں کے واسطے؟

خشت و گِل کی فکر ہوتی ہے مکاں کے واسطے؟
واں بھی انساں اپنی اصلیت سے بے گانے ہیں کیا؟

امتیازِ ملت و آئیں کے دیوانے ہیں کیا؟
واں بھی کیا فریادِ بلبل پر چمن روتا نہیں؟

اس جہاں کی طرح واں بھی دردِ دل ہوتا نہیں؟
)علامہ محمد اقبال)(۵۱(

عالمِ برزخ کے علاوہ علامہ محمد اقبالؔ جنت و جہنم کے حوالے سے بھی دریافت کرتے ہوئے کئی سوالات کرتے ہیںمثلاً جنت کیا ہے؟ کوئی باغ ہے یا منزلِ آرام ہے؟ یا حُسنِ ازل کے بے پردہ ہونے کا نام جنت ہے؟ کیا سچ میں جہنم کی آگ کا مقصد انسان کو گناہوں سے پاک کرنا ہے اور انسانوں کی سرشت کو گناہوں سے پاک کرنا ہے؟ دنیا کی ہست و بود ہی دل کے لیے اضطراب ہے تو کیا جنت میں بھی انسان کا علم ایسے ہی محدودہوگا؟ جنت کا ایک وعدہ دیدارِ خدا تعالیٰ بھی تو ہے تو سوال یہ ہے کہ غمگین دل تو دیدارِ ازل سے تسکین پاتا ہے تو کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہاں کے شجروحجر بھی ’’لن ترانی‘‘ ہی پکار رہے ہوں؟ کیا وہاں بھی انسان کو جستجو کا سودا ہوگیا ہے یا وہاں انسان کا ذوقِ استفہام قتل کردیا جائے گا؟ اس ساری گفت گو کے بعد وہ ایک سوال میں ہی اپنی جستجو کو سمیٹتے ہوئے کہتے ہیں:
؎تم بتادو راز جو اس گنبدِ گردوں میں ہے

موت اک چبھتا ہوا کانٹا ‘ دلِ انساں میں ہے
)علامہ محمداقبال)(۵۲(

اس نظم میں اقبالؔ نے دنیا کا تقابل عالمِ برزخ اور پھر اُس کے بعد جنت سے کیا ہے۔ بلا شبہ یہ ایک شاہ کار نظم ہے جو اقبالؔ کے اندر بیٹھے ہوئے ایک متجسس انسان کو ظاہر کرتی ہے۔ ایک ایسا انسان جو کسی بھی چیز کو یوں ہی دیکھ کر یا سُن کر یقین کرنے کا قائل نہیں ہے بل کہ ہر چیز کی گہرائی میں اتر کر اس کی حقیقت کو جاننا چاہتا ہے۔ اسی طرح اقبالؔ اپنی نظم ’’عالمِ برزخ‘‘ میں بھی موت پر استفہام کا شکار دکھائی دیتا ہے اور نظم ’’اذان‘‘ میں مختلف مظاہرِ قدرت انسان کے بارے استفسار کرتے نظر آتے ہیں کہ وہ اپنی ذات کے امکانات سے

بے خبر ' عیش و لذت میں زندگی بسر کررہا ہے۔ اس نظم میں سوال کرنے والے مظاہر میں نجمِ سحر' مریخ اور زہرہ شامل ہیں۔ نجمِ سحر ستاروں سے مخاطب ہوکر پوچھتا ہے کہ
ع آدم کو بھی دیکھا ہے کسی نے کبھی بیدار؟(۵۳)

جس پرمریخ انسان کو ''چھوٹا سا فتنہ'' کہہ کر مخاطب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ تو غفلت اور بے فکریِ مدام کی نیند میں مدہوش ہے ' جس پر زہرہ بے زاری کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:

ے زہرہ نے کہا ' اور کوئی بات نہیں کیا؟

اس کرمکِ شب کور سے کیا ہم کو سروکار

(علامہ محمد اقبال)(۵۴)

ان سوالات کے اٹھانے کا مقصد گویا اولادِ آدم کو یہ احساس دلانا ہے کہ اس کی غفلت کی وجہ سے اب وہ دیگر مظاہرِ قدرت کی نظر میں بھی اپنا مقام کھورہا ہے۔ اس نظم کو اگر قدیم دیومالائی تناظر میں دیکھا جائے تو یقینا اس سے بہت سے مزید نئے سوالات یا سوالات کے جوابات جنم لیں گے۔ یہ نظم اور اس کی تمام گفت گو انسان کو یہ باور کرانے کی سعی کرتی ہے کہ حضرت انسان جو اشرف المخلوقات ہے' اسے اپنے مقاماتِ بلند کو پہچاننا ہوگا کہ اس کے بنا کوئی چارہ نہیں۔مولانا جلال الدین رومی سے علامہ اقبال ؒ کو خاص عقیدت اور محبت ہے اور وہ خود کو مولانا رومی کا معنوی شاگرد کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ مُرید کا اپنے مُرشد سے سوالات کرنا معمولی بات سہی' مگر علامہ اقبالؒ اپنی نظم ''پیرومرید'' میں مولانا رومی سے جس طرح کے سوالات کرتے نظر آتے ہیں وہ ہندوستان کے ''شہرِ آشوب'' کا سا درجہ رکھتے ہیں۔ اس نظم میں اقبالؒ کے تمام سوالات اک جہانِ معنی لیے ہوئے ہیں۔ دیکھیے کہ مُرید (اقبال) اپنے مُرشد (مولانا جلال الدین رومی) سے کیا کیا سوالات کرتے ہیں۔

ے اے نگہ تیری مرے دل کی کشاد

کھول مجھ پر نکتۂِ حکمِ جہاد

(علامہ محمداقبال)(۵۵)

ے خاک تیرے نور سے روشن بصر

غایتِ آدم خبر ہے یا نظر؟

(علامہ محمداقبال)(۵۶)

ے زندہ ہے مشرق تری گفتار سے

امتیں مرتی ہیں کس آزار سے؟

(علامہ محمداقبال)(۵۷)

ے اب مسلماں میں نہیں وہ رنگ و بو

سرد کیوں کر ہوگیا اس کا لہو؟

)علامہ محمداقبال)(۵۸(

؂گرچہ بے رونق ہے بازارِ وجود

کون سے سودے میں ہے مردوں کا سود؟

)علامہ محمداقبال)(۵۹(

؂کاروبارِ خسروی یا راہبی؟

کیا ہے آخر غایتِ دینِ نبیؐ؟

)علامہ محمداقبال)(۶۰(

؂کس طرح قابو میں آئے آب و گِل؟

کس طرح بیدار ہو سینے میں دل؟

)علامہ محمداقبال)(۶۱(

؂سرِّ دیں ادراک میں آتا نہیں

کس طرح آئے قیامت کا یقیں؟

)علامہ محمداقبال)(۶۲(

؂تجھ پہ روشن ہے ضمیرِ کائنات

کس طرح محکم ہو ملت کی حیات؟

)علامہ محمداقبال)(۶۳(

؂کیوں مرے بس کا نہیں کارِ زمیں؟

ابلہ دنیا ہے کیوں دانائے دیں؟

)علامہ محمداقبال)(۶۴(

؂علم و حکمت کا ملے کیوں کر سراغ؟

کس طرح ہاتھ آئے سوزو درد و داغ؟

)علامہ محمداقبال)(۶۵(

علامہ اقبالؒ نے ان سوالوں کے جوابات بھی فکرِ رومی سے اخذ کرکے دینے کی کوشش کی ہے مگر یہ تمام سوالات اقبالؒ کی جدّتِ طبع کی غمازی بھی کرتے ہینکیوں کہ آج سے پہلے نظم تو کیا پوری شاعری میں اتنے گھمبیر سوالات اور اتنی شدومد سے نہیں اٹھائے گئے۔ ان سوالات کی متنوع جہات قاری کو بھی تفکر کی دعوت دیتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

اسی طرح اقبال نے جبرائیل‘ ابلیس اور یزداں کے مکالمے کی صورت میں ہبوطِ آدم کے واقعات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس حوالے سے ان کی نظمیں ’’جبرئیل و ابلیس‘‘ اور ’’تقدیر‘‘ قابلِ ذکر ہیں جب کہ نظم ’’ابلیس کی مجلسِ شورٰی‘‘ امتِ مسلمہ کی دگرگوں حالت کو زیرِ بحث لاتی ہے۔ ان نظموں میں اٹھائے گئے سوالات بھی قابلِ مطالعہ ہیں۔

نظم ’’جبرئیل و ابلیس‘‘ میں جبریل ‘ ابلیس سے دریافت کرتے ہیں کہ جہانِ رنگ و بو کیسا ہے؟ یہاں دراصل جبریل ‘ ابلیس کو سمجھانے آئے ہیں کہ وہ اپنی فطرت کو چھوڑ کر نیکی کے راستے پر آجائے مگر ابلیس کو یہ جہانِ رنگ و بو کچھ زیادہ ہی بھا گیا ہے۔ اس لیے وہ جبریل سے سوال کرتا ہے:

؎جس کی نومیدی میں ہو سوزِ درونِ کائنات

اُس کے حق میں تقنطو اچھا ہے یا لا تقنطو!!!

(علامہ محمداقبال)(۶۶)

اس پر جبریل ‘ ابلیس کو بتاتے ہیں کہ اس کے افکار کی وجہ سے اللہ کی نظر میں فرشتوں کی کوئی آبرو نہیں رہی۔ جس پر ابلیس کے سوالات ایک لمحے کے لیے قاری کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں اور اسے ورطۂ حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ ابلیس کا یہ کہنا اسے مبہوت کر دیتا ہے کہ

؎دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیروشر

کون طوفاں کے طمانچے کھارہا ہے؟ میں کہ تو؟

گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے

قِصّۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو؟

(علامہ محمداقبال)(۶۷)

اسی طرح نظم ’’تقدیر‘‘ میں ابلیس جب اپنے سجدہ نہ کرنے کی توجیح یہ بیان کرتا ہے کہ میرا سجدہ نہ کرنا بھی مشیتِ ایزدی میں شامل تھا تو اس پر خدا اس سے سوال کرتا ہے کہ

ع کب کھُلا تجھ پر یہ راز‘ انکار سے پہلے کہ بعد؟؟(۶۸)

نظم ’’ابلیس کی مجلسِ شوریٰ‘‘ میں بھی امتِ مسلمہ کے حوالے سے چند سوالات ملتے ہیں مگر اقبالؔ کی جرات وہاں قابلِ داد ہے جہاں وہ براہِ راست خدا سے سوال کرنے لگتے ہیں۔ ان سوالوں میں وہ جنت‘ دوزخ‘ امتِ مسلمہ اور اس کی دگرگوں حالت کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ اقبالؔ نے اپنی شہرہ آفاق نظم ’’شکوہ ‘‘ میں جب اللہ تعالیٰ کے حضور انتہائی جرات آمیز رویہ اختیار کرتے ہوئے سوالات کیے تو بہت سے اہلِ علم اور اہلِ دین اقبالؔ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان پر کفر کے فتوے تک جاری کردیے گئے لیکن جب ان کے شکووں اور سوالات کی نوعیت پر غور کیا جائے تو یہ ہر مسلمان کے دل کی آواز محسوس ہوتے ہیں۔ امتِ مسلمہ آج جس طرح اہلِ کفر کے مذموم ارادوں کا شکار ہے اس پر ہر مسلمان اللہ تعالیٰ سے یہی سوال کرتا دکھائی دیتا ہے:

؎ خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر

مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیوں کر؟

(علامہ محمداقبال)(۶۹)

؎تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا؟

قوّتِ بازوئے مسلم نے کیا کام ترا

)علامہ محمداقبال)(۷۰(

؎پر ترے نام پہ تلوار اٹھائی کس نے؟

بات جو بگڑی ہوئی تھی ‘ وہ بنائی کس نے؟

)علامہ محمداقبال)(۷۱(

؎تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کے لیے

سربکف پھرتے تھے کیا دہر میں دولت کے لیے؟

)علامہ محمداقبال)(۷۲(

؎قوم اپنی جو زرومالِ جہاں پہ مرتی

بت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی؟

)علامہ محمداقبال)(۷۳(

یہاں اقبالؒ کے پاس اپنے پاسِ وفاداری کو ثابت کرنے کے لیے سوالات کی ایک طویل فہرست ہے۔ وہ استفسارانہ انداز میں رب سے شکوہ کناں ہوتے ہوئے اسے یہ باور کرواتے ہیں کہ وہ امتِ مسلمہ ہی تھی جس نے درِ خیبر کو اکھاڑ پھینکا تھا‘ شہرقیصر کو سر کیا تھا‘ بتوں کو پاش پاش کیا تھا اور کفار کے لشکروں کے لشکر کاٹ کر رکھ دیے تھے۔ امت مسلمہ ہی نے آتش کدہ ایران کو ٹھنڈا کیا اور تذکرہ یزداں کو پھر سے زندہ کردیا تھا۔ کس قوم کی شمشیر جہاں دار ہوئی تھی؟ اور وہ کون سی قوم تھی جس نے اللہ اکبر کے نعرے سے دنیا کو بیدار کیا تھا؟ وہ کون تھے جن کی ہیبت سے نہ صرف یہ کہ اصنام سہمے ہوئے رہتے تھے بل کہ منہ کے بل گرتے تھے تو ھواللہ احد کہتے تھے۔ اقبالؒ کے ان تمام سوالات کا لبِ لباب یہی ہے کہ

؎پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں

ہم وفادار نہیں ‘ تو بھی تو دل دار نہیں

)علامہ محمداقبال)(۷۴(

یہ بھی حقیقت ہے کہ اقبالؒ نے اس نظم میں جو سوالات اٹھائے ہیں ‘ وہ اپنے مزاج میں تندوتلخ بھی ہیں اور جرأت مندانہ بھی۔ اس لیے اگر ان سوالات کی وجہ سے اقبالؒ کو کفر کے فتووں کا سامنا کرنا پڑا تو اس عہد میں یہ اتنے بے جا بھی نا تھے۔ کیوں کہ اس عہد میں دین محض دنیا داری تک محدود تھا اور اقبالؒ کے یہ سوالات ان لوگوں کی فہم و فراست سے بالاتر تھے۔ ذرا درج ذیل سوالات پر غور کیجیے کہ ان کے مزاج میں کتنی تندی ‘ کتنی درشتی اور برہمی کا پہلو نمایاں ہے۔

؎آج کیوں سینے ہمارے شرر آباد نہیں؟

ہم وہی سوختہ ساماں ہیں‘ تجھے یاد نہیں؟

)علامہ محمداقبال)(۷۵(

؎پھر یہ آزردگیِ غیر‘ سبب کیا معنی؟

اپنے شیدائوں پہ یہ چشمِ غضب کیا معنی؟

)علامہ محمداقبال)(۷۶(

ــہ طعن، اغیار ہے‘ رسوائی ہے‘ ناداری ہے

کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے؟

)علامہ محمداقبال)(۷۷(

ــخندہ زن کفر ہے‘ احساس تجھے ہے کہ نہیں؟

اپنی توحید کا کچھ پاس‘ تجھے ہے کہ نہیں؟

)علامہ محمداقبال)(۷۸(

اس نظم کے مزاج کی وجہ سے ہی مولانا غلام رسول مہر اسے اپنی نوعیت کی پہلی اور آخری نظم قرار دیتے ہیں۔(۷۹) پھر ’’شکوہ‘‘ کے جواب میں اقبالؔ نے ’’جوابِ شکوہ‘‘ تحریر کی۔ اس نظم میں ان تمام سوالوں کے جوابات ہیں جو اقبالؔ نے خدا کے حضور کیے تھے اور ان کے جواب میں بھی اقبالؔ ایک استفہامیہ انداز ہی اپنائے ہوئے ہیں گویا ہر سوال خود ہی اپنا جواب بھی عیاں کرتا ہے۔ اس انداز میں اقبالؔ اپنے اٹھائے ہوئے تمام سوالات کے جوابات ایسے تسلی بخش انداز میں دینے کی سعی کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ شکوہ بے جا محسوس ہونے لگتا ہے۔ رب کی طرف سے زبانِ اقبالؔ سے نکلنے والے یہ جوابات واضح کرتے ہیں کہ باطل کو صفحہ دہر سے مٹانے والے‘ انسان کو کفر کی گھٹا ٹوپ گہرائیوں سے نکالنے والے‘ کعبے کو اپنی جبینوں سے آباد کرنے والے اور قرآن کو سینوں سے لگانے والے یقینا اسی امتِ مسلمہ کے افراد تھے لیکن پھر اس کی توجیہہ بیان کرتے ہوئے یہ بیان صادر ہوتا ہے کہ

ــتھے تو آبا وہ تمھارے ہی مگر تم کیا ہو؟

ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

)علامہ محمداقبال)(۸۰(

کیوں کہ جب اُمتِ مسلمہ نے حکمِ ربی اور منشائے الٰہی کو چھوڑ دیا‘ تو ذلالت و گم راہی ان کے مقدر میں لکھ دی گئی حالاں کہ اس پر حق وہی جتا سکتا ہے جو اس کی مرضی کے تابع رہا ہو۔ اسی لیے یہ کہا گیا

ــتختِ فغفور بھی اُن کا تھا‘ سریرِ کَے بھی

یوں ہی باتیں ہینکہ تم میں وہ حمیّت ہے بھی؟

)علامہ محمداقبال)(۸۱(

اس کے علاوہ ’’مسجدِ قرطبہ‘‘ ، ’’لینن خدا کے حضور میں‘‘ ، ’’خضرِ راہ‘‘جیسی نظموں میں بھی اللہ تعالیٰ سے مختلف طرح کے سوالات کرتے نظر آتے ہیں۔ نظم ’’بزمِ انسان اور قدرت‘‘ میں بھی اقبالؔ کا سوالیہ آہنگ واضح ہے جہاں وہ اپنی تقدیر کے حوالے سے خورشید سے دریافت کرتے ہیں کہ

میں بھی آباد ہوں اس نور کی بستی میں مگر

جل گیا پھر میری تقدیر کا اختر کیوں کر؟
نور سے دور ہوں‘ ظلمت میں گرفتار ہوں میں

کیوں سیہ روز‘ سیہ بخت‘ سیہ کار ہوں میں؟
)علامہ محمداقبال)(۸۲(

اسی طرح اقبالؔ کی دیگر نظموں میں بھی مختلف النوع اور متنوع الجہات سوالات اٹھائے گئے ہیں۔ اقبالؔ کی نظموں کا یہی استفہامیہ انداز جہاں ان کی شاعری کو ایک منفرد انداز عطا کرتا ہے وہیں ان سوالوں کو بھی بہ نظرِ غائر دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ان سوالات میں فکرِ اقبال کی پرواز پوشیدہ ہے۔ نیز ان سوالات کی نوعیت اقبال ؔکی امتِ مسلمہ سے قلبی وابستگی کو بھی ظاہر کرتی ہے اور قاری کو دعوتِ فکر بھی دیتی ہے کہ وہ کائنات اور اس کے مظاہر پر غور کو اپنی زندگی کا حصہ بنائے۔ یوں اقبالؔ کی شاعری کا یہ انداز اردو نظم کی فکری توسیع کے حوالے سے ایک نیا اور منفرد رجحان معلوم ہوتی ہے جس سے اردو نظم میں تفکرِ کائنات کے سوتے پھوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔اور اقبالؔ نے آزادؔ‘ حالیؔ‘ شبلیؔ اور اسمٰعیلؔ کی رکھی بنیادوں پر نہایت حسین و جمیل اور پرشکوہ محل تعمیر کیے۔اقبال کی بصیرت پر بات کرتے ہوئے پروفیسر ضیاالدین احمد کا خیال ہے کہ

’’چوں کہ اقبال کو ایک غیر معمولی اور نہایت نادر فہم و ذکا عطا ہوا تھا۔ اس لیے حقیقت کی تہ تک اس کی تخیل اور بصیرت کی رسائی ہوجاتی ہے۔ اسے عشق اور خدا شناس نظر کے اوصاف فطری طور پر حاصل ہیں۔ جنھیں ایک ایسی روحانی قوت کہا جاسکتا ہے جو ایمان‘ پاکیزگی‘ محبت اور شعور کے اثرات سے فروغ پاتی ہے۔‘‘(۸۳(

اس دور کے اکثر شعرا‘ متنوع مزاج کے حامل ہیں۔ وہ قومی نظمیں بھی لکھتے ہیں‘ غزل بھی کہتے ہیناور رومانی نظمیں بھی الاپتے ہیں۔ جوشؔ‘ حفیظؔ‘ سیمابؔ‘ سب اسی قبیل کے شاعر ہیں۔ سیمابؔ کی نظمیں ’’خدا کی رات‘‘ اور ’’انجمن میں لگے آگ‘‘ اور جوشؔ کی نظم’’ انسانونکا خدا‘‘ جذبات کی شدت اور جدید اندازِ بیاں لیے ہوئے ہیں۔ جوش موضوع کی پروا کیے بغیر اکثر جذباتی ہوکر لکھتے ہیں اور جوش کے اسلوبِ نظم کا ایک زاویہ احساسِ حُسن کی صورت میں بھی سامنے آتا ہے اور جمالِ فطرت کی گوناگوں نیرنگیوناور بوقلموں رعنائیوں کوخارجی سطح پر نمایاں کرتا ہے۔(۸۴)بعد میں آنے والے کچھ شعرا نے نظم کو بہت طویل کرنا چاہا‘ مگر شعرا کی نظم کو طول دینے کی خواہش اردو نظم کے لیے مُضر ثابت ہوئی۔ اختر شیرانی کی نظم ’’بستی کی لڑکیو ‘ میں بدنام ہورہا ہوں‘‘ اس کی ایک قبیح مثال پیش کرتی ہے۔ اس کے بعد دو‘ تین بند رومانیت کی اچھی مثال پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد جب شاعر نے نظم کو بے جا طول دینے کی کوشش کی تو نظم کا لطف اور حُسن ضایع ہوگیا۔ ’’اے عشق کہیں لے چل‘‘ اور ’’جوگن‘‘ بھی ایسی طویل نظمیں ہیں۔

ان متنوع قسم کی تبدیلیوں کی بہ دولت ہماری شاعری نئی جہات سے آشنا ہوئی تاہم ارکان کو توڑنے کا معاملہ ذرا دیر سے شروع ہوا۔اقبال بند توڑنے والے شعرا میں اہمیت کے حامل ہیں۔ ۱۹۲۷ء میں تصدق حسین خالد نے پہلی آزاد نظم لکھی بعد ازاں نذر محمد راشد نے اس راستے کو اپنایا۔اردو نظم کے حوالے سے انجمن ترقی پسند مصنفین اور حلقۂ اربابِ ذوق

کا قیام اہمیت کے حامل واقعات ہیں۔ان میں سے ترقی پسند شعرا اشراکیت کی ترجمانی کرتے رہے جب کہ حلقۂِ اربابِ ذوق سرمایہ دارانہ ترجمانِ فکر کا نمائندہ ہے۔ تاہم یہ دونوں گروہ جاگیرداری کے شدید مخالف تھے۔ یہاںیہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سرمایہ دارانہ اور اشتراکی دونوں یورپی فکر کے ترجمان ہیںنیزحلقۂِ اربابِ ذوق کے شعرا کے ہاں فرائڈ‘ کانٹ‘ ڈارون‘ نطشے اور نیوٹن کے افکار کی گونج سنائی دیتی ہے۔جہاں تک اردو نظم نگاری کا تعلق ہے تو مختلف حوالوں سے اسے مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

پاکستانی اردو نظم نگاری کو عمومی طور پر دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

الف۔ حلقہ اربابِ ذوق ‘ جس کے نمائندہ شعرا میں حفیظ جالندھری‘ احسان دانش اور مجید امجد کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

ب۔ ترقی پسند شعرا‘ جس میں علی سردار جعفری‘ فیض احمد فیض اور ساحر لدھیانوی کے نام اہم ہیں۔

فکری سطح پر یہ زمرہ بندی درج ذیل دو گروہوں میں کی جا سکتی ہے:

الف: ترقی پسند شعرا: ان کا فکر خارجیت کا حامل اور اجتماعیت کا علم بردار ہے

ب: غیر ترقی پسند شعرا: ان کا فکر داخلیت کا حامل اور انفرادیت کا علم بردار ہے

انھی ایّام میں دو اور اندازِ شاعری کافی مقبول ہوئے۔ ایک طرف اخترؔ شیرانی کی رومانی نظمیں اور غزلیں تو دوسری طرف احسان دانش کی مزدور شاعری۔ فنّی اعتبار سے اختر اور احسان دونوں کا مرتبہ اتنا بلند نہیں‘ تاہم موضوعاتی اعتبار سے انھوں نے اردو نظم کو وسعت ضرور دی۔ اختر کی رومانیت ایک ہلکی قسم کی لذتیت سے آگے نہ بڑھ سکی اور احسان کی مزدور شاعری کسی بنیادی مسئلے یا کسی گہرے داخلی تجربے پر مبنی نہ تھی۔ البتہ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ تجربے شعر کو بعض نئی وسعتوں کی طرف لے گئے۔ نئی نظم کے باغیوں نے حسن و عشق سے آزادی حاصل کی۔ یہ دراصل اشارہ تھا کہ داخلیت پھر سے اردو شاعری میں پنپ رہی ہے۔محبوب کے لیے صیغۂِ تانیث کے استعمال نے اختر کے ہاتھوں فروغ پایا۔ اگرچہ اس سے پہلے عظمت اللہ خان اور شوق کے ہاں یہ چیز موجود تھی‘ لیکن جس بے باکی اور کثرت سے اختر نے اس چیز کو روارکھا‘ اور صرف یہی نہیں بل کہ نام لے کر مخاطب کرنے کا جو انداز اپنایا‘ اُس نے نوجوانوں کے اذہان پر گہرے اثرات چھوڑے۔

نظمِ آزاد کے ایک اور اہم ستون میرا جیؔ (۱۹۴۹ء۔۱۹۱۲ء) ہیں۔ میراجیؔ جہاں اپنی ذاتی حیثیت میں منفرد وعجیب تھے وہیں اردو نظم میں بھی انھوں نے ایک منفرد روّیے کی بہ دولت علاحدہ مقام پایا۔ اپنے اس روّیے کی بہ دولت انھیں نفسیاتی الجھنوں کا بیانیہ شاعر بھی کہا جاتا ہے۔ آج قاری کے لیے میراجیؔ کا جنسی تلذذ شاید اس قدر اچنبھے کی بات نہ ہو‘ مگر میرا جیؔ کے اپنے عہد میں یہ امر باعثِ حیرت تھا۔ اپنی نفسیاتی الجھنوں کے بیانیے کی وجہ سے میرا جیؔ کی شاعری بھی گنجلک روّیوں سے دو چار رہی اور ابہام کا شکار رہی۔ ان کے یہ روّیے ان کے نزدیک ایسے نہ تھے کہ انھیں چھپایا جاتا اسی لیے وہ علی الاعلان ان پر قائم رہے۔ ان کے اسی عجیب انداز کی بہ دولت ڈاکٹر حنیف کیفی کا خیال ہے کہ

’’میرا جیؔ اخلاقی اقدار کے حوالے سے اس حد تک متصادم تھے کہ انھیں بڑی آسانی کے ساتھ بے ہودگی اور کمینگی کا نام دیا جا سکتا ہے۔‘‘(۸۵(

اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا جیؔ نے جن موضوعات پر اظہارِ خیال کیا وہ بہت حد تک ناشائستہ تھے۔ چوں کہ میراجیؔ جنس کے حوالے سے خود اپنی ذات میں فاعل بھی تھے اور مفعول بھی اس لیے ان کی نظموں کا تانا بانا بھی ان کے اپنے ہی ذہنی روّیوں کے گرد گھومتا ہے ‘ جس میں موجود علامات و اشارات کا ایک مستقل نظام ہے اور اس نظام کو سمجھنے کے لیے ہمیں میرا جیؔ کے اندازِ زندگی بالخصوص ان کے جنسی فعل اور اس کے متعلقات کو بھی سامنے رکھنا پڑتا ہے کیوں کہ انھی کے بیانیے نے ان کی شاعری کو ابہام کا شکار کرتے ہوئے ابلاغ کی مشکل سے دوچار کیا ہے۔ اسی کی وضاحت ’’میرا جی کی نظمیں‘‘ کے دیباچہ میں وہ خود ان الفاظ میں کرتے ہیں:

’’میری نظر میں یہ نظمیں اپنی ہستی کا عریاں اظہار ہیں۔‘‘

گویا بلاشبہ میرا جیؔ کا شمار شعرا کی اس فہرست میں کیا جا سکتا ہے جو باغی کہلاتے ہیں لیکن ان میں بھی میراجیؔ کو یہ تفوق حاصل ہے کہ ان کا اوڑھنا بچھونا ہی اس بغاوت پر منحصر ہے۔ میرا جیؔ کا اپنی ذات کے حوالے سے یہ روّیہ تہذیبی و ثقافتی پابندیوں کے خلاف ایک نفسیاتی ردِّ عمل تھا جس کا ابلاغ ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ ان کی ذات کا یہ گنجلک پن ان کی نظموں ’’حرامی‘‘ ،’’دوسری عورت‘‘ ، ’’چل چلائو‘‘ ، ’’دور کنارا‘‘ ، ’’ایک نظم‘‘ ، ’’عدم کا خلا‘‘ ، ’’دورونزدیک‘‘ ، ’’جزوکل‘‘ وغیرہ میں واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ نظم ’’حرامی‘‘ میں ناجائز جنسی تعلقات کو ہی زندگی کا حاصل گردانا گیا ہے۔

قدرت کے پرانے بھیدوں میں جو بھید چھپائے چھپ نہ سکے
اس بھید کی تو رکھوالی کر
اپنے جیون کے سہارے کو اس جگ میں اپنا کر نہ سکی
یہ کم ہے کوئی دن آئے گا‘ وہ نقش بنانے والی ہے
جو پہلے پھول ہے کیاری کا
پھر پھلواری ہے مالی کی
غیروں کے بنائے بن نہ سکے
اپنوں کے مٹائے مٹ نہ سکے
جو بھید چھپائے چھپ نہ سکے
اس بھید کی تو رکھوالی ہے (میرا جی: حرامی)

یہی روّیہ نظم ’’دوسری عورت‘‘ میں بھی نظر آتا ہے ‘ جس میں میراجیؔ طوائف کے پاس جانے کو بھی قطعاً معیوب نہیں سمجھتے اور اس تعلق کا بھی کھل کر اظہار کرنا چاہتے ہیں۔نظم ’’یگانگت‘‘ بھی نفسیاتی حوالے سے غور طلب ہے کہ جس میں انھیں بجا طور پر یہ احساس ہوتا ہے کہ ’’برائی‘‘ زمانے میں نہیں ان کی اپنی ذات میں ہے۔ یہ نظم میراجیؔ کی ذات‘ برائی‘ بھلائی‘ تصورِ خیروشر اور تصورِ وقت کا ایک نفسیاتی اظہاریہ ہے۔ ان کی دیگر نظموں میں ’’لبِ جوئے بار‘‘ ۔’’اونچا مکان‘‘ اور’’ اغوا‘‘ بھی ان کی ذات کے اسی پہلو کو اجاگر کرتی ہیں۔ میرا جی کی شاعری اور شخصیت میں ربط کی تلاش میں ڈاکٹر جمیل جالبی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ

’’میرا جیؔ کے ہاں ابہام کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ان نفسی الجھنوں اور ذہنی کیفیات کو اپنی گرفت میں لانے کی کوشش کرتے ہیں جو ہمارے لاشعور میں سو رہی ہیں۔ ایسی نفسی

الجھنیں اور کیفیات جن کی کوئی شکل اور نام نہ ہو ' لفظوں کے ذریعے پیش کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔''(۸۶(

میراجیؔ کے ہاں موجود یہ ابہام ان کی شاعری کو گنجلک بنانے کے علاوہ اُن کے درونِ ذات کو جاننے کے راستے میں بھی بڑی رکاوٹ بنتا ہے۔ بہ ظاہر میراجیؔ کا نام سامنے آتے ہی ایک مست آدمی کا خاکہ ذہن میں ابھرتا ہے جو اپنی ذات اور اس کی گہرائیوں میں یوں مگن ہے کہ اسے یہ دنیا اور اس کے قوانین سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ آج تک میرا جیؔ کو جب بھی سمجھنے کی کوشش کی گئی ' جنس کا حوالہ ان کی تشریح کا واضح اشارہ بن کر ابھرا۔ لیکن یہ بات سامنے رہنی چاہیے کہ میرا جیؔ کے یہاں موجود یہ تمام عناصر علامات کا درجہ رکھتے ہیں۔ بہ قول ناصر ؔکاظمی:

)''میرا جی ؔکے یہاں) عورت علامتوں اور اشاروں میں ملبوس ہو کر آتی ہے۔''(۸۷(

میرا جیؔ کی نظمیں جس نفسیاتی الجھن کو پیش کرتی ہیں وہ الجھن کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ البتہ یہ بجا ہے کہ میراجیؔ نے اس نفسیاتی خلفشار کو علی الاعلان تسلیم کیا۔ ان کی شاعری میناس تلخ حقیقت کو جس طرح قبول کیا گیا' جس بے فکری و بے نیازی سے اپنایا گیا' وہ یقینا قارئین کے لیے اصل حیرت کی بات تھی۔ ورنہ حقیقی تناظر میں میراجیؔ کی شاعری پر غور کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ واحد انسان ہینجن کے ذریعے:

''انسان کا ایک ایسا عکس ظاہر ہوتا ہے جو زمینی آلائشوں کا پیدا کیا ہوا عکس ہے۔''(۸۸(

اسی لیے میرا جی اور ان کی شاعری کو سمجھنا نسبتاً ذرا مشکل ہوجاتا ہے۔ لیکن اسے سمجھنے کے لیے ڈاکٹر رشید امجد ایک آسان کلیہ بتاتے ہیں:

''میراجی کی نظموں کو سمجھنے کے لیے ان کی ذات کی خارجی زشت روئی اور داخلی خوب روئی کو سمجھنا ضروری ہے لیکن میراجی کی ذات پر داستان طرازی کی اتنی گہری چھاپ لگ چکی ہے کہ حقائق کی تلاش بہت مشکل ہے۔''(۸۹(

ہر فرد دو سطحوں پر زندگی گزارتا ہے۔ ایک اس کی انفرادی زندگی ہوتی ہے اور دوسری اجتماعی۔ فرد معاشرے کے ساتھ اپنے ربط کو قائم رکھنے کے لیے اپنے ظاہر کو اپنے باطن پر ترجیح دیتا ہے اور بہت سے ایسے عوامل جو اس کے لیے ایک بنیادی لوازمہ کی حیثیت رکھتے ہیں' اُن سے انحراف صرف اور صرف معاشرتی اقدار کی وجہ سے کرتا ہے ورنہ درونِ ذات کی خواہشات اور اس کا نفسیاتی ہیجان اس سے کسی اور ہی چیز کا متقاضی ہوتا ہے۔ تاہم میرا جیؔ اس انسانی روّیے سے باغی ہیں' یہ بغاوت ہی ان کی انفرادیت ہے ۔یہ میرا جی کا جنسی خلل ہی ہے جو شاعری میں ابہام کو جنم دیتا ہے اور ان کی شاعری کو ابلاغ کے مسائل سے دوچار کرتا ہے اور

''جنس کے بارے میں یہ بات واضح رہے کہ جنس ابہام کے پردے میں چھپ کر ہی جمالیاتی سطح کو چھو سکتی ہے۔''(۹۰(

ان کی نظم ''پاس کی دوری'' میں ان کا یہی انداز دکھائی دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو

پھر پرانا وہی افسانہ' وہی سیب کی انجیر کی بات
لرزشِ قلب سے رفتار کی تیزی لپٹی
تیز طوفان سے ملنے چلی کون کی گردش
جیسے کاجل کی گھٹا ساون کی

وحشیانہ سی امنگیں لائے
جسم کے ساز میں سب تار کھنچے اور پھیلے
نغمہ بیدار ہوا)میراجی)(۹۱(

جنسی حوالے سے میرا جی جس پاتال میں تھے ‘ نظم ’’دکھ دل کا دارو‘‘ اس کی بجا عکاسی کرتی ہے کہ یہ نظم سادیت کی آئینہ دار ہے۔ نظم کے مضمون کو گھٹیا درجے کا قرار دیا جا سکتا ہے مگر جھوٹ نہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ میراجیؔ کی شاعری ان کی ذات میں پڑنے والی گرہوں کا اظہاروبیانیہ تھی کہ میرا جیؔ جو نہ بھی کرسکے وہ تصورات بھی انھوں نے نظم کے حوالے کر دیے۔

میراجیؔ کو ڈاکٹر وزیر آغا ان کی ہندی لے اور لفظیات کی وجہ سے دھرتی پوجا کی ایک مثال قرار دیتے ہیں۔ ان کے ہاں ہندی لفظیات اور ہندی دیومالائی عناصر کا پرتو واضح انداز میں جھلکارے مارتا دکھائی دیتا ہے۔ فکری توسیع کے علاہ میراجیؔ کا ذکر اردو نظم کی فنی توسیع میں بھی ایک معتبر حوالے کا درجہ رکھتا ہے کیوں کہ میرا جیؔ نے آزاد نظم کے فروغ کے لیے راشدؔ کے شانہ بشانہ کام کیا۔ انھوں نے آزاد نظم کو فنی حوالوں سے مختلف تجربات سے مزین کیا۔ اسی بات کی تصدیق کرتے ہوئے ڈاکٹر شوکت سبزواری رقم طراز ہیں :

’’سب سے پہلے راشدؔ نے اردو میں آزاد نظم میں تجربے کیے۔ اس میں ان کے رفیق کار‘ میراجیؔ‘ ان کے شریکِ کار تھے۔‘‘(۹۲(

نذر محمد راشدؔ (۱۹۷۵ء ۔ ۱۹۱۰ء) نے جس طرح نظم کو ہئیتی اور موضوعاتی حوالے سے جلا بخشی‘ وہ ان کا ہی امتیاز تھی۔ راشدؔ اپنے فارسی زدہ اسلوب کی وجہ سے اگرچہ طبقۂ خاص تک ہی محدود رہے مگر جب ناقدین نے فکرِ راشدؔ کی گتھیاں سلجھائیں تو لوگ متوجہ ہوئے بنا نہ رہ سکے۔ راشدؔ جو پہلے محض ’’اے میری ہم رقص مجھ کو تھام لے‘‘ کی تفسیر نظر آتا تھا وہ دراصل ’’زندگی سے بھاگ کر‘‘ آنے والے ایک فرد کا احساسِ فرار تھا‘ جو بعد میں اپنی فکرِ رسا کو کبھی خدا کے وجود سے انکار کرکے بہلاتا ہے تو کبھی جنسی و سام راجی نظام کی گھٹن زدہ فصیلوں کو توڑ کر۔

جنسی و سام راجی نظام کی گھٹن راشدؔ کے یہاں بہت واضح انداز میں اپنا اظہار کرتی ہے اور سام راجی نظام کو راشدؔ اپنی سیاسی بصیرت سے واضح کرتے نظر آتے ہیں۔ راشدؔ کی شاعری میں ہمیں اس عہد کی سیاسی بصیرت کا واضح اظہار دکھائی دیتا ہے ‘ جس کا اس وقت برِ صغیر کے لوگوں کا سامنا تھا۔ اسی مطابقت پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر فخرالحق نوری کہتے ہیں:

’’اس (راشدؔ کے سیاسی شعور) کا بنیادی محرک تو متحدہ ہندوستان کے داخلی اور اس پر اثر انداز ہونے والے بیرونی دنیا کے سیاسی حالات تھے تاہم اس زمانے میں راشدؔ کی خاکسار تحریک کے ساتھ گہری وابستگی نے بھی سوچ کے رُخ میں تبدیلی پیدا کی۔‘‘(۹۳(

اسی حقیقت کی طرف راشدؔ نے آغا عبدالحمید کے نام ایک خط مکتوبہ ۱۳۔فروری‘ ۱۹۳۸ء میں بھی کیا ہے۔(۹۴) اگرچہ راشدؔ جلد ہی خاکسار تحریک سے کنارہ کش ہوگئے تھے بہ ہر حال ان کے یہاں بیان کیا گیا سیاسی شعور اور بصیرت کسی حد تک اس تحریک کی دین قرار دیے جا سکتے ہیں‘ جو ان کے پہلے مجموعے ’’ماورا‘‘ کی آخری چند نظموں میں نظر آنے لگتے ہیں اور اس بصیرت کا نقطۂ عروج ’’ایران میں اجنبی‘‘ میں واضح طور پر اظہار

پاتا محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مذکورہ بالا مجموعے میں ان کی نظموں کا پس منظر بھی جنگِ عظیم دوم تھی۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ دوسری جنگِ عظیم نے ہندوستان کے ساتھ ساتھ ایشیا کے دیگر ممالک کو بھی سیاسی بیداری سے آشنا کیا تھا۔ ان حالات نے بھی راشدؔ کی سیاسی بصیرت کو ان کی نظموں میں راہ دی۔ اس حوالے سے ’’اسی سومنات‘‘ ،’’پہلی کرن‘‘ ، ’’نمرود کی خدائی‘‘ ، ’’آواز‘‘ ، ’’حرف ناگفتہ‘‘ ، ’’ایران میں اجنبی‘‘ ، ’’ زنجیر‘‘ وغیرہ جیسی بہت سی دیگر نظموں میں یہ سیاسی شعور واضح صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ مثلاً ان کی نظم کا یہ ٹکڑا دیکھیے:

زمینِ مشرق کے اِک کنارے سے دوسرے تک
مرے وطن سے ترے وطن تک
بس ایک ہی عنکبوت کا جال ہے کہ جس میں
ہم ایشیائی اسیر ہو کر تڑپ رہے ہیں (ن۔م۔راشد:ایران میں اجنبی)(۹۵(

اگر غور کیا جائے تو راشد کا یہ سیاسی شعور انھیں جس بغاوت یا انتقام کی طرف لے جاتا ہوا محسوس ہوتا ہے وہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں وہ زندگی سے تھک کر کبھی کسی رقص گاہ میں جا نکلتے ہیں تو کبھی کسی فرنگی عورت کی قربت کی صورت میں لیتے نظر آتے ہیں:

اے میرے ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں
ڈار سے لرزاں ہوں کہ‘ کہیں ایسا نہ ہو
رقص گہ کے چور دروازے سے آکر زندگی
ڈھونڈ لے مجھ کو نشاں پا لے میرا
اورجُرمِ عیش کرتے دیکھ لے (ن۔م۔راشد)(۹۶(

اس نظم میں استعمال شدہ ترکیب ’’جرمِ عیش‘‘ بھی گہری معنوی تفہیم رکھتی ہے۔ اسی طرح ان کے جذبہ انتقام پر بھی ذرا غور کیجیے:

اس کا چہرہ اس کے خدوخال یاد آتے نہیں
اک برہنہ جسم اب تک یاد ہے
اجنبی عورت کا جسم
میرے ہونٹوں نے لیا تھا رات بھر
جس سے اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام (ن۔م۔راشد)(۹۷(

نظم بہ عنوان ’’زنجیر‘‘ میں یہ انتقام مزید واضح انداز یں اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ میراجیؔ ‘ راشدؔ کی اس نظم کو سیاسی حوالے سے پہلی خالص نظم قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

’’راشدؔ کی نظم میں ایک ایسے ملک کا نقشا نہایت نفیس کنایوں اور استعاروں سے بیان کیا گیا ہے جو سالہا سال سے غلامی کی بے بسی اور مشقت میں زندگی بسر کر رہا ہو۔‘‘(۹۸(

اور پھر راشدؔ کا یہی سیاسی شعور انھیں ’’خدا کے جنازے‘‘ تک لے جاتا ہے۔ یہاں راشدؔ کے فکر میں نطشے کا سا انداز جھلکتاہوا محسوس ہوتا ہے ۔

’’نطشے نے کہا تھا کہ خدا مرچکا ہے اور راشدؔ نے کہا خدا کا جنازہ لیے جارہے ہی فرشتے عدم آباد کی طرف۔‘‘(۹۹(

دراصل یہ بھی ان کی سیاسی بصیرت کا ایک پہلو ہے جس میں وہ صرف مشرق کے خدا کو ہدفِ تنقید بناتے نظر آتے ہیں۔ اسی بات کی وضاحت کرتے ہوئے وہ نظم ''شاعر درماندہ'' میں لکھتے ہیں:

تجھے معلوم ہے مشرق کا خدا کوئی نہیں
اور اگر ہے تو سرِپردہ نسیاں میں ہے (ن۔م۔راشد)(۱۰۰)

ایسا اس لیے ہے کہ راشدؔ کے نزدیک زندگی محض ''افرنگ کی دریوزہ گری'' بن کر رہ چکی تھی کہ راشدؔ کا فرد اجنبی عوت کے جسم سے تو لپٹ سکتا تھا مگر زندگی پر جھپٹنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ راشدؔ کے یہاں یہ بغاوت دراصل خدا کے مروّجہ تصور سے ایک بغاوت تھی' جس کے حوالے سے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

''یہ نہیں کہ راشدؔ خدا کے وجود سے منکر ہیں۔ انھوں نے اپنی بہت سی نظموں میں مغرب کے خدا کے وجود کو تسلیم اور مشرق کے خدا کے وجود سے انکار کرکے دراصل خدا کی ناانصافی کو نشانہ طنز بنایا ہے۔''(۱۰۱)

اسی لیے وہ نظم ''اتفاقات'' میں کہتے ہیں:

شبنمی گھاس پہ دو پیکر یخ بستہ ملیں
اور خدا ہو تو پشیماں ہوجائے (ن۔م۔راشد)(۱۰۲)

نظم ''دریچے کے قریب'' میں انھیں خدا ایک بے کارِ محض کی صورت دکھائی دیتا ہے اور وہ کہتے ہیں:

اسی مینار کو دیکھ
صبح کے نور سے شاداب سہی
اپنے بے کار خدا کی مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا ملائے حزیں (ن۔م۔راشد)(۱۰۳)

راشدؔ کا خدا کے بارے میں یہ روّیہ ایک عمومی روّیہ ہے جو لمحہ بہ لمحہ ارتقا پذیر ہے اور آخر کار نظم ''پہلی کرن'' میں یہ رویہ اپنی انتہا پر معلوم ہوتا ہے۔

خدا کا جنازہ لیے جارہے ہیں فرشتے
اسی ساحر بے نشاں کا
جو مغرب کا آقا ہے مشرق کا آقا نہیں (ن۔م۔راشد)(۱۰۴)

راشدؔ کے اس رویے اور باغی پن کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر فخرالحق نوری راشدؔ کے تصورِ خدا کو اس کے عہد کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو ان کے نزدیک راشدؔ کی اس بغاوت میں:

''مارکس' اینگلزاور نطشے جیسے فلسفیوں کے افکار کی مذہب کے بارے میں پیدا کردہ تشکیک کا پرتو پایا جاتا ہے۔۔۔ راشدؔ کا تو عہد ہی کچھ ایسا مذہب دشمن فلسفوں اور طبیعاتی سائنس کے مادی نظریوں کی ایک یلغار تھی جو اس دور کی نئی نسل کے ذہنوں کو متاثر کررہی تھی۔''(۱۰۵)

راشدؔ کے یہاں خدا کی ذات کے حوالے سے مزاج کی یہ شدت اس لیے پائی جاتی ہے کہ انھیں برِ صغیر کے حالات اور امتِ مسلمہ کے ابتر حالات پر دُکھ تھا' رنج تھا اور ان کا یہ رنج ہی ہے جو ان کی شاعری میں اس طرح کے رویوں کو راہ دیتا نظر آتا ہے۔ پھر جو آزادی

حاصل ہوئی وہ بھی ’’داغ داغ اجالا‘‘ تھی۔ ایسے میں راشدؔ کے فکر کی تفہیم کے لیے عمومی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ راشد کے فکر کو برِ صغیر کے سیاسی و سماجی حالات کے تناظر میں دیکھتے ہوئے ڈاکٹر فتح محمد ملک اپنے مضمون ’’راشدؔ اور ہمارا قومی مستقبل‘‘ میں بجا طور پر لکھتے ہیں:

’’راشدؔ کے نزدیک پاکستان کا تصور نوعِ انساں کی کہکشاں سے بلندوبرتر طلب سے عبارت ہے مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ طلوعِ آزادی کے بعد چند برسوں کے اندراندر ہماری قیادت ‘ تصور سے روگردانی اور نظریات سے انحراف کی راہوں پر سرپٹ دوڑنے لگی۔‘‘(۱۰۶)

کچھ ناقدین کا خیال ہے کہ اقبالؔ کے بعد راشدؔ ‘ اردو ادب میں ایک ایسی ہستی کے طور پر سامنے آتے ہیں جن کا دل ملت کے احساس میں دھڑکتا ہے۔ نظم کے باب میں راشدؔ نے فنی حوالے سے بھی نظم کی توسیع کی اور فکری حوالے سے بھی۔ آزاد نظم کو رائج کرنے میں راشدؔ کی خدمات قابلِ ستایش ہیں۔ نظم کو جس طرح انھوں نے اپنایا اور اس میں مختلف ہئیتی تجربات کرنے علاوہ انھوں کے کئی مقامات پر نظم کا دفاع بھی کیا۔ ڈاکٹر حنیف کیفی کی رائے ہے کہ

’’راشدؔ نے آزاد نظم کو کم سنی کے دور میں ہی جوانی کی اٹھان سے ہم کنار کر دیا۔‘‘(۱۰۷)

یہ کہنا درست ہے کہ اس حوالے سے راشدؔ کوئی پہلے فرد نہیں تھے۔ راشدؔ سے پہلے تصدق حسین خالد آزاد نظم تحریر کرچکے تھے مگر شہرت راشدؔ کے حصے میں آئی، انھوں نے آزاد نظم کو اس دور میں سلیقے سے نبھایا جب لوگ اسے تسلیم کرنے سے گریزاں تھے۔ وہ راشدؔ ہی تھے جن کی نظموں نے لوگوں کے فکر کو آزاد نظم کی طرف نہ صرف متوجہ کیا بل کہ راشدؔ کو سراہا بھی۔

کائنات اور مظاہر فطرت کے حوالے سے تفکر آمیز خیالات کو منظوم کرنے میں اقبالؔ کے بعد مجیدامجد (۱۹۷۴ء۔۱۹۱۴ء) کا نام قابلِ ذکر ہے۔ ان کے یہاں وقت کا ایک منفرد تصور ملتا ہے اور ان کی شاعری کا زیادہ تر حصّہ اسی منفرد تصور کا اظہار ہے۔ وقت میں بھی لمحہ حال مجید امجد کا محبوب لمحہ ہے جو ماضی اور مستقبل کا سنگم ہے۔ وقت کو وہ اس قدر اہمیت دیتے ہیں کہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا خیال ہے کہ

’’اس کے یہاں خدا کا متبادل وقت ہے۔‘‘(۱۰۸)

مجید امجد نظم ’’امروز‘‘ میں لکھتے ہیں:

مگر آہ یہ لمحہ مختصر
جو مری زندگی میرا زادِ سفر ہے
مرے ساتھ ہے‘ میرے بس میں ہے‘ میری ہتھیلی پر ہے یہ لبالب پیالہ
یہی کچھ ہے لے دے کے میرے لیے ‘ اس خراباتِ شام و سحر میں یہی کچھ
یہ اک مہلت کاوشِ دردِ ہستی! یہ اک فرصت کوششِ آہ و نالہ! (مجید امجد)(۱۰۹)

مجید امجد کے خیال میں کائنات کا یہ گھومتا ہوا چکر محض وقت کے دم سے رواں دواں ہے۔ وقت ہی ایک ازلی و ابدی قوت کا سرچشمہ ہے مگر اس وقت کو کون ماضی‘ حال اور مستقبل کے سانچوں میں انڈیل رہا ہے؟ خود مجید امجد بھی اس حقیقت سے بے خبر ہیں۔ وہ استفسار کرتے ہیں:

عدم سے ازل تک‘ ازل سے ابد تک‘ بدلتی نہیں ایک آن اس کی گردش
نہ جانے لیے اپنے دولاب کی آستینوں میں کتنے جہاں اس کی گردش
رواں ہے رواں ہے
تپاں ہے تپاں ہے
یہ چکر‘ یوں ہی جاوداں چل رہا ہے
کنواں چل رہا ہے (مجید امجد)(۱۱۰)

لیکن اس کنویں کو‘ اس کے چکر کو چلانے والا کون ہے؟ یہ عقدہ مجید امجد سے حل نہیں ہوپارہا۔ وہ حیرت سے یہی سوال کرتے ہیں کہ وقت کا یہ نظام اس قدر مستقل ہے کہ اس کے چلانے والے کی کبھی سمجھ نہیں آتی۔ نظم ''نہ کوئی سلطنتِ غم ہے نہ اقلیمِ طرب'' میں وہ اپنی اسی الجھن کو پیش کرتے ہیں۔

عقل حیراں ہے‘ یہ طرفہ حجابات حریم اسرار
عقدہ راحت و غم‘ رازِ جہانِ گل و خار
پابہ زنجیر ارادوں کا خروش پیہم
یہی مستقل معمورۂ انسانی ہے؟
کس کی فتراک میں ہیں عرشِ بریں‘ فرشِ زمیں؟ کون کہے
پس صدپردہ افلاک کوئی ہے کہ نہیں؟ کون کہے
جانے کتنے گہرے دھندلکوں سے ضیا پاتی ہے
درحقیقت یہ حقیقت کی جو تابانی ہے (مجید امجد)(۱۱۱)

وقت کا یہ تصور مجید امجد کے لیے حیرتوں کے نئے سے نئے در وا کرتا چلا جاتا ہے اور پھر وہ یہی خیال کرتے ہیں کہ وقت ایک وسیع و عریض کائناتی پہلو ہے اور ان کے فکر کی پرواز اور عقل کی حد خاصی محدود ہے۔ وقت کے حوالے سے ان کی سوچ کے مختلف پہلو‘ اُن کی نظم ''وقت''میں ‘ جو کہ RICHARD ALDINGTON کی ایک نظم کا ترجمہ ہے ‘ یوں ظاہر ہوتے ہیں:

وقت ہے اک حریمِ بے دیوار
جس کے دوار آنگنوں میں‘ سدا
رقص کرتے ہوئے گزرتے ہیں
دائروں میں ہزارہا ادوار

لاکھ قرنوں کے ان قرینوں میں
نہ کوئی دن‘ نہ سن‘ نہ یوم ‘ نہ عصر
صرف اک پل‘ بسیط‘ بے مدت
اپنے بھیدوں کی حد میں لامحدود

اتنے پہلو ہیں اس پہیلی کے
اور اک ہم کہ جن کے علم کی لِم
ہے فقط انگلیوں کا لمس اور بس
ہائے اندھی روایتوں کے طلسم (مجید امجد)(۱۱۲)

مجید امجد کا کائناتی تفکر محض وقت تک ہی محدود نہیں رہتا بل کہ وہ دیگر مظاہر کائنات کے حوالے سے بھی اپنے خیالات کا منظوم اظہار کرتے ہیں۔ خاص طور پر سورج کے حوالے سے ان کے فکر کا خلاصہ یہی ہے کہ ہر ستارہ اپنی ذات میں سورج ہے اور ہر سورج تخلیق کے بہت سے مراحل سے دوچار رہا ہے۔ اور ان مراحل سے گزرنے کے بعد اس کی جسامت اور رنگت بھی تبدیلیوں کے عمل سے گزری ہے۔ وہ نظم ''مرے خدا' مرے دل'' میں لکھتے ہیں:

ترے ہی دائرے کا جزو ہیں وہ دور کہ جب
چٹانیں پگھلیں' ستارے جلے' زمانے ڈھلے
وہ گردشیں جنھیں اپنا کے ان گنت سورج
ترے سفر میں بجھے تو انھی اندھیروں سے
(مجید امجد)(۱۱۳)

اسی طرح وہ نظم ''سرسبز پیڑوں کے سائے'' میں لکھتے ہیں:

ع فضائوں میں صد ہا سفید و سیاہ آفتابوں کے بکھرے سے ریزے (مجید امجد)(۱۱۴)

جس طرح وہ ایک ہی سورج پر اکتفا نہیں کرتے اسی طرح وہ اس دنیا کے بارے میں بھی متجسس ہیں۔ وہ اس بھید بھری دنیا کے اسراروں سے آشنائی چاہتے ہیں۔ انھیں دنیا کی تخلیق' اس کے مقاصدِ تخلیق اور دنیا میں انسان کا مقام الجھائے ہوئے رکھتے ہیں۔ وہ متجسس انداز میں ان تمام پہلوئوں پر سوچتے ہیں اور کمال مہارت سے یہ تجسس اپنے قارئین کے سپرد کردیتے ہیں۔ نظم ''دنیا'' میں وہ لکھتے ہیں:

جہاں کی حقیقت کی کس کو خبر ہے؟
فریبِ نظر تھی' فریبِ نظر ہے

یہ ہستی کا دریا بہا جارہا ہے
ہم آہنگِ سیلِ فنا جارہا ہے
پھنسے کچھ انوکھے قرینوں میں ہیں ہم
حبابوں کے نازک سفینوں میں ہیں ہم
یہ کیا ہے؟ یہ کیوں ہے؟ خبر کیا خبرکیا
مرے تیرہ ادراک کی ہو سحر کیا؟
مری بزمِ دل میں نہیں روشنی کیوں؟
ہے بے صید میری نگہ کی انی کیوں؟
یہ دنیا ہے میری کہ مرقد ہے میرا؟
یہاں بھی اندھیرا' وہاں بھی اندھیرا (مجید امجد)(۱۱۵)

مجید امجد کا یہ کائناتی تفکر ' تفہیمِ کائنات کے لیے انھیں اس کے مختلف پہلوئوں پرسوچنے پر اکساتا ہےمجید امجد غالباً وہ پہلے شاعر ہیں جو سائنسی نقطۂ نظر سے کائناتی تفکر کو اپنی نظموں کا باقاعدہ ایک موضوع بناتے ہیں اور ان کا یہی تفکر انھیں غالبؔ کی طرح '' نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا'' کی طرح یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ اگر یہ آسمان ' زمین' دشت' دریا' کوہ و صحرا' مہروماہ' ازل و ابد اور موت و حیات کا وجود نہ ہوتا ' کسی

ذرّے اور اس کے خالق کا وجود نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟نظم ’’پھر کیا ہو؟‘‘ ان کے ایسے ہی فکر کو عیاں کرتی ہے۔

آسماں بھی نہ ہوزمیں بھی نہ ہو
دشت و دریا نہ ہو کوہ و صحرا نہ ہو
دن ہو بے نور‘ رات بے ظلمت
ماہ کافور‘ مہر عنقا ہو
بے نشاں بے کراں فضائوں میں
کوئی تارا نہ جھلملاتا ہو
نہ ازل ہو نہ ہو ابد کوئی
کوئی جلوہ نہ ہو کوئی پردا ‘نہ ہو
نہ کہیں بھی نشانِ ہستی ہو
نہ کہیں بھی گمانِ دنیا ہو
موت ناپید‘ زندگی معدوم
نہ حقیقت ہو اور نہ دھوکا ہو
کہیں نقشِ وجود تک نہ رہے
کہیں اک سانس تک نہ آتا ہو
یہ جہاں بھی نہ ہو‘ خدا بھی نہ ہو
کہیں اک ذرّہ تک نہ اڑتا ہو
سوچتا ہوں تو کانپ جاتا ہوں
یہاں کچھ بھی نہ ہو تو پھر کیا ہو؟)مجید امجد)(۱۱۶(

اسی طرح ان کی نظم ’’ نہ کوئی سلطنتِ غم ہے نہ اقلیمِ طرب‘‘ میں کرۂِ ارض کے ذیلی عنوان سے وہ اس کائنات کو اپنے انداز میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

نہ عکس خاک کہیں اور نہ رقصِ نور کہیں
نہ کوئی وادیِ ایمن نہ شمعِ طور کہیں
بچھی ہے راکھ میں غلطاں مئے طہور کہیں
پڑا ہے شیشہ افلاک چور چور کہیں
پلوں کے جھنڈ میں لرزے ابد کی پینگ کوئی)مجید امجد)(۱۱۷(

اس نظم کے حوالے سے ڈاکٹر سہیل احمد خان اپنے مضمون ’’مجید امجد کی نظم نگاری‘‘ میں لکھتے ہیں:

’’طویل نظم ’نہ کوئی سلطنتِ غم ہے نہ کوئی اقلیمِ طرب‘ میں عجموں کی شکن آلود بساط وقت کے گھومتے زینوں پر بچھتی ‘ لپٹتی ہوئی ایک طولانی کہانی کا آغاز بن جاتی ہے۔ جس میں داخل‘ خارج مل جاتے ہیں۔ غمِ افلاک سے ٹکرا کر بھسم ہوتے لاکھوں تارے لاکھوں دنیائوں کے لٹتے ہوئے کھلیان‘ حجاباتِ حریم‘ اسرار اور پھر سیاروں کے نغمے پوری کہانی کو کونیاتی رنگ دیتے ہیں۔‘‘(۱۱۸(

گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مجید امجد نے اردو شاعر میں سائنسی طرزِ فکر کو راہ دی ہے۔ یوں گمان ہوتا ہے کہ مجید امجد کو خالقِ کائنات سے یہ شکوہ ضرور رہا ہوگا کہ ان بے کراں وسعتوں کے باوجود یہ کائنات ابھی تک محدود ہے یا پھر یوں کہہ لیجیے کہ خالق

اور اس کی تخلیق کی ہوئی کائنات کے وہ تمام زاویے اور پہلو جو انسان کے احاطۂ شعور و ادراک میں سما سکتے ہیں وہ ضرور محدود ہیں۔ اس لیے فطرت‘ مظاہرِ فطرت اور زیست کے ان گنت زاویے اور پہلو مجید امجد کو مبہوت کرتے ہیں۔

فیض احمد فیضؔ (۱۹۸۴ء۔۱۹۱۱ء) بھی جدید اردو نظم کا ایک معتبر حوالہ ہیں۔ ان کی نظموں نے جس طرح رومان سے حقیقت تک کا موضوعاتی سفر مکمل کیا وہ فیض ہی کا امتیازی وصف ہے۔ ان کی شاعری میں اپنے دور کی عکاسی جس خوب صورت انداز سے ملتی ہے‘ ناقدینِ فن کے نزدیک وہ فیض کی صداقتِ طبع کا برملا اظہار ہے۔ فیض ؔ کی نظموں کا عوامی پھیلائو ایک طرح سے ان کی آپ بیتی بھی قرار دیا جاسکتا ہے کہ فیض صاحب کو حق گوئی کی پاداش میں کبھی جلا وطن ہونا پڑا تو کبھی اسیری کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے باوجود فیض کی حق گوئی اور بے باکی میں کوئی فرق محسوس نہ ہوگا۔

’’فیض کی پوری شاعری میں۔۔سب سے اہم نکتہ۔۔ ان کے اندر اپنا عہد جینے (To Love The Abc)کی امنگ‘ اس کے نشیب و فراز کے ساتھ پوری حوصلہ مندی سے ہم سفر رہنا اور ایک مسلسل تڑپ اور اضطراب مسلط کیے جانے کے باوجود اندرونی طور پر کوہِ گراں کی طرح ڈٹے رہنا ہے۔‘‘(۱۱۹(

فیضؔ کی نظم ’’یہ وہ سحر تو نہیں‘‘ میں فیض یہی اعتراف کرتے نظر آتے ہیں کہ جس سحر کی لگن دلوں میں بسائے ہم نے ظلم و زیادتی اور استحصال کے دشت پار کیے تھے ‘ یہ سحر وہ تو نہیں۔ سرزمینِ پاک میں پروان چڑھتی انتہا پسندی‘ دہشت گردی‘ لوٹ کھسوٹ‘ جاگیردارانہ و سرمایہ دارانہ نظام‘ آمریت کے گھیرے سائے‘ مطلق العنانی کی جمہوری روشیں‘ یہ سب فیضؔ جیسے انسان کی فہم سے بالاتر تھا۔ اسی لیے تو فیض نے فوراً ہی اعلان کیا کہ وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

یہ داغ داغ اجالا‘ یہ شب گزیدہ سحر
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل

جواں لہو کی پراسرار شاہراہوں سے
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
دیارِ حسن کی بے صبر خواب گاہوں سے
پکارتی رہیں بانہیں‘ بدن بلاتے رہے
بہت عزیز تھی لیکن رخِ سحر کی لگن)فیض احمد فیض)(۱۲۰(

فیضؔ کا سیاسی شعور اس کی نظموں میں سانسیں لیتا محسوس ہوتا ہے۔ جب ایوب خان نے خان منظور قادر کے ’’تخلیق کردہ‘‘ آئین کے تحت انتخابات کرائے اور وہ لوگ جو ایوب خان کے خلاف تھے وہ الیکشن کے خاک کا رزق بنے‘ نظم ’’لہو کا سراغ‘‘ ان کے لہو کی فریاد بن کر سامنے آتی ہے۔

پکارتا رہا‘ بے آسرا‘ یتیم لہو
کسی کو بہر سماعت‘ نہ وقت تھا نہ دماغ
نہ مدعی‘ نہ شہادت‘ حساب پاک ہوا

یہ خون خاک نشیناں تھا‘ رزقِ خاک ہوا)فیض احمد فیض)(۱۲۱(

فیضؔ کی شاعری میں اس عصری صورت حال کا یہ پھیلائو ہمیں اختتام تک نظر آتا ہے۔ ان کی نظمیں ’’اگست۵۵ء‘‘ ، ’’خورشیدِ محشر کی لو‘‘ ، ’’درد امید کے دریوزہ گر‘‘ ، ’’ادھر نہ دیکھو‘‘ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں جو آمریت کے دبیز سایوں کی روداد بن کر سامنے آتی ہیں۔ فیضؔ کی ایسی نظموں کے حوالے سے ڈاکٹر فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

’’لیلائے وطن کا حسن نیلام اٹھانے والوں کی حکمتِ فرعونی کے باعث وطن سے عشق کا دم بھرنے والوں کی ہمتیں رفتہ رفتہ یوں پست ہوئیں کہ حق فراموشی اور ابن الوقتی کی اس گھناونی فضا میں فیضؔ ہم پر باطل کے ساتھ مفاہمت کی عارضی زندگی کی نہیں بل کہ حق کی خاطر موت میں ابدی زندگی کی راہِ عمل اجاگر کرتے ہیں۔‘‘(۱۲۲(

ایسا نہیں ہے کہ فیضؔ کے یہاں عصری حسیّت کا محض سیاسی پہلو مذکور رہا ہے بل کہ انھوں نے دیگر موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ مثلاً ’’زندان نامہ‘‘ میں اپنے وطن کے ابتر حالات کے علاوہ تیسری دنیا کے ممالک کے عوام کی پسماندگی اور ان ممالک میں اٹھنے والی انقلابی تحریکیں بھی ان کی توجہ کا مرکز رہیں۔ علاوہ ازیں سرمایہ دارانہ ممالک کے استحصالی حربے بھی ان کی شاعری کا موضوع بنتے نظر آتے ہیں۔

فیضؔ آزادی کی لگن میں اس قدر گرفتار تھے کہ انھوں نے ’’حقیقی آزادی‘‘ کو پانے کی صرف لفظی ہی نہیں عملی کاوش بھی کی‘ جس کی ناکامی نے ’’راول پنڈی سازش کیس‘‘ کو جنم دیا۔ فیضؔ نے اسے سازشِ اغیار کا نام دیا ہے۔ فیضؔ اس سازش میں کس حد تک ملوّث تھے اس سے قطع نظر‘ یہ ایک حقیقت ہے کہ فیضؔ جذبۂ حب الوطنی سے سرشار تھے۔ اور اس سازش میں فیضؔ کو اسیری کا کرب بھی برداشت کرنا پڑا۔ ’’زنداں نامہ‘‘ اسی دور کی تخلیق ہے۔ اس میں فیضؔ نے اسی منافقانہ رویے پر شکایت کی ہے جس کے اسیر‘ وطنِ عزیز کے انتظام و انصرام پر متعین تھے اور اس کی بنیادوں کو کھوکھلا کررہے تھے۔ سابق میجر محمد اسحاق ’’زنداں نامہ‘‘ کے دیباچہ ’’رودادِ قفس‘‘ میں لکھتے ہیں:

’’زنداں نامہ‘ میں فیضؔ صاحب نے حق و باطل کی اس ہول ناک جنگ میں بہادروں کی بہادری کے واقعات کا تذکرہ شروع کردیا ہے‘ جس کی ابتدا وہ ’ دستِ صبا‘ میں ’ایرانی طلبہ کے نام‘ لکھ کر کر چکے ہیں۔‘‘(۱۲۳(

اور پھر اس صدق بیانی کا فیضؔ کو خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔ نظم ’’صبحِ آزادی‘‘ کا مزاج ایسا تھا کہ کہیں سنگِ ملامت کا ہدف بنے تو کہیں غدارِ وطن کی صلیب پر مصلوب ہوئے۔ حق گوئی کا یہ ’’انعام‘‘ بھی فیضؔ کی سمجھ سے بالاتر تھا مگر اس کے باوجود فیضؔاپنے عصر کی سچائی کو جھٹلا نہ سکے۔ نظم ’’زنداں کی ایک صبح‘‘ کے اشعار ملاحظہ ہوں:

صحنِ زنداں میں رفیقوں کے سنہرے چہرے
سطح ظلمت سے دمکتے ہوئے ابھرے کم کم
نیند کی اوس نے ان چہروں سے دھو ڈالا تھا
دیس کا درد‘ فراق رخِ محبوب کا غم
دور نوبت ہوئی‘ پھرنے لگے ہزار قدم
زرد فاقوں کے ستائے ہوئے پہرے والے
اہلِ زنداں کے غضب ناک‘ خروشاں نالے
جن کی باہوں میں پھرا کرتے تھے باہیں ڈالے)فیض احمد فیض)(۱۲۴(

فیضؔ کی حق گوئی اور بے باکی کا یہ رجحان جسے لوگوں نے ردِ پاکستان تصور کیا اصل میں پاکستان مخالف رویوں کی رد کی ذیل میں بیان ہوا تھا۔ اسی طرح فیضؔ کی نظمیں ’’نثار میں تری گلیوں کے‘‘ طوق و دار کا موسم‘‘ ، ’’سرِمقتل‘‘ اور ’’دو آوازیں‘‘ بھی عصری شعور کے حوالے سے قابلِ ذکر ہیں۔ نظم ’’طوق و دار کا موسم‘‘ دیکھیے۔

یہی جنوں کا یہی طوق و دار کا موسم
یہی ہے جبر‘ یہی اختیار کا موسم
قفس ہے بس تمھارے‘ تمھارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم
صبا کی مست خرامی ‘ تہِ کمند نہیں
اسیرِ دام ہیں‘ ہے بہار کا موسم
بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغ گلشن و صورت ہزار کا منظر)فیض احمد فیض()۱۲۵(

فیض احمد فیضؔ کی شاعری میں عصری پھیلائو اس حد تک دخیل ہے کہ فتح محمد ملک کا یہ ماننا ہے کہ

’’ان کی شاعری کی تفہیم عصری سیاست کو سامنے رکھ کر ہی بہتر طور پر ممکن ہے۔‘‘(۱۲۶(

فیضؔ کا مجموعہ ’’سر وادیِ سینا‘‘ایوب اور یحییٰ خان کے مارشل لائوں کے پس منظر میں تخلیق ہوتا نظر آتا ہے۔ جس میں حالات کے جبر کی عکاسی کی گئی ہے۔ جب کہ نظم ’’سرِ وادیِ سینا‘‘ کا پس منظر عرب اسرائیل جنگ محسوس ہوتا ہے۔

پھر برق فروزاں ہے سرِ وادیِ سینا
پھر رنگ ہے شعلۂ رخسارِ حقیقت
پیغامِ اجل دعوتِ دیدار حقیقت
اے دیدہ بینا)فیض احمد فیض()۱۲۷(

ترقی پسند تحریک خود کو براہِ راست سیاسی اور سماجی اقدار سے وابستہ قرار دیتی ہے۔ اس کی کامیاب مثال فیض احمد فیضؔ ہے۔ اُن کا خیال‘ شعوری طور پر جنسی یا جمالیاتی تحریک سے سیاست کی طرف آتا ہے۔ اس کے بر عکس ساحرؔ لدھیانوی کے ہاں جنسی عوامل کا اظہار یا اقرار موجود نہیں لیکن جتنی عریاں صورت میں جنسی ردِّ عمل ساحر نے بیان کیا ہے‘ وہ فیض کے ہاں نہیں۔ جنسی فرار اُسے اُکساتا ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کے سامنے سیاسی عُذر پیش کرے‘ جنسی رقابت اُسے تاج محل سے بھاگنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس کے علاوہ جنس سے ایک منفی قسم کی لذتیت بھی اُن کے ہاں پائی جاتی ہے مثلاً جاگیر‘ چکلے‘ لٹی ہوئی عصمتیں وغیرہ ساحر کے خاص موضوعات ہیں۔

دوسرے ترقی پسند شعرا کا حال بھی یہی ہے۔ ان میں سے زیادہ تر شعرا نے اسلوبِ بیان اور اظہار کی قدیم روش سے قدم آگے نہیں بڑھایا۔اس ضمن میں مجازؔ‘ علی جواد زیدی‘ جاں نثار اختر وغیرہ کی مثال دی جاسکتی ہے۔ مخمور جالندھری کی نظمیں ’’انوکھا بیوپاری‘‘۔ ’’بھوکی جوانیاں‘‘۔ ’’تضیعِ اوقات‘‘ اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔

یہ ترے نغمے‘ ترے قہقہے پھیکے پھیکے
یہ ترے خال یہ خط زرد سے دھندلے دھندلے

دے رہے ہیں تری عفّت کی تباہی کا ثبوت
ہے ترا رنگ ترے دل کی سیاہی کا ثبوت
غیظ میں کھوکھلے جوبن کی اٹھانوں کو نہ کھینچ
سجا ہوا ترا کمرا ہے خواب گاہِ جمیل
شکن سے پاک ہے رنگین پلنگ کی چادر
پڑے ہیں کونے میں کیوں تیل' صابن اور حمام
ابھی کل ہی کا قصّہ ہے کہ اک نادار دوشیزہ
سڑے تالاب کی سخت اور گندی کھال کی مچھلی
پھٹے کپڑوں میں لپٹی میل سے چکٹی نزاکت سے
اِدھر وہ رحم کی طالب' اُدھر میں سوچ میں گم تھا
بُری کیا ہے' اگر اک رات اس کے ساتھ کٹ جائے (مخمور جالندھری)

یہ درست ہے کہ حلقۂ اربابِ ذوق اور ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر ہونے والی شاعری میں جنس اور سیاست اہم موضوعات رہے' لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جدید نظم' موضوعاتی تنوع سے محروم ہوگئی۔ خالدؔ' قیوم نظر' یوسف ظفر' میرا جی' احمد ندیم قاسمی' مجید امجد' شاد عارفی' ضیا جالندھری' سعید احمد اعجاز وغیرہ کے ہاں موضوعات کا تنوع موجود ہے۔ یہ نوجوان شعرا حساس دل اور دماغ کے مالک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید علوم سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی آنکھیں اور دل و دماغ' ماحول کے ارتعاش کو محسوس کرتے تھے اور ہر نئے جلوے کی تڑپ کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

جدید اردو نظم کے ایک اور شاعر قیوم نظر کی شاعری کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قیوم نظر نے نہ تو مسائل کی علمی توجیہہ کو ڈھونڈا ہے نہ جذبات کی نفسیاتی توضیح پیش کی ہے' اور نہ ہی سیاسی تحریکات سے موضوعات اخذ کیے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے نفس کی گہرائیوں میں ڈوب کر آزاد تسلسل کو جنم دینے کی کوشش کرتے بھی دکھائی نہیں دیتے۔ حالات اور مظاہر کی ہر دو صورتوں سے انھوں نے حقیقت کا ادراک کیا' فطرت کے مظاہر اور انسان کی داخلی کش مکش اور خارجی تگ و دو میں مماثلتیں دیکھیں' اور انھیں اپنی شاعری میں بیان کیا۔ حقیقت کا تصوّر' قیوم نظر کے ہاں وقت کے جبر اور زندگی کے نہ ٹوٹنے والے طلسم سے عبارت ہے۔

میں قدرت کے اسرار و رموز پنہاں سے آگاہ کہاں
اس اندھیارے کے اتھاہ سمندر کی مرے دل میں چاہ کہاں
اور مجھ کو دکھاتی ہے نورِ حقیقت کے جلووں کی راہ کہاں
یہ شام' یہ گہری شام' یہ ہر لحظہ بڑھتی ہوئی تاریکی (قیوم نظر)

قیوم نظرؔ نے اپنی مختلف نظموں کے لیے جو بند وضع کیے ان میں قافیے کی نئی ترتیبیں پیش کیں۔ اُن کی نظموں کی مخصوص ہئیت موضوع کی داخلی کیفیات کا ایک خارجی مظہر ہوتی ہے او ریہ خصوصیت اس کی تمام نظموں میں موجود ہے۔ مثال کے طور پر قندیل کی پہلی نظم ہی دیکھیے۔

اُڑتی اُڑتی گرد سی دیکھی
لب پر آہِ سرد سی دیکھی

عمرِ رواں نے اک جھٹکا سا
کھایا۔ اور اک سال گیا)قیوم نظر(

یوسف ظفر میں ہمیں ایک ایسا شاعرنظر آتا ہے‘ جس کے ہاں موضوع اور اسلوبِ بیاں کو یکساں اہمیت حاصل ہے۔ وہ کبھی بھی خیال کے لیے اپنے فن کو قربان نہیں کرتاجس کی وجہ سے اس کی خاص ہئیت نے کبھی اس کے اظہارِ خیال میں دِقت پیدا کی۔ مثلاً ’’سنجوک‘‘ ’’ولولے‘‘ ’’پھر بھیگی کالی راتیں‘‘ وغیرہ ظفرؔ کی پابند نظموں کی عمدہ مثالیں ہیں۔ دوسری طرف ظفرؔ کی معرّا نظمیں ہیں۔ جن میں خیالات کی روانی اس بات کی متقاضی تھی کہ اس پر قافیہ ردیف کی پابندی نہ لگائی جائے مثلاً ’’زندگی‘‘ ’’طمانچہ‘‘ اور ’’موت‘‘ وغیرہ۔ یوسف ظفرؔ بھی فیض کی طرح نفسیاتی الجھنوں سے پاک ہے اور اس کا ردِّ عمل حسن و رومان کی طرف صحت مندانہ ہے۔ لیکن فیض کے ہاں یہ ردِّ عمل بہت محدود ہے اس کے برعکس ظفر کے ہاں حسن و رومان کا تصوّر بہت وسیع ہے۔

مخمور جالندھری جدید اردونظم کا ایک ایسا شاعر ہے جو اپنی نظم کا موضوع واقعاتِ زندگی سے منتخب کرتا ہے‘ لیکن نظم کا موضوع منتخب کرتے ہوئے اس بات کا لحاظ نہیں رکھتا کہ وہ موضوع شعریت کا حامل ہے یا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں کے بیش تر موضوعات شعریت سے عاری ہیں۔ مخمور جالندھری پر جنسی جذبات غالب ہیں اسی لیے ہمیشہ انھیں وہی چیزیں متاثر کرتی ہیں جن میں ان جذبات کی آسودگی یا تحریک کے اسباب موجود ہوں۔ البتہ ان کی اہم خوبی یہ ہے کہ وہ منظر پیش کرتے وقت اپنی ہستی کو اس میں کھو نہیں جانے دیتامثلاً ’’کٹھ پُتلی کا ناچ‘‘۔ اس نظم میں بوڑھے‘ بچّے‘ عورتیں‘ جوان سبھی ناچ میں محو ہیں‘ لیکن شاعر ان سے دور کھڑا ان کی حرکات کا جائزہ لے رہا ہے۔ یا پھر مخمور کی نظم ’’مجبور ‘‘کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ دکان کے اندر کی ہر چیز پر شاعر کی نظر ہے‘ لیکن وہ خود کسی چیز میں نہینکھوتا۔ یا پھر ان کی نظم’’ بھوکی جوانیاں‘‘ جس میں شاعر اپنے دوستوں کے تجربات بیان کرتا ہے لیکن اپنے آپ کو افشا نہیں کرتا۔

احمد ندیم قاسمی کا زیادہ تر کام قدیم و جدید اثرات کا مرکب ہے۔ تاہم ان کے قطعات خالص جدید شاعری کا انداز لیے ہوئے ہیں اور ان میں احساس کی شدّت‘ بیان کا زور‘ محاکات اور منظر نگاری کے لوازم ہیں۔ وہ اکثر محض ایک منظر کی تصویر ہی سے اپنے مافی الضمیر کو ادا کرجاتے ہیں۔

کھڑکھڑاتی ڈول وہ اندھے کنویں میں گر گئی
دم بخود پنہاریاں کنگن گھماتی رہ گئیں
وہ لپک کر ایک چرواہا کنویں میں گھُس گیا
وہ صبوحی کی نگاہیں مُسکراتی رہ گئیں)احمد ندیم قاسمی(

احمد ندیم قاسمی کی نظم کی خاص اہمیت ان کا دیہاتی پس منظر ہے۔ جس طرح نذر محمد راشد نے اردو شاعری پر مغربی ماحول کے خاکے کھینچے ہیں‘ قاسمی نے خالص دیہاتی مناظر سے اپنی نظموں میں ایک خاص دل کشی پیدا کی ہے اور اس ماحول میں جب شاعر دیہاتی عورتوں کا بیان کرتا ہے تو دل پھڑک اٹھتا ہے۔

جب دیکھتا ہے وہ کہیں بدمست پنگھٹ والیاں
گالوں کو جن کے چومتی ہیں پتلی پتلی بالیاں
زلفیں گھٹائوں کی طرح آنکھیں ستاروں کی طرح

چلنا ہوائوں کی طرح‘ رنگت شراروں کی طرح
لہنگے کی لہروں کے تلے مکھّن سے پائوں رقص میں
پگ ڈنڈیوں کے اس طرف گاگر کی چھائوں رقص میں
سینے چھلکتے میکدے اور ہونٹ پیمانوں کے لب
ٹخنوں پہ بجتی جھانجھریں ہنسنا ہنسانا بے سبب)احمد ندیم قاسمی(

مختار صدیقی کی شاعری کے متعلق دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک اس کی زبان اور دوسری اس کی تلمیحات۔ مختار صدیقی نے میرؔ کا تتبع کرتے ہوئے مقامیت کے رنگ کو اپنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں روزمرّہ کو بہت دخل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ نسوانی محاورے بھی ان کی نظموں میں ملتے ہینجو کہ نسوانی جذبات کی عکاسی کرتے ہیں مثال کے طور پر ان کی نظمیں ’’داسی اور دیوداسی‘‘ ’’ادھوری کہانی‘‘ وغیرہ۔

نظم جدید کے حوالے سے ایک اہم نام جیلانی کامران (۲۰۰۳ء۔۱۹۲۶ء) کا بھی ہے۔ آغاز میں جیلانی کامران افتخار جالب کے گروہ کا حصہ تھے۔ انھوں نے نئی نظم کی جو تحریک شروع کی وہ مغربی شاعری کے جدید رجحانات سے متاثر ہوکر کی۔ لیکن جلد ہی وہ اس گروہ سے الگ ہوکر اپنے ایک منفرد نقطۂ نظر کے داعی بن گئے۔ جسے ڈاکٹر محمد زکریا ’’اسلامی عجمی روایت‘‘ کا نام دیتے ہیں۔(۱۲۸(

جیلانی کامران کے تخلیقی فکر کا محوروًمرکز باغ بہشت محسوس ہوتا ہے۔ وہ اس دنیا کو جنت کی طرح دیکھنا چاہتے ہیں جو شر کے تصور سے پاک‘ امن و خوش حالی کا گھوارا نظر آئے۔ اس حوالے سے جیلانی کامران کی طویل نظم ’’باغِ دنیا‘‘ لائق مطالعہ ہے کہ اس نظم میں انھوں نے اپنی پورے شعری فکر کا نچوڑ پیش کردیا ہے۔ اس نظم میں چار کردار ہیں:

۱۔ محبوب ۲۔ ابلیس ۳۔ ملائکہ ۴۔ انسان

نظم میں چار ہی شہروں کا ذکر ہے:

۱۔ شہرِ محبوب ۲۔ شہرِ جدائی ۳۔ شہرِ شر ۴۔ شہرِ وفا

اور اس نظم میں بیان کردہ کیفیات بھی چار ہی ہیں:

۱۔ فرقت ۲۔ سفر ۳۔ قیام ۴۔ تمنّا

ان عناصر پر غور کیا جائے تو یہ انسان کے فکر کو تخلیق آدم کے واقعے کی طرف مبذول کرتے نظر آتے ہیں۔ آدم‘ جو جنت بدر کیا گیا تھا اور پھر جنت ہی کو اس کا حاصل و مقصود بھی قرار دیا گیا۔ ’’باغِ دنیا‘‘ میں اور ان کی دیگر نظموں میں دائرے کا چکر موضوع بنتا نظر آتا ہے۔ نظم کا آغاز ہی بڑا خوب صورت انداز لیے ہوئے ہے۔

آج کے بعد
آج کے بعد‘ نیا آج
اک نیا آج‘ تمھارے لیے لائے گا مہک
پھول اور پھول میں سوئے ہوئے کچھ خواب‘ کئی
دوست!
عشق اور عشق کے انداز
رفت کے بعد گذشت‘ عمر کے بعد نئی عمر
صبح کے بعد نئی صبح۔۔۔

آج کے بعد نیا آج، نئے تم
ایک موسم کا مہکتا ہوا موسم۔ تم! تم!
ایک گزری ہوئی دنیا کے مسافر۔ ہم! ہم!
آج کے بعد)جیلانی کامران(

یہ نظم کل چھے حصوں پر مشتمل ہے۔ منزلِ اوّل میں وہ اس دنیا کے موجودہ حالات پر تبصرہ کرتے ہیں۔ اوراگلے حصوں میں وہ انسان کے مختلف تہاذیب کے سفر پر روشنی ڈالتے ہیں۔ جس میں ہندی، عربی، عجمی اور آخر میں مغربی تہذیب پر بات کرنے کے بعد وہ اسی ایک بات پر متفق ہوتے نظر آتے ہیں کہ طاقت اور ہوس کی بے کنار خواہش، انسان کو اس کی متعین کردہ راہ سے بھٹکا دیتی ہے۔ اسی طرح منزلِ آخر میں انسان کا معاصر دور میں سفر پیشِ نظر رہتا ہے۔ اس حصے کے ذیلی عنوانات بھی توجہ طلب ہیں۔ ’’صبح کی نماز کے ساتھ دعا‘‘ ان دو چیزوں کو گویا وہ منزل ناتمام کے حصول کا ذریعہ تصور کرتے ہیں۔مسلم ممالک کی نشاۃِ ثانیہ یا تجدیدِ نو کی خواہش کو جیلانی کامران ’’احیا‘‘ کے کردار میں نظم کا حصہ بناتے ہیں، جو شہرِ غم میں اپنا ورد کرتا ہے۔ اس ’’احیا‘‘ کو تمام لوگ خاص طور سے ’’مرشد قم‘‘ خوش آمدید کہتا ہے۔ مگر آلِ ابلیس کو اس سے خدشات ہیں کہ ’’احیا‘‘ کی اتنی پذیرائی کے بعد ان کے لیے تو کوئی علاقہ نہیں بچے گا۔

آج ایران میں اتری ہے (احیا(
کل وہ لبنان میں، سوڈان میں، اومان میں اترے گی
مصر اور شام میں اترے گی
عیدِ امروز کے انجام میں اترے گی
احیا
وقت کے لکھے ہوئے انجامِ سحر میں اترے گی
عیدِ امکان میں اترے گی
احیا
اپنے ارادوں کے پرستان میں اترے گی)جیلانی کامران(

’’احیا ‘‘کی اس قدر مقبولیت کو دیکھ کر آلِ ابلیس ’’قم‘‘ کو تباہ و برباد کردینا چاہتی ہے کہ کسی طرح ’’احیا‘‘ کی کامیابیوں کو ناکامیوں میں تبدیل کردے۔ جیلانی کامران کی اس نظم کے حوالے سے ڈاکٹرضیا الحسن نے اپنے خیالات کا درج ذیل الفاظ میں اظہار کیا ہے:

’’نظم کا کمال یہ ہے کہ جیلانی کامران نے اسے جس نقطے سے شروع کیا ہے، انسان کے تہذیبی و تصوراتی سفر کی پوری روداد رقم کرنے کے بعد نہایت منطقی انداز میں اسی نقطے پر اس کا اختتام بھی کیا ہے۔‘‘(۱۲۹(

جیلانی کامران کی نظموں کا ایک خاص انداز ہے جو قاری کو متوجہ کرتا ہے اور وہ ان کا رجائیت بھرا انداز ہے۔ چوں کہ ان کے فکر میں یہ ایک بنیادی پہلو ہے اس لیے ان کی شاعری کے استعارے اور علامات بھی یہی انداز لیے ہوئے ہیں۔ ان کی نظموں میں ایک خوب صورت، شاداب و مسحور صبح کی نوید، معصوم بچوں سے تخاطب اور باغ اور اس کے متعلقات کا ذکر جابجا ملتا ہے۔ اس حوالے سے ان کی نظموں کی درج ذیل سطور ان کے رجائی پہلو کو عیاں کرتی ہیں:

دیے جلائو

کہ اس زمانے کی سب سے بہتر یہی عبادت ہے
مجھے تمھیں دیکھنا سکھانا بھی
اک کرامت ہے   )جیلانی کامران:دیے جلائو(

بچے کتنے پیارے بچے
کل کے آج سہارے بچے
ہرلمحے جو موسم بدلے‘ اس کے چاند ستارے بچے
آئو باغ میں صبح سویرے‘   (جیلانی کامران: پیارے بچّے(

شبنم ڈھونڈیں
پھولوں والے موسم ڈھونڈیں
کچھ تم ڈھونڈو
کچھ ہم ڈھونڈیں
موسم ڈھونڈیں‘ شبنم ڈھونڈیں   )جیلانی کامران :شبنم ڈھونڈیں(

نظم کی ہئیت کے حوالے سے بات کریں تو جیلانی کامران کے یہاں اس معاملے میں بھی انفرادیت قائم دکھائی دیتی ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ہمیں ان کی شاعری کی تکنیک اور ہئیت میں کچھ تبدیلیاں اپنا راستا بناتی نظر آتی ہیں‘ مگر بنیادی طور پر وہ آزاد نظم کی اس تکنیک کے قریب رہے جس کی بنیاد راشدؔ اور میراجیؔ رکھ چکے تھے۔ فرانسیسی زبان میں جوVERSE LIBRE کا تجربہ کیا گیا تھا اسے انگریزی میں   FREE VERSE کا نام دیا گیا اور اردو میں اسے آزاد نظم کے نام سے موسوم کیا گیا۔ انگریزی زبان میں WILLIAM WORDSWORTHنے مصرعوں میں بحر کا وزن قائم رکھتے ہوئے ان کی طوالت میں کمی پیشی کا تجربہ کیا تھا‘ مگر مصرعے پھر بھی ہم قافیہ ہوتے تھے‘ جب کہ جو تجربہ فرانسیسی زبان میں VERSE LIBRE کے نام سے کیا گیا تھا ‘ میں نظم کے برابر مصرعوں کے آخر میں قافیہ نہیں لایا جاتا تھا۔ اردو میں ٓزاد نظم کے باب میں ان دونوں تجربات کو اکٹھا کردیا گیا۔ یہ تجربات ‘ تصدق حسین خالد‘ ن۔م۔راشد اور میراجی نے کیے۔(۱۳۰(

جیلانی کامران نے اگرچہ خود کو اسی آزاد نظم تک محدود رکھا مگر ان کے یہاں مصرعوں کو توڑنے کا ایک اپنا انداز ملتا ہے نیز وہ مصرعوں میں رموزِ اوقاف کا بھی استعمال کرتے ہیں جو صرف ان ہی سے مخصوص ہے۔ ان سے قبل آزاد نظم کے باب میں رموزِ اوقاف کا اتنا باقاعدہ استعمال دیکھنے کو نہیں ملتا۔ اس حوالے سے لطیف قریشی جیلانی کامران کی انفرادیت کا اثبات ان الفاظ میں کرتے ہیں:

’’بیسویں صدی کے نصف آخر میں ان تجربات میں جیلانی کامران نے ایک اور تجربے کا اضافہ کیا اور وہ تھا شعری سطر میں اوقاف (PUNCTUATION) کا استعمال۔ اور شعری سطر کو اس طرح دو یا تین یا اس سے زیادہ حصوں میں توڑنے کا۔‘‘(۱۳۱(

یوں جیلانی کامران نے جدید نظم کو موضوعاتی و فکری حوالے سے ایک منفرد اسلوب بخشا۔ ان کے فکر میں مغربی رجحانات کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے مگربہ ہرحال ان کا فکر اختتام پر خود کو جس کوزے میں بند کردیتا ہے وہ اسلامی عجمی روایت ہی ہے۔ ان کے یہاں نظم کی ہئیت کے حوالے سے بھی صحت مند تجربات ہوئے ہیں‘ جن کو دیکھتے ہوئے یہ

امید کی جاتی ہے کہ جیلانی کامران کا منفرد فکر اور جدتِ ادا آنے والوں کے لیے مشعلِ راہ بنے گی۔

اردو نظم کا یہ سفر یہیں ختم نہیں ہوتا۔ تاہم اس کے بعد کے شعرا کو ہم آئندہ ابواب میں ذرا تفصیلی طور پر زیرِ بحث لائیں گے کیوں کہ وہ بنیادی شعرا ہیں جن کا تعلق اپنے کائناتی تفکر کے حوالے سے اس مقالے کی جان ہے۔ جدیداردو نظم کے حوالے سے یوسف ظفر‘ قیوم نظر‘ اختر حسین جعفری‘ وزیر آغا‘ انور جاوید‘ اظہر غوری‘ شہزاد احمد‘ جواز جعفری‘ زاہد امروز‘ یٰسین آفاقی‘ نسرین انجم بھٹّی ‘ افضال سید‘ عبدالرشید اور ان کے دیگر ہم عصر نظم گو شعرا اہمیت کے حامل ہیں۔

دیکھا جائے تو بیسویں صدی ہنگاموں‘ تحریکوں اور جغرافیائی تبدیلیوں کی صدی تھی اور برِ صغیر ان اثرات کی زد پر تھا۔ نوآبادیاتی نظام کے مفادات نے جن دو عظیم جنگوں کی راہ ہموار کی‘ ان میں جن لوگوں کی اکثریت رزقِ خاک بنی ان کا تعلق اسی خطے سے تھا۔ دوسرا ان جنگوں نے تمام ممالک کو اپنی بقا کے خطرے سے بھی دوچار کیا۔

پہلی جنگِ عظم جو ۱۹۱۴ء میں ہوئی‘ اس میں ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی حمایت ترکی کے ساتھ تھی۔ اس حمایت سے انگریز خائف تھے۔ اس لیے انھوں نے مسلمان لیڈروں کو پابندِ سلاسل بھی کیا۔ شبلیؔ کی نظم ’’اک جرمن نے مجھ سے کہا ازراہِ غرور‘‘ اسی واقعے کے پس منظر میں تخلیق ہوتی محسوس ہوتی ہے کہ اس نظم میں خاصے بے باک انداز میں اتحادیوں پر طنزوتعریض کے وار کیے گئے ہیں اور اس نظم کی وجہ سے حکومتِ وقت نے شبلی کو گرفتار بھی کرنا چاہا تھا مگر اس سے پہلے ہی وہ راہیِ ملکِ عدم ہوگئے۔

اس جنگ کے دوران میں انگریزوں نے برِ صغیر کے لوگوں کا تعاون حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کے لالچ دیے۔ مثلاً! کپاس کی درآمد پر محصول بڑھادیا انھیں خودمختاری کے حقوق دینے کا بھی اعلان کیا۔ لیکن اس فتح کے بعد انگریزوں نے برِ صغیرپر اپنی گرفت مزید مضبوط کرلی۔ اس حوالے سے ۱۹۲۰ء میں ہندوستان میں جن قوانین کا نفاذ کیا گیا وہ پہلے سے بھی زیادہ سخت تھے۔ ان حالات کی ترجمانی حسرتؔ موہانی کی نظم میں بڑی خوب صورتی سے کی گئی ہے:

کس درجہ فریب سے مملو
تجویزِ رفارم مانیے گو
مشہور زمانہ ہیں مسلّم
دستور کے حسبِ ذیل پہلو
قانون پر اختیار کامل
عمال پر زور‘ زر پہ قابو
ان میں سے نہ ہو جب ایک بھی
گل ہائے رفارم میں کہیں بو
کاغذ کے سمجھیے
کہ جن میں نام کو بھی نہیں خوش بو
مقصود ہے صرف یہ کہ تا جنگ
ہم سب رہینصرف ایں تگاپو (حسرت موہانی)

مگر عوام کوحکومت کے وعدوں پر بھروسا تھا‘ اس لیے جب یہ وعدے ایفا نہ ہوئے تو وہ بے حد مایوس ہوگئے۔ ملک اقتصادی بدحالی کا شکار ہوا۔ مزاحمتی تحاریک نے بھی جنم لیا۔ رولٹ ایکٹ کے ذریعے اس مزاحمت کو دبانے کی کوشش کی گئی مگر بے سود۔ جلیاں والا باغ کا سانحہ بھی جنگِ عظیم کے دور کی ہی اک یادگارہے۔ یوں ان حالات نے وطن پرستی کے جذبات کو فروغ دیا اور مقامی لوگوں کو ان کے حقوق دلوانے کے لیے ادیب بھی سیاسی راہ نمائوں م ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہوگئے۔ اس حوالے سے نظم کے باب میں اکبرؔ الہٰ آبادی‘ ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؔ اور مولانا ظفرؔ ولی خان کی ادبی کاوشیں اہمیت کی حامل ہیں۔ ان ادبا کی بہت سی نظموں میں حب الوطنی‘ وطن پرستی اور انگریزوں کے استحصالی چہرے کو بے نقاب کرنے کی کوششیں دکھائی دیتی ہیں۔ مولانا ظفر علی خان نے ’’ڈیڑھ سو سال کی وفاداری کا صلہ‘‘ ، ’’مشعلِ فانوسِ ہند‘‘ ، ’’قانونِ وقت‘‘ اور ’’دعوتِ عمل‘‘ جیسی نظمیں لکھ کر ان حالات کی ترجمانی کی۔

اکبرؔ الہٰ آبادی ہندوستانی تحریکِ آزادی کے کوئی پرجوش حامی نہیں تھے مگر جنگِ عظیم کے بعد انھیں بھی حقیقت کا واضح ادراک ہوا تو وہ بھی انگریزوں کی مخالفت اور ہندوستانیوں کی تحریکِ آزادی کے قائل ہوگئے۔

علامہ محمد اقبالؔ کی شاعری میں بھی ہمیں ان عالمی جنگوں کے اثرات نظر آتے ہیں۔ انھیں ادراک ہوچکا تھا کہ ہندوستان کا اصل مسئلہ صنعتی پس ماندگی ہے۔ اس لیے انھوں نے قدم قدم پر سامراج اور سرمایہ داری کی مخالفت کرتے ہوئے ’’چیمس فورڈاصلاحات‘‘ کے موقع پر یہ واضح طور پر اعلان کیا کہ یہ آزادی کی ’’نیلم پری‘‘ نہیں بل کہ سرمایہ دارانہ نظام کی ’’جنگِ زدگری‘‘ ہے:

آتجھ کو بتائوں رمز آیہ ان الملوک
سلطنتِ اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلادیتی ہے اس کو حکم راں کی ساحری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے کہ یہ آزادی کی ہے نیلم پری　　　　(علامہ محمد اقبال)

پہلی جنگِ عظیم کے بعد اقبالؔ حالات کو بہت واضح انداز میں بھانپ چکے تھے۔ اس لیے وہ ’’خضرِ راہ‘‘ اور ’’طلوعِ اسلام‘‘ جیسی نظمیں تخلیق کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ’’ابلیس کی مجلسِ شورٰی‘‘ بھی قابلِ توجہ نظم ہے۔ نظم ’’خضرِ راہ‘‘ کے بارے میں آل احمد سرور کا موقف ہے:

’’خضرِ راہ کی اشاعت سے وہ ذہنی آتش فشاں اپنی اصل شان سے نمودار ہوتا ہے جس کا نام اقبالؔہے۔ خضرِ راہ بہ ظاہر عالمِ اسلامی کے انتشار اور جنگِ عظیم کے تاثرات پر ایک دکھے ہوئے دل کی پکار ہے۔ مگر دراصل وہ ایک مفکر شاعر کا عہد نامہ جدید ہے۔ اس سے پہلے جنگ کا اثر ہندوستان میں کسی نے اتنا محسوس نہیں کیا تھا اور نہ ہی کسی نے اتنے اعتماد سے ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم چھوڑ کر آفتابِ تازہ کا خیر مقدم کیا تھا۔ سیاسی الجھنیں‘ اقتصادی مسائل‘ شہنشاہیت کے خلاف جہاد ‘ غرض وہ سب چیزیں جو ہماری زندگی کا جزو بن گئی ہیں‘ اقبالؔ کی خضرِ راہ کے ذریعے سے ادب بنیں۔ اس کی مشیت انقلابی ہے۔‘‘(۱۳۲)

اسی دور میں جن دیگر شعرا نے عالمی جنگ کے اثرات سے متاثر ہوکر نظمیں تخلیق کیں ان میں جوش ملیح آبادی، نیازفتح پوری، تلوک چند محروم اور سید سلیمان ندوی قابلِ ذکر ہیں۔ ہندوستان کے عوام پہلی جنگ اور اس کے اثرات سے سبق حاصل کرچکے تھے۔ اس کے باوجود دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوا تو وائسرائے کی مجلسِ قانون نے کسی کو بتائے بغیر اور کسی سے مشورہ کیے بنا ہی ہندوستان کو بھی اس جنگ میں دھکیل دیا۔ ہندوستان نے اس فیصلے کی مخالفت کی جس سے حکومتِ برطانیہ کو تشویش ہوئی اور وہ جنگ میں ساتھ دینے پر ہندوستان کے محتاج تھے۔ اس صورت حال کو علی سردار جعفری کی اس نظم میں واضح طور پو محسوس کیا جا سکتا ہے:

اڑرہا ہے ظلم و استبداد کے چہرے سے رنگ
چھٹ رہا ہے وقت کی تلوار کے ماتھے سے زنگ
موت ہنس کر دیکھتی ہے آئینہ تلوار میں
زرپرستی کا سفینہ آگیا منجدھار میں
یہ ہے وہ زنجیر خود ہاتھوں سے ڈھالا تھا جسے
یہ ہے وہ بجلی کہ خود خرمن نے پالا تھا جسے)علی سردار جعفری(

برطانیہ جب جنگ میں شکست سے دوچار ہونے لگا تو ان نے سر سٹیفورڈ کرپس کی سربراہی میں ایک وفد ہندوستان بھیجا مگر یہ وفد بھی اپنے مقاصد میں ناکام رہا۔ اسی اثنا میں ’’ہندوستان چھوڑ دو تحریک‘‘ کا آغاز ہو۔ یوں آزادی کی لگن برِ صغیر کے لوگوں میں مزید فزوں تر ہوئی۔ شعرا نے ان تمام حالات کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔ اختر حسین رائے پوری اس ضمن میں کیا خوب لکھتے ہیں:

’’دورِ حاضر کی تاریخ میں دوسری جنگِ عظیم کو سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے بعد دنیا وہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔ یہ تبدیلی اتنی ہمہ گیر تھی کہ اس کا اثر آج بھی ہماری زندگی پر سایہ فگن ہے، اگر ایک طرف اشتراکیت کا سیلاب روس سے نکل کر مشرق اور مغرب میں ، وسطی یورپ میں پھیل گیا تو دوسری طرف یورپی سام راج کے شکنجے سے افریقہ اور ایشیا کو گلو خلاصی مل گئی۔‘‘(۱۳۳(

جنگِ عظیم دوم نے ہندوستان کو جو بھوک، قحط، بے روزگاری اور مختلف وبائوں کے تحفے عطا کیے انھوں نے معاشرے میں بے سکونی، انتشار، بے چینی اور بے یقینی کو جنم دیا۔ شعرا نے ان رویوں کو بھی نظموں کا موضوع بنایا۔ انھوں نے بھوک، افلاس، بے روزگاری اور معاشی پس ماندگی کے ساتھ سمجھوتا کرنے سے انکار کردیا۔ شعرا اور خاص طور پر ترقی پسند تحریک نے جنگ کو انسانیت کے قتل کے مترادف خیال کیا۔ اس حوالے سے جوش کی شاعری لائقِ مطالعہ ہے۔ ان کی نظمیں ہی تھیں جو انھیں ’’شاعرِ انقلاب‘‘ کہلوانے کا باعث بنیں۔ ان کی نظمیں ’’وفاق‘‘ ، ’’ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام‘‘ ، ’’دامِ فریب‘‘ ، ’’شکستِ زنداں کا خواب‘‘ ، ’’ نئے مہرے‘‘ ، ’’روحِ استبداد کا فرمان‘‘ ، ’’وفادارانِ ازلی کا پیام ‘ شہنشاہِ ہند کے نام‘‘ ، ’’مستقبلِ ہندوستان‘‘ ، ’’وقت کی آواز‘‘ اور ’’لیلائے آزادی‘‘ انھی رجحانات کی غمازی کرتی ہیں، جن میں وہ نسلی منافرت، سیاسی غلامی، قومی نفاق، معاشی جبر اور استحصال کے حیلوں کو بے نقاب کرتے نظر آتے ہیں۔ نظم ’’شکستِ زنداں‘‘ خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ اس میں جوشؔ تحریکِ آزادی، برطانوی جبرواستحصال اور ان سے پیدا ہونے والے ذہنی و فکری رجحان کو واضح کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے‘ توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے‘ دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
آنکھوں میں گدا کی سرخی ہے‘ بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے‘ سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں
کیا ان کو خبر تھی زیروزبر رکھتے تھے جو روحِ ملت کو؟
ابلیں گے زمین سے مارِ سیہ‘ برسیں گی فلک سے شمشیریں
کیا ان کو خبر تھی سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں
سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا‘ جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں‘ دوڑو کہ وہ ٹوٹی زنجیریں (جوش ملیح آبادی)

اسی طرح نظم ’’ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام‘‘ میں بھی اسی باغیانہ لحن کی گونج سنائی دیتی ہے جو دوسری جنگِ عظیم کا شاخ سانہ تھی۔ اسرارالحق مجازؔ اپنی چند نظموں میں اسی انداز کو اپنائے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی نظمیں ’’انقلاب‘‘ ، ’’مطرب سے‘‘ ، ’’مضر دور‘‘ ، ’’نوجوان سے‘‘ ، ’’ اندھیری رات کا مسافر‘‘ اور ’’آوارہ‘‘ جنگِ عظیم دوم کے پس منظر میں ہی تخلیق ہوئی ہیں۔ اسی طرح مخدوم محی الدین کی نظمیں بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ان کا انقلابی فکر ’’باغی‘‘ ، ’’جنگ‘‘ ، ’’مشرق‘‘ ، ’’موت کا گیت‘‘ ، ’’انقلاب‘‘ اور ’’جہانِ نو‘‘ میں اپنی جولانیاں دکھاتا ہے۔

جنگ جیسی بے رحم حقیقت نے فیضؔ کی حساس طبیعت کو بھی شدید متاثر کیا اور انھوں نے جنگ اور اس کے اثرات کے خلاف بہت سی نظمیں تخلیق کیں۔ ’’مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ‘‘ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف فریاد ہے۔ ان کی نظم ’’سوچ‘‘ اس حوالے سے ان کی فکری وابستگی کو یوں ظاہر کرتی ہے:

ہم نے مانا کہ جنگ کڑی ہے
سرپھوٹیں گے‘ خون بہے گا
خون میں غم بھی بہہ جائیں گے
ہم بھی نہ رہیں گے‘ غم بھی نہ رہے گا (فیض احمد فیض)

علی سردار جعفری نے بھی عالمی جنگوں کے حوالے سے نظمیں تخلیق کیں۔ وہ اشتراکیت کے حامی اور سام راجیت مٹانے کے حامی تھے۔ اس حوالے سے ’’عہدِ حاضر‘‘ ، اور ’’ایک سوال‘‘ فکرِ انسان کو عصری آشوب سے آگاہی دلاتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ فراق گھورکھ پوری بھی اس حوالے سے ’’زندگی کی للکار‘‘ ، ’’دنیا کا بحرانی دور‘‘ ، ’’زمانے کا چیلنج‘‘ ، ’’آج دنیا پہ رات بھاری ہے‘‘ ، ’’آزادی‘‘ اور ’’آدھی رات کو ‘‘ جیسی نظمیں تخلیق کرتے ہیں‘ جن کے پس منظر میں جنگِ عظیم دوم کی ہول ناکیاں واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہیں۔ علاوہ ازیں سلام مچھلی شہری‘ ساحر لدھیانوی‘ احسان دانش اور کیفی اعظمی کی چند نظمیں بھی اس حوالے سے اہمیت کی حامل ہیں۔

احمد ندیم قاسمی نے بھی جنگ اور اس کے اثرات کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے دیہاتی زندگی کے تناظر میں مقامی لوگوں کا افلاس کے ہاتھوں مجبور ہونا اور اپنے بیٹوں کو جنگ کی بھٹی میں جھونکنے کا رویہ منظوم کیا ہے۔ ’’بھوکا دیہاتی‘‘ اور ’’بیوی کا خط‘‘ اسی رجحان کی غماز ہیں۔ ان کے فکری رویے کو واضح کرنے میں ’’لمحہ بہ لمحہ‘‘ ،

’’سپاہی کی موت‘‘ ، ’’یوٹوپیا‘‘ ، ’’کل اور آج‘‘ ، ’’احساس کی پھریری‘‘ ، ’’اور بیسویں صدی کے نصف آخر کا انسان‘‘ جیسی نظمیں اہمیت کی حامل ہیں۔ ’’سپاہی مورچے میں‘‘ ، ’’پنشن‘‘ اور ’’چوگا‘‘ بھی جنگ کے کرب اور ہول ناکی کو ہی عیاں کرتی ہیں۔ نظم ’’سپاہی مورچے میں‘‘ میں وہ ایک سپاہی کی ذہنی کیفیت کو درج ذیل الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

گرجتا ہے بجتا ہے میدانِ جنگ
نرالے ہیں ہٹنے جھپٹنے کے ڈھنگ
دھویں میں مسلسل دھماکوں کی گونج
گرج کا تواتر‘ کڑاکوں کی گونج
بڑھیں سیٹیاں سنسناتی ہوئی
بڑھیں سیٹیاں سی بجاتی ہوئے
فضائوں سے گرتے ہیں بم پے پرچے
بگولے اٹھے‘ مورچے اڑگئے
سنا ہے کہ یہ چاندنی رات ہے
مگر چاند پر موت کا ہاتھ ہے۔)احمد ندیم قاسمی(

اس حوالے سے ن۔م۔راشدؔ کی ’’شاعرِ درماندہ‘‘ ، ’’من و سلوٰی‘‘ ، ’’دستِ ستم گر‘‘ ، ’’پہلی کرن‘‘ ، ’’زنجیر‘‘ اور ’’تیل کے سوداگر‘‘ برطانیہ کی ہوسِ زراور ظلم و تشدد کی روایت کو عیاں کرتی ہیں۔ اسی حوالے سے مجید امجد کی نظم ’’قیصریت‘‘ بھی قابلِ مطالعہ ہے کہ ایک ایسا سپاہی جو جنگ میں حکومتِ برطانیہ کو خواہش پر قربان ہوچکا تھا اس کے اکلوتے بیٹے کو استعماریت کا دیو نگل گیا۔ وہ لکھتے ہیں:

اس سپاہی کا وہ اکلوتا یتیم
آنکھ گریاں‘ روح لرزاں‘ دل دو نیم
بادشہ کے محل کی چوکھٹ کے پاس
لے کے آیا بھیک کے ٹکڑے کی آس
اس کے ننگے تن پہ کوڑے مار کر
پہرے داروں نے کہا دھتکار کر
کیا ترے مرنے کی باری آگئی؟
دیکھ وہ شہ کی واری آگئی
وہ مڑا‘ چکرایا اور اوندھا گرا
گھوڑوں کے ٹاپوں تلے رونده گیا
دی رعایا نے صدا ہر سمت سے
’’بادشاہِ مہرباں!زندہ رہے‘‘ (مجید امجد)(۱۳۴(

متذکرہ بالا شعرا کے علاوہ جن دیگر شعرا نے عالمی جنگوں سے متاثر ہوکر نظمیں تخلیق کیں ان میں اخترالایمان کی ’’عہدِ وفا‘‘ ، ’’قلوپطرہ‘‘ ، خاک و خون‘‘ ’’جنگ‘‘ ، ’’زندگی کے دروازے پر‘‘ ، ’’تنہائی میں‘‘ وغیرہ اہم ہیں۔ مختار صدیقی کی نظم ’’ آخری جنگ‘‘ جاپان کے شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے جانے کے حوالے سے اہم ہے۔ نیز ’’فاشزم‘‘، ’’کیسے کیسے لوگ‘‘ اور ’’قریہ ویران‘‘ بھی اس ضمن میں اہمیت کی حامل ہیں۔

گویا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عالمی جنگوں نے صنفِ نظم میں اظہار کے مختلف پیرائوں کی راہ ہموار کی۔ شعرا نے ان جنگوں کو مختلف انداز سے نظموں کا موضوع بناتے ہوئے ان سے وابستہ اثرات کو بھی اجاگر کیا اور ان جنگوں نے برِ صغیر کے مسلمانوں کو ذہنی و فکری حوالے سے جس طرح کے خدشات سے دوچار کیا' وہ خدشات بھی ہمیں نظم نگاروں کے یہاں مرقوم نظر آتے ہیں۔ فرد کی تنہائی' بے بسی' عدم تحفظ' قحط' بھوک' افلاس' بے روزگاری' میدانِ جنگ کی ہولناکیاں اور دیگر متنوع جو ان جنگوں کی عطا تھے و ہ برِّ صغیر کے نظم نگاروں سے پوشیدہ نہ تھے۔ یوں ان عالمی جنگوں نے جس طرح انسانیت کی پامالی اور کے ضیاع کے راستے ہموار کیے اور ان راستوں نے جس طرح مختلف انسانی المیوں کو جنم دیا' نظم نگاروں نے ان تمام پہلوئوں کو اپنے انداز سے اجاگر کرنے کی کاوشیں کی ہیں گویا یہ بیان بالکل درست ہے:

''پہلی جنگِ عظیم اور اس کے کے اثرات کی واضح جھلکیاں اردو شاعری میں نظر آتی ہیں--- دوسری عالمی جنگ کے پیچھے جو ملک گیری کی ہوس اور قومیت کا آمرانہ جذبہ کام کر رہا تھا' شعرا نے اسے بھی محسوس کیا۔ تیسری جنگ کے خطرے نے انھیں جنگ کے خلاف ردِ عمل اور امن کے حصول پر اکسایا۔''(۱۳۵(

اور ڈاکٹر حنیف کیفی کا یہ موقف بھی بجا دکھائی دیتا ہے:

''دونوں عظیم جنگوں کے درمیانی دور میں اردو نظم کے تجربات میں جتنا تنوع نظر آتا ہے اتنا کبھی نہیں پایا جاتا۔''(۱۳۶(

اگر ہم اردو نظم کی اس فکری تاریخ پر غور کریں تو واضح دکھائی دیتا ہے کہ ادب نے ہمیشہ کی طرح معاشرے سے تعلق قائم رکھتے ہوئے اس کی اقدار و روایات میں آنے والی تبدیلیوں کو بھی شدید طور پر نہ صرف محسوس کیابل کہ اس کے اظہار کی بھی نمایاں کوششیں کیں۔ ان تبدیلیوں میں سب سے بڑا رویہ عقلیت پسندی کا ہے۔ پچھلے ڈیڑھ سو سال میں سائنس نے ایسے روز افزوں ترقی کی ہے کہ ایک مفکر کا کہنا ہے کہ اگر کوئی ایسا شخص آج کے عہد میں دوبارہ زندہ ہو جائے ' جو آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے مر چکا تھا ' تو وہ سائنسی ترقی اور ایجادات سے اس قدر حیران ہوگا کہ اس کی حیرت ہی اسے موت سے ہم کنار کردے گی۔

اک وقت تھا جب انسان کی جملہ سرگرمیوں کا انحصار مذہبی اور معاشرتی روایات پر تھا۔ مذہبی پیشوا اور حکم ران اس ضمن میں بنیادی اہمیت کے حامل تھے۔ عمومی طور پر یہی دو عناصر لوگوں کے زندگی گزارنے کواور سوچنے کے طریقہ کارکا فیصلہ کیا کرتے تھے۔ کیوں کہ کائنات کو سمجھنے کی کوششوں کے دوران میں ہی مذہب یا اجتماعیت کی طرف زیادہ توجہ مرکوز ہوئی۔ انسانی تاریخ کے اسی دورانیے میں مذہبی پیشوا اس انداز میں چھا گئے کہ مذہب کے خلاف کسی بھی قسم کی آواز اٹھانا ناقابلِ برداشت سمجھا جاتا تھا اور عقلیت اگر کہیں بھی مذہب سے ٹکراتی ہوئی محسوس ہوتی تھی تو اسے شدید قسم کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ جیسا کہ سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑا کیوں کہ اس کے افکار مروجہ مذہبی روایات سے متصادم تھے۔ گلی لیو کو سزائے موت سنائی گئی کیوں کہ اس کا علم بائبل کے اصول سے انحراف کی طرف مایل کر رہا تھا۔ ہائی پیشیا دختر تھوین کو ایک پادری نے صرف اس لیے بازار سے گزرتے ہوئے خنجر سے قتل کر ڈالا کہ وہ بچوں کو سائنس پڑھایا کرتی تھی۔

تاہم سائنس کے راستے میں آنے والی یہ تمام تر رکاوٹیں انسان کو عقل کی راہ پر آگے بڑھنے سے روک نہ پائیں۔ کائنات کی تسخیر میں انسان کے بڑھتے ہوئے قدموں نے سائنس کی معاونت کو نہ صرف سراہا‘ بل کہ عقل پرستی پر انسان کے اعتقاد کو مضبوط بنیاد بھی فراہم کی۔ اسی عقلی رویے کو راہ نما بناتے ہوئے انسانی سوچ کا دھارا بھی بدلنے لگا۔ یہ کائنات جو پہلے صرف انسان کی اپنی ذات اور اس زمین و آسمان تک محدود تھی‘ نے وسعت اختیار کی اور اس وسعت نے انسان کی سوچ میں بھی وسعت کو فروغ دیا۔ انسان نے اپنی ذات سے بڑھ کر اس کائنات کی بے پایاں وسعتوں کی حیرت ناک انداز میں دیکھنا شروع کیا اور اس کا تجسس اسے کائنات کے نئے رنگوں سے آشنا کرتا گیا۔

ان رویوں نے جہاں زندگی کی دیگر جہات کو متاثر کیا وہاں ادب اور خصوصاً شاعری بھی اس کے احاطۂ عمل سے باہر نہ رہ پائی۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس نے سوچ کے افق پر ایک نئے انسان کو جنم دیا تو بالکل غلط نہ ہوگا۔جدید شاعری میں ایسے عناصر جا بجا دکھائی دینے لگے جو شاعر کی حیرت کے غماز تھے۔ یہ حیرت اس کی سب سے بڑی راہ نما تھی۔ سائنس دانوں نے آسمان پر تھگلی لگائی تو شعرا کا تخیل بھی انھیں اس زمین سے بہت پرے نئی دنیائوں کی سیر پر آمادہ کرنے لگا۔ جدید اردو نظم کے شعرا میں انسان ‘ کائنات اور خدا کے باہمی تعلق کے رشتے دکھائی دینے لگے۔ وہ زمان‘ مکان‘ وقت‘ روح‘ حیات‘ ممات‘ زمین‘ آسمان‘ کہکشائوں‘ وجودِ انسانی کی حقیقت اور دیگر عواملِ فطرت سے اس کے تعلق کو اک نئے انداز سے دیکھنے لگا۔ جدید اردو نظم کے شاعر کا تخیل اسے ایک بار پھر سے اُن ان دیکھی دنیائوں کے سفر پر لے گیا جو اس کی نظر سے ماوراتو تھیں مگر اس کے ادراک اور تخیل کی حدود کے اندر تھیں۔

یہ نیا انسان تمام قدیم رویوں کا ہرگز باغی نہیں تھابل کہ جگہ جگہ پر قدیم دیومالائی روایات سے بھی جڑا ہوا تھا اور انھی روایات کو بھی تعقل کی سطح پر پرکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس اندازِ نظر کی وجہ سے اس پر اپنی حقیقت ایک متضاد کیفیت کی صورت عیاں ہوئی۔ وہ یقین اور بے یقینی کے درمیان پھنس کر رہ گیا۔ کبھی اسے سب کچھ زیر دکھائی دیتا اور کبھی زبر۔ کبھی وہ خود کو اشرف المخلوقات کے تناظر میں دیکھتا تو کبھی خود کو کیڑے مکوڑوں سے بھی کم تر درجے پر دیکھتا۔ تاہم ان تمام چیزوں میں حیرانی اس کی بنیادی صفت رہی۔اسی حیرانی اور کائناتی تفکر نے اس کی ادبی تخلیقات میں اپنا آپ ظاہر کیا۔ اور یہی پرتحیر بیانیہ اس مقالہ کا بنیادی نکتہ ہے ‘ جس پر ہم آئندہ ابواب میں تفصیلی بحث کرتے ہوئے کسی حتمی نتیجہ پر پہنچنے کی سعی کریں گے۔

حوالہ جات:

۱: رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر: اصنافِ ادب، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص ۱۰۰
۲: حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز: کشاف تنقیدی اصطلاحات، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۲۰۰
۳: آل احمد سرور: (پیش لفظ، اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم از ڈاکٹر حنیف کیفی)، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص ۱۴
۴: رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر: اصنافِ ادب، لاہور، ص ۱۰۰-۱۰۱
۵: حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز: اصنافِ ادب، لاہور، سنگت پبلیشرز، ۲۰۱۲ء، ص ۶-۷
۶: میر انیس: کلیاتِ انیس مرتبہ رانا خضر سلطان: کراچی، بک ٹاک، ۲۰۰۶ء، ص ۶۵۲
۷: تنویر احمد علوی، ڈاکٹر (مرتب): کلیاتِ ذوق، لاہور، مکتبہ شعر و ادب، ۱۹۸۸ء، ص ۴۰۱
۸: ایضاً، ص ۴۰۵
۹: سودا، مرزا محمد رفیع :(ڈاکٹر محمدشمس الدین صدیقی ،مرتب): کلیات سودا، لاہور، مجلسِ ترقیِ ادب، جلد دوم، ۱۹۷۶ء ، ص۸۵
۱۰: میر حسن: مثنوی رموز العاشقین، وحید قریشی، ڈاکٹر (مرتب) ، مثنویاتِ میر حسن، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۶ء ، ص۵۵-۵۶
۱۱: نسیم، دیا شنکر: گلزارِ نسیم، رشید حسن خان (مرتب)، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۷ء، ص ۱۵۴
۱۲: ایضاً، ص ۱۶۷
۱۳: خضر سلطان ، رانا (مرتب): مثنوی سحرالبیان، لاہور، بک ٹاک،۲۰۰۵ء، ص ۶۵
۱۴: ایضاً، ص ۶۷
۱۵: ایضاً،ص ۶۷
۱۶: ایضاً،ص ۶۸
۱۷: حفیظ جالندھری: شاہ نامہ اسلام، لاہور، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، س ن ، ص ۲۵
۱۸: ایضاً ، ص ۳۵
۱۹: ایضاً، ص ۳۷
۲۰: ایضاً ، ص ۳۸
۲۱: ایضاً ، ص ۳۹-۴۰
۲۲: ایضاً ، ص ۳۹-۴۰
۲۳: حنیف کیفی، ڈاکٹر: اردو میں نظمِ معرا اور آزاد نظم، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص ۴۶

۲۴: ایضاً
۲۵۔ محمد سلیم: پاکستان میں جدید اردو نظم نگاری کا ارتقاء' (مقالہ پی ایچ ڈی غیر مطبوعہ)' مخزونہ جامعہ پشاور' ۲۰۰۳ء' ص۹
۲۶: ابواللیث صدیقی' ڈاکٹر: آج کا اردو ادب' علی گڑھ' ایجوکیشنل بک ہائوس' ۲۰۰۸ء' ص ۳۹
۲۷: افتخار احمد صدیقی' ڈاکٹر (مرتب) : کلیاتِ نظمِ حالی'لاہور' مجلس ترقی ادب'جلد دوم'۱۹۷۰ء' ص ۹۱
۲۸: رشید امجد' ڈاکٹر (مرتب): پاکستانی ادب (۲۰۰۸ء۔۱۹۴۷ء) (انتخابِ شاعری)' اسلام آباد' اکادمی ادبیاتِ
پاکستان' ۲۰۰۹ء' ص ۴۴
۲۹: شیما مجید(مرتب): مقالاتِ ن۔م۔راشد' کراچی' بک ٹائم' ۲۰۱۱ء' ص۳۰۰
۳۰: عتیق احمد: فیض' عہد اور شاعر' لاہور' مکتبہ عالیہ' ۱۹۹۱ء' ص۴۹
۳۱: انورسدید' ڈاکٹر: اردو ادب کی تحریکیں' کراچی' انجمن ترقی اردوپاکستان' ۱۹۹۱ء' ص ۳۹۰
۳۲۔ میرا جی: اس نظم میں' کراچی' آج پبلشرز' ۲۰۰۲ء' ص ۴۰
۳۳: آل احمد سرور: نظم کی دنیا' مشمولہ اردو ادب کی فنی تاریخ' مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری' لاہور' الوقار پبلی کیشنز '
۲۰۰۳ء'ص۱۳۵
۳۴: ظفر علی خان: بہارستان' لاہور' اردو اکیڈمی پنجاب' ۱۹۳۷ء' ص ۲۰۱
۳۵: عتیق احمد: فیض' عہد اور شاعری' لاہور' مکتبہ عالیہ' ۱۹۹۱ء' ص ۶۵
۳۶: ظفر علی خان: بہارستان' ص ۴۹۵
۳۷: ظفر علی خان: نگارستان' لاہور'یونائیٹڈ پلیشرز' س ن' ص ۵۴
۳۸: نظیر حسین زیدی' پروفیسر ڈاکٹر: مولانا ظفر علی خان بہ حیثیت شاعر' کراچی' انجمن ترقی اردو پاکستان' ۱۹۷۹ء' ص ۱۰۹
۳۹: شیما مجید (مرتب): مقالات ن م راشد' کراچی' بک ٹائم' ۲۰۱۱ء' ص۳۱۷
۴۰: محمد زکریا' ڈاکٹر خواجہ(مدیرِ اعلیٰ): تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند' لاہور' پنجاب یونی ورسٹی' جلد پنجم'۲۰۱۲ء' ص ۱۲۵
۴۱: اکبرؔ الٰہ آبادی: رانا خضر سلطان (مرتب) کلیاتِ اکبر' لاہور' بک ٹاک' جلد اوّل' ۲۰۰۶ء' ص۲۹۸
۴۲: ایضاً ص۳۰۷
۴۳: محمد زکریا' ڈاکٹر خواجہ: اکبر الٰہ آبادی۔تحقیقی و تنقیدی مطالعہ' لاہور' سنگِ میل پبلی کیشنز' ۲۰۰۳ء' ص۱۰۹
۴۴: ابواللیث صدیقی' ڈاکٹر: جدید اردو ادبیات' کراچی' غضنفر اکیڈمی' ۱۹۸۹ء' ص۳۲۲'۳۲۱
۴۵: اکبرؔ الٰہ آبادی: رانا خضر سلطان (مرتب) کلیاتِ اکبر'لاہور' بک ٹاک' جلد دوم' ۲۰۰۶ء' ص ۲۵
۴۶: اکبرؔ الٰہ آبادی: رانا خضر سلطان (مرتب) کلیاتِ اکبر' جلد دوم' ص ۳۴

۴۷: اقبالؔ، علامہ محمد: کلیاتِ اقبال، لاہور، اقبال اکادمی، ۱۹۹۷ء، ص۵۴
۴۸: ایضاً، ص۱۷۳
۴۹: ایضاً، ص۲۶۷
۵۰: ایضاً، ص۲۶۷
۵۱: ایضاً، ص۷۱۔۷۰
۵۲: ایضاً، ص۷۴
۵۳: ایضاً، ص۴۷۵
۵۴: ایضاً، ص۴۷۵
۵۵: ایضاً، ص۴۶۳
۵۶: ایضاً، ص۴۶۵
۵۷: ایضاً، ص۴۶۶
۵۸: ایضاً، ص۴۶۶
۵۹: ایضاً، ص۴۶۷
۶۰: ایضاً، ص۴۶۸
۶۱: ایضاً، ص۴۶۸
۶۲: ایضاً، ص۴۶۹
۶۳: ایضاً، ص۴۶۹
۶۴: ایضاً، ص۴۷۱
۶۵: ایضاً، ص۴۷۱
۶۶: ایضاً، ص۴۷۴
۶۷: ایضاً، ص۴۷۴
۶۸: ایضاً، ص۵۶۰
۶۹: ایضاً، ص۱۹۱
۷۰: ایضاً، ص۱۹۱
۷۱: ایضاً، ص۱۹۱
۷۲: ایضاً، ص۱۹۲
۷۳: ایضاً، ص۱۹۲
۷۴: ایضاً، ص۱۹۵
۷۵: ایضاً، ص۱۹۶
۷۶: ایضاً، ص۱۹۵
۷۷: ایضاً، ص۱۹۵
۷۸: ایضاً، ص۱۹۴
۷۹: غلام رسول مہر (مرتب): سرود فتنہ، لاہور، کتاب منزل،۱۹۵۹ء، ص ۲
۸۰: اقبالؔ، علامہ محمد: کلیاتِ اقبال، ص۲۳۰
۸۱: ایضاً، ص۲۳۳
۸۲: ایضاً، ص۸۷
۸۳: ضیا الدین احمد، پروفیسر: اقبال کا فن اور فلسفہ، لاہور، بزمِ اقبال، ۲۰۰۱ء، ص۶۹

۸۴:    )منصور احمد قریشی: جوشؔ کی نظم نگاری اوراردو شاعری پر اُس کے اثرات‘ (پی ایچ ڈی مقالہ غیر مطبوعہ)‘ مخزونہ
بہائو الدین زکریا یونی ورسٹی‘ ملتان‘ ۲۰۰۴ء‘ ص۱۹۹
۸۵:    حنیف کیفی ‘ ڈاکٹر: اردو میں نظمِ معرا اور آزاد نظم‘ ص ۴۸۲
۸۶:    جمیل جالبی ‘ ڈاکٹر (مرتب): میرا جی ۔ایک مطالعہ‘ لاہور‘ سنگِ میل پبلی کیشنز‘ ۲۰۰۹ء‘ ص ۲۹۱
۸۷:    ناصر کاظمی:میراجیؔ شخص اور عکس‘ مشمولہ میرا جیؔ ایک مطالعہ‘ مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی‘ لاہور‘ سنگِ میل پبلی کیشنز‘ ۲۰۰۹ء ‘
ص۲۳۹
۸۸:    جیلانی کامران: میراجی‘ مشمولہ میرا جیؔ (میراجیؔ صدی۔منتخب مضامین) مرتبین: ڈاکٹر رشید امجد‘ ڈاکٹر عابد سیال ‘
اسلام آباد‘ مقتدرہ قومی زبان‘ ۲۰۱۰ء‘ ص ۲۰۲
۸۹۔   رشید امجد‘ ڈاکٹر: میراجی۔شخصیت اور فن‘ فیصل آباد‘ مثال پبلشرز‘ ۲۰۱۰ء‘ ص ۱۲۶
۹۰:    جمیل جالبی‘ ڈاکٹر: معاصر ادب‘ لاہور‘ سنگِ میل پبلی کیشنز‘ ۱۹۹۱ء‘ ص ۹۰
۹۱:    میرا جیؔ: کلیاتِ میراجیؔ مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی‘ لاہور‘ سنگِ میل پبلی کیشنز‘ ۱۹۹۶ء‘ ص۲۵۰
۹۲:    شوکت سبزواری‘ ڈاکٹر: نئی پرانی قدریں‘ کراچی‘ مکتبہ اسلوب‘ ۱۹۶۱ء‘ ص۴۷’۴۸
۹۳:    فخرالحق نوری‘ ڈاکٹر: مطالعہ راشدؔ‘ فیصل آباد‘ مثال پبلیشرز‘ ۲۰۱۰ء‘ ص۱۹
۹۴:    نسیم عباس احمر (مرتب و مدون:) ن۔م۔راشدؔ کے خطوط ‘ لاہور‘ پاکستان رائٹرز کو آپریٹو سوسائٹی‘ ۲۰۰۸ء‘ ص۱۳۰‘۱۲۹
۹۵:    راشدؔ‘ ن۔م: کلیاتِ راشد‘ لاہور‘ ماورا ‘ س ن‘ ص۱۹۲
۹۶:    ایضاً‘ ص۱۰۰
۹۷:    ایضاً‘ ص۱۰۷
۹۸:    جمیل جالبی‘ ڈاکٹر(مرتب): میرا جیؔ۔ ایک مطالعہ‘ لاہور‘ سنگِ میل‘ ۲۰۰۹ء‘ ص۴۸۸
۹۹:    حمید نسیم: پانچ جدید شاعر‘ لاہور‘ دارالشعور‘ ۲۰۱۵ء‘ ص۹۳
۱۰۰: راشدؔ‘ ن۔م: کلیاتِ راشد‘ ص۹۴
۱۰۱: وزیر آغا‘ ڈاکٹر: نظم جدید کی کروٹیں‘ لاہور‘ سنگت پبلشرز‘ ۲۰۱۳ء‘ ص۴۷
۱۰۲: راشدؔ‘ ن۔م: کلیاتِ راشد‘ ص۶۸
۱۰۳: ایضاً‘ ص۹۷
۱۰۴: ایضاً‘ ص۱۳۲
۱۰۵: فخرالحق نوری‘ ڈاکٹر: مطالعہ راشدؔ‘ ص۱۷۸
۱۰۶: فتح محمد ملک‘ ڈاکٹر: راشد اور ہمارا قومی مستقبل ‘ مشمولہ بیادِ راشد مرتبہ ڈاکٹر فخرالحق نوری‘ لاہور‘ اورینٹل کالج‘ پنجاب
یونی ورسٹی‘ ۲۰۱۴ء‘ ص۱۹
۱۰۷: حنیف کیفی: اردو میں معرا نظم اور آزاد نظم‘ ص۴۵۴
۱۰۸: محمد زکریا‘ ڈاکٹر خواجہ: چند اہم جدید شاعر‘ لاہور‘ سنگت پبلشرز‘ ۲۰۰۳ء‘ ص۱۳

۱۰۹: مجید امجد: کلیاتِ مجید امجد مرتبہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص۱۰۱
۱۱۰: ایضاً، ص۶۰
۱۱۱: ایضاً، ص۲۹۲۔۲۹۱
۱۱۲: ایضاً، ص۳۹۰۔۳۸۹
۱۱۳: ایضاً، ص۴۱۸
۱۱۴: ایضاً، ص۴۳۶
۱۱۵: ایضاً، ص۵۶
۱۱۶: ایضاً، ص۷۱
۱۱۷: ایضاً، ص ۲۹۸
۱۱۸: سہیل احمد خان: مجید امجد کی نظم نگاری ، مشمولہ مجید امجد نئے تناظر میں، مرتبہ احتشام علی، لاہور، بیکن بکس، ۲۰۱۴ء، ص۷۱
۱۱۹: عتیق احمد، فیض ۔عہد اور شاعر، ص۴۱
۱۲۰: فیضؔ فیض احمد: نسخہ ہائے وفا، لاہور، مکتبہ کارواں، س ن، ص۲۰،۲۱
۱۲۱: ایضاً، ص۳۹۶
۱۲۲: فتح محمد ملک، ڈاکٹر: فیض۔شاعری اور سیاست، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء، ص۹۲
۱۲۳: محمد اسحاق، میجر: رودادِ قفس (دیباچہ)، فیضؔ فیض احمد: نسخہ ہائے وفا، لاہور، مکتبہ کارواں، س ن، ص۲۲۸
۱۲۴: فیضؔ فیض احمد: نسخہ ہائے وفا، لاہور، مکتبہ کارواں، س ن، ص۱۸۲
۱۲۵: ایضاً،ص۱۴۸
۱۲۶: فتح محمد ملک: بحوالہ حمید شاہد، راشدؔ۔میراجیؔ۔فیضؔ۔نایاب ہیں ہم، فیصل آباد، مثال پبلشرز، ۲۰۱۴ء، ص۲۰۷
۱۲۷: فیضؔ فیض احمد: نسخہ ہائے وفا، ص۴۲۱
۱۲۸: محمد زکریا، ڈاکٹر خواجہ: (مدیرِ اعلیٰ) تاریخِ ادبیاتِ مسلمانان پاکستان و ہند، جلد پنجم، ص۳۳۶
۱۲۹: ضیاالحسن، ڈاکٹر: جدید اردو نظم۔آغازوارتقا، لاہور، سانجھ، ۲۰۱۲ء، ص ۱۴۵
۱۳۰: ماخوذ از جیلانی کامران: ایک مطالعہ، از لطیف قریشی، ملٹی میڈیا افئیرز، ۲۰۰۴ء،ص۷۵
۱۳۱: لطیف قریشی: جیلانی کامران۔ایک مطالعہ، ملٹی میڈیا افئیرز، ۲۰۰۴ء، ص۷۴
۱۳۲: فرمان فتح پوری، ڈاکٹر (مرتب): اردو ادب کی فنی تاریخ، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص۱۳۵
۱۳۳: اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر: گردِ راہ، کراچی، المسلم پبلشرز، ۱۹۹۳ء، ص۲۷۳
۱۳۴: مجید امجد: کلیاتِ مجید امجد مرتبہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ص ۲۲۹
۱۳۵: ناہید قاسمی، ڈاکٹر: جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۲ء، ص۵۰۰
۱۳۶: حنیف کیفی، ڈاکٹر: اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم، ص۷۲

باب سوم

جدیداردو نظم، کائناتی شعور اور فطری سائنسز

اس دنیا میں علوم کی بہت سی اقسام ہیں جو تقسیم در تقسیم کے عمل سے گزرتی ہوئی اپنی اپنی کسی خاص جہت کی طرف اپنے کام کو آگے بڑھاتی رہتی ہیں۔ ابتدائے زمانہ میں انسان کا علم اور مشاہدہ محدود تھا ۔ اپنے ان مشاہدات کو معلوم حقائق کے مطابق بیان کرنے کی انسانی سعی پہلے دن سے ہی آشکار ہے۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا انسان کا علم بھی بڑھتا چلا گیا اور اس پر سوچنے اور پرکھنے کا انسانی انداز بھی۔

انسانی علوم کو ہم بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں یعنی سائنس اور عمرانیات۔ سائنس ایسا علم قرار پایا جس میں ہم مشاہدات و تجربات کی بنیاد پر اپنے ارد گرد کی اشیا کے بارے میں جانتے ہیں۔ سائنس کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ پر ہے۔ مشاہدہ تو ہر علم کے لیے لازم ہے تاہم تجرباتی نوعیت کے لحاظ سے ہم علوم کو مختلف شاخوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اسی بنا پر عصرِ موجود میں سائنس کو بھی دو بنیادی گروہوں میں بانٹا گیا ہے۔

الف۔ فطری سائنس ب۔ سماجی سائنس

فطری سائنس سے مراد وہ سائنسی علم ہے جس کی بنیاد ایسے حقیقی تجربہ پر ہے جسے بار بار آزمایا جا سکے۔ فطری سائنس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ فرد اور اس کے رجحانات سے ماورا ہے کہ اس کی ذاتی رائے اس وقت تک مستند نہیں مانی جاتی جب تک اسے تجربہ کی کسوٹی پر رکھ نہ لیا جائے۔ تجربہ کے لیے مخصوص حالات اور آلات کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان حالات اور آلات کی مدد سے سائنس کو آزمانے والا ہر فرد ایک ہی جیسے نتائج تک پہنچتا ہے۔ اگر فرق ہے تو اتنا کہ ہر فرد اس نتیجے کی جزیات کو اپنے علم اور استدلال کی بنیاد پر نیا آہنگ عطا کرسکتا ہے۔ مثلاً روزِ اولین سے یہ بات انسانی مشاہدہ کا حصہ ہے کہ جب پھل پک جاتے ہیں تو وہ درخت کی شاخ سے ٹوٹ کر گرنے لگتے ہیں۔ اس مشاہدہ کی بہ دولت انسان نے ایک نتیجہ حاصل کرلیا تھا کہ جب درخت سے پھل خود بہ خود گرنے لگتے تو یہ اشارہ ہوتا ہے کہ پھل پک چکے ہیں اور ان کے توڑنے کا وقت آپہنچا ہے۔ یہ مشاہدہ اور اس سے اخذ شدہ نتائج یقینا حقیقت پر مبنی ہیں۔ لیکن اس مشاہدہ کی گہرائی میں ایک اور پیغام بھی موجود تھا جسے انسان نے ایک لمبے عرصے تک سمجھنے کی سعی ہی نہیں کی۔ جب انسانی علم بڑھا تو اس مشاہدے کے ساتھ نئے سوال نے بھی جنم لیا جس کی بہ دولت اس حقیقت کے اندرچھپی ایک اور حقیقت نے اظہار کی صورت پائی۔پھل پک کر گرنے کا ایسا ہی ایک واقعہ جب سر آئزک نیوٹن کے ساتھ پیش آیا تو ان کی سوچ نے ایک نیا پہلو اختیار کیا۔ نیوٹن کے ذہن نے ایک نیا سوال اٹھایا کہ یہ بات بجا کہ سیب پک گیا ہے لہٰذا اس

نے شاخ کوخیر باد کہہ دیا لیکن سوال یہ ہے کہ درخت سے ٹوٹنے کے بعد یہ پھل نیچے کیوں گرااور اوپر کی طرف کیوں نہیں گیا؟ اس سوال نے مزید مشاہدات کی طرف توجہ دلائی تو اس نے جانا کہ ہر شے جب آزاد انہ نیچے گرتی ہے تو زمین کی طرف ہی لپکتی ہے۔ جیسے کہ فضا میں اڑتی اک پتنگ جیسے ہی اڑانے والے سے آزادی حاصل کرتی ہے تو زمین کی طرف آتی ہے۔ ایک مکان کی چھت سے چھوڑا گیا پتھر آزادانہ طور پر زمین کی طرف ہی بڑھتا ہے۔ یہ وہ مشاہدات ہیں کہ انھیں کوئی بھی آزمانا چاہے تو ایسے ہی نتائج حاصل کرے گا۔ ان تجربات و مشاہدات کی بنیاد پر نیوٹن نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یقینا زمین میں کوئی ایسی صلاحیّتِ کشش موجود ہے جو اجسام کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور اسی بات کو اس نے اپنے شہرہ ٔآفاق قوانین کی صورت میں پیش کیا۔ اسی خصوصی اندازِ نظر کے بارے میں شاعر کہتا ہے:

مگر چشمِ تماشا کو کہاں فُرصت
کہ جھانکے دیدۂِ تخلیق میں
اور رونما ہو جلوۂِ حیرت
دریچے کھولنا آساں اگر ہوتا
تو ہر نظارہ بیں صاحبِ نظر ہوتا (شہاب صفدر:آخری دستک)(ا)

ایسی سائنسز جنھیں کوئی بھی تجربہ کی بنیاد پر آزماسکے فطری سائنسز کہلاتی ہیں۔ اگرچہ اس کی سیکڑوں شاخیں ہیں تاہم بنیادی طور پر اسے جن اہم شاخوں میں تقسیم کی گیا ان میں ریاضی‘ طبیعیات‘ کیمیا اور حیاتیات سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر سائنسز جن کا تعلق انسانی زندگی کے سماجی مشاہدات سے ہے انھیں سماجی سائنسز کا نام دیا گیا۔ سماجی سائنسز میںادب‘ علم الانسان‘ علم الاقتصادیات‘ تاریخ‘ فلسفہ اور مذہب کو شامل کیا جاتا ہے۔ زیرِ نظر باب کا بنیادی تعلق کیمیا اور حیاتیات سے ہے ۔ اگرچہ طبیعیات بھی فطری سائنسز کا ہی حصہ ہے تاہم اسے مابعدالطبیعیات کے ساتھ تعلق کی بنا پر آخری باب میں جگہ دی گئی ہے جہاں طبیعیاتی اور مابعدالطبیعیاتی مباحث سے نتائج اخذ کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اسی طرح سماجی سائنسز کے مباحث کو بھی ایک علاحدہ باب میں جگہ دی گئی ہے۔

فطری سائنسز کے ضمن میں سب سے اولین سوال یہ ہے کہ فطری سائنسز کے کام کرنے کا اصول کیا ہے؟ یہ اصول اگرچہ سماجی سائنسز میں بھی اسی طرح کارفرماہے تاہم فطری سائنسز میں اسے تجربہ کی بنیاد پر آزمایا جا سکتا ہے جو کہ سماجی سائنسز میں ممکن نہیں ہے۔تمام تر علوم کی بنیاد انسانی مشاہدہ ہے۔ یہ مشاہدہ انسان کے حواسِ خمسہ کی مدد سے بھی کیا جا سکتا ہے اور ان آلات کی مدد سے بھی جو انسان نے مخصوص مقاصد کے لیے تخلیق کیے ہیں۔ خصوصاً فطری سائنسز میں تجربہ بنیادی نوعیت کا حامل ہوتاہے لہٰذا فطری سائنسز میں ان آلات کا استعمال انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ انسان نے اشیا کی ماہیت و کیفیت کو ماپنے کے لیے کئی طرح کے سائنسی آلات تخلیق کیے ہیں ۔ یہ آلات مخصوص عوامل کو دیکھنے‘ سمجھنے اور پرکھنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثلاً خوردبین کی مدد سے ہم مختلف اشیا کو انتہائی باریک بینی سے دیکھ سکتے ہیں جب کہ عام آنکھ سے ایسے دیکھنا ممکن نہیں۔ ترازو کے ذریعے ہم اشیا کا بالکل صحیح وزن ماپ سکتے ہیں ۔ اس کے بغیر ہم اندازہ تو لگا سکتے ہیں لیکن بالکل صحیح وزن کا ادراک ممکن نہیں۔ سائنس ‘اندازوں کا نام

نہیں ہے۔ سائنس اندازوں کی بنیاد پر کی گئی بات کو صرف سطحی انداز میں دیکھتی ہے اور نتائج کو اس وقت تک قبولیت کی سند عطا نہیں کرتی جب تک کسی سلسلے میں حتمی نتیجہ سامنے نہ آئے جس پر کسی شک و شبہ کی گنجایش نہ ہو۔ فطری سائنسز کے طریقہ ہائے کار کو درج ذیل تصویر سے واضح کیا جا سکتا ہے۔

اس شکل سے واضح ہوتا ہے کہ فطری سائنسز میں مطالعاتی طریقہ ہائے کار کا پہلا مرحلہ مشاہدہ ہے۔ اس مشاہدہ کی بنیاد پر ایک سائنس دان کچھ عمومی نتائج تک پہنچتا ہے اور ان پر غوروخوض کرتے ہوئے کوئی مفروضہ قائم کرتا ہے۔ اس قائم شدہ مفروضے کو تجربے کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ ان تجربات سے نتائج کا استنباط دو صورتوں میں ہوتا ہے:

۱لف: تجربات‘ مفروضہ کی تصدیق کرتے ہیں۔

ب: تجربات‘ مفروضہ کی تنقیص کرتے ہیں۔

اب ان دونوں صورتوں میں اگلے مراحل مختلف ہوتے ہیں۔ اگر تو تجربات ‘ مفروضہ کی تصدیق کریں تو پھر مفروضہ کو ایک نظریہ کی صورت اپنا لیا جاتاہے اور دیگر لوگوں کے سامنے مزید تحقیق کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ فطری سائنس کی خوبی یہی ہے کہ اس کے نتائج کو کوئی بھی ماہرِ فن تجربہ کی بنیاد پر آزما سکتا ہے اور ان نتائج کا اقرار یا انکار استدلال سے کر سکتا ہے۔ اگر مختلف ماہرینِ فن کے بار بار کے تجربات اسی نظریہ کا اقرار کریں تو پھر اس مفروضہ کو‘ جو کہ نظریہ کی صورت اختیار کرچکا ہے‘ ایک سائنسی قانون یا اصول کی صورت میں قبول کرلیا جاتا ہے اور اس کی بنیاد پر تحقیق کو اگلے مرحلے کی طرف بڑھایا جاتا ہے اور مزید نتائج حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اگر تجربات ‘ مفروضے کی نفی کریں تو پھر تجربہ سے جو نتائج حاصل ہوتے ہیں انھیں مشاہداتی سطح پر پھر سے آزماتے ہوئے کوئی نیا مفروضہ قائم کیا جاتا ہے اور پہلے ہی کے انداز میں تجربے کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے اور استنباطِ نتائج کی سعی کی جاتی ہے۔ یہ دائروی عمل اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک ہم کسی حتمی نتیجہ پر نہیں جاتے۔اس بات کو شاعر اپنے لفظوں میں یوں بیان کرتا ہے:

کبھی تم بھی تنہا درختوں سے آباد
گونگی چٹانوں پہ سوئے ہوئے

موسموں کی کہانی سُنو!
ان کی آنکھوں سے بچھڑی ہوئی نیند اور خواب کی سرحدوں سے بہت دور
گرتے ہوئے آب شاروں کی گہرائی میں ڈوب کر
کبھی منظروں کا اکیلا پن آنکھوں کی ویرانیوں میں سجائو
جدائی کے سوکھے ہوئے زخم کھل جائیں گے)ایوب خاور: مشورہ)(۲(

اگرچہ یہ عمومی نظریہ ہے کہ سائنس حقانیت کا دعواکرتی ہے لیکن اس کی حدود اپنی جگہ قائم ہیں۔ سائنس کسی بھی نظریہ کو حتمی قرار نہیں دیتی بل کہ معلوم حقائق کے تناظر میں کسی دعوے کو ردوقبول کا درجہ عطا کرتی ہے۔ اس لیے عین ممکن ہے کہ ایک زمانے میں جو بات مستند قرار دی گئی ہو آئندہ زمانے میں اسے مسترد کردیا جائے۔ سائنسی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ مثلاً ایٹم کی ساخت کے بارے میں بنیادی نظریہ ڈیموقراطیس نے پیش کیا اور اسے ناقابلِ تقسیم قرار دیا تاہم بعد میں ایٹم تقسیم در تقسیم کے عمل سے گزرا اور آج ہم کوارکس اور اینٹی کوارکس کی سطح تک پہنچ چکے ہیں تو سائنس نے قدیم نظریہ کو رد کردیا ۔ یہ بھی کوئی ایک دن یا ایک مرحلے کی بات نہیں ہے بل کہ تدریجی تبدیلیوں کا عمل ہے جیسے ڈیموقراطیس کے نظریے کو لمبے عرصہ تک قبول کیا جاتا رہا لیکن جب جان ڈالٹن نے اپنا ایٹمی نظریہ پیش کیا تو بہتر ہونے کی بنا پر اسے قبول کر لیا گیا۔ جان ڈالٹن کے بعد لارڈ رتھر فورڈ نے ایٹمی ساخت کو واضح کرنے کی سعی کی تو ڈالٹن کے نظریے کو چھوڑ دیا گیا۔ پھر نیل بوہر نے رتھر فورڈ کے نظریے کو غلط ثابت کیا تو بوہر کا نظریہ قبولیت کی سند پا گیا۔ بوہر کے بعد سمر فیلڈ نے اس میں تبدیلیاں کیں۔ غرض یہ ایک تدریجی عمل ہے جو کبھی حقانیت کا دعوانہیں کرتا لیکن اتنا ضرور کہتا ہے کہ معلوم حقائق کے مطابق فلاں چیز قبولیت کے درجے پر فائز ہے۔

تمام علوم ‘ چاہے سائنسی ہوں یا غیر سائنسی‘کا مطمعٔ نظر ہمیشہ یہی رہا ہے کہ وہ کائنات کے سربستہ رازوں کی عقدہ کشائی کریں اور اس کائنات کو تسخیر کرنے کی کوشش کریں۔ سائنس کا سفر ہمیشہ معلوم سے نامعلوم کی طرف ہوتا ہے۔ انسانی معلومات کا پہلا منبع خود انسان کی ذات اور ہمارا یہ سیارا (زمین) ہے جسے زندگی کا مرکز مانا گیاہے۔ سائنسی علوم نے ان سے ابتدا کرتے ہوئے کائنات کے دیگر مظاہر تک رسائی کی کوششیں کی ہیں اور ان کی تفہیم کی سعی کی ہے۔ کیوں کہ ادب انسانی سوچ کا بیانیہ ہے لہٰذا ادب نے بھی ان اثرات کو محسوس بھی کیا اور سائنس کو اثر پذیر بھی کیا۔ ہمارے ادب اور شاعری میں بھی یہ سوالات اور موضوعات در آئے ہیں۔

جدید اردو نظم کے شعرا کا تخیل ان کا سب سے بڑا رفیق رہا ہے۔ نیز برآں روزافزوں سائنسی ترقی نے بھی ان کے علم میں اضافہ کیا ہے اور اس علم کو بنیاد بناکر نا صرف یہ کہ ان شعرائے کرام نے کائنات اور اس کے مظاہر پر مختلف سوالات اٹھائے ہیں بل کہ ان سوالات کے ممکنہ جوابات کو بھی اپنے تخیل کی مدد سے واضح کیا ہے۔ادب اور خصوصاًشاعری کو سائنس پر یہ تفوق حاصل ہے کہ شاعر حسیّاتی سطح سے بلند ہوکر زندگی کو دیکھتا ہے۔ سائنس جن راستوں پر چلنے کے لیے حقائق کے سہارے تلاش کرنے میں صدیوں سرگرداں رہتی ہے‘ شاعر چشمِ زدن میں اُس دنیا کی سیر بھی کر ڈالتا ہے اور اس ان دیکھی دنیا کی پہچان بھی رکھتا ہے۔ وہ اس بات کی حاشیہ پیمائی بھی کرتا ہے کہ اُس دُنیا کو کیسا ہونا چاہیے۔ مثلاً سائنس دان تو دیگر اجرام پر زندگی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ وہ ابھی

اس کا ثبوت پائے گا تب ہی آگے کی طرف قدم بڑھائے گا مگر شاعر اس جستجو میں اُس سے بہت آگے نکل جاتا ہے۔ وہ دیگر دنیائوں میں زندگی کے بیج تلاش کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ یہ ایک نیا سوال بھی اٹھاتا ہے کہ اُن سیاروں سے زندگی یہاں منتقل ہوئی یا ہمارے سیارے سے وہاں؟ بہ ہر حال جو بھی ہے وہ زندگی کی اس نقل مکانی پر یقین رکھتے ہوئے اس بات کا اعادہ کرتا ہے کہ انسانیت کی بقا کے لیے دیگر سیاروں پر زندگی کے بیج پھینکنے جانا اُس کی اوّلین ذمّہ داریوں میں سے ہے۔جستجو کا یہی انداز شاعر کو سائنس دان سے کئی قدم آگے رکھتا ہے اور وہ شاعر کی ذہنی ریاضتوں کو عملی صورت میں اجاگر کرنے کی سعی کرتا ہے۔ لیکن وہ بنیادی سوچ' جس پر عمل کی پہلی اینٹ رکھّی گئی ہمیشہ شاعر کے حصّے میں ہی آئی کیوں کہ اُس کی قوّتِ متخیلہ کائنات کو سائنس دان سے آگے بڑھ کر دیکھتی ہے۔

کائنات فہمی کے مختلف سطح اور انداز کے سوالات ہر شاعر کے ہاں کسی نہ کسی صورت اظہار ضرور پاتے ہیں لیکن صرف چند شعرا ہی ایسے ہیں جن کے ذہنی روّیوں کو ہم سائنسی روّیہ کہہ سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں چند اہم شعرا کا مختصر تعارف یقینا اس مقالہ کے لیے اہم ہے کہ ان شعرا کی انفرادیت واضح کی جاسکے۔ تاہم یہ بھی زیرِ نظر رہے کہ ایک ہی مقالہ میں تمام شعرا کا احاطہ کرنا ممکن نہیں لہٰذا اس مقالہ کے لیے یہاں جدید اردو نظم کے اُن شعرا کا چنائو کیا گیا ہے جن کا بنیادی روّیہ سائنسی ہے' تاہم بعض ایسے افراد کو بھی شامل کیا گیا ہے جن کے ہاں عمومی روّیہ سائنسی تو نہیں لیکن انھوں نے کائنات فہمی کا کوئی ایسا انفرادی انداز اپنایا ہے جو اہمیت کا حامل ہے۔

جدید اردو نظم کے وہ شعرا جنھوں نے کائناتی تفکر کو اپنی کاوشوں کا خاصہ بنایا ان میں ایک اہم نام شہزاد احمد (۲۰۱۲ء۔۱۹۲۳ء)کا ہے' جو امرتسر میں پیدا ہوئے اور لاہور میں وفات پائی۔ شہزاد احمد ایک متنوع ادبی شخصیت کے مالک ہیں جنھوں نے ۔ انھوں نے بہ حیثیت ایک ادیب کے متعدد کتب تحریر کیں جو شاعری' تراجم' فلسفہ' نفسیات اور سائنس فکشن سے متعلق ہیں۔ ان کی اہم کتب میں اربوں سال کی دوری (شاعری)' اسلامی فلسفے کی تاریخ (فلسفہ)' تحلیلِ نفسی۔تین مختلف نفسیاتی اندازے (نفسیات)' آٹو رینک نفسیات اور ماورائے نفسیات (نفسیات)' دماغ کی صورت گری (نفسیات)' آپ کیوں سوچتے ہیں (نفسیات)' تیسری دنیا کے مسائل اور سائنسی انقلاب (نفسیات)' انفرادی نفسیات اور احساسِ کم تری (نفسیات' مترجم)' اسلامی فکر کی نئی تشکیل (مترجم)' وجودی نفسیات پر ایک نظر (نفسیات)' پریشان حالی سے نجات (نفسیات' مترجم)' اعلیٰ ترین انسانی واردات (نفسیات' مترجم)' نیند اور عادت کے خلاف جنگ (نفسیات' مترجم)' معجزے کی تلاش میں (سائنس' مترجم)' سائنس کے عظیم مضامین (سائنس' مترجم)' فرائڈ کی نفسیات۔دودور (نفسیات)' آج اور کل سائنس کے آئینے میں (سائنس فکشن' مترجم)' ارمان اور حقیقت (سائنس' مرتب)' سائنسی انقلاب (سائنس' مرتب)' دوسرا رخ (نفسیات)' نفسی طریقِ علاج میں مسلمانوں کا حصّہ (نفسیات)' ذہنِ انسانی کا حیاتیاتی پس منظر (سائنس)' تخلیقی رویے (نفسیات)' مذہب' تہذیب' موت (نفسیات)' پاکستانی ادب ۱۹۹۰ء (مرتب)' رنگِ غزل (انتخاب)' جاگن والی رات (شاعری)' دیوار پہ دستک (شاعری)' معلو م سے آگے (شاعری)' مٹّی جیسے لوگ (شاعری)' اترے مری خاک پر ستارہ (شاعری)' آنے والا کل (شاعری)' ایک چراغ اور بھی (شاعری)' پیشانی میں سورج (شاعری)' اندھیرا دیکھ سکتا ہے(شاعری)' کون اسے جاتا دیکھے (شاعری)' بکھر جانے کی رُت(شاعری)' ٹوٹا ہوا پُل

(شاعری)' خالی آسمان (شاعری)' ادھ کھُلا دریچہ (شاعری)' جلتی بجھتی آنکھیں (شاعری) اور صدف(شاعری) شامل ہیں۔ ان کی ادبی کاوشیں نفسیات اور سائنس سے خصوصی تعلق رکھتی ہیں۔ اسی لیے وہ کائنات کو دیکھنے کا ایک مکمل سائنسی انداز اپناتے ہیں اور کائناتی حوالے سے اپنی شاعری میں بہت سے سوالات اٹھاتے ہیں جن کا بیان اس مقالے میں کیا جائے گا۔نیز ان پر ادبی حوالے سے کئی مضامین اور مقالات تحریر کیے جاچکے ہیں۔ شہزاد احمد کی شاعری پر مختلف ناقدینِ ادب کی آرا ملاحظہ ہوں:ڈاکٹر وزیر آغا اپنے مضمون''لامتناہیت کا لمس'' میں رقمطراز ہیں:

''انھوں نے جو کتابیں لکھی ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ شہزاد احمد کائنات اصغر کی کنہ میں جھانکنے پر ہمیشہ سے مائل رہے ہیں۔ نفسیات کے حوالے سے انسانی دماغ ہی کائنات اصغر ہے۔ جس میں شعور، تحت الشعور اور لاشعور تہہ در تہہ موجود ہوتے ہیں۔ شہزادا حمد نے اس کائنات اصغر کا خوب مطالعہ کیا ہے جس کے گہرے اثرات ان کے کلام پر مرتسم ہوئے ہیں۔ مگرشہزاد احمد نے محض ''اندر'' تک میں خود کو محدود نہیں رکھا۔ وہ ''باہر'' کے تہہ در تہہ عالم سے بھی آشنا ہوئے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے کا سمولوجی (Cosmology)کے ایک اچھے طالب علم کی حیثیت میں جس بصیرت کے ساتھ ''کائنات اکبر'' کا مطالعہ کیا ہے وہ بے حد قابلِ تعریف ہے۔۔پرانے زمانے میں صوفیا اورویدانتی جزو اور کل میں فرق نہیں کرتے تھے۔ اب طبیعیات نے بھی ان کی بات کو قبول کر لیا ہے۔ اب وہ بھی یہ کہنے لگی ہے کہ ہر پارٹیکل کائنات کے جملہ پارٹیکلز کو محیط ہوتا ہے۔''(۳(

ریاض احمد نے اپنے مضمون ''شہزاد احمد___ علمی شعور کی تخلیقی جہت'' میں شہزاد احمد کی شاعری میں تعقل اور فکر کے شعوری رجحان کو خوب صورت انداز میں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''نظم میں بھی اس نے لفظی چٹخارے کا سہارا نہیں لیابل کہ معنوی گہرائی اور معنوی ربط سے الفاظ کو اس طرح استعمال کیا ہے کہ ان کے ترکیبی عمل میں ایک تخلیقی انفرادیت پیدا ہو گئی ہے۔۔۔ مختصر یہ ہے کہ شہزاد احمد نے علمی شعور کو تخلیقی جہت بھی عطا کی ہے۔ ''(۴(

مبین مرزا اپنے مضمون ''سازِ سخن بہانہ ایست'' میں شہزاد احمد کے دو شعری مجموعوں ''اترے مری خاک پر ستارہ'' اور ''معلوم سے آگے'' میں شہزاد احمد کو سائنسی فکر کا ایک اہم شاعر قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''امر حال یہ ہے کہ شہزاد احمد کی شاعری میں جوہری تبدیلی کا یہ سفر کسی درجے میں سیرو سلوک کا سفر بنتا ہی نہیں۔ان کے تاحال آخری دو مجموعوں ''اترے مری خاک پر ستارہ'' اور ''معلوم سے آگے'' کی نظمیں جو منظر نامہ بنتی ہیں وہ اس تیسری آنکھ یا چشم دل کی بصارت کا معجزہ نہیں ہیں۔۔۔ بل کہ اس کے برعکس ہم ان مجموعوں کے شعری کینوس پر طبیعیات کی دنیا کو نئے ابعاد تک وسیع ہوتا ہو ادیکھتے ہیں۔ اس دنیا میں ہمیں صرف اپنے اطراف کا جہاں یا صرف اس کرۂ ارض کی حکایت سننے کو نہیں ملتی بل کہ شہزا داحمد پوری کائنات اور اس کے وجودونمود کو بودونبود کے تناظر میں جاننے اور سمجھنے کی تگ و دو میں محو نظر آتے ہیں۔ اس کاوش و کد کے لیے انھوں نے اپنا میڈیم سائنس کو بنایا ہے۔

فلسفہ اور نفسیات کے Discipline سے ان کی پرانی دلچسپی اس جستجو میں ہمہ وقت ان کو کمک پہنچاتی رہتی ہے۔

ان دونوں مجموعوں میں جو اصلاً ایک ہی موضوع کو اس کے تسلسل اور مختلف جہات اور وسیع تر تناظر میں دیکھتے ہیں۔ شہزاد احمد نے ایک طرف جدید انسان جو فلسفے کے نئے نظریات، نفسیات کی جدید تھیوریز اور سائنس کے نو بہ نو انکشافات کا گہرا شعور رکھتا ہے، کے قلب و نظر کی کیفیات کو بیان کیا ہے۔''(۵(

ڈاکٹر فوزیہ چودھری نے اپنے مضمون ''شہزاد احمد کٹھن منزلوں کا شاعر'' میں شہزاد احمد کے شعری مجموعے ''معلوم سے آگے'' پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ

''شہزاد احمد کی نظم نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے جو چیز ہمیں سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ ان کا موضوعاتی تنوع ہے۔ ان کی نظمیں ذات سے لے کر کائنات تک مختلف اور متنوع مضامین اور افکار پر پھیلی ہوئی ہیں۔۔۔ ان کا تخلیقی شعور ماضی، حال اور مستقبل کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے۔ بل کہ خوشی اور تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ اس عصر کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے نظم میں مابعد کی بات بھی کی ہے۔ ان نظموں میں بعض موضوعات ماورائے مستقبل کے مسائل سے کشید کیے گئے ہیں۔ ۔۔''معلوم سے آگے'' کے مضامین اور مسائل خود اتنے مبہم اور پیچیدہ ہیں کہ ابھی بعض سائنس دانوں اور دانش وروں کی آنکھوں سے بھی ان کی ماہیت چھپی ہوئی ہے۔''(۶(

جب کہ ڈاکٹر سعید احمد کا یہ کہنا ہے کہ شہزاد احمد کے سائنسی شعور نے اُردو شاعری کو ثروت مند بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

شاہین مفتی ‘گجرات کی سرزمین سے تعلق رکھنے والی ایک اہم ادیب اور شاعر ہہیں۔ ان کی نگارشات میں دشتِ رائیگانی میں(شاعری)‘ انیس ناگی: شخصیت اور فن(تحقیق)‘ کشور ناہید: شخصیت اور فن‘(تحقیق) اردو ادب کا انٹی ہیرو۔انیس ناگی(تحقیق)‘ آپ کا خادم‘ فیض کی شاعری میں رنگ(تحقیق)‘ جدید اردو نظم میں وجودیت(تحقیق)‘ کنارہ کس نے دیکھا ہے(شاعری)‘ مسافت(شاعری)‘ امانت(شاعری)‘ پانی پہ قدم(شاعری) اور امکان کی بازیافت (شاعری) شامل ہیں۔ ان کے ہاں بھی کائنات کو دیکھنے کا منفرد انداز سامنے آتا ہے‘ جس کی پیش کش آئندہ باب میں کی جائے گی۔

شہاب صفدر کا تعلق ڈیرہ اسماعیل خان کی سرزمین سے ہے۔ ان کی اہم تصانیف میں لہریں لیتی پیاس(شاعری)‘ تکلم(شاعری) اور نیلگوں(شاعری) شامل ہیں۔ ان کے کائناتی حوالے سے سماجی سائنسز کا بیانیہ اہمیت کا حامل ہے۔ خالد علیم جدید اردو نظم کے ان شعرا سے ہیں جو اس مقالے کا حصّہ ہیں۔ وہ لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کی اہم تصانیف میں کوئی آنکھ دل سے بھری‘ (شاعری)فغان دل(شاعری)‘ شامِ شفق‘ تنہائی(شاعری)‘ بغداد آشوب (شاعری)‘ اردو کی نعتیہ شاعری (تحقیق) شامل ہیں۔

اختر حسین جعفری نام ور جدید اردو نظم نگاروں میں سے ہیں۔ ان کے تخیل کی اڑان انھیں کائنات کی ان جانی حدود تک لے جانے میں ان کی معاون رہی ہیں۔ ان کی اہم تصانیف میں جہاں دریا اترتا ہے (شاعری)‘ اور آئینہ خانہ (شاعری) شامل ہیں۔ ان کی کلیات ‘ کلیاتِ اختر حسین جعفری کے نام سے طبع ہوچکی ہے۔

نصیر احمد ناصر کا شمار عصرِ حاضر کے ان جدید نظم نگاروں میں ہوتا ہے جن کا خاص رجحان کائنات اور اس کے دیگر لوازمات کی طرف ہے۔ ان کے ہاں کائنات کے تمام تر

مباحث کا خوب صورت بیانیہ ملتا ہے۔ ان کی تصانیف میں دسمبر اب مت آنا (شاعری)' جدائی راستوں کے ساتھ چلتی ہے (شاعری)' پانی میں گم خواب (شاعری)' عرابچی سوگیا ہے (شاعری) اور زرد پتوں کی شام (شاعری) شامل ہیں۔

ڈاکٹر جواز جعفری(پ ۱۹۶۴ء) موجودہ عہد کے ممتاز شعرا میں سے ہیں جو ' امنِ عالم کی نظریاتی شاعری اور کائناتی تفکر کے حوالے سے اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی شاعری میں پہلی دفعہ ہمیں اس کائنات سے باہر نکل کر دوسری دنیائوں کی سیر کا احساس ملتا ہے۔ ان کی اہم تصانیف میں اثاثہ' کلیاتِ اقبال ساجد(مرتب)' مٹھی میں ترا وعدہ (شاعری)' دہلیز پہ آنکھیں (شاعری)' اک ہجر جو ہم کو لاحق ہے (شاعری)' محبت خسارہ نہیں ہے (شاعری)'موت کا ہاتھ کلائی پر ہے (شاعری WRIST OF LIFE IN THE ' (CLUTCHES OF DEATH(شاعری)' اردو شاعری کے مغربی دریچے (تحقیق)' خاک سے اٹھنے والا فن (تحقیق موسیقی و دیگر فنونِ لطیفہ)' عمرِ رواں سے پرے (شاعری) شامل ہیں۔اگرچہ بنیادی طور پر ان کی شاعری میں امنِ عالم کی تڑپ دکھائی دیتی ہے لیکن وہ نہ تو محبت کی نرماہٹوں سے دور محسوس ہوتے ہیں اور نہ ہی جدید علوم سے۔ اسی لیے جاوید شاہین اُن کی شاعری کو ''وسیع کینوس کی شاعری''قرار دیتے ہیں۔

)''ڈاکٹر جواز جعفری کی) نظموں (کے دوسرے حصے)کا تعلق کائنات کے ان سربستہ بھیدوں سے ہے جنھیں سائنس اپنی حیرت ناک ترقی سے انسانی ذہنوں پر کھول رہی ہے۔ نیرنگیِ عالم نے ازل ہی سے انسان کو اپنے سحر میں گرفتار کیے رکھا ہے۔ فطرت کے رموز جاننے کی اسے بے پناہ لگن رہی ہے۔ ۔جوازجعفری کی سائنس کے انکشافات کے حوالے سے لکھی ہوئی نظمیں ایک بالکل نیا اور تازہ شعری تجربہ ہیں۔ ان کا اسلوبِ بیان بھی عام اسلوب سے ہٹا ہوا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ فقط شاعر کے لیے ہی نئی بات کہنا ممکن ہوتا ہے۔ وہ لفظوں کو عام زبان سے نکال کر شاعری میں نیا جنم دیتا ہے۔''(۷(

''جوازجعفری کی شاعری میں ایک متبادل دُنیا کا خواب بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی شاعری میں کائنات کے اسرارورموز سے متعلق بڑے خوب صورت اشعارملتے ہیں۔ ان اشعار میں ژرف نگاہی بھی ہے اور بیان کا ہنر بھی۔ جواز نئی نسل کے شعرا میں فکری اعتبار سے بہت توانا اور نمایاں ہیں۔ ''(۸(

سیّد مبارک شاہ کے تینوں شعری مجموعے 'جنگل گمان کے (۱۹۹۳ء)، ہم اپنی ذات کے کافر (۱۹۹۵ء) اور مدار نارسائی میں (۱۹۹۸ء)کائناتی شعور کے حوالے سے اہمیت کے حامل ہیں ۔ ان کے شاعری غزل اور نظم دونوں کو محیط ہے مگر اس مقالہ کا تعلق ان کی نظموں سے ہے۔

عبدالرشید کا تعلق بھی جدید اردو نظم کے اہم شعرا سے ہے۔ ان کا زیادہ تر فکری اثاثہ نظم کی صورت میں ہے۔ ان کی اہم تصانیف میں اپنے لیے اور دوستوں کے لیے نظمیں (شاعری)' انور ادیب کے لیے نظمیں (شاعری)' نیند'موت اور بارش کے لیے نظمیں(شاعری)' بنکاک میں اجنبی (شاعری)' خزاں اور میں (شاعری)' پھٹا ہوا بادبان (شاعری)' چار پرندے (شاعری)' اور انی کنت من الظالمین (شاعری) شامل ہیں۔

جاوید انور بھی اس سلسلے کے ایک اہم ادیب اور شاعر ہیں۔ ان کی اہم تصانیف میں بھیڑیے سوئے نہیں (شاعری)' اشکوں میں دھنک (شاعری)'اور شہر میں شام (شاعری)شامل ہیں۔ اسی طرح عابد ودود برطانیہ میں مقیم جدید اردو نظم گوشاعر ہیں جن کے ہاں کائناتی

عناصر کا اظہار ملتا ہے۔ ان کی تصانیف میں کڑی دھوپ کا مسافر (شاعری) اور زرِ خاک (شاعری) شامل ہیں۔

جاوید شاہین بھی متنوع ادبی جہات کی حامل شخصیت ہیں۔ ان کی اہم تصانیف میں ہندو کش کے قبائل (تاریخ)، ایک دیوار کی دوری (ناول)، مانیں نہ مانیں (مترجم)، گفتگو اور تقریر کا فن (مترجم)، صبح سے ملاقات (شاعری)، جاگتا لمحہ (شاعری)، میرے ماہ و سال (یادداشتیں)، زخمِ مسلسل کی ہر ی شاخ (شاعری)، دیر سے نکلنے والا دن (شاعری)، محراب میں آنکھیں (شاعری)، ہوا کا وعدہ (شاعری) اور نیکیوں سے خالی شہر (شاعری) شامل ہیں۔ان کی کلیات عشقِ تمام کے نام سے چھپ چکی ہے۔نیز ان کی مرتبہ کتاب ''آٹھ غزل گو'' نئی غزل کے نمائندہ شاعروں کے انتخاب اور تنقیدی جائزے پر مشتمل ایک اہم ادبی دستاویز ہے۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی جاوید شاہین کے متعلق رقم طراز ہیں:

''جاوید شاہین کی غزلیں دیکھیے، آپ کو ایک ایسا شاعر ملے گا جواپنے فن کے اعتبار سے موجودہ دور کے ان تمام غزل گو شاعروں سے مختلف ہے جو اپنے آپ کو نیا کہتے ہیں، لیکن سوائے اجنبی الفاظ کے موقع بے موقع استعمال کے، ان کے ہاں کسی قسم کے نئے پن کا احساس نہیں ہوتا۔''(۹(

ڈاکٹر جواز جعفری کی رائے کے مطابقکائنات تو خیر ایک بہت بڑا موضوع ہے انسانوں کی اکثریت تو اپنے سیارے کے بارے میں بنیادی سوالات اٹھائے بغیر مر جاتی ہے، مگر جاوید شاہین اس خوب صورت اور حیرت افزا کائنات کو ایک معصوم بچے کی طرح دیکھتا ہے اور ایک فلسفی کی طرح درست سمت میں سوال اٹھاتا ہے۔ یہی حیرت، تجسس اور تفکر اس کی شاعری کو عالمگیر زاویہ عطا کرتے ہیں۔ سب سے پہلے اس نے کائنات کے حوالے سے اس اہم ترین سوال پر غور کیا ہے جو آج بھی بڑے بڑے دانشوروں، فلسفیوں اور سائنس دانوں کو تنگ کیے ہوئے ہے۔ جاوید شاہین اس سوال پر ایک فلسفی اور سائنسدان کی طرح غور کرتا ہے اور کائنات کے تخلیقی عمل کی وضاحت کے علاوہ کائنات آشنائی کا دعویدار بھی ہے۔

عامر سہیل بھی ایک اہم جدید اردو شاعر ہیں۔ ان کی تخلیقات میں مشہدِ عشق (شاعری)، تیوہاڑ کا پانی (شاعری)، اور لبادہ (شاعری)شامل ہیں۔ جب کہ اسلام آباد کی سرزمین سے تعلق رکھنے والے نوجوان شعرا میں زاہد امروز کا نام کائناتی تفکر کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی شعری کاوشوں میں جدید جاپانی شاعری (مترجم)، خود کشی کے موسم میں (شاعری) اور کائناتی گرد میں عریاں شام شامل ہیں۔

اظہر غوری بھی ان جدید اردو نظم نگاروں میں شامل ہیں جنھوں نے زیادہ تو نہیں لکھا لیکن بہت اچھا لکھا۔ اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے ہیں۔ ان کی تصانیف میں سیان دی کتھا (پنجابی شاعری) اور اظہر غوری کی نظمیں (غیر مشروط محبت) '(شاعری) شامل ہیں۔ اشفاق حسین کینیڈا میں مقیم جدید نظم نگار ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ایک اچھے محقق اور نقاد بھی ہیں۔ ان کی تصانیف 'میں گیا وقت نہیں ہوں (شاعری)، پذیرائی (شاعری)، فیض ۔ایک جائزہ (تحقیق)، فیض کے مغربی حوالے (تحقیق)، اعتبار (شاعری)، فیض احمد فیض۔شخصیت اور فن (تحقیق)، آشیاں گم کردہ (شاعری)، احمدفراز۔ یادوں کا اک ورق (یادداشتیں)'اور شہرِ علم کے دروازے پر ہم اجنبی ہیں (شاعری) پر مشتمل ہیں۔

سلیم شہزاد ایک جدید اردو نظم نگار اور محقق کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی تصانیف میں انیس ناگی۔نئے ادب کا معمار(تحقیق)' قسم ہے کفارے کی (شاعری)' اور ماسوا(شاعری) شامل ہیں۔ افتخار نسیم امریکہ میں مقیم شاعر' کالم نگار اور افسانہ نگار ہیں۔ ان کی تخلیقات میں شبری (افسانے)' افتی نامہ (افسانے)' ایک تھی لڑکی (افسانے)' نرمان (شاعری)' اور غزال (شاعری) شامل ہیں۔

افضال احمد سید' کائناتی تفکر کے حوالے سے جدید اردو نظم کا ایک معتبر حوالہ ہیں۔ ان کی تصانیف میں دوزبانوں میں سزائے موت (شاعری)'اور خیمۂ سیاہ (شاعری) شامل ہیں۔ ان کی کلیات مٹی کی کان کے نام سے طبع ہوچکی ہے۔ احمد صغیر صدیقی بھی عہدِ حاضر کے ممتاز نقاد' افسانہ نگار اور شاعر ہیں۔ ان کی تخلیقات میں تجرید(شاعری)' گوشے اور اجالے (تنقید)' ادکھ کھلی کھڑکیاں (افسانے)' لمحوں کی گنتی (شاعری)' اور اطراف (شاعری) شامل ہیں۔

حسین صمدانی کا تعلق بھی جدید اردو نظم نگاروں کے گروہ سے ہے۔ ان کا مجموعۂ کلام ''بارزِ خواب'' کے نام سے ہے اور اس کا مرکزی فکر نفسیاتی ہے۔احمد فقیہہ ان نوجوان شعرا میں شامل ہیں جن کی سوچ کائنات کے لوازمات پر ہے۔ ان کی اہم تصانیف میں ڈھیر زرد پتوں کا (شاعری۔قطعات)' شہرِ افسوس میں (شاعری)' بادشاہ ننگا ہے (شاعری)' اور حرفِ انکار (شاعری) شامل ہیں۔ اعجاز رضوی بھی ایک اہم جدید اردو نظم نگار' خاکہ نگار اور ادیب ہیں۔ ان کی تصانیف میں کلوز اپ (خاکے)' یہ مجھ سے کون بچھڑا ہے (خاکے)' خوف اور اداسی کی نظمیں (شاعری)' بہت سے دکھ ہیں(شاعری)' اور سفر واجب ہوا (شاعری) شامل ہیں۔

مبارک احمد بھی غزل و نظم کے میدان کے اہم شناور ہیں جنھوں نے بیسویں صدی کی آخری دہائی میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ان کی کتاب ''کلیاتِ مبارک'' متنوع ہئیتوں اور افکار کی حامل ہے۔ سماجی شعور کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں بہت سے کائناتی مباحث بھی ملتے ہیں۔

سید غلام حسنین بخاری (پ ۱۹۵۱ء)کا نام بھی کائناتی تفکر کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔ ہمیں ان کے ہاں کائناتی تفہیم کا بہت خوب صورت ریاضیاتی بیانیہ ملتا ہے۔ ان کا شعری سفر ''وہ ایک لمحہ''،'' سیار آخر سے آگے جہاں'' ''کہکشانی پازیبیں' ' ''زمان اور مکان۔دوجزیرے'' '' آشعوری سیارہ گاہیں' ''' مہرِ منیر' ' '' الا بسلطٰن'' اور'' نو'' کو محیط ہے۔وہ اس کائنات کے مستقبل پر گہری نظر رکھتے ہیں اور مستقبل کی دنیا کی پیش قیاسی کا فریضہ بھی سرانجام دیتے ہیں۔''زماں و مکاں دو جزیرے'' حسنین بخاری کا چوتھا شعری مجموعہ ہے۔ خواجہ محمد زکریا اس مجموعے کے تعارف میں رقم طراز ہیں:

''زماں و مکاں دو جزیرے'' کی نظمیں ایک جرأت مند شعری تجربے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ تیزی سے بدلتی ہوئی کائنات کا ادراک کرتے ہیں تو ایک طرف حیرت میں ڈوب جاتے ہیں۔ دوسری طرف یہ ترقیاں انھیں نئی نئی امنگوں اور خواہشوں سے آشنا کر کے انھیں رجائیت کی طرف مائل کرتی ہیں۔ تیسری طرف متعدد ایجادات نسلِ انسانی کے معدوم ہو جانے کا خوف بھی پیدا کرتی ہیں۔ چنانچہ یہ شاعری قاری کوبہ یک وقت نئے تحیرات سے نئی امیدوں اور نئے خطروں کی جھلکیاں دکھائی ہے۔ مگر وہ ایک انسان دوست ہیں۔ وہ چاہتے ہیں

کہ ان ترقیات کی سمت انسانی فلاح و بہبود کی طرف ہو گی تو بات بنے گی ورنہ یہ سب کچھ اکارت چلا جائے گا۔‘‘(۱۰(

’’زماں و مکاں دو جزیرے‘‘ کے دیباچے میں آغا سہیل ‘حسنین بخاری کے ادبی مقام کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’حسنین بخاری نے جس خلوص سے اپنے فن کو بازارِ ادب میں پیش کیا ہے اور اسے جوہرشناس نگاہوں کی ضرورت ہے۔‘‘(۱۱(

’’آشعوری سیارگاہیں‘‘ حسنین بخاری کا پانچواں شعری مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کے آغاز میں احمد ندیم قاسمی، ظہیرکاشمیری ، خورشید رضوی اور ڈاکٹر آفتاب احمد ملک کے ’’تاثرات‘‘ شامل ہیں۔ احمد ندیم قاسمی حسنین بخاری کے سائنسی شعور کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

’’حسنین بخاری نے انسانی زندگی میں سائنس کی ہمہ گیر شوکت کے علاوہ فضا اور خلا بل کہ پوری کائنات کے حقائق کو اپنی نظموں میں منتقل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔‘‘(۱۲(

حسنین بخاری کے کائناتی تفکر کو جدید سائنس کے تناظر میں دیکھتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا رقم طراز ہیں:

’’بیسویں صدی نے ایک اور کام یہ کیا ہے کہ چاروں قوتوں یعنی مضبوط نیوکلائی قوت، کم زور قوت، الیکٹرو میگنیٹک قوت اور کششِ ثقل قوت کو ایک ہی ’’قوت‘‘ ثابت کرنے کی سعی کی ہے۔ یعنی ’’وحدت‘‘ کا پرچم بلند کر لیا ہے۔ لہٰذا جو منظر نامہ ابھرا ہے وہ مابعد الطبیعیات کے تحت ابھرنے والے منظر نامے سے کئی سطحوں پر مشابہ ہے۔۔بیسویں صدی میں انسان کسی ایک ملک کا شہری ہونے کے ساتھ ساتھ کرۂ ارض کا شہری بھی بن گیا ہے اور وہ دن اب زیادہ دور نہیں جب وہ ’’کائنات کا شہری‘‘ بھی بن جائے گا۔ قدیم یونان کے شہری کائنات کو Kosmos کہتے تھے جس کا مطلب تھا تنظیم یا Order! لہٰذا جب انسان کائنات کا شہری بنے گا تو لازم ہے کہ ایک نئےOrderکو وجود میں لائے گا۔ چونکہ شاعری میں آنے والے زمانوں کی پرچھائیاں سب سے پہلے منعکس ہوتی ہیں اس لیے ا س امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ شاعری اس نئے آرڈر کو سب سے پہلے محسوس کرنے کی سعادت حاصل کرے گی۔ حسنین بخاری قابلِ مبارک باد ہیں کہ وہ اُس کارواں میں شامل ہو گئے جو سائنس کی مدد سے کائنات کا شعری عرفان حاصل کرنے کے لیے رواں دواں ہے۔‘‘(۱۳(

ڈاکٹر نعیم احمد حسنین بخاری کو ’’کائناتی شعور کا ترجمان‘‘ قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

’’حسنین بخاری کی شاعری دراصل ایک نئے جمالیاتی زاویۂ نگاہ کی تلاش ہے۔ جس میں عصرِ حاضر کا شعور، سائنسی انکشافات اور روایتی اقدار باہم دگر مدغم ہوں۔ ان کے اشعار پڑھتے ہوئے قاری آنے والے دور کے ابتدائی جھونکوں کا لمس محسوس کرتا ہے۔‘‘(۱۴(

کیپٹن شہزاد نیئر پاک فوج سے متعلق نوجوان شاعر ہیں ان کا مجموعۂ کلام ’’برفاب‘‘ کے نام سے سامنے آچکا ہے اور ان کے ہاں کائنات کے موسمیاتی حوالوں کا خوب صورت ذکر ملتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا شہزاد نیئر کی منظومات کے مجموعے ’’برفاب‘‘ کے متعلق (فلیپ پر) لکھتے ہیں:

’’شہزا دنیئر کی ان نظموں کا مرکزی اور کلیدی امیج انتہائی ٹھنڈے گہراؤ سے عبارت ہے جسے اس نے حبسِ تاریک، افلاک کا پنجرہ، برف زار، کنڈ، چھتنار کا سایہ اور بیضہ دانی ایسی تراکیب اور الفاظ سے نشان زد کیا ہے۔ ایسے تمام اشارات میں قدر مشترک منجمد کر دینے والی ’’ٹھنڈک‘‘ ہے جو اساطیری گہراؤ کے مماثل ہے؛ مگر شہزاد نیئر نے اس ٹھنڈک کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے۔ اس نے محبت کی ایک نظر اور تسلی کے دو حروف کی حرارت سے اس انجماد کے بطن سے اکھووں کے پھوٹنے کا منظر بھی دکھایا ہے؛ یہ گویا شاعر کے باطن کے پگھلنے اور کشتِ ویراں کو سیراب کرنے کی طرف ایک بلیغ اشارہ ہے جو تخلیقی کارکردگی کے منظر نامے کو نظروں کے سامنے لے آتا ہے یوں لگتا ہے جیسے شاعر اپنے اندر کے چاہ یوسف سے باہر آنے اور کور آنکھوں میں بینائی کو متحرک کرنے کی کوشش میں ہے۔ یہی تخلیقی عمل کا عطر ہے۔‘‘

پروفیسر ڈاکٹر محبوب الدین (پ۔۱۹۳۹ء) پاکستان کے نام ور سائنسدان ڈاکٹر عطا الرحمٰن کے استاد اور عملی کیمیا دان ہیں۔ محبوب الدین محبوب کا تعلق اجمیر کے ایک علمی و ادبی خانوادے سے ہے۔ ان کی شاعری میں محبت کی دل نشین کسک کے ساتھ کائناتی تفکر بھی اپنی جولانیاں دکھاتا ہے

کنور اخلاق محمد خان(پ۔۱۹۳۶ء)اردو کی ادبی دنیا میں شہریار کے قلمی نام سے جانے جاتے ہیں۔ وہ ہندوستان کے جدید اردو نظم نگاروں میں اہم مقام رکھنے کے علاوہ بہ طور فلمی شاعر بھی کافی نام کما چکے ہیں۔ شہریار کی شاعری میں سماجی شعور کے ساتھ ساتھ کائناتی تفکرات کی پرچھائیں بھی دکھائی دیتی ہے۔ان کے چھے شعری مجموعے’’اسمِ اعظم‘‘،’’ ساتواں در‘‘،’’ ہجر کے موسم‘‘،’’ خواب کا دربند ہے‘‘،’’ نیند کی کرچیاں‘‘ اور’’ شام ہونے والی ہے‘‘ کے نام سے موجود ہیں۔ ان کا کلیات بھی چھپ چکا ہے۔

ڈاکٹر صفی حسن برمنگھم میں موجود ایک خوش افکار اور عملی سائنس دان ہیں۔ ان کے تین شعری مجموعے ’’کچی نیند کے گہرے خواب‘‘ ’’رنگ سب چراغاں تھے‘‘ اور ’’ اگر ہم دور سے دیکھیں کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ ایک عملی سائنس دان ہونے کے باوجود ان کا ادب سے لگائو اور بلند فکری یقینا نئے آفاق کھولنے اور کائناتی گتھیاں سلجھانے میں معاون ہے۔

چند ایک اہم شعرا کے اس مختصر تعارف کے بعد اس مقالہ میں ہم سائنس دانوں اور شعرا کے حوالے سے چند بنیادی سوالات پر بحث کریں گے مثلاً کائنات کیسے وجود میں آئی؟ کہکشائیں‘ستارے اور سیارے کیسے تشکیل پاتے ہیں؟ کائنات کن اصولوں کے تحت کام کرتی ہے؟ کائنات کی ماہیت کیا ہے؟ زندگی کیسے وجود میں آئی؟ کیا زندگی نے زمین پر آغاز کیا تھا یا یہ کسی اور سیارے سے زمین پر منتقل ہوئی؟ موت کیا ہے؟ وقت کیا ہے؟ کائنات کا انجام کیا ہے؟ ہماری اس معلومہ کائنات میں انسان اور خدا کا مقام کیا ہے؟

کیمیائی اور حیاتیاتی نقطۂِ نظر سے ‘ہماری زمین اور اس پر موجود زندگی انسان کے بنیادی سوالات رہے ہیں۔ انھی سوالات کے جوابات کی تلاش میں خدا یعنی خالق کا کردار بھی اس کا حصہ بنا ہے۔ اس ضمن میں تخلیق کے حوالے سے سب سے اہم نظریۂِ تخلیق BIG BANG THEORYیا عظیم دھماکا کہلاتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق ابتدا میں ہماری کائنات ایک عظیم گولے کی صورت میں تھی جس کا اندرونی درجہ حرارت بہت زیادہ تھا ۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ یہ گولا ہمارے نظامِ شمسی کے برابر تھا اور بعض کا کہنا ہے کہ

یہ مواد سوئی کے ناکے جتنا تھا۔ اس اندرونی درجہ حرارت کی بہ دولت اس گولے کے اندر دباؤ بڑھتا گیا اور آخر کار یہ اس حد تک جا پہنچا کہ ایک عظیم دھماکے کے ساتھ پھٹ گیا۔ اس گولے کے چیتھڑے فضائوں میں بکھر گئے۔دھماکوں کا یہ عمل تسلسل کے ساتھ جاری رہا جس سے مختلف کائناتی اجسام بنتے بگڑتے رہے۔ ذیلی سطح پر ہونے والے ایسے ہی ایک دھماکے سے ہمارا نظامِ شمسی بنا۔ کچھ حصے درمیان میں منجمد ہوگئے اور کچھ نے اس کے گرد تیرنا شروع کردیا۔ وسطی ٹکڑا سورج کہلایا اور باقی اس کے گرد گھومنے والے ٹکڑے مختلف سیارے کہلائے۔ جن میں سے ایک ہماری زمین ہے۔اسی نظریہ کا پرچار جدید اردو نظم کے شعرا کے ہاں بھی دکھائی دیتا ہے

کون پوچھے گا کہ یہ رنگ سے معمور خلا
اس گھڑی کون سے عالم میں تھا
جب کوئی صدا
کسی جانب سے نہیں آتی تھی!
اور پھر شور اٹھا
ایک دھماکا سا ہوا
ہر طرف آگ کی یلغار ہوئی
ہر گھڑی رنگ بدل لینے پہ تیار ہوئی
اور رنگ ہی رنگ
اور سب رنگوں کا حاصل وہی بے رنگی سی
جس میں سب رنگ ہیں موجود
مگر دیکھنے والی آنکھیں
کہیں موجود نہیں (شہزاد احمد:رنگ چیزوں میں ہیں موجود)(۱۵)

سید مبارک شاہ تخلیق سے پہلے کے مرحلے پر نظر ڈالتے ہیں تو انھیں تبدیلیوں کا ایک سلسلہ دکھائی دیتا ہے جس نے ہماری زندگی کو یہاں تک پہنچایا اسی لیے وہ گرد اور دھویں میں لپٹی اس کائنات کی تخلیق کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

یہ بزم انجم جواب ہماری نگاہ میں ہے
کبھی اندھیرے کی کوکھ میں تھی
دہکتے سورج سے جھڑنے والی ذرا سی دھرتی
ذرا سی مدت میں
اپنے چہرے کے نقش کیسے بدل چکی ہے

جو لمحے لمحے میں خلیہ خلیہ بدل رہا ہے
ہمارا حلیہ بدل رہا ہے (سید مبارک شاہ: میں سوچتا ہوں)(۱۶)

اس نظریے کو مذہبی سطح پر شدید قسم کے احتجاج کا سامنا کرنا پڑا ۔ تاہم گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ جیسے جیسے ذہنی آفاق نے نئی بلندیوں کو چھوا ہمارے ہاں عام سطح پر بھی یہ نظریہ قبولِ عام سے سرفراز ہوتا چلا گیا۔ اقبالؔ جو ایک مذہبی فلسفی کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں، وہ بھی اس نظریہ کا اظہار یوں کرتے ہیں:

بنایا ذرّوں کی ترکیب سے کبھی عالم

خلافِ معنیِ تعلیمِ اہلِ دیں میں نے
لہو سے لال کیا سیکڑوں زمینوں کو
جہاں میں چھیڑ کے پیکارِ عقل و دیں میں نے
سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی
اسی خیال میں راتیں گزار دیں میں نے)اقبال:سرگزشتِ آدم)(۱۷(

یہ اس وقت تک کی بات ہے جب تک ہماری زمین ہی کل کائنات سمجھی جاتی تھی۔ بعد ازاں یہ واضح ہوا کہ ہماری زمین تو ہمارے نظامِ شمسی کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے اور ہمارے نظامِ شمسی جیسے کروڑوں نظام تو صرف ہماری ہی کہکشاں میں موجود ہیں جو کہ MILKY WAYکہلاتی ہے۔ اور اس کائنات میں کہکشاؤں کی تعداد ہمارے تصوّر سے بھی بالاتر ہے۔ کبھی اس کائنات کو سکڑتا ہوا سمجھا جاتا رہا لیکن جدید تحقیق یہ بتاتی ہے کہ ہماری یہ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے ۔ اس نظریہ کا تفصیلی بیان باب اوّل میں کیا جاچکا ہے۔ پھر جب سائنسی تحقیق کا دائرہ وسیع ہوکر ہماری زمین سے باہر دوسرے سیاروں تک پہنچا تو نئے نئے تناظرات سامنے آنے لگے۔ عقل حیرت سے اس وسیع و عمیق کائنات کو دیکھتی رہ گئی۔ خالق کا تصوّر شکوک کی زَد میں آنے لگا ۔ جب انسان نے دیگر سیاروں پر پہنچنے کی کوششیں کیں اور کہنے کی حد تک اس میں کامیابی بھی حاصل کر لی‘ اگرچہ یہ بات شک و شبہ سے بالاتر نہیں ہے کیوں کہ اس سلسلے میں ایسے شواہد بھی سامنے آنے لگے ہیں جو اس بات پربہ ضد ہیں کہ انسان کی چاند اور دیگر سیاروں تک رسائی صرف ایک تماشا ہے اور حقیقت سے اس کا دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔ تاہم یہ کوششیں جاری تو اک زمانے سے ہیں اور اس بات میں کوئی شک نہیں ہے۔

اگلا سوال انسان کی اپنی ذات کی حقیقت پر اٹھایا گیا۔ اس سلسلے میں سب سے بنیادی بات یہ کی گئی کہ جب عظیم دھماکا ہوا تو اس زمین کا درجۂ حرارت بہت زیادہ تھا جو وقت گزرنے کے بعد آہستہ آہستہ کم ہوتا چلا گیا۔ ابتدا میں یہ درجۂ حرارت اتنا زیادہ تھا کہ اشیا کا اپنے وجود کو قائم رکھنا ناممکنات میں سے تھا۔ زندگی کے ظہور کی بنیادی شرائط میں سے سب سے اہم بات ایک ایسا درجۂ حرارت ہے جس پر اشیا مایع حالت میں رہ سکیں ۔ اس درجۂ حرارت کے حصول میں ہماری زمین نے کروڑوں سال انتظارکیا۔

کیسا ہنگامہ رہا صدیوں تلک
الحفیظ والامان
پھر کہیں جاکر سنی
نیلی فضاؤں نے اذاں
پھر کہیں جاکر ملی
آدمیت کو اماں)شہزاد احمد:شہادت)(۱۸(

جب زمین اس درجۂ حرارت تک پہنچ گئی تو پھر اس پر موجود مواد بھی صورت پذیر ہونے لگا۔ یہاں موجود ہائیڈروجن‘ نائٹروجن اور آکسیجن آزاد حالت میں سامنے آنے لگیں۔ ان تبدیلیوں کے باوجود فضا میں چھوٹے موٹے دھماکے جاری رہے جو آج بھی ہو رہے ہیں۔کائنات گھٹا ٹوپ اندھیروں میں مستور تھی۔ کہیں بھی کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔

کہیں لہراتے ہوئے دودھیا بادل تھے
کہیں ایسی سیہ راتیں تھیں

جن میں مہتاب نہ تھا
ٹمٹماتے ہوئے تارے بھی نہ تھے
وہ نظارے بھی نہ تھے
جو فقط رات کی تاریکی میں
کسی پرچھائیں کی مانند بہک جاتے ہیں
اپنے رستے سے بھٹک جاتے ہیں
اور پھر دور تلک جاتے ہیں)شہزاد احمد:تو کہیں ہے کہ نہیں)(۱۹(

ایسے میں اک دھماکے سے پیدا ہونے والے شعلے نے ہائیڈروجن اور آکسیجن کے ملاپ سے پانی پیدا کیا۔ یہ پانی جب بارش کی صورت میں برسا تو فضا میں موجود نائٹروجن کے ساتھ کیمیائی تعامل کے نتیجے میں امائینو ایسڈ پیدا ہوا۔ یاد رہے کہ امائینو ایسڈ کو مادۂ حیات بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ جان دار کی بنیادی اکائی اسی کو سمجھا جاتا ہے۔ یہ امائینو ایسڈ برستی بارش کے ساتھ سطحِ زمین تک پہنچا اور اس کی تہہ میں دب گیا۔ وہاں یہ کروڑوں سال تک پڑا رہا اور مختلف تبدیلیوں سے گزرتا رہا جس کی بہ دولت پہلا جان دار بیکٹیریا کی صورت میں پیدا ہوا۔

خواب دیکھنے کے لیے
نیندوں کی نہیں آنکھوں کی ضرورت ہوتی ہے
پروٹوزون (Protozoan) سے منش تک
کئی ملین سالوں کی ارتقائی نیند
محض آنکھیں کھولنے کا عرصہ ہے
)نصیر احمد ناصر:خواب اور محبت کی کوئی عمر نہیں ہوتی)(۲۰(

پانیوں کو زمیں نہیں ملتی
حاملہ بدلیاں کہاں برسیں
سائونی رُت کہیں نہیں ملتی)نصیر احمد ناصر)(۲۱(

ان اشعار میں پروٹوزون ابتدائی جان دار ہیں اور بدلیوں کے حاملہ ہونے کے بیان سے مراد ان میں امائینو ایسڈز کا پایا جانا ہے جو کہ جان دار خلیے کی بنیادی اکائی ہے‘ اور سائنس دانوں کے بہ قول یہ مادہ برستی بارش کے سبب زمین تک پہنچا اور اولین جان دار کی تخلیق سے پہلے ایک لمبا عرصہ زمین کے سینے میں دفن رہا۔ اس جان دار کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ آکسیجن کی غیر موجودگی میں بھی زندہ رہ سکتا تھا یعنی اس کا سانس لینے کا طریقہ AN-AEROBIC RESPIRATION کہلاتا تھا۔ اس کی دوسری بڑی خاصیت یہ تھی کہ اپنی نسل کو آگے بڑھانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس بیکٹیریا نے مرنے سے پہلے خود کو تقسیم کرتے ہوئے نیا جان دار تخلیق کیا۔ اس طرح ایک سے دو‘ دو سے چار‘ چار سے آٹھ جان دار پیدا ہونے لگے اور یہ سلسلہ روزافزوں انداز میں آگے بڑھنے لگا۔

میں کئی برس زمین کے سینے پر لیٹا رہا ہوں
اس کا لرزتا بیمار دل میرے وجود میں دھڑکنے لگا ہے
مٹی کی بھربھراہٹ سے بنے انسان!
میں نے زندگی کو زمین کے ہر ذرّے میں سنا ہے)زاہد امروز:زمین کے ہنکارے)(۲۲(

نصیر احمد ناصرؔ زمین کو ماں کی صورت میں دیکھتے ہیں جس کااولین فریضہ تخلیق ہے۔ وہ اپنی تخلیقات سے اتنی محبت رکھتی ہے کہ اس کی تکمیل سے پہلے ہی اس کے لوازمات کا سامان اکٹھا کرنا شروع کردیتی ہے‘ جیسے ایک ماں بچوں کی پیدایش سے پہلے ان کے لیے کپڑوں کا انتظام شروع کر دیتی ہے۔اسی طرح زمین بھی انسان اور جان دار کی تخلیق سے پہلے ان کی زندگی کے لوازمات کا انتظام کرتی رہی ہے‘ جس میں سب سے اہم سبزہ اور روئیدگی ہے جس کی بہ دولت زندگی اتمام و کمال کو پہنچ سکتی ہے۔

زمیں ماں ہے
ہر اک ماں کی طرح
تخلیق سے پہلے ہی بچوں کے لیے
سرسبز خوابوں کی ردائیں بُنتی رہتی ہے (نصیر احمد ناصر:سٹی ہائٹس)(۲۳)

اس سلسلے میں بھی دو سائنسی نظریات ہیں ایک BIOGENSIS اور دوسرا A-BIOGENSISکہلاتا ہے۔ پہلے نظریے کے مطابق جان دار چیزیں صرف جان دار چیزوں سے ہی پیدا ہو سکتی ہیں جب کہ دوسرے نظریے کے مطابق جان دار چیزیں بے جان چیزوں سے بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔ خیر اس سلسلے میں حتمی فیصلہ پاسچر کے تجربات سے سامنے آیا کہ کم ازکم عصرِ حاضر میں ایسا ممکن نہیں ہے کہ بے جان چیزوں سے جان دار تخلیق ہو سکیں۔ پھر ان جان داروں میں تنوع کا سلسلہ شروع ہوا تو اس پر بھی مختلف نظریات سامنے آئے جن میں زیادہ اہمیت و شہرت لامارک اور ڈارون کے نظریات نے پائی۔ لامارک کا کہنا تھا کہ جان داروں کی مختلف اقسام اپنے فطری ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کا نتیجہ ہیں۔ ہماری زمین پرمختلف طرح کے جان دار پائے جاتے تھے جو اپنی جسمانی تبدیلیوں کو اگلی نسل تک منتقل کردیتے اس طرح اگلی نسل پہلی نسل سے بہتر ہوتی۔ اس کے نظریے کے مطابق زرافوں کی گردنیں پہلے چھوٹی ہوا کرتی تھیں جب کہ سانپ کے پائوں بھی ہوا کرتے تھے۔ شاعر اس ارتقائی منزل کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہے:

یہاں پر آدمی جنگل بنائے
صنوبر کے درختوں کی طرح پھیلے ہیں
جن کا ارتقا گردن کے لمبے ہونے میں ہے
اور پائوں تو زمیں نے باندھ رکھے ہیں
آنکھ کی سرحد میں کوئی انساں
اب باقی نہیں ہے
میں تنہا رہ گیا ہوں
سوچتا ہوناب کہاں جائوں!
یا مرجائوں؟ (زاہد امروز:ذات کے مرکزِ ثقل پر)(۲۴)

سائنسی حلقوں میں اس کی اس بات کو یہ کہہ کر رد کردیا گیا کہ تبدیلیاں بنیادی طور پر دو طرح کی ہوتی ہیں جیسا کہ جسمانی خلیات دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک SOMATIC اور دوسرےGENETIC ۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ SOMATIC یا عام جسمانی خلیات میں ہونے والی تبدیلیاں کبھی بھی اگلی نسل کو منتقل نہیں کی جا سکتیں جیسا کہ AUGUSTUS WISEMENنے چوہوں کی اک نسل لے کر اس کی دُم کاٹ دی پھر اگلی پیدا ہونے والی نسل کے ساتھ بھی یہی کچھ کیا اور اس سلسلے کو بائیس نسلوں تک جاری

رکھا۔ لیکن نتیجہ وہی رہا کہ ہر نئی نسل دُم کے ساتھ ہی پیدا ہوئی۔ دوسری قسم GENETIC یا جینیاتی خلیات کی ہے یہ خلیات آئندہ نسل کو خواص کی منتقلی کا باعث ہوتے ہیں اور ان میں آنے والی تبدیلی اگلی نسل کو منتقل ہوتی ہے۔ اسی چیز کو بنیاد بناکر SIR CHARLES DARWIN نے اپنا نظریہ ارتقا پیش کیا جو کہ DARWINISM کہلاتا ہے۔

اس نظریے کے مطابق جان داروں کے جینز میں یا جنسی خلیات میں ہلکی پھُلکی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں جنھیں GENETIC MUTATION کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ تبدیلیاں اتنی کم اثر ہوتی ہیں کہ دو متصل جان دار نسلوں کے درمیان ان کا فرق نا ہونے کے برابر ہے۔ لیکن ان تبدیلیوں کا تسلسل آخر کار اک ایسی نسل پیدا کرتا ہے جو پہلی نسل سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس طرح مختلف نسلیں سامنے آتی ہیں اور وسائل کے حصول کے لیے ان میں اک جنگ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان میں سے جو طاقت ور ہو وہ زندہ رہتی ہے اور جو کم زور ہو اور ماحول کے ساتھ مطابقت نہ پیدا کر پائے وہ آخر کار ختم ہوجاتی ہے۔

کاش کہ تم تدریجی عمل کے دوران ہی جان لو کہ
زندگی کے ہوائی اڈے کے ہینگر پر
متعدد قابلِ مرمت طیارے رکے رہتے ہیں
ہوسکتا ہے کہ تم بھی گرائونڈ ہو چکی ہو' یا
گیراج کی زندگی بسر کررہی ہو' یا پھر قابلِ مرمت قرار دے کر
کسی مطالعاتی سیارچہ گاہ کے باہر نمائیشی تفریح کے طور پر کھڑا رکھا گیا ہو (اظہر غوری:دائرے)(۲۵(

یہ نظریہ جان داروں کے جسم میں پائے جانے والے ان اعضا کو بھی ٹھوس دلائل کی صورت میں پیش کرتا ہے جو آج بھی وجود کا حصہ تو ہیں لیکن فی الحال بے کار ہے۔ ایسے اعضا کو سائنسی اصطلاح میں VESTEGIAL ORGANS کا نام دیا جاتا ہے۔ تمام جان داروں میں ایسے سیکڑوں اعضا کا کھوج لگایا گیا ہے' جن کے بارے میں کہا جاتا تھا ہے کہ شاید یہ پہلے جان دار اجسام میں باقاعدہ کارکردگی کا مظاہرہ کرتے رہے تاہم بعد ازاں ان کی باقیات غیر فعال صورت میں جان دار اجسام میں آج بھی موجود ہیں مثلاً جسمِ انسانی میں موجود اپنڈکس' غیر فعال عضو ہے۔ اوپر مذکور نظم میں ایسے ہی اعضا کو ہینگر پر یا کسی عجائب گھر میں گرائونڈ شدہ طیارے سے تشبیہ دی گئی ہے۔

ڈارون نے اپنے اسی نظریہ کی بنیاد پر کہا کہ تخلیقِ انسانی بھی ایک مسلسل تبدیلی کی وجہ سے ہے۔ جیسا انسان آج ہمیں دکھائی دیتا ہے ' وہ ہمیشہ سے ایسا نہیں رہا ہے بل کہ مسلسل تبدیلیوں کی زد میں رہا ہے اور آج کی اس حالت کو پہنچا ہے۔ اس کے نظریے میں یہ بات انتہائی شہرت کی بلندیوں تک پہنچی کہ انسان بندر کی ارتقائی شکل ہے۔ انسان ' جو خود کو اشرف المخلوقات سمجھتا رہا ہے اس کے لیے اپنے اجداد کی طرف اٹھائے جانے والے اس سوال نے اسے ہلا کر رکھ دیا اور دنیا کا کوئی ایسا خطّہ نہیں جہاں ان نظریات پر سوال نہ اٹھایا گیا ہو یا اس کی صدائے باز گشت نہ سنائی دی ہو۔

شہریار اس حوالے سے زمین کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے زمین اور زندگی کے تعلق پر درج ذیل انداز میں سوال اٹھاتے ہیں۔

دھند کا ننھا نقطہ پھیل رہا ہے
اور افق اس کی زد میں ہے

میری آنکھیں دشت خلا میں
نور کی ایک لکیر کو بنتا دیکھ رہی ہیں
لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں
میری زمیں کس کی حد میں ہے‘‘ (شہریار: میری زمین)(۲۶(

زمین کی اسی اہمیت کو ظاہر کرتے ہوئے ڈاکٹر صفی حسن اسے موجودہ تناظر سے ہٹ کر دور بیٹھ کر اس کا مطالعہ کرنے پر اکساتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

’’اگر ہم دور سے دیکھیں
تو آب وگل کا یہ چھوٹا سا ٹکڑا آسماں کی بے کراں وسعت میں کتنا خوش نما لگتا ہے
جیسے دودھیا چادر پہ رنگوں کے قرینے ہوں
سمندر گہرے نیلے ہیں
بہت دل کش
کسی کی مدھ بھری آنکھوں کے نیلم کی طرح
جن میں
ازل کے خواب ٹھہرے ہوں‘‘ (صفی حسن: اگر ہم دور سے دیکھیں)(۲۷(

دنیا کی دیگر تہاذیب اور ادبی سرمایوں کی طرح جدید اردو نظم میں بھی ان سوالات کو اٹھایا گیا ہے اور ان کی وضاحت کی کوشش کی گئی ہے۔ ڈارون کے نظریۂ ارتقا کو خوب صورت انداز میں بیان کرتے ہوئے زاہد امروز اپنی ایک نظم بہ عنوان +++ = + میں رقم طراز ہیں کہ

ہم تین نہیں
میرا باپ
اپنے باپ کا
اور میں
اپنے باپ کا
ارتقا ہیں)زاہد امروز: +++ = +)(۲۸(

سید مبارک شاہ کی ایک نظم ’’ارتقا‘‘ کو بھی انسان کی تخلیق اور ارتقائی منازل کے ضمن میں ذرا ملاحظہ کیجیے تو تخلیق کے تمام ادوار بالکل واضح دکھائی دیں گے۔

’’خاک پر اک بوند ٹپکی
بوند جم کر لوتھڑا
اس لوتھڑے میں ہڈیاں
پھر ہڈیوں پر ماس آیا
ماس جس پر نقش ابھرے
نقش کو جنبش ملی
اور خامشی کی کوکھ خالی ہو گئی
چیخ پہلی گفتگو تھی
تھم گئی تو اس سے پھوٹاقہقہہ
جب تھک کے ٹوٹا قہقہہ
تب آخری آواز سسکی

جنبشیں ساکت ہوئیں
اور قبر کی خاموشیوں میں
نقش پگھلے، ماس اترا
ہڈیاں عریاں ہوئیں اور منہدم
لوتھڑا گل سڑ کے پھر سے بوند تھا
اور بوند دھرتی کھا گئی
ہائے میرے ا بتلاء کی انتہا ہی ابتدا تک آگئی‘‘ (سید مبارک شاہ: ارتقا)(۲۹(

چارلس ڈارون کے مطابق یہ کوئی مختصر ارتقائی عمل نہ تھا بل کہ اس کی تکمیل میں لاکھوں کروڑوں سالوں کا عرصہ لگا۔ جان دار پہلے سے زیادہ متنوع ہوتے چلے گئے۔ جان داروں میں آنے والے یہ تغیّرات بہت آہستگی سے رونما ہوتے تھے۔ ان کی رونمائی اتنی آہستہ تھی کہ کئی نسلوں کے بعد کوئی بہت ہی معمولی سی تبدیلی دکھائی دیتی ہے۔ ہزاروں نسلوں کے بعدکوئی ایسی واضح تبدیلی سامنے آتی ہے جو کسی نئے پن کا اظہاریہ بن سکے۔ ڈارون انسانی تخلیق کو بھی اسی ارتقائی عمل کی ایک کڑی قرار دیتے ہیں اور ان کے نزدیک انسان بندر کی اولاد ہیں۔ یہ سائنسی افکار عصرِ جدید سے تعلق رکھتے ہیں تو جدید نظم گو شعرا کے ہانبھی ان پر تفکر دکھائی دیتا ہے۔بہ قول ڈاکٹر جواز جعفری:

سُنتے ہیں کہ ماضی میں
حیوان ہمارے رشتہ دار تھے
پھر یوں ہوا کہ نیچر
اور زندگی کے درمیان ٹھن گئی
ہم نے جُہد البقاء کی گٹھڑیاں
سروں پر اُٹھائیں
اداس درختوں کی شاخوں سے لٹکتے گھروں پر
الوداعی نظریں ڈالیں
اور نامعلوم راستوں پر ہو لیے! (جواز جعفری:وائلڈ لائف اور تیسری دنیا)(۳۰(

حسین صمدانی اپنی نظم ’’اکیورس اور سی گلز‘‘ میں کائناتی تناظر میں ارتقا کے حامی دکھائی دیتے ہیں جہاں ایک شے کی موت دوسرے کو زندگی عطا کرتی ہے۔ دوسری طرف یہ نائٹروجن چکر کے معیارات کو بھی واضح کرتی ہے۔ اسے جس بھی سطح پر دیکھا جائے یہ کائناتی نظام کے طریقہ ہائے کار کو واضح کرتی ہے۔

’’زمین دوز
اپنی ساری دھوون
سمند رمیں بہا دیتی ہے
اس کے ذخائر پہ پلنے والے
ان کا ہتھیاری استعمال کرتے ہیں
فضا بے حد مہلک ہو چکی ہے
پروں کے ٹوٹنے کی ایک بیماری کے سبب
سمندری فرشتے مرتے جا رہے ہیں
اکیورس

ساحل سمندر پہ بنی اپنی ہٹ میں بیٹھا
یہ تماشا دیکھتا ہے
اور بالترتیب
غم کرتا ہے، شاعری کرتا ہے
یا اس ہی قسم کا کوئی اور
نیک تخلیقی کام---
ساتھ ہی ان ٹوٹے ہوئے پروں کو بھی جمع کرتا ہے
چپکے، چپکے
اپنے دنگ بھی بناتا ہے
جس روز سورج بجھ جائے گا یا
زمین پر جلائی گئی کاربن
سورج کا چہرہ ڈھانپ دے گی
تب اپنی ہٹ سے اڑتا ہوا
شعبدہ دکھلائے گا'' (حسین صمدانی: اکیورس اور سی گلز)(۳۱(

کائنات خالق کی نیرنگیوں کی گواہ ہے۔ اس کے مظاہر عقل سے ماورا ہیں۔ ان میں سے ایک اہم مظہر سرمائی نیند (WINTER SLEEP) ہے اسے HIBERNATION بھی کہا جاتا ہے۔ سرد خون کے جان ور اپنی زندگی کی بقا کے لیے ایک مخصوص عرصے کے لیے خود کو کیچڑ میںدفن کرلیتے ہیں اور مناسب وقت آنے پر پھر اٹھ جاتے ہیں۔ عموماً یہ نیند مہینوں کو محیط ہوتی ہے۔ کچھ جان دار تو ایسے ہوتے ہیں کہ سائنس کے مطابق وہ اپنے آپ کو قلموں کی شکل میں تبدیل کرکے یہ دورانیہ بیس بائیس سال بھی بغیر کچھ کھائے پیے گزار دیتے ہیں۔ شہزاد نیئر کی نظم میں اس عمل کا مطالعہ کیجیے کہ کس طرح انھوں نے خوب صورتی کے ساتھ اپنی زندگی کے تجربات کو نہ صرف بیان کیا ہے بل کہ ہماری کائناتی زندگی کے حوالے سے سورج اور اس کی توانائی کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا ہے۔

''میں صدیوں سے تنہا
گھٹن میں گندھے حبسِ تاریک میں سانس روکے پڑا ہوں
بدن کے غلیظ اور سیلن زدہ بل میں بے حس و حرکت
نم آلود مٹی میں لتھڑا ہوا ہوں

نہیں--- بِل کے باہر کا موسم
ابھی سازگاری پہ مائل نہیں ہے
ابھی ایسا سورج جہاں کے افق پر نمودار ہوتا ہے
جو میری پسلی میں
کرنوں کا نیزہ چبھو کر کہے:
اُٹھ کھڑا ہو!'' (شہزاد نئیر: ہائبرنیشن)(۳۲(

درج ذیل نظم میں شہزاد نیئر جہاں تخلیق کی بات کرتے ہیں وہیں وہ جدید سائنسی علوم کا وطیرہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ کس طرح کسی ایک فرد اک نطفہ ایک ادھار لی ہوئی اووری کی زینت بن کر اولاد کی تخلیق کا باعث بن سکتا ہے۔ وہ اسے ایک نیکی تو سمجھتے ہیں لیکن

اووری‘ جو تخلیق کے لیے اور ملاپ کے لیے سب سے اہم مقام ہے‘ کو دکھ کا گھر قرار دیتے ہیں۔ گویا فلسفیانہ سطح پر دیکھا جائے تو وہ زندگی کو ہی دکھ سمجھتے ہیں۔

قطرہ قطرہ... میں خود کو انڈیلوں
شکم، قوسِ محراب ہو
آسماں، گول گنبد بنے
میرے اندر تنے
جس کو دیکھوں تو آنکھیں تقدس جھپکنے لگیں!
منتظر آنکھ سے خطِ زیبا کھنچے
عکس رنگین ہو
عالم خواب میں
اس کی کوری سماعت کی انگنائی میں
میری آواز اترے تو پہچان لے
میری پہچان بدلے
مگر ’’اووری‘‘ گہرا دکھ ہے
جہاں سکھ کا بیضہ نہیں! (شہزاد نئیر)(SURROGATION :۳۳)

تخلیق اور پیدایش ‘ بہ ظاہر تو ایک ہی معنی رکھتے ہیں لیکن عموماً تخلیق سے مراد پہلی بار پیدا ہونا لیا جاتا ہے اور پیدایش سے مراد اس کا تسلسل اور دوام ہے۔ ادیبوں اور سائنس دانوں کے ہاں بھی ان دونوں تناظرات میں مختلف نظریات سامنے آتے ہیں۔ سائنس کا ایک نظریہ تو بے جان اشیا سے جان دار اشیا کی تخلیق ہے جوA-BIOGENSIS کہلاتا ہےدوسرا نظریہ اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ جان دار صرف جان دار چیز سے ہی پیدا ہوسکتے ہیں۔ یہ نظریہ BIOGENSIS کہلاتا ہے۔ لوئس پاسچر کے تجربات سے پہلے تک یہ دونوں نظریات ایک دوسرے سے ہمیشہ متصادم رہے تاہم اس کے تجربات سے سائنس نے یہ حتمی نتیجہ ضرور نکال لیا کہ کم از کم عہدِ حاضر مینبے جان سے جان دار کی تخلیق ممکن نہیں۔

سید مبارک شاہ کی نظم ’’ٹراؤٹ‘‘ بھی حیاتیاتی حوالے سے ایک اہم نظم ہے۔ اس میں ٹرائوٹ مچھلی کی فطرت کو استعاراتی معانی میں استعمال کرکے کائناتی چکر کو سمجھنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس طرح ٹرائوٹ پانی کی مخالف سمت میں سفر کرتی ہے کیا ہم بھی تخلیق سے عدم تخلیق کی طرف رواں ہیں:

راہ میں پھیلی ہوئی
ان اشتہا انگیز ڈوروں کو نہ دیکھ
دیکھ کیا یہ جستجو ہے آدمی کا پیٹ بھرنے کے لیے
اتنی زندہ زندگی ہے اتنی مردہ موت مرنے کے لیے؟‘‘ (ٹرائوٹ: سید مبارک شاہ)(۳۴)

جہاں تک پودوں کا تعلق ہے ان میں بھی نر اور مادہ کی تخصیص پائی جاتی ہے۔ تاہم کچھ پودے ایسے بھی ہیں جن میں اوویول کی بارآوری کے بغیر ہی پھل پیدا ہوجا تا ہے۔ یعنی پیدایش میں صرف ایک جنس حصہ لیتی ہے۔ اس عمل کو سائنسی اصطلاح میں

PARTHENOCARPYکہا جاتا ہے۔ اسی پیدایشی عمل کا اشاریہ ہمیں ڈاکٹر جواز جعفری کی درج ذیل نظم میں دکھائی دیتا ہے۔

میں بن باپ کا بچہ ہوں
کائنات کی کنواری دوشیزہ نے
نیلے پانیوں کی چادر کی اوٹ میں
مجھے اپنی کوکھ سے جنم دیا
اور ہوا کی ہتھیلی پر رکھ کر
تمام سمتوں میں بکھیر دیا
میری تخلیق میں
کسی باپ کا کردار نہیں!
میری پہچان
صرف رحم ہے!
میں کائنات کے اندر سے برآمد ہوا
اور اپنے باہر سے
رسائی کے لیے بے چین ہوں
میں اپنی ابتدا کی کھوج میں ہوں)جواز جعفری:میں اپنی ابتدا کی کھوج میں ہوں)(۳۵(

اس نظم میں جہاں پیدایش کے لیے صرف ایک ہی جنس کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے وہیں پر اس سے غیر اطمینانی کا اظہار بھی دکھائی دیتا ہے اور اس کی حقیقت تک پہنچے کی طلب آخری تین مصرعوں میں بہت واضح ہے۔ لیکن دوسرے نظریے کے پرچارک بھی ہمیں ادب میں دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے اشعار میں زیادہ زور پیدایش کی بجائے تخلیق پر دیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے یہ بھی ایک نپا تُلا اور قبول شُدہ سائنسی نظریہ ہے کہ ابتدا میں شاید-A BIOGENSISکا عمل وقوع پذیر ہوتا رہا ہو۔ کیوں کہ ہر شے بھی اگر ارتقائی مراحل سے گزری ہے تو بھی کوئی نہ کوئی تو اولین جان دار رہا ہوگا۔ اوراس سلسلے میں BIG BANG THEORYاس بات کی غماض ہے کہ قدیم دھماکے سے جو چیزیں تخلیق ہوئیں وہ یقینا سیارے‘ اور ستارے ہیں۔ یہ سب بے جان ہیں اور جان داروں کی تخلیق و پیدایش بہت بعد کا مرحلہ ہے۔ اظہر غوری اسی تخلیقی سطح کو جب کیمیائی سطح پر دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں:

ہر شے ستاروں کے مادے سے وجود میں آئی
کششِ ثقل حد سے بڑھتی چلی جائے تو
روشنی کی کرنیں خمیدہ ہوتے ہوتے لوٹ آتی ہیں
ضروری گیسوں کے ایٹم مناقشے کے مثل کاٹ پیٹ کا شکار ہوجاتے ہیں
جس طرح بچپن سے نوجوانی کے عرصے میں داخل ہوتے‘ اور پھر
جوان ہوکر بوڑھے ہوجاتے ہیں‘ اسی طرح
ہائیڈروجن کے ذخائر ہیلیم میں ‘ اور پھر
کاربن میں بدل کر آکسیجن کا روپ دھار لیتے ہیں)اظہر غوری:بلیک ہول)(۳۶(

جہاں اس میں تخلیق کی طرف اشارہ ہے وہیں اس نظم میں مختلف کیمیائی عوامل کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے۔ جس میں ایٹموں کا ٹوٹ کر نئے ایٹم بنانااہم ہے۔ کیوں کہ

سائنس کا یہ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ مادہ نہ تو پیدا کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی تباہ کیا جاسکتا ہے۔ اسے سائنسی اصطلاح میں قانون بقائے مادہ "LAW OF CONSERVATION OF MATTER"کہا جاتا ہے۔ نیز ایک اور سائنسی قانون جو قانون بقائے توانائی "LAW OF CONSERVATION OF ENERGY"کہلا تا ہے اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ توانائی نہ تو پیدا کی جاسکتی ہے اور نہ ہی تباہ لیکن اسے ایک سے دوسری قسم میں بدلا جا سکتا ہے۔ اسی تناظر میں تیسرا قانون نیوٹن کی ایک مساوات کی صورت سامنے آتا ہے (E=mc2) ۔ اس قانون کے مطابق مادہ اور توانائی ایک دوسرے میں تبدیل کیے جا سکتے ہیں۔ ان تینوں چیزوں کا بیانیہ نہ صرف سائنسی نوعیت کا حامل ہے بل کہ یہ امر بھی سامنے رہے کہ کائنات کو سمجھنے کے لیے تمام تر متصوفانہ نظریات میں بھی ان اصولوں سے انحراف ممکن نہیں رہتا ۔ یہی وہ بنیادی نظریات ہیں جو صوفیا اور سائنس دانوں کے کائناتی تفکرات کو ایک ہی لڑی کی صورت پیش کرتے ہیں جن کا اظہار جدید اردو نظم میں کیا گیا ہے۔

زندگی کی جولانیوں اور پھر اس کی ابعادیت کے حوالے سے سید مبارک شاہ کی درج ذیل نظم اہمیت کی حامل ہے۔ جس میں وہ کائنات اور اس کے لوازمات کے ساتھ اپنے تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ

’’مگر اس دائرے میں
نقطہ نقطہ نارسائی کے تعاقب میں
مسلسل گھومنے والو!
کبھی مرکز کو دیکھا ہے
کہ تم جس کے تعلق سے
خلائے لاوجودیت میں قائم ہو
تعلق بھی عجب شے ہے
مدار نارسائی میں تعلق بھی عجب شے ہے
اگر اس کی طنابوں کا تناؤ ٹو ٹ جائے تو
کوئی مرکز کے سینے میں اتر جائے
کوئی جلتی لکیریں چھوڑ کر
اندھے خلاؤں میں بکھر جائے
فنا ہوتے ہوئے لمحے کدھر جائے
ستارے میں اتر کر یا
شرارہ بن کر مر جائے
مقدر کی یہی ساعت تو سیارے کے بس میں ہے
مدار نارسائی میں
یہی اک بے بسی تو دسترس میں ہے‘‘ (سید مبارک شاہ: مدارِ نارسائی میں(

تبدیلی کائنات کا خمیر ہے اور ڈارون کے نظریۂ پیدایش و ارتقا کے مطابق جینے کا حق صرف اسی کو حاصل ہوتا ہے جو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق نہ صرف خود کو ڈھالتا ہے بل کہ مقابلے کی بہتر صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ یہ مقابلہ و مسابقت زندگی کے ہر میدان میں ہوتی ہے۔ اور اسی کے طفیل جان دار اپنے اندر ایسی تبدیلیاں لاتے ہیں جو انھیں ماحول سے مطابقت میں مدد دیتی ہیں۔ انھی تبدیلیوں کا اشارہ دیکھیے:

جن پھولونکو ہر وقت پانی اور کھاد دینے والا کوئی نہیں ہوتا
بالآخر وہ شکاری بن کر
اپنے قریب سے گزرنے والے والے کیڑے مکوڑوں کو ہڑپ کرنے لگتے ہیں
کیا ہی اچھا ہو کہ ہم بھی ستاروں کی طرح
دوسروں پر انحصار کرنے کے بجائے اپنی روشنی سے ہی چمکنا شروع کریں
ابھی تم خلا کے دریافت نہ ہوسکنے والے گوشوں یا
زمین کی دل فریب اور پراسرار مخفی سطحوں جیسی ہو
بہ ہرحال میں خبر رکھتا ہوں کہ
کس وقت تمھاری آواز کی فریکوینسی کتنے ہرٹز ہوتی ہے
اگر ہم چاہیں تو ذرا سا بھی متاثر کیے بغیر
ایک دوسرے کی تہذیب و تقدیر بدل سکتے ہیں (اظہر غوری:حالاتِ حاضرہ)(۳۷)

اظہر غوری کا خود کفالتی کی طرف قدم بڑھانے کا یہ ایک مستحسن نظریہ ہے۔ ستارے خود روشن ہوتے ہیں لہٰذا انھیں اپنی روشنی کسی سے چھیننا نہیں پڑتی۔ اسی طرح اگر جان دار کسی طور خود کفالتی انداز اپنا لیں تو دوسروں سے چھیننا چھوڑ دیں گے اور دنیا خوش حالی کا مرکز بن جائے گی۔انسان ہوں یا ستارے، سب کو ہی اس مسابقت سے واسطہ پڑتا ہے اور جیسے ایک جان دار دوسرے جان دار کی تخلیق کا باعث ہوتا ہے، اسی طرح ایک ستارے کا ٹوٹنا نئے ستاروں کو متشکل کرتا ہے۔ اسی عمل کو شاعر بیج گرانے سے تشبیہہ دیتا ہے

راستے میں
جہاں پچھلے سال آسمان سے ستاروں کے بیج گرے تھے
وہاں روشنی کے درخت اُگ آئے تھے
جہاں تتلی کے پر بوئے گئے تھے
وہاں پھول
جہاں مٹی بوئی گئی تھی
وہاں لوگ
جہاں آنسو
وہاں سیلاب (افضال احمد سید:گھاس سے ہریالی کاٹنے کے بعد)(۳۸)

ان مراحل کا ادراک کرنے کے لیے اپنے اندر کی آواز کو سننا پڑتا ہے۔ یہاں اندر کی آواز سے مراد صوفی کی متصوفانہ خود آشنائی نہیں بل کہ اجسامِ سماوی کے اندر پیدا ہونے والے والی شکست و ریخت کی وہ صدا ہے جو نئی تخلیق کا پیغام لے کے آتی ہے۔ اور یہ تبدیلی ہمیشہ اندر سے آتی ہے۔ جیسے انڈے کے اندر کے ایک خلیے کا باربار ٹوٹنا (SEGMENTATION)چوزے کی تخلیق کا اولین مرحلہ قرار پاتی ہے۔ اسی طرح اجسامِ سماوی کے اندر بھی شکست و ریخت نئے اجسام کی تخلیق کا باعث ہوتی ہے۔

دریچہ دل کا ہو آنکھ کا
اس وقت کھُلتا ہے
جب اندر سے کوئی آہٹ
کوئی آواز آتی ہے (شہاب صفدر:آخری دستک)(۳۹)

تبدیلی کے یہی چکر کائنات کی تمام اشیا میں پائے جاتے ہیں۔ عمومی سائنسی اور روزمرہ کے مشاہدات میں کاربن ڈائی آکسائیڈ‘ پانی اور نائٹروجن کے چکر (CO2 Cycle, Water Cycle, Nitrogen Cycle)اہمیت کے حامل ہیں ۔ یہی نظریہ ہندوئوں کے آواگون یا جونی چکر میں دکھائی دیتا ہے اور اسی کے عناصر ہمیں مسلمانوں کے فلسفہ وحدت الوجود میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اور اس بنیاد پر اسے جدید سائنس بھی قبولیت کی سند عطا کرتی ہے۔ پانی آسمان سے برستا ہے‘ برف اوردیگر اشکال اختیار کرنے کے بعد آخر کار بخارات کی صورت میں فضا میں لوٹ جاتا ہے۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ عملِ تنفس‘ عملِ احتراق اور ضیائی تالیف کی تبدیلیوں سے گزرتی ہوئی واپس اپنی حقیقت کو پہنچتی ہے۔ نائٹروجن جان داروں کی تخلیق کا باعث ہے مگر موت کے بعد بیکٹیریا اسے توڑ کر نائٹریٹ کی صورت میں زمین کا حصہ بناتے ہیں اور پھر وہاں سے یہ مختلف شکلیں بدلتی ہوئی اپنی حقیقت کو لوٹ جاتی ہے۔

گرو مہاراج کہتے ہیں
کہ یہ سنسار فانی ہے
جو شے دُنیا میں آئی ہے
وہ واپس لوٹ جانی ہے
فنا کا ذائقہ چکھنا
ہر اک شے کا مقدر ہے
فنا کا نام دُنیا ہے
یہ بستی موت کا گھر ہے
میں کہتا ہوں
زمیں پر
اور ہماری کہکشائوں میں
ہر اک شے آنی جانی ہے
سبھی کچھ غیر فانی ہے
جو مرتا ہے
حقیقت میں بدن تبدیل کرتا ہے (افضال فردوس:فانی .....غیرفانی)(۴۰)

تخلیق سے اگلے حیاتیاتی مراحل کو بھی جدید سائنس نے سمجھنے اور انھیں اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کے لیے جینیاتی انجینئرنگ کو معیار بنایا ہے۔ GENETIC ENGINEERINGکو سمجھنے کے لیے سب سے پہلا مرحلہ جینز کو سمجھنے کا ہے جو پروٹین کے دھاگوں اور نائٹروجنی مبادیاتی مادے سے مرکب ہیں۔ ان میں معلومات کا وہ ذخیرہ موجود ہوتا ہے جو نئے جان دار کو اجداد سے ملنے والی خصوصیات کی منتقلی کا ذمہ دار ہے۔ اسی کی طرف اشارہ دیکھیے:

اُس دن کا دریچہ
وقت کے عقبی باغ میں کھلتا ہے
جہاں ہمارے ڈی این اے کے پھول
ڈبل ہیلکس کے الجھے ہوئے دھاگے
ڈالی کی تصویروں سے بھی زیادہ سریلے ہیں (سلیم الرحمان: ایک دن میں زندگی)(۴۱)

GENETIC ENGINEERINGپر انسان کی دست رس نے اسے انسان کی اندرونی کائنات کو بھی سمجھنے کا موقع دیا ہے۔ علاوہ ازیں کئی پودوں پر تحقیقات سے یہ بات بھی سامنے آچکی ہے کہ ان میں نر اور مادہ دونوں کی خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔ مزید برآں اس کی مدد سے آج کے دور میں نر اور مادہ کی پیدایش نہ صرف اپنی مرضی کے مطابق بنا دی گئی ہے بل کہ پیدا ہونے کے بعد بھی جنس کی تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ اسی کا اظہار اس نظم میں بھی دکھائی دیتا ہے۔

میں اک عورت قید تھی
مرد کے جسم کے اندر
میرے پستانوں میں دودھ نہیں تھا
خون بھرا تھا
اپنی کوکھ خیال سے بچے جنتی تھی
پھر اک بھوکی بلی جیسے خود ان کو
کھاجاتی تھی
میں کیا تھی
اور اب کیا ہوں
میں اس دور کا معجزہ ہوں
جانتی ہوں
میں اصل نہیں ہوں نقل ہوں
اک کوشش ہوں جو تکمیل کے
رستے میں ہے   )افتخار نسیم: سیکس چینج آپریشن)(۴۲(

انسانی وجود ویسے تو ایک انتہائی گنجلک شے ہے لیکن ذہنِ انسانی کے گنجلک پن نے اسے کائنات کے نئے رنگوں کو جاننے میں بھی بڑی معاونت دی ہے۔ انسان نے اس کی مدد سے کیا کیا ایجادات نہیں کی ہیں۔ آج کے عہد کا انسان دماغ پر دست رس پانے والے کمپیوٹر کی تخلیق کے خواب دیکھ رہا ہے لیکن انسانی دماغ اتنا پیچیدہ ہے کہ اس کی گہرائیوں کا ماپا جانا کارِ آساں نہیں ۔ شاعر بھی انسانی دماغ کی اسی جہت پر یقین رکھتا ہے اور اتنی آسانی سے سمجھ میں آجانے کو قبول نہیں کرتا۔

میں خبردار ہوں کہ تمھارے دماغ کی لائبریری میں موجود
جنیٹک معلومات کی ادھوری فائیلیں قابلِ اعتماد نہیں
لہٰذا بیس یا پچیس سوالوں کے ذریعے
درست جواب پانے والے کھیل میں
تم مجھے کبھی نہیں بوجھ سکو گی   )اظہر غوری:حالاتِ حاضرہ)(۴۳(

’’جدید لوحِ محفوظ‘‘ حسنین بخاری کی ایک خوبصورت نظم ہے۔اس میں بھی ذرا معلومات کو ذخیرہ کرنے کے لیے جینز کے استعمال سے لطف اٹھائیے۔

’’لوحِ محفوظ کیا ہے، کہاں ہے
ہمارا گماں تھا
نیلے آکاش سے بھی بڑی ایک چادر ہے
جس پر

ازل سے ابد تک کی ہر اک کہانی رقم ہو چکی ہے
یہی لوحِ محفوظ ہے
تذکرہ جس کا بچپن سے سنتے چلے آ رہے تھے
مگر مختلف لوحِ محفوظ دیکھی
ہے عہدِ رواں میں
جسے جینز (Genes) اپنی زباں میں
بشر کہہ رہا ہے
نہایت ہی ننھے سے گوشے میں
خلیے کے کیا کچھ نہیں ہے؟
گزشتہ رُتوں کی سبھی داستانیں
محبت بھرے ’’آج‘‘ کے سب ترانے
حسیں آنے والے دنوں کے فسانے
بشر کے مقدر کی ساری کتھائیں
خیالوں سے لبریز دلکش فضائیں‘‘ (حسنین بخاری: جدید لوحِ محفوظ)(۴۴)

انسان نے اشیا کی ماہیت پر غور کرتے ہوئے ان میں تبدیلیاں لانے اور اس کائنات کو تسخیر کرنے کا عزم کر رکھا ہے۔یہ کائنات بہت سے حوالوں سے اس کی دست رس میں ہے۔ اور وہ چیزینجو ابھی اس کے اختیار سے باہر ہیں وہ اس کے ذہن اور اس کی سوچ کا حصہ ہیں اور انسان اس کوشش میں ہے کہ ان کو بھی بدلتے ہوئے حقیقت کا روپ دے ڈالے۔ ایسی ہی تبدیلیوں کی اساس جدید نظم میں یوں بیان پاتی ہے:

جہاں سے بات چلتی ہے
وہیں پہ آکے رکتی ہے
کہ رنگوں سے بنی ہے
ہر پرانی اور نئی تخلیق
ہر اک زندگی اور موت
ان کے درمیاں ہر چیز
زندہ اور مردہ ---
زمیں اور آسماں کے راز
پانے والی آنکھیں بھی
حقیقت اور خوابوں کو ملانے والا رستہ بھی
تمھیں معلوم ہوگا!
کہ جب دورنگ ملتے ہیں
نیا اک رنگ بنتا ہے
یہی اک قاعدہ ہے
جس پہ سب کچھ خلق ہوتا ہے
میں کہتا ہوں
کہ بے رنگی بھی اپنا رنگ رکھتی ہے
تمھاری اور میری زندگی دو رنگ ہیں

ہمارے ملنے سے جو رنگ پیدا ہوگا
ہم سے مختلف ہوگا
نئی تخلیق کی پوری صلاحیت کے ساتھ)زاہد امروز: رنگوں کی حقیقت)(۴۵(

اسی علمِ حیاتیات کی بدولت انسان نے کائناتی عمل میں نہ صرف انسان بل کہ دیگر جان داروں کی زندگی کی تہہ در تہہ گتھیوں کو بھی سلجھانے کی کوشش کی ہے اور ان علوم کی دریافتوں کو جدید اردو نظم کے شعرا نے بازیافتوں کی صورت پیش کیا ہے۔

اندھیرے میں دیکھنے کے لیے
کاکروچ بننا ضروری ہے
جس کی مرکب آنکھوں کی بینائی
انسان کی بصارت سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے
رات کی جھاڑیوں میں
ستارے جگنوئوں کی طرح چمکتے ہیں
یہ ٹیکنالوجی بہت سے درختوں کو سکھائی جارہی ہے
جلد ہی چھائوں دھوپ میں بدل جائے گی)نصیر احمد ناصر:سارے خواب کلیشے ہیں)(۴۶(

حسنین بخاری محبت کو سب سے بڑی سچائی سمجھتے ہیں جو زہر کو بھی لطف لینے کی چیز بنا دیتا ہے۔جیسے سوڈیم بھی زہر ہے اور کلورین بھی۔ لیکن ان کے کیمیائی ملاپ سے ذائقے دار نمک‘ سوڈیم کلورائیڈ‘‘ بنتا ہے۔ اسی طرح ہائیڈروجن اور آکسیجن کے ملاپ سے پانی کی تخلیق کی بات کرتے ہیں:

’’جلانے کے عمل کو آکسیجن تیز کرتی ہے
بھڑک اٹھتا ہے دامن ہائیڈروجن کا حرارت سے
مگر جب پیار کے رشتے سے جڑ جائیں
خنک تاثیر پانی کی بجھا دیتی ہے آتش کو
بھڑکتا سوڈیم دیکھو کلوریں کی جدائی میں
کلوریں سوڈیم کے ہجر میں زہر ہلاہل ہے
گلے مل کر بہم آبِ محبت میں
اگر تحلیل ہو جائیں نمک بنتا ہے
نمکیں ذائقہ جس کا نہ ہو کھانوں میں
تو وہ زہر لگتے ہیں)حسنین بخاری: محبت کا اثر ہے کیمیائی)(۴۷(

ایسے ہی کیمیائی عوامل کا شاعرانہ اظہار ہمیں ڈاکٹر محبوب الدین محبوب کی نظم ’کیمیا‘‘ میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ ذرا یہ نظم ملاحظہ ہو اور اس میں بتائے گئے کیمیائی اصولوں پر غور کیجیے تو دل سے داد نکلتی ہے کہ کیسے کائنات میں عمل پیرا ان اصولوں کو شاعر نے نظم بنا دیا ہے۔

اے میرے ہمدم ہے کیا کیا گل کھلاتی کیمیا
کام دنیا کا بہر نوع ہے چلاتی کیمیا
جن کو ہر شے کی حقیقت جاننے کی ہے تلاش
علم جو کو اپنا گرویدہ بناتی کیمیا

کاربن کے جوہروں نے کیا بنائیں بندشیں
ہے حیاتی سلسلہ از نامیاتی کیمیا
زندگی کے راز وا ہو جائیں گے ان پر تمام
جو سمجھ جائیں حقیقت میں حیاتی کیمیا
کارنامے ادویہ سازی کے ہیں سب پر عیاں
محسنِ انسانیت ہے ادویاتی کیمیا
زندگی دیتی ہے ان کو جو ہیں مایوسِ حیات
اور کبھی ہے جوہری بم بھی بناتی کیمیا
لمحوں میں ہر چیز کی تشریح ہو جاتی ہے اب
کتنی آگے بڑھ گئی ہے تجزیاتی کیمیا
صنعتیں دنیا کی اس کے دم سے قائم ہیں یہاں
صنعتی تالیف کے پہلو دکھاتی کیمیا
خامروں نے کس طرح سے زندگی تخلیق کی
سالمی تالیف وجہ عضویاتی کیمیا
تابکار ، اشعاع زدگی ، انشقاق
یہ مظاہر آپ کے نزدیک لاتی کیمیا
ڈی این اے اور جینیاتی ہندساتی عملیات
علم کی تحصیل کو ہے حد پہ لاتی کیمیا
جب کہا طلبا سے سمجھو درس ہائے کیمیا
ہنس کے بولے امتحاں میں ہے رلاتی کیمیا
کیا محبت کیمیائی سی کشش محبوبؔ ہے
نظریے انجان سے ہے دل میں لاتی کیمیا)محبوب الدین محبوب: کیمیا)(۴۸(

ہمارے شعرا کے ہاں چند اہم سوالات ہیں جیسے کائنات کی ماہیت کیا ہے؟ کیا کائنات ایک ہے یا ایک سے زیادہ؟ ان کا آپس میں رشتہ کیا ہے؟ انسان کی اپنی زمانی و مکانی حدود ہیں‘ مگر ان حدود تک رسائی کا انسانی خواب ابھی تک شرمندۂِ تعبیر نہیں ہو سکا ‘ لیکن انسان پھر بھی ان کائناتی حدود سے باہر نکلنے اور ان کی تسخیر کی خواہش میں مگن ہے اور حقیقتِ کُل تک رسائی کے لیے اس تسخیر کو لازمۂِ زندگی سمجھتا ہے۔

کائناتی کلاک سے باہر
ایک دائمی لمحے کی پکار
تمام بازگشتوں پر غالب آرہی ہے
ابدی ترتیب سے بھٹکا ہوا وجود
اپنے خلیوں اور سالموں میں چھپا ہوا سچ تلاش کرتا ہے)نصیر احمد ناصر:کائنات کا آخری گیت)(۴۹(

اسی طلب کا اظہار ہمیں ڈاکٹر جواز جعفری کے ہاں بھی دکھائی دیتا ہے کہ وہ ان تمام حدود سے باہر نکلنا چاہتے ہیں اور اس سے آگے کی دنیا کی دریافت کے خواہاں ہیں:

اس سے پہلے کہ نامعلوم سرپٹ بھاگتی ہماری کہکشاں
ہمیں اپنے آفاق گیر بازئوں میں سمیٹے

کائنات کے آخری کنارے سے باہر جا گرے
میری بجھتی آنکھوں پر
اپنے روشنی افزا ہونٹوں سے بوسہ دو
کہ مجھے ابد کا کنارا دیکھنا ہے
مجھے جاننا ہے
کہ اس کنارے سے آگے کیا ہے؟
محض حیرت
کوئی اور کائنات
یا پھر کچھ بھی نہیں
یا پھر سرے سے یہ سوال ہی مبہم ہے
تیری باتونی آنکھوں کے مخفی اشاروں کی طرح
بہت ہی مبہم (جواز جعفری:مجھے ابد کا کنارہ دیکھنا ہے)(۵۰)

تفہیمِ کائنات نے انسان کو جینیاتی میدان میں اگرچہ بہت بڑی بڑی کامیابیاں دی ہیں۔ انسان نے اپنی مرضی اور منشا کے مطابق گوشت ' دودھ یا انڈے دینے والے جان دارتو تخلیق کر لیے ہیں لیکن خواب ابھی بھی اس کی پہنچ سے باہر ہیں۔ یہ کائنات کا وہ پہلو ہے جو کبھی انسان کا خدا رہا ہے۔ اس کائنات میں انسانی ذات کی انفرادیت کو کسی صورت بھی ختم نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ وہ کائنات کی اہم ترین تخلیقات میں سے ہے۔ اس کے خواب تبدیلی کے مظہر ہیں لیکن ان کی کلوننگ ممکن نہیں ۔

تالمودی راستوں کے اطراف میں
صلیبی پھول کھل رہے ہیں
لفظوں اور خوابوں کی کلوننگ نہیں کی جاسکتی (نصیر احمد ناصر:کائنات کا آخری گیت)(۵۱)

اور اس تبدیلی نہ ہونے کی وجہ انسان کا گنجلک پن ہے۔ شدید کوشش کے باوجود اس کی ذات کے نہاں خانوں کے بہت سے حقائق آج بھی اندھیروں میں پوشیدہ ہیں اور انسان شاید کبھی ان کا ادراک کر پائے تو اپنے لیے نئی دنیا کی تخلیق کا اس کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو

پرچھائیوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہوئے
موت بھی مجسم نہیں ملتی
اور تم
پانی کے ساتھ پانی ہونے کے لیے
روح کا سیال
کس حیاتیاتی عمل سے گزاروگی؟
کچھ رشتوں کی
جینیاتی رمز ابھی تک معلوم نہیں ہوسکی!! (نصیر احمد ناصر:کاغذ کی تنہائی)(۵۲)

معلوم کائنات کی یہ ارتقائی منازل کسی ایک دن کی بات نہیں بل کہ نامعلوم ادوار کا دورانیہ ہے۔ وہ دورانیہ جس سے ہم ابھی تک نابلد ہیں اور اگر جان بھی جائیں تو کیا اُس دورانیے کو تحریر کرنا انسان کے بس کی بات ہوسکتی ہے؟ یہی تحیر شاعر کی ذات میں بستا ہے تونصیر احمد ناصرکو اِس سوال کا جواب نفی میں ملتا ہے۔

زیرِ آب صدیوں کی کہانی
کہاں تک لکھو گے
سمندر اور دوات
دونوں خالی ہیں! (نصیر احمد ناصر:نظمیہ)(۵۳(

کائنات کے دیگر مظاہر کی طرح انسان نے خوابوں کی حقیقت بھی جاننے کی سعی کی ہے۔ اس کے لیے علمِ نفسیات کا بھی بھرپور سہارا لیا گیا ہے۔ تاہم ہماری اس زمین کی کم مائیگی کا احساس بھی عصرِ حاضر کے اذہان میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے اور وہ ایک نئی دنیا کا خواب دیکھتا ہے۔ وہ نئی دنیا جو آج کے انسان کا مطمعٔ نظر ہو' جو اُس کے اشاروں پر چلے۔ اسی خواب کی تکمیل کے لیے انسان GENETIC ENGINEERING کو استعمال کرکے مرضی کی اشیا لوگوں کے اذہان پر منطبق کرتے ہوئے کائنات کو بھی اپنا غلام بنا لینا چاہتا ہے۔

ایک خواب
ہر شب میری نیند میں داخل ہوجاتا ہے
کسی خفیہ راستے سے
میرے وجود کا خودکار حفاظتی نظام
اُسے ٹریس نہیں کرپاتا
آنکھ کھلنے پر بھی
کچھ پتہ نہیں چلتا
کہ وہ اپنی نامعلوم کارروائی مکمل کرکے جاچکا ہے
مجھے تو وہ خواب
حالیہ ترقی یافتہ زمانے کا تربیت یافتہ لگتا ہے
جسے فرد کو اغوا کرنے کا
خصوصی مشن سونپا گیا ہے
یا کسی عہدِ عتیق کی
ہڈیوں سے نکلی ہوئی جینیاتی سازش کا حصہ
جسے خلیوں میں چھپی
اولین سچائیوں کے کوڈز معلوم ہیں
اور وہ انھیں چپکے چپکے
دوسری دنیائوں کے ذی ارواح میں منتقل کرنا چاہتے ہیں
جہاں ان کی مدد سے
سدابیدار اعلیٰ تعبیراتی کلونز بنائے جائیں گے
اور خوابوں میں آمدورفت کے راستے
ہر خلائی مخلوق کو ازبر کرائے جائیں گے)نصیر احمد ناصر:نیند میں جاگتے رہنا ضروری ہے)(۵۴(

ان تمام تر حقائق اور کوششوں کے باوجود کائنات تو درکنار ' انسان کا اپنا آپ بھی آج تک اس کی مکمل اطاعت میں نہیں آسکا ہے۔ وہ آج تک اپنی ہی پہچان کی تلاش میں سرگرداں ہیں ۔ وہ کائنات کے اور اپنے ازلی رشتوں کی کھوج میں لگا رہتا ہے۔ وہ یہ بھی جاننے کا

متمنی ہے کہ وہ یہاں کب سے ہے؟ کیوں ہے؟ کیسے ہے؟اسی لیے اُسے تقدیر کی یہ جکڑ بند زندگی قید خانہ محسوس ہوتی ہے اور وہ اس سے چھٹکارا چاہتا ہے۔

میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں
مجھے تو یہ یاد بھی نہیں
میں یہاں کیسے پہنچ گیا تھا
کسی نے شاید مجھے فلک سے گرادیا تھا
یا پھر زمیں نے
مجھے بھی پودا سمجھ کے باہر اگل دیا تھا
تو کیا میں پودا ہوں؟
یا پرندہ ہوں یا درندہ ہوں
یا خزندوں کی نسل سے ہوں
میں جو بھی کچھ ہوں
خود آگہی کی اداس رُت میں
گھرا ہوا ہوں (شہزاد احمد:پہچان)(۵۵)

یہیں پر ذرا ڈاکٹر جواز جعفری کی نظم کے یہ مصرعے بھی دیکھتے چلیے جن کے ذریعے انسان اور کائنات کے باہمی تعلق کو سمیٹنے کی سعی کی گئی ہے اور وہ خود کو ستاروں کے رشتے دار کی صورت میں دیکھتے ہیں اور اپنے اور ستاروں کے تعلق کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے کائنات کی نیرنگیوں کی حقیقت بھی جاننے کے خواہاں ہیں:

میری آنکھیں
ستاروں سے میرے تعلق کی وضاحت کرتی ہیں
میں ستاروں کا دور پار کا
غریب رشتہ دار ہوں
میں اُسی گم شُدہ ڈار سے
بچھڑی کونج ہوں (جواز جعفری:ڈار سے بچھڑی کونج)(۵۶)

میں اپنی ابتدا کی کھوج میں ہوں
سورج کی کچھ راکھ
میرے اندر دہکتی ہے
میرا دل
لامحدود وسعتوں پر رقص کرتے
سورج کے ساتھ دھڑکتا ہے!
میرا جلنا
سورج کے بجھنے تک ہے!
میری آنکھوں کی روشنی پر
میرا سلسلۂ نسب لکھا ہے
ستارے میرے پُرکھے ہیں
اور میں ستاروں کی راکھ ہوں

چاند
مجھے اپنے چہرے پر ملتا ہے)جواز جعفری:میں اپنی ابتدا کی کھوج میں ہوں)(۵۷(

اپنی اس تلاش کے سفر میں انسان ارتقا کے راستے پر واپسی کا کھوج لگا رہا ہے۔ وہ اس نتیجے تک پہنچ چکا ہے کہ پانی کا کردار تخلیقِ جان دار میں انتہائی اہم رہا ہے لہٰذا ان نیرنگیوں کو سمجھنے کے لیے پانی آج بھی اُس کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ یہ پانی آج سے ہی نہیں بل کہ قدیم ترین معلوم زمانے سے ہی انسانی زندگی اور بقا کا نہ صرف ضامن رہا ہے علاوہ ازیناپنی اسی خاصیت کی بہ دولت اسے خدائی بھی حاصل رہی ہے اور پانی کو دیوتائوں کی طرح پوجا جاتا رہا ہے۔ اور انھی تخلیقی مراحل کا پرتو نصیر احمد ناصر کے ہاں دیکھیے:

عجب نم زدہ سلوٹوں میں گھری زندگی ہے
زمیں ایک آبی عمل سے گزر کر
مدوّر ہوئی ہے
چٹانوں کے نیچے بھی‘ اندر بھی
خوابیدہ بل دار آبی چٹانیں
شب ارتقا کی عجب داستانیں)نصیر احمد ناصر:ساگر دیوتا)(۵۸(

پانی مجھے پکارتا ہے
پانی جو زندگی کی کوکھ ہے
میرا بچپن
اس کی لوری سے بندھا ہے)جواز جعفری:سمندر کا پہلا ورق)(۵۹(

سمندر کی عمیق گہرائیوں میں موجود غاروں میں انسانی زندگی اور پہلے جان دار کی تلاش آج بھی جاری ہے۔ اس سفر میں کائنات کی بے انتہائی کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور اس کے طریقہ ہائے کار کا بھی۔ کیوں کہ کائنات تو بہ ذاتِ خود مرکب ہے ان جان دار اور بے جان چیزوں کا جن میں سے زندہ اشیا حیاتیات کے زیرِ مطالعہ جگہ پاتی ہیں اور عموماً بے جان اشیا کیمیا کے تحت۔ اس تلاش میں دونوں علوم ہاتھوں میں ہاتھ دیے چل رہے ہیں۔ ذیل کی نظم میں بھی اسی ارتقائی سفر کے نقوش ان دونوں علوم کی روشنی میں بیان ہیں:

بدن کی پہاڑی میں خفتہ
نمک اور چونے کی کانیں
نمی چاٹتے ریگ زاروں کی سوکھی زبانیں
سیہ سنگِ آہن رُبا اور سنگِ ستارا
جزیرے‘ ڈھلانیں
حجر اور جل کھور مٹی کے تودے
خراطین‘ پھل‘ پھول‘ پودے
پتاور‘ سماروغ‘ تالوس
جل ناگ‘ سیلا(Scylla)
شکن دار اصداف‘ سرطان ‘ کچھوے
سمک اور بگلے---

مگر تم کہاں ہو!
تمھیں ڈھونڈتے ہیں مرے خواب کب سے
میں صدیوں کے ساحل پہ تنہا
تمھارے جنم روپ‘ ساروپ کا منتظر ہوں)نصیر احمد ناصر:ساگر دیوتا)(۶۰(

بڑھتے ہوئے سائنسی علوم اور رجحانات نے اس بات کی تردید کی کہ ہماری زمین کائنات کا مرکز ہے۔ زمین کے بعد سورج کومرکز مانا گیا بعد ازاں انسان نئی دنیاؤں کی تلاش میں چل پڑا اور دیگرنظام ہائے شمسی اس کی توجہ کا مرکز بنے اور دیگر سیاروں پر زندگی کی تلاش اس کا مطمعِ نظر ٹھہرا۔مگر پھر بھی زمین اور اس کا ماحول ہی وہ بنیادی لوازمات ہیں جن کی تلاش دیگر سیاروں پر کی جارہی ہے۔ وہ ماحول جہاں زندگی کی بقا و ترویج ممکن ہوسکے۔ اسی لیے عبدالرشید زمین کو اک حاملہ عورت سے تشبیہہ دیتے ہیں اور تخلیق کے مختلف مراحل کی وضاحت کرتے ہیں۔

زمیں زندہ حاملہ ہے‘ اُگل رہی ہے بشارتوں کو
بشارتیں‘ جو خدا سے منسوب تھیں‘ خدا کے حواریوں نے
روایتوں کے سہارے اُن کو اُچک لیا ہے‘ لگام ڈالی
اُس کی رحمت پہ حد لگائی‘ خطوط کھینچے)عبدالرشید: زمین زندہ ہے)(۶۱(

زمین سے باہر زندگی کی تلاش کا سوال اب قدرے پیچھے رہ گیا ہے۔ آج کا شاعر تو زمین پر موجود زندگی کے نمونے کسی دوسرے سیارے پر منتقل کرنے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ یہ وہ سوال ہے جس کی طرف ابھی تک سائنس دانوں کا دھیان ہی نہیں گیا۔ یہ وہ اہم ترین معاملہ ہے جہاں شاعر‘ اہلِ سائنس کی پیش قیاسی کرتا نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر جواز جعفری کے یہ مصرعے ملاحظہ ہوں:

میرے پاؤں کو کسی غیر منکشف سیارے کی
ان چھوئی خاک پر
اپنے نقش چھوڑنے جانا ہے
مجھے زمین سے خلا تک
روشن راستوں کا جال بچھانا ہے
مجھے روشنی کے گھوڑے پر بیٹھ کر
کائنات کے دور پار کے اجنبی خطوں میں
زندگی کے بیج پھینکنے جانا ہے
کیوں کہ زندگی نہتّی ہے
اور موت کے نرغے میں ہے
میں زندگی کا وفادار ہوں)جواز جعفری:میں زندگی کا وفادار ہوں)(۶۲(

اسی زمین پر جب کائناتی حوالے سے غور کیا جاتا ہے تو انسان شدید کم مائیگی اور تنہائی کے احساس میں گھر جاتا ہے۔ اور یہ زمین کائناتی پہلو سے ایک بہت ہی حقیر ذرّے کی صورت دکھائی دیتے ہیں جس پر بیٹھا انسان تو اس سے بھی کم تر ہے لیکن اس کا احساس اور تخیل اُسے اس لامحدود کائنات کے سربستہ رازوں کو جاننے پر اکساتا ہے۔اپنی اسی بے قراری کے ہاتھوں اپنی حقیقت کی تلاش کے سفر پر رواں ہوتے ہوئے ڈاکٹر جواز جعفری رقم طراز ہیں کہ

پھر سے ڈھیر ہوجانے کی آرزو میں
سرگرداں
لامحدود وسعتوں کے مضافات میں تیرتے
کسی حقیر ذرّے کے
پسماندہ کونے میں بیٹھا
میں ابدیت کے زعم میں مبتلا ستاروں سے
مکالمہ کرتا ہوں!
میری آنکھیں
ستاروں سے میرے تعلق کی وضاحت کرتی ہیں!
میں ستاروں کا دور پار کا غریب، رشتے دار ہوں
وہ میرے اور اپنے بیچ
مناسب فاصلہ رکھتے ہیں
اور کبھی کبھار
مجھ پر اثر نداز ہوتے ہیں
میری آنکھیں
کائنات کی لامحدود وسعتوں میں
کھوجانے والے ستاروں کا
راستہ دیکھتی ہیں!
میں اسی گمشدہ ڈار سے بچھڑی
کونج ہوں! (جواز جعفری:ڈار سے بچھڑی کونج)(۶۳)

شاعر اس کائناتی تناظر میں خود کو ایک ایسی کونج کی طرح محسوس کرتا ہے جو اپنی ڈار سے بچھڑ چکی ہوں۔ وہ نہیں جانتا کہ اس کے دیگر ہم نسل کہاں ہیں اور ہیں بھی یا نہیں۔وہ اپنے ہم جنسوں تک پہنچنے کے لیے بے چین ہے مگر خاک کی زنجیر نے اسے باندھ رکھا ہے۔ وہ اپنی کائنات سے نکل کر دوسرے جہانوں تک پہنچنا چاہتا ہے اور اُس کا راستا بھی اُسے معلوم ہو چکا ہے۔اسی راستے کی حاشیہ پیمائی کرتے ہوئے ڈاکٹر جواز جعفری کا کہنا ہے:

میرے حصے کے آسمان نے
یکسانیت اوڑھ لی
میری آنکھوں نے آسمان کے نیلے صفحے پر
اپنی بینائی سے اکتاہٹ لکھ دی
اب یہ آنکھیں
کسی اور مٹی اور موسم کا خواب دیکھتی ہیں
میری زمین کے ہم سائے میں
مجھے ایک پوشیدہ رستے کی تلاش ہے
جو ان دیکھی دنیا کی
نقاب کشائی کے لیے
میرا منتظر ہے (جواز جعفری:کسی اور مٹی کا خواب)(۶۴)

میرے اردگرد بچھی بساط
میرے لیے ایک معمّا ہے
میں زمین پر زندگی کا پیڑ ہوں
میری جڑیں
وقت میں دور تک پیوست ہیں)جواز جعفری:میں زندگی کا پیڑ ہوں)(۶۵(

اختر حسین جعفری کو جب یہ زمین ہی زندگی کا مرکز دکھائی دیتی ہے تو وہ زندگی کو اک جمالی کیفیت میں دیکھتے ہیں۔ اور اس بات کا اعادہ کرتے ہیں کہ مختلف اجرامِ فلکی کی تخلیق کے بعد زمین کی تخلیق اور اس پر زندگی کی تخلیق وہ جمالیاتی پہلو ہے جس پر زمین خود بھی حیران ہے۔

ہوا نے ارض و سما پر کمند جب پھینکی
حقیقتوں کی گرہ گردنوں پہ تنگ ہوئی
نجوم تیرہ تو شاخِ زغال تھی روشن
زمین دیکھ کے اپنا جمال دنگ ہوئی)اختر حسین جعفری:ہوا نے کھول دیے بھید)(۶۶(

تلاش کا یہ سفر جب زمین سے آگے دوسرے سیاروں کی طرف بڑھتا ہے تو مریخ انسان کی پہلی متوقع آماج گاہ کے طور پر سامنے آتا ہے۔ جہاں بارش اور پانی کی امید یہ احساس دیتی ہے کہ شاید وہ بھی کبھی برفانی ادوار سے گزر کر تخلیق کے مراحل پورے کرسکے۔ ایک عورت کی طرح جو ایامِ حیض سے فراغت کے بعد تخلیقی عمل کے لیے پھر سے تیار ہوجاتی ہے۔ عامرسہیل زمین کی موجودہ حالت کو موجودہ سائنسی تناظرات میں مزید تخلیق کے قابل نہیں سمجھتے اور نئے سیارے پر زندگی کی توقع رکھتے ہیں۔

زمیں بارشوں کی تلاوت میں تھی
مگر برف ازلی عداوت میں تھی
زمیں دیکھتی تھی پگھلتے ہوئے
وہی برف جو غیر حالت میں تھی

زمیں حیض والی نجاست میں تھی
زمیں مشتری سے ہوئی ہم کلام
مگر برف سفلہ قدامت میں تھی
زمیں منصفی کو ترستی رہی
مگر برف خاکی اہانت میں تھی)عامر سہیل)(۶۷(

برف کا دور جان داروں کی تخلیق میں اہمیت کا حامل ہے۔ کیوں کہ زندگی کے اولین نقوش اس کے بعد ہی ظاہر ہوتے ہیں۔ اور یہی نم زندگی کی نمو پذیری کا باعث ہے جو حالات کے تھپیڑے جھیلتا ہوا آخر کار زندگی کے ظہور کی وجہ بنا۔

کوئی کہنگی شب پہ جھڑتی رہی
زمیں اپنے سے نم سے ٹھٹھرتی رہی
سبھی اپنے اپنے مداروں میں تھے
مگر برف ساروں پہ پڑتی رہی

حواس و عناصر میں رخنہ پڑا
زمیں برف والوں سے ڈرتی رہی
زمیں برف والوں سے ڈرتی رہی
زمان و جہاں کو جکڑتی رہی)عامر سہیل)(۶۸(

جب انسان سوچ کے سمندر میں ڈوب کر حقیقت تک رسائی کی کوشش کرتا ہے تو خود کو اس زمین میں ایک قیدی کی صورت محسوس کرتا ہے۔ یہ قید خانہ ' جو ایک چھوٹے سے بلبلے پر مشتمل ہے ' یہی اس کی کل کائنات سہی تاہم وہ یہ سوچتا ہے کہ اختتام کیا ہوگا

تو کیا میں قید ہوں اک بلبلے میں!
مرے چاروں طرف پھیلی ہوئی یہ نیلی دیواریں
نہ کوئی شکل رکھتی ہیں'
نہ ان میں کوئی خوشبو ہے
میں اک مٹی کے تودے پر کھڑا ہوں
میرے جیسے ان گنت قیدی یہاں موجود ہیں
اور سوچتے ہیں
کائناتیں بلبلے کی شکل میں آوارہ ہیں
اک روز وہ
اک دوسرے کے راستے کو کاٹ جائیں گے)شہزاد احمد:اک بلبلے میں)(۶۹(

اسی بلبلے کو زاہد ڈار تنہائیوں کا صحرا اور تنگ و تار کمرا قرار دیتے ہیں۔

تنہائیوں کا صحرا
وہ تنگ و تار کمرہ
جس میں گزار دی ہے
جس میں گزر رہی ہے
یہ زندگی ہماری)زاہد ڈار)(۷۰(

زمین کی انھی جکڑ بندیوں سے نکلنے کی خواہش اور اس زمین کی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جواز جعفری کائناتی رشتوں کے حوالے سے وقت کو بھی دیکھتے ہیں اور جدید سائنسی نظریات کے موافق وقت ان کے ہاں ماضی' حال اور مستقبل کی حد بندیوں سے آزاد ہو کر ایک ہی نقطے میں سماجاتا ہے۔

میرے پائوں خاک سے بندھے ہیں
اور آنکھیں
اور آسمان پر اپنا رستہ ٹٹولتی ہیں!
میں وقت کا مسافر ہوں
)کائنات کے افق کی طرف(
وقت اور خلا جڑواں بھائی ہیں
میں خلا کی تاریکیوں میں راستے بچھاتا
ایک ہی وقت میں
اپنے ماضی اور مستقبل کی طرف روانہ ہوں)جواز جعفری:میں وقت کا مسافر ہوں)(۷۱(

انسان کی حقیقت اور کائنات میں اس کا مقام بنیادی اہمیت کے حامل سوالات ہیں‘ جن کے جواب کی جستجو نے انسان کو ورطۂ حیرت میں مبتلا رکھا ہے۔ ڈاکٹر جواز جعفری اس تعلق کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

میں کائناتی پنگھوڑے کے بازو سے چمٹا
وقت کا مسافر
میں نے زمین کے حقیر ذرّے سے
اوپر اٹھنا سیکھ لیا ہے)جواز جعفری:مغرب سے طلوع ہوتے سورج)(۷۲(

ہماری اس دھرتی پر زندگی نے حقیقتاً اپنا نم کھودیا ہے۔ کیوں کہ اس کی پیدایش کی صلاحیت تو قائم ہے لیکن اس سے تخلیق کی صلاحیت چھینی جا چکی ہے۔ یہ پھر اُسی زمانے کی طرف لوٹ چکی ہے جہاں اسے تخلیق کا یارا ‘ نہ تھا۔

یہاں سب آئینے دھندلا چکے ہیں
زمیں تخلیق ہونے سے بھی پہلے کے زمانے آچکے ہیں
چمن میں جتنے موسم تھے
وہ واپس جا چکے ہیں
کوئی آسودگی باقی نہیں ہے
کوئی موجودگی باقی نہیںہے)شہزاد احمد:کوئی صورت نہیں)(۷۳(

زمین ‘ اپنی تخلیق سے پہلے بھی کسی نہ کسی صورت ضرور موجود تھی۔ ایسی ہی تھی۔ اس کا بنیادی مادہ اور عناصر تب بھی ایسے ہی تھے جیسے کہ اب ہیں۔ یہ قانون بقائے مادہ کی تصویر ہے۔اور اسی کا اظہار ہمیں شہزاد احمد کے درج ذیل اشعار میں دکھائی دیتا ہے۔

ہمیشہ سے یہ پتھر اس جگہ موجود ہے!
مجھ سے بہت پہلے
ہزاروں سال پہلے‘بل کہ لاکھوں سال پہلے
یہ زمیں ایسی ہی تھی
جیسی کہ اب ہے)شہزاد احمد:مرے دل میں جو پتھر ہے)(۷۴(

مظاہرِ کائنات میں پہاڑ ایک اہم چیز ہیں۔ زاہدامروز جب ان پر تفکر کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ تو دراصل زمین کا لباس ہیں۔ ایسا لباس جو اس کی زیبایش کا باعث ہے اور یہ زیبایش اس دم اپنا جوبن دکھاتی ہے جب وہ بارش سے ہم سخن ہوجائے۔

ویسے تو پہاڑ زمین کا سکڑا ہوا لباس ہیں
لیکن جب بارش ہوتی ہے
ان کی سلوٹوں میں اجلاہٹ اُگ آتی ہے)زاہد امروز:کائناتی گرد میں برسات کی شام)(۷۵(

معلومہ حد تک اس کائنات میں صرف زمین ہی اک ایسا مقام ہے جہاں زندگی کے آثار موجود ہیں۔ اس کے علاوہ باقی ساری کائنات تنہائی کے سمندر کی صورت ہے جس میں زمین کا مقام ایک حیاتیاتی جزیرہ کا ہے۔اس حیاتیاتی جزیرے بارے شاہین مفتی لکھتی ہیں

موج کی ماتمی لے کا کہنا ہے یہ

’’اہلِ فرقت کے ماتھے پہ میری رفاقت لکھی ہے‘‘
فقط ایک رستہ کھلا ہے
مگر دور تک
دلدلوں سے اٹا ہے
کنارہ کہیں بھی نہیں ہے
زندگانی کے اندھے سمندر میں ہم
جس جگہ پر ملے ہیں
یہی ایک لمحہ جزیرہ نما ہے)شاہین مفتی:کنارہ کہیں بھی نہیں ہے)(۷۶(

زمین کے چاروں طرف گھٹاٹوپ اندھیرا ہے‘ یہ اندھیرا موت کا استعارہ ہے۔ انسان اس موت کے سمندر میں زندگی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔بہ قول نصیر احمد ناصر:

زمین چاروں طرف سے رات کے خلا میں ڈوبی ہوئی ہے
اور وہ ایک ستارے میں مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں)نصیر احمد ناصر:مفرور)(۷۷(

اسی رشتے کی وضاحت ڈاکٹر جواز جعفری بلیک ہول کی صورت میں بیان کرتے ہیں جو تمام اجسام کو اپنے اندر کھینچتا چلا جاتا ہے۔ کوئی بھی چیز اس کی دست برد سے بچ نہیں پاتی حتّٰی کہ خلا بھی۔

میرے اندر ایک خلا ہے
جسے میں اپنی تنہائی سے بھرتا ہوں
میرے باہر بھی ایک خلا ہے
جو میرے اندر کے خلا میں گرتا ہے
میرے باہر کے خلا میں
تاریک سمندر بہتا ہے
میری زمین‘ کالے پانیوں میں ڈوبتا جزیرہ ہے
میں زمین کے ساحل پر ننگے پائوں کھڑا
اپنے ڈوبتے جزیرے پر
اپنے حصّے کی مٹّی ڈال رہا ہوں)جواز جعفری:مجھے ابد کا کنارہ دیکھنا ہے)(۷۸(

اندھیرے کے مقابل روشنی ہے ۔ آسمان کی ان عمیق گہرائیوں میں اگر کہیں کوئی روشنی ہے تو وہ ستاروں کی دہکتی ہوئی آگ کی صورت میں ہی میسر ہے۔

آسمان پر اب کوئی روشنی نہیں
سو وقت کے زخموں کو ستاروں کا لمس درکار ہے)زاہد امروز:زمین کے ہنکارے)(۷۹(

روشنی کی یہ عدم موجودگی اور اندھیرا بھی لازم ہے۔ حیاتیاتی قوانین کے مطابق بھی ضیائی تالیف کا عمل مسلسل روشنی کی بجائے وقفے وقفے سے دی گئی روشنی میں بہتر طور پر تکمیل پذیر ہوتا ہے جس سے خوراک بنتی ہے۔ اسی طرح خوابوں کی تکمیل بھی نیند کے اندھیرے راستوں پر ہوتی ہے۔ یہی حاصل ہے کہ

تب مجھے پتہ چلا
کہ خواب روشنی میں سیاہ کیوں ہوجاتے ہیں
انھیں ایکسپوز کرنے کے لیے اندھیرے کا محلول کیوں ضروری ہے

روشنی تاریکی ہی میں نظر آتی ہے
)نصیر احمد ناصر:خواب اور محبت کی کوئی عمر نہیں ہوتی)(۸۰(

تکوینِ کائنات کے عناصر میں انسان بنیادی نکتے کی حیثیت رکھتا ہے۔ مذاہب کے مطابق تو یہ بزم سجائی ہی انسان کے لیے گئی ہے۔ وہ انسان جونیابتِ الٰہی اور اشرف المخلوقات کے منصب پر فائز ہے' جب اپنے گرد پھیلی اس کائنات کے سامنے آتا ہے تو تحیر اور پریشانی اس کا مقدر بنتی ہے۔ معلوم انسان زندگی کے آثار کی حد تک صرف اپنی زمین کو ہی جانتا ہے۔ تاہم اس کی تلاش کا سفر جاری ہے۔ ایسے میں یہ زمین و آسمان اس کے احساسات پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں اور اس کی سوچ کا انداز شہزاد احمد کے ہاں یوں دکھائی دیتا ہے:

زمانہ ہوگیا ہم ایک سیڑھی پر کھڑے ہیں
ڈر رہے ہیں گر نہ جائیں
لیکن اس دھرتی میں جنبش ہی کہاں ہے
آسماں اپنے ستارے ساتھ لے کر
سر پر یوں ٹھہرا ہوا ہے
جیسے گردش اس کی قسمت میں نہیں ہے)شہزاد احمد:زمانہ ہوگیا)(۸۱(

یہاں شاعر آسمان کو غیر متحرک اور جامد قرار دیتا ہے۔ جو خود تو رکا ہوا ہے مگر تمام اجرامِ فلکی اس کے سامنے محوِ حرکت ہیں۔ لیکن اس آسمان کی حقیقت کیا ہے؟ سائنس کے مطابق جہاں ہماری بصارتوں کی حد ختم ہوجاتی ہے وہاں ہماری آنکھیں نیلا رنگ محسوس کرناشروع کردیتی ہیں اور بھی اک سراب ' اک دھوکا ہے' جس کی کوئی حقیقی حیثیت نہیں۔یہی نظریہ اپناتے ہوئے اختر حسین جعفری اور شہزاد احمد لکھتے ہیں کہ

آسماں کی چھت سے
روز جالپٹتے ہیں
آسماں جو نیلے
پانیوں کا دھوکا ہے)اختر حسین جعفری:آگ کتنی روشن ہے)(۸۲(

شاید یہ فلک کہیں نہیں ہے
آنکھوں ہی میں کوئی سرزمیں ہے)شہزاد احمد:اترے مری خاک پر ستارہ)(۸۳(

کائنات میں ہر شے متحرک ہے۔ کیوں کہ حرکت زندگی اور سکون موت ہے۔ شہزاد احمد کے بہ قول یہ آسمان ساکت ہے جس میں باقی تمام چیزیں حرکت کرتی رہتی ہیں

بس جہاں ہوں' وہیں ہوں
مگر سردوساکت نہیں ہوں
اک حرارت ہے' جس میں سکونت کا پھیلائو ہے)شہزاد احمد:میں کہاں ہوں)(۸۴(

انسان اور اس آسمان کے درمیان تعلق کو بیان کرنے میں ہوا بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ مگر یہ خود بھی خاک کے ذرّے اڑائے پھرتی ہے۔ وہ خاک جس سے اجسام کی تخلیق ہوئی۔ وہی خاک اس کا حاصل ہے۔

مگر یہ کون ہے کیا چاہتا ہے

ہیولا سا کہاں آگیا ہے
کوئی چلتی ہوا سے پوچھتا ہے
سوائے خاک تیرے پاس کیا ہے؟)شہزاد احمد:بہت بے آبرو ہونے کے دن ہیں)(۸۵(
اپنی تمام تر لطافتوں اور پنہائیوں کے ساتھ یہ آسمان ہمیشہ سے انسان کے ہم راہ رہا ہے۔ اس کا ساتھ ‘ تحیر کے سفر کا ساتھی بھی ہے اور منبع بھی جو انسانی حیرتوں کے در‘ وا کرتے اجرامِ فلکی کا مسکن بھی ہے۔
وہی آسماں ہے
وہی اس کے تارے
وہی چپ درختوں پہ بیٹھی ہوئی غم زدہ چاندنی ہے
وہی دور تک رات کا سرد آنچل
دریدہ پڑا ہے
کہ جس کو ہوا اپنے پیروں تلے روندتی جارہی ہے
دریچے سے باہر
وہی چشمِ حیراں
جسے چاند کہتی ہے یہ ساری دنیا
مری منتظر ہے
ازل سے ابد تک
یہی ایک منظر
یہی ایک موسم
شریکِ سفر ہے)شاہین مفتی:وہی آسماں ہے)(۸۶(
آسمان ہی وہ صنعت ہے جس میں تمام تر عناصر کے بننے بگڑنے کا عمل جاری رہتا ہے اور یہ ایک گرداب کی صورت کسی شے کو فنا کے گھاٹ اتار کر اس کی ہستی کو معدوم کردیتا ہے اور کسی کو عیاں کردیتا ہے۔
آسمان کالے سمندر کی طرح
اپنی گہرائی میں گرتا ہی چلا جاتا ہے
ایک چکر ہے جو پھرتا ہی چلا جاتا ہے
ایک گرداب ہے جس میں ہر شے
بنتی اور ٹوٹتی شکلوں کی طرح
ریزہ ریزہ ہوئی جاتی ہے)شہزاد احمد:رات تنہا نکل آئی گھر سے)(۸۷(
آسمان کی طرح آفاق کی حدود بھی اس کی سمجھ سے ماورا ہیں۔ انسان کی عقل آفاق کی حقیقت پر بھی طبع آزمائی کی کوشش کرتی ہے اور کائناتی آفاق کی بجا آوری کا فریضہ سر انجام دیتی ہے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ
افق کیا ہے
یہی پرواز کا تھک کر سمٹ جانا
رسائی سے ذرا پہلے
مسافر کا کہیں رستے میں مرجانا
کسی دہلیز کی نسبت سے دوری اور مجبوری

زمین و آسماں کے درمیاں
موہوم سا نقطہ!!!
مرے انفاس کو ان کے مدور دائروں میں
رقص کرنے دو
انھیں جاں سے گزرنے دو
یہ سرحد پارکرنے دو
محبت کے سمندر کا کنارا کس نے دیکھا ہے
بھلا ایسی زمینوں پر کسی خط کشیدہ کا اشارہ کس نے دیکھا ہے
جہاں آنکھیں ٹھہر جائیں
وہی آفاق کی حد ہے)شاہین مفتی:کنارہ کس نے دیکھا ہے)(۸۸(

آسمان پر چمکتے سورج اور چاند بھی' انسان کے تاریکیوں کے سفر کو روشنی عطا کرتے ہیں۔ ان کی حرکت دن اور رات کی تخلیق اور تسلسل کا باعث بنتی ہے۔اور یہاں سورج کے کھلتے بادبان نئی صبح کا استعارہ بن جاتے ہیں۔

دنوں کے کناروں کو چھوتا ہوا چاند'
سورج کے ساحل پہ کھُلتے ہوئے بادباں روشنی کے
بہت لمبی راہوں کے جوکھم' وہ رستے
جو باہر سے اندر کی منزل کو جاتے ہیں
دم گھونٹتے والی تاریکیوں میں
یہاں تو بسرے زمانوں کی سنگت میں کھِلتا ہوا
زرد سورج مکھی' جس کے رنگوں کی چادر بھی دھندلاگئی
خون کی باڑ پر' خون میں تربتر ایسی پرواز کا حوصلہ
کہ جس کی حکایت سیاہی کی دیوار پر
صبحِ لرزاں)عبدالرشید:کہ جن آنسوئوں کی حکایت)(۸۹(

روشنی اور اندھیرے' دن اور رات کے تناظر میں سورج کا یہ بیانیہ بہت حسین معلوم ہوتا ہے جس میں تاریکی میں سورج کے چھپ جانے کا اشارہ ملتا ہے۔

سب کو آواز دو' آج سورج کا نیلام ہے'
اپنی جیبوں میں خالص اندھیرے لیے گھر سے آئیں'
وہ بک جائے گا' اس کی عصمت کی قیمت بھی بھاری نہیں' (عبدالرشید:قبیلے کے ماتھے پہ)(۹۰(

عبدالرشید کے ہاںیہ دراصل موت کی طرف مائل سورج کا اظہار ہے جو رفتہ رفتہ اپنی روشنی کھوئے چلا جا رہا ہے اور اندھیروں کا گرویدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی عصمت کی قیمت بھی اندھیرے ہی قرار پاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی دوشیزہ اپنے آپ کو اپنے محبوب کی دست رس میں یوں دے دیتی ہے کہ اُسے نہ تو رشتوں کا کوئی احساس باقی رہتا ہے نہ ہی زمانے کا۔ کیوں کہ اُس کی قیمت اس پیار کی صورت ہے جسے وہ حاصل کرنے کے لیے اپنا سب کچھ دے کر بھی محسوس کرتی ہے کہ اُس نے گھاٹے کا سودا نہیں کیا۔

اگرچہ سورج کی نیلامی کا اعلان کردیا گیا ہے۔ اور عبدالرشید اس کے تمام تر راز ہائے دروں کو عیاں کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں لیکن اس سائنسی حقیقت کو بھی بیان کرتے ہیں کہ ہمارا سورج لمحہ بہ لمحہ موت کی آغوش میں جا رہا ہے اور گرد پھیلا وسیع خلا نہ جانے پہلے ہی کتنے سورج نگل چکاہے لیکن اس کی پیاس نہیں بجھ پائی۔

میں روز اپنے گھر سے یہ کہہ کے نکلتا ہوں ڈھلوان پر آج سارے تماشے سے پردہ اٹھادوں گا۔
لیکن وہ سورج مری سانس میں اپنے پارے کی رفتار سے بجھ رہا ہے'
سمندر کا پانی حرارت کو پی کر بھی ٹھنڈے کا ٹھنڈا ہے' (عبدالرشید:قبیلے کے ماتھے پہ)(۹۱(

اب دیکھنا یہ ہے کہ سورج کے یہ تماشے کیا ہیں؟ وہ دیگر اجرام کے ساتھ کیا تعلق رکھتا ہے اور کیسے اپنی زندگی کے سفر پر چلتا ہے تو صدا آتی ہے کہ

پھر کہیں بابِ سخن کھلتا ہے
ایک دریا کی صدا آتی ہے
وقت کا بھید کھلا ہے جس میں
چاند معذور مسافر کی طرح
ڈولتا پھرتا ہے پانی پہ کہیں
سب ستارے سرِ افلاک کھڑے ہنستے ہیں
بادباں کوئی نہیں اور بدن سوختہ ہے
تشنگی۔۔ ۔ چاند کا اندوختہ ہے)شاہین مفتی:بابِ سخن کھلتا ہے)(۹۲(

چاند تو اپنی تشنگی کی مدھم روشنی لیے فلک پر ایستادہ رہتا ہے مگر تاروں کی روانی کو صبح تک نیم روشن ہوائیں رقصاں رکھتی ہیں اور جب وہ فلک کا دامن چھوڑ کے نکلتا ہے تو:

ایک تارہ برگِ شب سے ٹوٹ کر
جب کرم خوردہ ہوائوں کے
ورق کی رحل سے'
نیم روشن صبح کی دہلیز پر آکر گرا
کھڑکیوں پر نیلے پردے زور سے سمٹے
فلک سے کہر کی بارش ہوئی)عبدالرشید:ایک تارہ برگِ شب سے ٹوٹ کر)(۹۳(

اور جب یہ ٹوٹتے بکھرتے رقصاں تارے خلا کی بے انت گہرائیوں کے نشیمن میں اپنی جگہ نہیں پاتے تو اپنی یاد کی مدھر موسیقی کو خلا کے سپر د کر کے روشنیاں بکھیرتے ہیں

نیلے فلک کی جھیل میں تارے ابھر کر ڈبکیاں لیتے چمکتے ہیں
کہیں پر دور شہنائی کی مدہم تان یخ بستہ فضا میں
بھولے بسرے گیت کی وارفتگی کے ساتھ
شعلہ سا لپکتی ہے)عبدالرشید:دوسری نظم 1)(۹۴(

میرے باہر کے خلا میں تاریک سمندر بہتا ہے
جس کی سطح پر الہڑ کہکشائیں ککلی ڈالتی ہیں
جب کبھی کہکشائیں آپس میں ٹکراتی ہیں

تو ے کہکشائوں کی روشنی سے لدی ڈالیوں سے
تازہ پھلوں کی طرح جھڑ جھڑ کر
نامعلوم ابدی خطوں میں
گرتے چلے جاتے ہیں۔)جواز جعفری:مجھے ابد کا کنارہ دیکھنا ہے)(۹۵(

انسانی کم مائیگی کے حوالے سے لکھی گئی خالد علم کی درج ذیل نظم ‘بہ ظاہر ایک عورت کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے کہ وہ کس انداز میں میدانِ جنگ میں گئے اپنے خاوند کی واپسی کی تمنا لیے ہوئے ہے۔ لیکن آخر میں اٹھائے گئے سوال کائنات کی نیم جانی اور موت کا موازنہ بہت خوب صورت ہے۔ موت اور خواب کے منظر میں تعلق کو ڈھونڈنے کی خوب صورت کوشش ہے۔

میں نے اپنی نظر سے دیکھا
اپنے اجڑے نگر سے دیکھا
وہ رات کے آسماں کے اس پار
تاروں کا جو قافلہ رواں تھا
ہر چند بہت ہی نیم جاں تھا
چلتے چلتے افق پہ پہنچا
اپنی جاں سے گزر گیا تھا
اس رات کے ساتھ مر گیا تھا
جب مر ہی گیا تو رات کیوں ہے
سوئی ہوئی کائنات کیوں ہے
خاموش ہے کیوں کنارِ دجلہ
چپ چاپ کھڑافرات کیوں ہے)خالد علیم:سورج نکلا نہیں ابھی تک)(۹۶(

یہ سب یوں ہی رواں رہتا ہے اور ایک انسان اس سانسوں کے جنگل میں قید‘ اپنی زندگی کے دن پورے کرتا ہے۔ جہاں سورج اک سگِ مامور بن جاتا ہے اور وقت ایک سرکتی فصیل کی اینٹوں کو صورت سامنے آتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پر زندگی پانیوں کی کوکھ سے پیدا ہوتی ہے اور پھر حیات و ممات کا سفر شروع ہوتا ہے۔اور کائنات کا یہ اسرار اختر حسین جعفری کو یوں متحیر کرتا ہے:

سرِ نگاہ وہی عکسِ آئینہ خانہ
وہی‘ ہجومِ مقیّد‘ وہی خطِ پرکار
وہی پناہ کا جنگل‘ وہی سگِ مامور
خود اپنے آپ سرکتی فصیلِ ذات کی خشت
خود اپنے آپ اپنے قدم چھوڑتی زمینِ فرار
وہی نگاہ‘ وہی چاک حرف کی تفہیم
زمیں کا اوّلیں مکتوب بادلوں کے لیے
ازل سے تا بہ ابد تیرتے نجوم‘ طیور
پروں سے جن کے افق تا افق دمِ پرواز
زمینِ منتظر و کوہِ بے ارادہ پر
دھنک کے رنگ میں گردِ ممات گرتی ہے)اختر حسین جعفری)(۹۷(

اس ضمن میں زاہد امروزکا احساسِ تنہائی بڑھتا ہے تو وہ خود کو ایک چمگادڑ کی صورت میں محسوس کرتے ہیں جو وقت کے ہاتھوں مجبور اور ایک کھلونے کی صورت میں ہے ۔ بے کنار کائنات کی کوئی شے بھی اس کی تشفی کا سامان نہیں کر پاتی۔

اس بے کنار کائنات میں
میں چمگادڑوں کی طرح تنہا ہوں
میرے انتشارِ خون میں سانپوں کی پھنکار رینگتی ہے
میرا جسم اُڑ گئے پرندوں کے بعد لرزتی شاخ ہے
آج وقت میری گرفت میں نہیں
آج رومی میری تشفی نہیں بن رہا
میری کم زور روح!
تیرے سینے کا یہ پتھر خود غرضی ہے یا محبت؟
نجات کا کوئی راستہ نہیں
دن کا کولہو مجھے پیل رہا ہے
رات کی چکی مجھے پیس رہی ہے
اور کھیت کھیت پھیلی میرے انتظار کی سرسوں
شام کا مرجھایا ہوا پھول بن گئی ہے   )زاہد امروز:میرا انتظار مرجھایا پھول ہے)(۹۸(

انسان اس کائنات میں بہت چھوٹا ہونے کے باوجود اہم ہے کیوں کہ اس فضا میں وہی اک ایسی ہستی ہے جس کے ہونے سے اس کائنات کی تفہیم ہوتی ہے۔ وہی واحد ہستی ہے جس کے ہونے سے بزمِ عالم میں شورو غوغا سنائی دیتا ہے اورکائناتی رشتوں کا احساس پنپتا ہے۔

چمنیوں کے رستے سے
لفظ‘ آدمی‘ رشتے
ہانپتے ہوئے طائر
آدمیت کا شور
کائنات کے شانت لہجے میں دراڑیں بھرتا رہتا ہے)   زاہد امروز:زمین کے ہنکارے)(۹۹(

ان ہی آوازوں کی تلاش وہ دوسری جگہوں پر بھی کرتا ہے۔ وہ اسی آواز سے زندگی کا اندازہ لگانا چاہتا ہے۔ ان صدائوں کی بہ دولت وہ ماضی حال اور مستقبل کے تانے بانے ملانے کا طلب گار ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے‘ کیونکہ آواز بھی توانائی کی ایک قسم ہے لہٰذا‘ آواز کبھی فنا نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ مستقبل میں کوئی ایسا آلہ ایجاد کیا جاسکے جو ہمیں اس قابل بنا سکے کہ ہم ماضی‘ حال اور مستقبل کی ان آوازوں کو سن پائیں۔

ان کی آواز سنو جو یہاں موجود نہیں
ان کی آواز‘ جو آئے تھے کبھی
ان کی آواز‘ جو آئیں گے کبھی
اور ان لوگوں کی آواز سنو
جو نہ آئے تھے ‘ نہ آئیں گے کبھی   )زاہد ڈار:نظم)(۱۰۰(

انہی آوازوں کی تلاش کے ساتھ اسے اپنی تلاش بھی جاری رکھنا پڑتی ہے۔ ڈاکٹروزیر آغا اپنی جسمانی حدود کو ایک پنجرے کی صورت دیکھتے ہیں اور ذہنی سطح پر جب وہ اپنے

خول سے باہر نکلتے ہیں تو مزید حیرانی انھیں آلیتی ہے اور وہ پھر سے اپنی جسمانی حدود میں سہارے کے متلاشی دکھائی دیتے ہیں۔

جب میں خود سے باہر آکر
اپنے خول کو دیکھتا ہوں
تو ہنس پڑتا ہوں
سوچتا ہوں
اس ٹوٹے پھوٹے پنجر میں
جو پنجرے سے بھی بدتر ہے
میں ایک اکیلا پنچھی ہوں
پل بھر کو باہر نکلا ہوں
اور نکلا ہوں تو پنجر مجھ کو
کتنا خالی کتنا مضحک سا لگتا ہے
ہنس پڑتا ہوں
پنجر میں واپس آتا ہوں
اک اک کرکے سارے طوق پہن لیتا ہوں
پنجر جیسے جی اٹھتا ہے
اور میں پھر سے
قسطوں میں مرنے لگتا ہوں (وزیر آغا:اور میں پھر سے)(۱۰۱)

انسان کی کائناتی تسخیر کی تمنا مکمل نہیں ہوتی حالاں کہ وہ اس حقیقت سے بھی آشنا ہے کہ آج تک یہ کائنات اس کی تسخیر کے زمرے میں نہیں آپائی۔ اس کی وسعتیں آج بھی انسان کے لیے سامانِ حیرت مہیا کرتی ہیں۔بہ قول شہزاد احمد:

اسے تسخیر کرلیں
جو کبھی تسخیر ہونے میں نہیں آیا
ستارے ان گنت ہیں
وسعتیں بے انتہا ہیں
اس زمیں پر جس قدر انسان ہینسیارگاں ان سے زیادہ ہیں
کمی کوئی نہیں
پھر بھی کمی محسوس ہوتی ہے (شہزاد احمد:بند مٹھی)(۱۰۲)

بہ ہرحال شاعر کی یہ تمنا نہیں چھوٹتی ۔ نصیر احمد ناصر اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اس جیسی زندگی ‘ اُن کے ادراک سے باہر ضرور ہے‘ لیکن کہیں نہ کہیں موجود ضرور ہے۔ وہ اپنی حدود کے باعث شاید ان دوریوں کو پاٹ نہیں پارہے۔

مجھے تم دور لگتے ہو
افق کی آخری قوسوں کے بیچوں بیچ
اک موہوم سے فلکی جسیمے کی طرح
خاموش اور تاریک
اپنی ہی کشش کے دائمی قیدی
کسی بھی دوسرے ذی روح کے

احساس سے عاری/بہت بھاری--! (نصیر احمد ناصر:سنو' بلیک ہول جیسے آدمی!)(۱۰۳(

وسیع و عمیق کائنات میں خالد علیم اپنی حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ وہ کائنات کو اندھیروں میں مستور محسوس کرتے ہیں اور پھر خود آگہی کے سفر پر نکلتے ہیں۔

یہ سیہ خانۂ ظلمات تَوَہّم بھی عجب ہے
کہ کوئی ایک کِرن بھی نہیں ایسی
کہ جو اتنا بھی اجالاکردے
مجھ کو میری ہی خبر مل جائے)خالد علیم: حفظِ ماتقدم)(۱۰۴(

خالد علیم خود آگہی کی اگلی منزل کی طرف بڑھتے ہوئے خود سے ہم کلام ہوتے ہوئے اپنی انسانی حدود کا تعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

میرے معلوم کی سرحد مری آنکھوں کے اندھیروں میں
کہیں گم ہے کہ میں یہ بھی نہیں جانتا
معلوم کی سرحد کا ہے آغاز کہاں سے
مرے معلوم کی حد میری زمیں تک بھی اگر ہو تو چلو
یہ بھی غنیمت ہے مگر
مجھ کو معلوم کی سرحد بھی تو معلو م نہیں)خالد علیم: حفظِ ماتقدم)(۱۰۵(

مگر اس آسمان کی حدود کیا ہیں؟ کیا یہ ہماری عقل کے بس میں ہے کہ ہم اسے جان پائیں؟ تو یہ بے انت وسعتیں شہزاد احمد کے دل و دماغ پر یوں چھا جاتی ہیں کہ ایسے میں وہ یہ کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ

فلک بھی ریت کی بکھری ہوئی مٹھی نظر آتا ہے
جس کے سارے ذرّے کوئی گن پاتا نہیں)شہزاد احمد:بند مٹھی)(۱۰۶(

یہ حد بندی عابد ودود پر ایک احساس کی صورت اترتی ہے اور انھیں بتاتی ہے کہ وہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اشیا کی حقیقت ارتقائی مراحل سے گزرتی ہوئی ماضی اور مستقبل کی زندگیوں کے درمیان ایک پُل کی سی ہے اور وہ کہہ اُٹھتے ہیں۔

میں جا چکے موسموں کا نغمہ
ادھورے خوابوں کا ایک سایہ
افق کی تاریکیوں میں
کھویا ہوا ستارہ
پلٹ کے دیکھے گا
کون پوچھے گا
مجھ سے باتیں
گئے دنوں کی صعوبتوں کی
محبتوں کا گیا زمانہ
میرا قفس ہے نہ آشیانہ
فقط پرندہ ہوں
بے ٹھکانہ)عابد ودود: خواب موسموں کی ایک نظم)(۱۰۷(

ان ارتقائی مراحل کو شہزاد احمد نے ایک خوب صورت نظم میں سمو کر یوں پیش کیا ہے:

اس دن لاکھوں سورج تھے
جب پہلا دن نکلا تھا
پھر صدیوں تک دن ہی رہاتھا
رات نہ آئی تھی
پھر ایک آندھی اٹھی تھی
اور لاکھوں سورج
اس آندھی میں دور دور تک پھیل گئے تھے
گرد کے ان طوفانوں میں کچھ انگارے تھے
جو اپنے اپنے سورج کی جانب لپکے تھے
تب پہلی رات پڑی تھی
جب پہلا چاند ہنسا تھا
تب پہلا پھول کھلا تھا
تب پہلی بار سمندر نے انگڑائی لی تھی
پہلی بار زمینوں سے تب
آگ کے فوارے چھوٹے تھے
تب پہلی بار ستارے ٹوٹے تھے
ہر اک جانب‘ رنگ رنگ کے دن پھوٹے تھے
پھر چلتے آوارہ دنوں نے راتوں کو مسمار کیا تھا
ہر شے کو ہونے کے لیے تیار کیا تھا
پھر اس آگ پر برف پڑی تھی
لیکن برف کہاں سے آئی تھی؟
کیا ہر شے سودائی تھی!
جو انجانے رستوں کی جانب بھاگ پڑی تھی
شاید حیرت جاگ پڑی تھی
لیکن اب ڈر لگتا ہے
کیا جانے کل کیا ہوجائے
آنکھیں کھول دے ہر اک ذرہ
یا ساری وسعت سوجائے
جو کچھ اک عالم لگتا ہے
پھر سے اک ذرّہ ہوجائے! (شہزاد احمد: جب پہلا دن نکلا تھا)(۱۰۸(

یہی آگہی شاعر پر ایک نیا در ‘وا کرتی ہے کہ یہ دنیا تو مسلسل دھوکے کا نام ہے۔ یہاں اشیا کی ماہیت مختلف دکھائی دیتی ہے لیکن حقیقت تو ایک ہی ہے جو کسی بھی قسم کے فرق سے ماورا ہے۔

روشنی اور اندھیرے میں کوئی فرق نہیں
گرم اور سرد میں کچھ فرق نہیں

دھوپ اور چھائوں میں کچھ فرق نہیں
جسم اور روح میں کوئی فرق نہیں)زاہد ڈار: نظم)(۱۰۹(

ہماری روشنی کا سب سے بڑا وسیلہ سورج ہے۔ یہ روشنی کا منبع ہے۔ ہماری زمین کو روشنی دینے کی ذمہ داری اسی پر عاید ہے اور یہ دن رات کی قید سے بالاتر ہوکر ہمیں روشنی مہیا کرتا ہے۔

یہ منجمد روشنی کا ہالا
نہ مہر جیسا، نہ ماہ جیسا
اک ایسے لمحے کے تخت پر جاگزیں ہے، جس کا شمار
دن رات میں نہیں ہے)اختر حسین جعفری)(۱۱۰(

ستارے
قدرت کی خوش ذوق دوشیزہ کی کولیکشن ہیں
جو اس نے اربوں سالوں سے جمع کی
میں اس نمایش کو حیرت سے دیکھتا ہوں)جواز جعفری:مغرب سے طلوع ہوتے سورج)(۱۱۱(

اسی لیے تو روشنی اور کائنات کے تعلق میں سورج کا کردار کلیدی رہتا ہے۔ تاہم اقبالؒ اک نئی بات کو بھی سامنے لے کر آتے ہیں کہ یہ روشنی یک سمتی نہیں بل کہ واپس سورج سے بھی مل سکتی ہے۔

آفاق کے ہر گوشے سے اٹھتی ہیں شعاعیں
بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش)اقبالؒ:شعاعِ امید)(۱۱۲(

ہر طرف پھیلتی یہ روشنی ایک سمندر کی لہروں کی صورت ہے، لیکن جس طرح اس نے زندگی پہلے تخلیق کی ویسے حالات اب موجود نہیں اس لیے زندگی کا رنگ بھی عجیب ہے۔ گویا انسان صاحبِ بصیرت نہیں یا صاحبِ بصارت نہیں۔

روشنی کا اک سمندر
ہرطرف پھیلا ہوا ہے
لیکن اس میں ایک بھی مچھلی نہیں ہے
دھوپ، سورج، مچھلیاں معدوم ہوتی جارہی ہیں
اور شاید میری آنکھیں بھی! (شہزاد احمد:کوئی اچھی خبر آئے)(۱۱۳(

ہمیں دکھائی دینے والے بادل بھی زندگی کا استعارہ ہیں اور یہ بھی روشنی کی توانائی کے طفیل ہی دکھائی دیتے ہیں ورنہ ان کی حقیقت تو دھویں سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔

سفید بادل، ازل سے یونہی بھٹک رہے ہیں
سُنا رہے ہیں، عجیب قصے
عظیم کہنہ عمارتوں میں
قدیم روحوں کا اک جہاں تھا
بس ایک سیال روشنی تھی
بس ایک منظر دھواں دھواں تھا
رُکا ہوا سا کئی زمانوں کا کارواں تھا)نصیر احمد ناصر:سفید بادل)(۱۱۴(

نصیر احمد ناصر روشنی کو ہی حقیقتِ کُلی کے معنوں میں محسوس کرتے ہوئے اس سے مخاطب ہوتے ہیں کہ یہ زندگی اس کے ہی دم قدم سے ہے۔

محبت شہر کی وہ سمت ہے
جس سمت میں اے روشنی زادی!

نادیدہ زمانوں کے ابد آباد کرتی ہو
کسی دل کو رُلاتی ہو' کوئی دل شاد کرتی ہو
نہ جانے کون سی ازلوں کے دُکھڑے یاد کرتی ہو)نصیر احمد ناصر:مسافر راستوں سے لوٹ آتے ہیں)(۱۱۵(

کیوں کہ روشنی زندگی ہے اور زندگی کا اظہار بھی۔ لہٰذا جواز جعفری اسے اپنا ہم سفر بنانے کے تمنائی ہیں۔ سائنس دانوں کا بھی یہی خیال ہے کہ اگر ہم روشنی کی رفتار سے زیادہ رفتار سے سفر کریں تو وقت کی کوئی حیثیت باقی نہ رہے گی اور ہم حال کے ساتھ ساتھ ماضی اور مستقبل کے ان جانے جزیروں تک بھی نہ صرف پہنچ سکیں گے بل کہ واپس بھی آپائیں گے اور ایسے میں زندگی کوئی راز نہ رہے گی۔ یہی خواہشِ سفر شاعر کو بے چین رکھتی ہے۔

مجھے روشنی کے گھوڑے پر بیٹھ کر
کائنات کے دورپار کے اجنبی خطّوں میں
زندگی کے بیج پھینکنے جانا ہے
کیوں کہ زندگی نہتّی ہے
اور موت کے نرغے میں ہے
میں زندگی کا وفادار ہوں
زمین زاد بول
چلے گی میرے ساتھ؟)جواز جعفری: میں زمین کا وفادار ہوں)(۱۱۶(

نئی دنیاؤں کی خواہش بجا لیکن انسان اپنی حقیقت اور اپنی دنیا کی حقیقت کو پانے کا بھی اتنا ہی شدید متمنی ہے اور اس کے من میں مختلف طرح کے نظریات جنم لیتے ہیں۔ وہ خود میں موجود توانائیونکو سورج کی توانائی کی دین قرار دیتا ہے اور خود کو بھی اسی کی طرح زندگی کا استعارہ پاتا ہے کہ ہنگامہ ہائے جہاں اسی کے دم سے بپا ہے لیکن وہ ابتدا سے نا آشنا ہونے کے باوجود کائنات میں رنگ بکھیرتا رہتا ہے۔جس کا اظہار ڈاکٹرجواز جعفری کے ہاں یوں ملتا ہے:

میں اپنی ابتدا کی کھوج میں ہوں
سورج کی کچھ راکھ
میرے اندر دہکتی ہے!
میرا دل
لامحدود وسعتوں پر رقص کرتے
سورج کے ساتھ دھڑکتا ہے!
میراجلنا
سورج کے بُجھنے تک ہے!

میری آنکھوں کی روشنی پر
میرا سلسلۂ نسب لکھا ہے
ستارے میرے پُرکھے ہیں
اور میں ستاروں کی راکھ ہوں
چاند
مجھے اپنے چہرے پر ملتا ہے! (جواز جعفری:میں ستاروں کی راکھ ہوں)(۱۱۷(

ہماری یہ معلوم انسانی دنیاجس میں ہزارہا اجرامِ موجود ہیں۔ اس کی سیال فضا ان دوریوں میں ربط پیدا کرتی ہے اور وسعت کی متقاضی رہتی ہے۔

یہ بستی آسماں تک پھیلنے کی حرص میں دن رات کیوں چنگھاڑتی ہے
یہ دوری جس پہ ہم اک دوسرے کو دیکھتے ہیں
اسی سیال آئینے میں خوشبو اور پانی کھیلتے ہیں
اسی خطِّ نظر پر چاند میرے اور تمھارے درمیاں
اک لمسِ گُل اندام کی کرنیں کھلاتا ہے)ایوب خاور:ہوا کب سانس لے گی)(۱۱۸(

لیکن ان اجرام کی حقیقت کیا ہے؟ کیا ان کا وجود بھی حقیقی ہے یا یہ بھی محض گرد کے بگولے ہیں ؟ بادل ‘ زمین‘ آسمان‘ چاند‘ تارے ‘ کیا ہیں یہ سب؟ شاید یہ اسی کائناتی گرد کا حصہ ہیں جو مجسم ہوکے ستارے اور سیارے تخلیق کرتی ہے

کہیں بادل نہ بادل کا نشاں ہے
مری بستی پہ خالی آسماں ہے
مگر یہ آسماں بھی اب کہاں ہے
فقط اک گرد سی ہر سو رواں ہے)شہزاد احمد:بہت بے آبرو ہونے کے دن ہیں)(۱۱۹(

اگر یہ گرد ہی سب کچھ ہے تو پھر ہم اس گرد کے پار اتر کر کسی دوسری زندہ مخلوق تک کیوں نہیں پہنچ پاتے جو کہ معلوم انسانوں سے مشابہت رکھتی ہو؟ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ

ْاِس دھرتی سے
اُس دھرتی تک
بیچ میں کتنے دریا اور سمندر ہوں گے)اشفاق حسین: نیند نہیں آتی ہے)(۱۲۰(

یہ فاصلے بھی درست‘ مگر اس کائنات کے اپنے بھی تو کیمیائی اصول وضوابط ہیں۔ ان اصولوں کے تحت تو آخر کار ہم کو بھی فنا ہوکر شاید کسی بلیک ہول کا حصہ بننا پڑے کہ تبدیلی کائنات کا خمیر ہے۔

جیسے حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر ہمارا رویہ بدل جاتا ہے‘ بعینہ
انتہائی درجۂِ حرارت پر کیمیائی عناصر قلبِ ماہیت کرتے ہیں
جب کششِ ثقل کا اثر کمزور ہوجائے تو
ستارے کی بیرونی سطح پھیل جاتی ہے ‘ اور
وہ عقرب اور اژدر کے مانند اپنے ہی پیدا کردہ ذیلی و طفیلی سیارے ہڑپنے لگتا ہے
اپنے جذبات‘ خواہشات اور سکون کے سفاک قاتل بن جاتے ہیں
جب ہم ایک دوسرے کے شریکِ رگِ جاں ہوتے ہوئے بھی بہت دور لگیں گے

سمندر کھولنے لگیں گے
گلیشئیر پگھل کر طُغیانی پر آجائیں گے‘ اور
ہرسمت بے کراں تباہی کی آغوش میں چلی جائے گی
تب ہم اپنی مشترکہ کائنات سے بلیک ہول کے مانند غائب ہوجائیں گے
)اظہر غوری: بلیک ہول)(۱۲۱(

انسان ان ہی الجھنوں میں پھنسا کائنات اور اس کی پرچھائیں بنا‘ حقیقتوں کی تلاش میں رہتا ہے۔ مگر حقیقتِ ازلی تک پہنچے بھی تو کیسے؟ اس کے راستے میں ڈھیروں مشکلات اور رکاوٹیں ہیں۔ ان رکاوٹوں کا ریاضیاتی بیانیہ بھی کتنا دل کش ہے‘ جیسے احمد صغیر صدیقی رقم طراز ہیں کہ

کہاں وہ سیدھی لکیر
جس پر
خودی کا گہرا عمود
حسنِ انا کا اک زاویہ بنائے کھڑا ہواتھا
شکستگی اک نُکیلی پرکاربن کے ہرسو
طویل قوسوں سے
حوصلوں کی مثلثوں پر
سیہ خراشیں لگارہی ہے
نئے نئے دائرے ہر اک سمت
صاف ستھرے وجود کی مستطیل کو
ایک بے معنی شکل دینے میں منہمک ہیں
پروٹریکٹر کے بس میں اب کچھ نہیں رہا ہے
کہ ننھے نقطے تک
اس کی پیمائشوں کی زد سے باہر نکل گئے ہیں
خود اپنی ہی تھیورموں کی موٹی مہیب جلدوں کے نیچے آکر
کراہتا ہے
نقیبِ اشکالِ اوقلیدس)احمد صغیر صدیقی: جیومیٹری)(۱۲۲(

آسمان اور اس کی حدود اور بے تابی کے اسی سوال نے جب اقبالؔ کے ہاں جگہ پائی وہ بے ساختہ یہ کہہ اٹھے کہ

یہ گنبدِ مینائی! یہ عالمِ تنہائی!
مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی
بھٹکا ہوا راہی میں‘ بھٹکا ہوا راہی تو
منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی؟)اقبالؔ:لالۂ صحرائی)(۱۲۳(

کائناتی تفہیم کے لیے تو یہ سوال بھی اہم ہے کہ کیا سورج اور چاند تارے ایک دوسرے کے ازلی دشمن ہیں جو ایک دوسرے کے خاتمے پر آمادہ اور کوشاں ہیں؟ مگر ایسا نہیں ہے ۔ جب ایک جاگتا ہے تو دوسرا سوتا ہے کہ

تاروں کی روشنی میں
سورج لرز رہا ہے

اور چاند اونگھتا ہے   )زاہد ڈار)(۱۲۴(
اور ان ستاروں کی حقیقت کو ڈاکٹر جواز جعفری شاعرانہ آہنگ میں یوں بیان کرتے ہیں:

ستارے
قدرت کی خوش ذوق دوشیزہ کی کولیکشن ہیں
جو اُس نے اربوں سالوں میں جمع کی
میں اس نمایش کو حیرت سے دیکھتا ہوں
نیلے‘ زرد‘ سرخ اور سیاہ ستارے
)جواں‘ ادھیڑ عمر‘ بوڑھے اور موت کی راہ تکتے ہوئے(
ایک دوسرے سے دور بھاگتے ہوئے ستارے
آپس میں بغل گیر ہوتے ہوئے ستارے
تنہائی کا بن باس کاٹتے ہوئے ستارے
اور اپنی ہی آگ میں جلتے جہنمی ستارے   )جواز جعفری:مغرب سے طلوع ہوتے دن)(۱۲۵(

مگر انسانی تمنا تو ایک نئی دنیا کی ہے۔ وہ دنیا جہاں اس جیسے دوسرے انسان بستے ہوں۔ جنھوں نے ارتقا کے اس سلسلے کو فتح کر لیا ہو مگر اس کے باوجود ہمارا اور ان کا تعلق بس اتنا سا ہے:

مگر ہم ان ستاروں کی طرح ہینجو کبھی اک دوسرے کو چھو نہیں پاتے
ہمیشہ دور ہی سے دیکھتے رہتے ہیں
قربت کی کبھی خوش بو نہیں پاتے   )شہزاد احمد: محبت کل جو تھی)(۱۲۶(

کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس کائناتی سفر میں وہ ہم سے بچھڑ چکے ہوں؟ اور یہ گرد ہوتی مسلسل پھیلتی کائنات اور اس کی گردشیں ہمارے پانو کی بیڑیاں بن کر ہمیں الجھائے ہوئے ہوں؟

کبھی ہم ایک مرکز سے چلے تھے
مگر اب فاصلہ دیوار ہوتا جارہا ہے
ہماری گردشیں
اک دوسرے کے پانو کی زنجیر بنتی جارہی ہیں   )شہزاد احمد:محبت کل جو تھی)(۱۲۷(

لیکن ڈاکٹر جواز جعفری انھیں بیڑیاں نہیں بل کہ اپنی جڑیں سمجھتے ہیں جو گہرائیوں میں اتر کر اپنے ہونے کا ثبوت مہیّا کرتی ہیں اور نسلوں تک قائم رہتی ہیں:

میں زمین پر قید
زندگی کا پیڑ ہوں
میری جڑیں
وقت میں دور تک پیوست ہیں
روشنی کے سنہری ہاتھ میں
جادوئی چابی ہے
مری آنکھیں
کائنات کا قفل کھلتے دیکھ رہی ہیں   )جواز جعفری:میں زندگی کا پیڑ ہوں)(۱۲۸(

ہماری ان تمنائوں پر کائناتی اصولوں کا پہرہ ہے۔ کبھی ہم ایک ہی مرکز کا حصہ تھے
مگر آج
وہی افلاک کی پہنائیاں
جس میں ہم تم
کبھی ہم رقص ہونے کے نشے میں چور تھے
مگر اب یہ نشہ کافور ہوتا جارہا ہے
قریب آنے کا لمحہ دور ہوتا جارہاہے)شہزاد احمد:محبت کل جو تھی)(۱۲۹(
ان اصولوں کے ہاتھ مجبور ہوکر ہی ہم اپنی مرضی نہیں کر پاتے کیوں کہ
کئی صدیوں میں سورج کی کرن
آتی ہے آکر لوٹ جاتی ہے
ہم اس کو دیکھتے ہیں
روکتے ہیں،ہر طرح ناکام رہتے ہیں)شہزاد احمد:ہم تم سے کیوں ملتے)(۱۳۰(
مگر شہزاد احمد مایوسی کا شکار نہیں ہوتے۔ وہ خود پسند بھی ہیں اور خود آگاہ ہونے کے ساتھ ساتھ پر امید بھی۔ وہ سمے کے بندھن سے آزاد ہونے کے معاملے میں خود کو نا امید نہیں پاتے کہ
کس قدر ہلکا ہوں میں
جس طرف چاہوں، نکل جائوں
خلا ہر سمت سے آواز دیتا ہے مجھے
دور ہوتی ہوئی کائناتو! میں تمھارے پاس ہوں)شہزاد احمد:نیند کے بعد)(۱۳۱(
ان کی امید کائنات پر انسان کا احساسِ تسلط ہے۔ اسی لیے تو وہ سوال اٹھاتے ہیں کہ
کوئی پوچھے کہ ٹھہری ہوئی یہ گھڑی
کس طرح چل پڑی
کیسے جامد زمینوں کو حرکت ہوئی
کس کے ہاتھوں سے ایسی شرارت ہوئی
کیا ہوا، کیوں ہوا؟)شہزاد احمد: ابھی دو بجے ہیں)(۱۳۲(
شاہین مفتی ناکامی کا اعتراف کرتی ہیں مگر نا امیدی ان کے دامن میں جگہ نہیں پاتی کہ وہ سورج کی حرارت اور توانائی کو اپنی بصارتوں کا راہ نما بنا لینے کی متقاضی ہیں
اس شہرِ لب بستہ میں یادوں کے گھنے جنگل سے آگے
ایک رستہ ہے
جہاں پر رات اتری ہے
)پرانے رت جگوں کی اوڑھنی لے کر(
فلک کے ہاتھ میں بھی ایک کشکولِ بصارت ہے)شاہین مفتی: خواب اور خواہش کے درمیان)(۱۳۳(
یہاں کشکولِ بصارت سے مراد توانائی اور روشنی اگلتا ہوا سورج ہے۔اُسی توانائی کی طلب شاہین مفتی کو یہ کہنے پر مجبور کردیتی ہے کہ
فلک اپنی اندھی مسافت سے تھک کر
مرے گھر کی چھت پر

بہت دیر سے
چپ کھڑا ہے
زینہ زینہ اترتی ہوئی پائوں کی چاپ سے
یہ مکاں گونجتا ہے
خدا جانے کس عرصۂ خواب میں ہوں
نہ مہتاب باقی‘ نہ تاروں کے جھرمٹ
فقط اک اندھیرا‘ ازل سے ابد تک
یہ جی چاہتا ہے
کبھی نیند ٹوٹے تو آنکھوں سے پوچھوں
کہ تم نے جو سورج تراشا ہوا تھا
کہاں رکھ دیا ہے
تمھاری مسافت کا انجام کیا ہے؟)شاہین مفتی: فقط اک اندھیرا)(۱۳۴(

جب یہ مایوسی فیضؔ کے دامن گیر ہوتی ہے تو اس کے دل سے یہ صدا نکلتی ہے کہ
گل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام
دُھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات)فیض احمد فیضؔ: موضوعِ سخن)(۱۳۵(

زاہد امروز جب تخیل اور سائنس کا مقابلہ کرتے ہیں تو انھیں سائنسی ایجادات اور دریافتیں بے معنی محسوس ہوتی ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا مطمعِ نظر پورا کرنے کی صلاحیت ابھی ان میں پید انہیںہوئی تو کہتے ہیں کہ
میں ضعیف سائنسی قوت سے محسوس کرتا ہوں
سب سے عظیم دکھ یہی ہے
کہ کائنات ہماری دسترس میں نہیں)زاہد امروز:کائناتی گرد میں برسات کی شام)(۱۳۶(

ہم اپنی انسانی حدوں کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ ہماری طرح ہمارے احساسات بھی محدود ہیں اور وہ کائنات کی باریکیوں کو آج تک مکمل طور پر سمجھ ہی نہیں پائے۔ اسی لیے شہزاد احمد کائنات کی بے پناہی کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ
جہاں تک دیکھنے کی ہم میں طاقت ہے
وہاں سے بھی نئے افلاک کا آغاز ہوتا ہے
جہاں ہم ختم کرتے ہیں کہانی
اس جگہ بھی
اک نئے قصّے نئی روداد کا امکان ہوتا ہے
جہاں کچھ بھی نہیں رہتا
وہاں تکوین کا سامنا ہوتا ہے)شہزاد احمد:کہاں تک ساتھ دے سکتی ہیں آنکھیں)(۱۳۷(

تقدیر اور تدبیر کا مسئلہ روزِ اوّل سے بحث کا موضوع رہا ہے۔ ہندو مذہب میں اسے بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ عہدِ قدیم کا انسان بھی ان باتوں پر ابتدا سے ہی غور کرتا رہا ہے جس نے مختلف علوم و فنون کو جنم دیا ہے جن میں سب سے اہم علمِ فلکیات ہے۔ ہندوئوں میں آج بھی کُنڈلی ملانے کا نظریہ اس کی بہترین مثال ہے کہ وہ ستاروں کی حرکت سے

سعدونحس کا نتیجہ نکالتے ہیں۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عبدالرشید اپنی نظم زمین زندہ ہے میں لکھتے ہیں کہ

شکستہ حرفوں کے زائچوں میں گھُلی ملی وہ کہانیاں جو
بہانہ بنتی ہیں ' راستوں کا نشاں لگا کر
سفر کی جانب دھکیلتی ہیں
نظر جو قیدی ہے آئینوں میں' خود اپنے محبس میں لوٹتی ہے۔)عبدالرشید: زمین زندہ ہے)(۱۳۸(

یہی فلسفہ کائناتی جہات اور اجسام کے تعلق پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ بعض شعرا کے ہاں اسی لیے یہ زمین کائناتی اصولوں کی جکڑن کا شکار دکھائی دیتی ہے۔بہ قول شہزاد احمد:

یہ زمین قید ہے خود ایک خلا کے اندر
کوئی رشتہ نہیں پھیلی ہوئی پہنائی سے
کچھ تعلق نہ بلندی سے' نہ گہرائی سے
ایک پتھر جو لڑھکتا ہی چلا جاتا ہے
کس طرف جانا ہے معلوم نہیں)شہزاد احمد:یہ زمیں ہے مرا کالا پانی)(۱۳۹(

اس کائنات میں جو بھی ہوتا ہے خود بہ خود ہوتا چلا جاتا ہے۔ آنسو اور انبساط بھی تقدیر کا ہی شاخ سانہ ہیں اور باقی اجسام بھی اسی کا شکار ہیں۔

اگر تم پوچھو کہ سب کیوں ہے تو میں کہوں گا
''مجھے نہیں معلوم''
سب خود بہ خود بادل کی طرح امڈ آتا ہے اور خود ہی گرجنے لگتا ہے
خود ہی ایک کُوند کبھی رات کبھی روشنی بن جاتی ہے
تیز ہوا خود ہی کہیں شور کہیں موسیقی بن جاتی ہے
خود بہ خود آنکھ برسنے لگتی ہے
)زاہد امروز: منافقت ایک گڈریا ہے جو اسے عدم کی سمت ہانک رہا ہے)(۱۴۰(

وقت کا چرواہا
ہماری محبتوں' مجبوریوں
اور حیرتوں سے بے نیاز
کہکشائوں کے ریوڑ کو اپنی جبری چھڑی سے
افق کی طرف
تیزی سے ہانکے لیے جارہا ہے)جواز جعفری)(۱۴۱(

تقدیر اور تدبیر کا کھیل اس کائنات میں یوں ہی جاری رہتا ہے لیکن اس کے ساتھ موت کو حیاتیاتی اور کیمیائی سطح پر سوچنے کی امنگ بھی قائم رہتی ہے۔ ہماری مجبوریاں ان کائناتی اجسام کے ساتھ ہمیں کشاں کشاں لیے پھرتی ہیں اور ان کی تبدیلی ہماری تبدیلی کا بھی باعث بنتی ہے۔

سورج ایک گوشے سے اٹھ کر
دوسرے گوشے میں بیٹھ جاتا ہے
لیکن ہم روشنیاں تلاش کرتے ہوئے

سایوں میں ڈھل جاتے ہیں)جواز جعفری:سارے خواب کلیشے ہیں)(۱۴۲(
جب موت سایہ فگن ہوگی تو صرف انسان ہی نہیںبلکہ دیگر اجرام بھی اس کا شکار بنیں گے اور ان کی موت نئی حیات کا باعث ہوگی۔
کل جب سورج زیست کی چھت پر
برف کی صورت جم جائے گا
کل جب راتیں راکھ کی صورت بُجھ جائیں گی
اس ایندھن کے سوکھے پتّے
آتشدان کے کام آئیں گے)اختر حسین جعفری:اسکول)(۱۴۳(
اسی کش مکش میں گھِرے، ہم، دیگر اجرام سے زندگی کی بھیک مانگتے ہیں ۔ مگر اُن سے بھیک کیا مانگیں جو خود زوال کے سفر پر آمادہ ہیں اور اسی بات کی وضاحت کرتے ہوئے اختر حسین جعفر کہتے ہیں کہ
کیا زرد شجر کو خط بھیجیں
کیا اس موسم سے میل کریں
جس کے مہتاب تہِ دریا، جس کے سورج گرداب میں ہیں
جس کے انجم کشتی کشتی، ساحل ساحل زنجیر ہوئے
)اختر حسین جعفری: کیا زرد شجر کو خط بھیجیں)(۱۴۴(
ہمارے چاروں اور پھیلی یہ دنیا ہماری تنہائی پر ہنستی ہے۔ ہم حیرت میں ڈوبے اس زندگی کی بقا کی دوڑ میں شامل ہوکر اپنی سی کوشش کرتے ہیں کہ کسی صورت کم از کم اس معلومہ حیات کو ہی تباہی سے بچا پائیں۔
مرے چاروں طرف دنیا ہے
دنیا کے ہزاروں کام ہیں اور میں اکیلا ہوں
اک ایسا حیرتی ہوں جس کی مُٹھی سے گزرتی ساعتیں بھی
ریت کے ذرّوں کی صورت دانہ دانہ کر کے نکلی جارہی ہیں
ہاتھ خالی ہو رہا ہے اور ابھی مجھ کو بہت سے کام کرنا ہیں
ابھی اس شام کے ریوڑ کو صبحِ زرد کی کھیتی تک
اک بوڑھے گڈریے کی طرح سے ہانک کر لانا ہے، یہ بھی
دیکھنا ہے میرے ریوڑ سے کوئی ننّھا ستارہ ٹوٹ کر آفاق تک
پھیلے ہوئے اندھے سفر کی دھول میں غائب نہ ہو جائے
)ایوب خاور:ابھی مجھ کو بہت سے کام کرنا ہیں)(۱۴۵(
ہم اس زندگی کو بچانے کے خواہاں اس لیے ہیں کہ ممکن ہے کہ زندگی اپنی معنویت بدل کر کسی اور صورت میں جلوہ گر ہو لیکن یہ جو بن مانگی زندگی ہے یہ ہمیں صرف اور صرف ایک ہی بار ملتی ہے جو کہ ہمارا اثاثۂ کُلّی ہے۔جو کہ ہماری سوچ کے آگے اس کائنات کو بھی دو قدموں میں سمو دیتی ہے۔
امرت کے لیے دودھ کے سمندر بلونا آسان ہے
لیکن زہر پینا بہت ہی مشکل!
دوقدموں کے فاصلے پر کائنات ختم ہوجاتی ہے

تیسرے قدم کا خمیازہ پاتال کا اندھیرا ہے
سات جنموں کے بعد مہا جنم شروع ہوتا ہے
لیکن بن مانگی محبت زندگی میں ایک ہی بار ملتی ہے)نصیر احمد ناصر:محبت کی جنم کوتا)(۱۴۶(

موت کے گیلے لبوں سے روشنی لے کر
میں خود کو پھر اکٹھا کر رہا ہوں
دوڑ کر جانا ہے مجھ کو
اپنی پچھلی عمر کی سردی سے بچ کر
ڈھونڈنا ہے زیرِ پائے تختِ جاں
اُس صدا کو جس کا افسوں چار سو تھا
عُمر کے جبڑے نے جس میں چھید کر ڈالے)عبدالرشید:گر ہے کوئی آواز دے)(۱۴۷(

سائنس کے مطابق بھی یہ زندگی زوال پذیر ہے۔ قوائے جسم عمر کے ساتھ اضمحلال کا شکار ہوئے چلے جاتے ہیں اور آخر موت کی آغوش میں جا سوتے ہیں۔ہم اس غبارے کی صورت ہیں جس میں ہوا بھردی جاتی ہے۔ یہ ہوا روح کی ہوا ہے جو رفتہ رفتہ اس غبارے سے نکلتی جاتی ہے۔ قوائے انسانی کم زور پڑتے جاتے ہیں اور آخر موت ہی اس جسم کی حتمی منزل قرار پاتی ہے۔

عُضوِ مُعطّل کی طرح زندہ نہ مردہ
خودکشی کے خواب سے لبریز
اور بستی کے جوہڑ کے کنارے
اپنی پرچھائیں مسلسل دیکھتے
مجہول کوشش کی طرح ثابت
غبارے کی طرح پھولے ہوئے)عبدالرشید: برس اے ابرِ نیساں)(۱۴۸(

جسم تو وقت کے ہاتھوں تباہ ہوجاتا ہے لیکن روح کا سفر ختم نہیں ہوتا۔ تاہم روح کا احساس جسم کے قیام کے ساتھ ہی محسوسات کا حصہ بنتا ہے کیوں کہ جسم روح کا بندی خانہ ہے

وقت کے سمندر میں
جسم کے جزیرے پر
روح کا بسیرا ہے)نصیر احمد ناصر)(۱۴۹(

موت اور حیات ہماری کائنات کی حقیقتیں ہیں مگر ہمیں ان کی اصل ماہیت کا بھی ادراک نہیں ہے ۔ اسی لیے تو ان پر جب سوال اٹھتا ہے تو زاہد ڈار کہتے ہیںکہ

زندگی کیا ہے؟ مجھے علم نہیں
زندگی کیوں ہے؟ مجھے علم نہیں
زندگی کس نے بنائی ہے؟ مجھے علم نہیں
کچھ بھی معلوم نہیں‘ کچھ بھی تو معلوم نہیں
جنازوں پہ روتے ہوئے ہم نشینو! اٹھو‘ مسکرائو
یہ مٹی ہے بوسیدہ‘ بے کار مٹی‘ ٹھکانے لگائو)زاہد ڈار)(۱۵۰(

اسی احساس کا بیان ہمیں یوسف ظفر کے ہاں بھی درج ذیل الفاظ میں دکھائی دیتا ہے:
مگر موت کیا ہے؟ فنا کی حقیقت ہے کیا؟ --- کچھ نہیں، کچھ نہیں
یہ ہنگامہ کیسا ہے، یہ مجلسِ غم بپا !! --- کچھ نہیں، کچھ نہیں
لحد کیا ہے، مدفن کی گونگی فضا!--- کچھ نہیں، کچھ نہیں)یوسف ظفر:بقا)(۱۵۱(

جب کہ ڈاکٹر جواز جعفری کے ہاں موت بہ ذاتِ خود ایک ایسا سوال بن کر ابھرتی ہے کہ موت تو بر حق سہی لیکن اس سے آگے کیا ہے اور موت کے بعد زندگی اور کائنات کے رنگ کیا ہوں گے اور انھیں کون دیکھے گا۔

موت کا الٰہ دین
طلسمی چراغ ہاتھ میں لیے
ہمارے سروں پر پھڑپھڑاتا ہے
اور زمین ہمارے اندر رینگنے والے عہد کی آواز سنتی ہے
زندگی نے
زمین سے ہجرت کا ارادہ اوڑھ لیا ہے
زندگی کے بغیر زمین کیسی لگے گی
یہ دیکھنے کے لیے
یہاں کون ہوگا؟)جواز جعفری)(۱۵۲(

زاہد امروز، موت کو ایک ایسے عقاب کی صورت میں دیکھتے ہیں جو ارضِ معلوم سے زندگی کے چوزوں کو اچک لے جانے لیے بے تاب و بے قرار ہے۔ موت 'زندگی کی پیدایش سے ہی اس کا پیچھا شروع کردیتی ہے۔

بارش کے بعد
جب دھرتی میلے کپڑے اتارتی ہے
میں بھید بھری شام کے تعاقب میں
اس کے دائودی بدن پر پھیل جاتا ہوں
اور دیواریں پھلانگتا، خدا کے شکستہ صحن میں نقب لگاتا ہوں
میرے شعور میں اندھا خلا پھیلنے لگتا ہے
میں دیکھتا ہوں
آسمان میں چھپا عقاب ہماری زندگیوں کے چوزے اچک رہا ہے
)زاہد امروز:کائناتی گرد میں برسات کی شام)(۱۵۳(

وقت کے ساتھ موت کا تال میل حیات کو ازل سے ابد کی طرف لے کر چلا جا رہا ہے، ایک گڈریے کی طرح جسے اپنی بھیڑوں کو ان کی منزل تک پہنچانا ہے۔

ہمہ وقت آسماں گرتا رہتا ہے
ہمہ وقت زمیں چلتی رہتی ہے
انسانوں کا ریوڑ
ہمہ وقت محوِ سفر رہتا ہے
منافقت ایک گڈریا ہے
جو اسے عدم کی سمت ہانک رہا ہے

)زاہد امروز: منافقت ایک گڈریا ہے جو اسے عدم کی سمت ہانک رہا ہے)(۱۵۴(

فرار کی کوشش جاری ہے لیکن انت سے فرار ممکن نہیں ہو پارہا۔ تقدیر‘ وقت کی پابندیوں میں آکر ایک ایسی بددعا کی صورت ہر طرف اپنا گھور اندھیرا پھیلا دیتی ہے کہ آخرہم موت کی اندھیر وادی میں جا نکلتے ہیں بہ قول زاہد امروز

مجھے خبر ہے
مرے شکستہ ادھورے خوابوں کی
گہری مجذوب رات مجھ کو اب اندھا کردے گی
اور میں پھر سے بددعائوں کے مردہ منظر میں جاگروں گا)زاہد امروز)(۱۵۵(

لیکن اس تمنا‘ اس تڑپ اس ہوس کا کیا کیا جائے جو زندگی سے کسی صورت علاحدگی نہیں چاہتی اور اسی کے سنگ رہنا چاہتی ہے کہ؛

جب عمر کا آخر آتا ہے
ہر دن صدیاں بن جاتا ہے
جینے کی ہوس ہی نرالی ہے
ہے کون جو اس سے خالی ہے)ابنِ انشا:جب عمر کی نقدی ختم ہوئی)(۱۵۶(

انسان بہت سے معاملات میں دیگر جان داروں پر سبقت لے جانے کے باوجود لمحہ بہ لمحہ قریب ہوتی موت سے ناآشنا رہتا ہے جب کہ نظامِ فطرت میں آنے والی تبدیلیوں کو کئی دیگر جان دار وقت سے پہلے جان لیتے ہیں جیسے:

چیونٹیاں فرشِ خاک پر لاکھوں
فکرِ اندوختہ کا بار لیے
تیز قدموں سے ہیں رواں جیسے
کوئی طوفان آنے والا ہے)اختر حسین جعفری:پیش از وقت کے اندیشے)(۱۵۷(

کائنات میں اشیا اپنی قلبِ ماہیت کرتی رہتی ہیں۔ جو ایک دائرے کی صورت گھوم کر وہیں اُس نقطہ پر آپہنچتی ہیں جہاں سے انھوں نے اپنے سفر کی ابتدا کی ۔ زندگی بھی ایک ایسا ہی دائرہ ہے جو موت سے گھوم کر پھر زندگی تک آنکلتا ہے۔

ہر طرف دائرے ہی دائرے ہیں
ہر حقیقت دائرے بنا رہی ہے
زمین اور کائنات‘ وقت اور زندگی)زاہد ڈار)(۱۵۸(

اور حقیقت بس یہی دائروی عمل سے جس سے ہم نجات نہیں حاصل کر پارہے کہ واپسی کا راستا موت کے خلا سے گزر کر ہی ممکن ہے لیکن ہم ابھی تک اس خلا کی حقیقت کو ہی نہیں پاسکے۔

دنیا میں صرف ایک ہی راستہ ہے‘ جو واپس جاتا ہے
واپسی کے راستے سوا دوسرا کوئی راستہ نہیں
حقیقت دائروں کے سوا اور کچھ بھی نہیں
نہ ہونے سے‘ نہ ہونے تک
یہ ایک دائرہ ہے

درمیان میں موجودگی ہے
اور وہ ایک خلا ہے (زاہد ڈار)(۱۵۹)

جاننا ' نہ جاننا ہماری مجبوری سہی لیکن ہم اس جسم کو اس کے دائرے میں گھومنے سے روک نہیں پاتے اور

جسم محنت کرتے ہیں
جسم لذت اندوز ہوتے ہیں
جسم اذیت برداشت کرتے ہیں
جسموں کی فطرت حرکت کرتے رہنا ہے (زاہد ڈار)(۱۶۰)

درج ذیل نظم میں زاہد ڈار موت کو ایک پاکیزگی کے استعارے کے طور پر استعمال کرتے ہیں کہ فنا دراصل ہماری کائنات کی پاکیزگی کا باعث ہوگا۔ یہی اختتام اس کائناتی موت کی انتہا ہے جس کے نقوش تاریخِ انسانی پر مرتسم ہیں۔

آسمان پھیلتا جائے گا
زمین ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوجائے گی
آرزوئیں آنسوئوں میں بہہ جائیں گی
وہ دریا جو انسانوں کے درمیان بہتا تھا
پیاس کے ریگستان میں جذب ہوگیا
ہم اپنے شہر کے ساتھ زندہ ہیں
جب ہمارا شہر مر جائے گا
ہم بھی زندہ نہیں رہیں گے۔ کہ
وہ کہانی جو آج سے ہزاروں سال پہلے
انسان نے لکھنی شروع کی تھی
انسان کے خاتمے کے ساتھ
اپنے انجام کو پہنچ جائے گی
پانی میں ڈوب کر نہیں
آگ میں جل کر
زندگی کی ساری کثافتیں ختم ہو جائیں گی
جب انسان نہیں ہوگا
اور یہ زمین بھی نہیں ہوگی
تو یہ کائنات
پاکیزگی کا ایک عظیم خلا بن جائے گی
اور آسمان ہمیشہ پھیلتا رہے گا (زاہد ڈار)(۱۶۱)

شہزاد احمد دوسرے سیاروں پر موجود جان دار کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہوئے یہ محسوس کرتے ہیں کہ شاید اس سیّارے کی زندگی ان کی زندگی سے مختلف ہے۔ شاید وہ ہماری طرح کی زندانی زندگی نہیں گزار رہے اور وقت کے ہاتھوں مجبور نہیں۔ کیوں کہ ہمارا حیاتیاتی سفر تو وقت کے زنداں میں قید ہے اور ہم ان دوریوں کو پاٹنے کی فرصت نہیں رکھتے۔

تمھارے پاس ہی

ہمسایے میں‘ اک اور زندان ہے
ہماری ذات کا زنداں
ہم اس زنداں میں رہتے ہیں)شہزاد احمد:ہم تم سے کیوں ملتے)(۱۶۲(

عبدالرشید کہتے ہیں کہ ہماری زندگی کی گاڑی ‘ اس کائنات کے اسٹیشن پر ابھی کھڑی ہے۔ اس کی آخری منزل موت ہے لیکن ابھی شاید اسے راستے میں کئی مراحل سے گزر کر اپنی منزل کو پانا ہے۔

مرا گاڑی کے چلنے کی طرح کا رینگنا مقسوم ہے
اور لوٹ کر میں اپنے ردی کاغذوں میں جا کے
کھوجاؤں گا یہ امکان ہے
پھر خواب میں دیکھوں گا ان جادوئی گلیوں کو
کہ جن کے نام مجھ پر موت سے بھی تیز خوش بو
کی طرح حاوی ہوئے ہیں
اور جنھیں میں جاگتے سوتے میں اکثر بڑبڑاتا ہوں
ابھی کچھ دیر ہے گاڑی کے چلنے میں ہری جھنڈی کے ہلنے میں)عبدالرشید:دوسری نظم2)(۱۶۳(

زندگی کا سفر یوں ہی جاری رہتا ہے اور ہم انسان زندگی اور موت کے درمیان ایک پُل کی طرح ایستادہ کھڑے ان دونوں کو ملانے کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ ہم صدیوں پرانے خوابوں کی تکمیل کی کوشش میں سرگرداں ہیں۔بہ قول نصیر احمد ناصر:

خواب ہمیشہ صدیوں پرانے ہی ہوتے ہیں
ہم گزرے زمانوں میں ملتے ہیں
یا آنے والے وقتوں میں
حال‘ جس میں ہم زندہ ہیں
محض ایک قوسی پُل ہے
دو انتہاؤں کو ملاتا اور جدا کرتا ہوا
جسے کراس کرتے ہوئے
ہم چلنا بھول جاتے ہیں
خواب لکھنے اور پوسٹ کرنے کا
کوئی سمے نہیں ہوتا
میں ہر عہد میں تمھاری راہ دیکھتا رہا ہوں
وقت کا ڈاکیا روز گزرتا ہے
کسی یُگ‘ کسی جنم‘ کسی عمر‘ کسی صدی میں
تم جب بھی خود کو پوسٹ کرو گی
میں تمھیں وصول کروں گا
جنم دن کے تحفے کی طرح)نصیر احمد ناصر: تاریخ کا جنما تنتر)(۱۶۴(

ہماری زندگی موت کے صحرا میں سرگرداں ہے۔ انسانی تاریخ کے تناظر میں مبارک احمد کے ہاں اس کا خوب صورت بیانیہ دیکھیے:

زندگی پھیلا ہوا صحرا

دور تک بکھرے ہوئے ریت کے دانوں کے سوا کچھ بھی نہیں
ریت کے دانے کبھی سنگ‘ کبھی لاوا تھے
کھولتے ‘ پھیلتے‘ بڑھتے ہوئے‘ بہتے ہوئے‘ بل کھاتے ہوئے لاوے میں
میری ہستی نے کسی قطرے کی گہرائی میں انگڑائی لی/اور یوں ایک نئے دور کا آغاز ہوا
پیچ و خم کھاتی ہوئی رات کے دامن میں سمٹ جاتی ہوئی زیست کی راہوں پہ نئے باب کھلے
پیچ و خم کھاکے بکھرجاتے ہوئے لمحوں میں
ناگہاں چلنے لگی بادِ نشیب
جس کی تندی نے مجھے آخرِ کار
قلۂِ کوہ پہ استادہ کیا
قلۂِ کوہ پہ بہتی ہوئی دھارا نے سواگت میں تھرکتے ہوئے نغمے گائے
پائوں لینے کو مرے دودھیا بادل آئے
چاند پر تھاپ پڑی‘ رقص کیا تاروں نے
نغمے بل کھانے لگے گھومتے سیاروں میں
اور پھر شومئیِ قسمت میری
دیکھتے دیکھتے ماحول نے کروٹ بدلی
چڑھتے خورشید کی کرنوں کے مقابل یہ رسیلے پربت
ریزہ ریزہ ہوئے
اور اب ہر طرف اک پھیلا صحرا)مبارک احمد:عکس و معکوس)(۱۶۵(

اسی لیے عبدالرشید اک نئی خبر کے منتظر ہیں۔ وہ خبر جو حیات سے بھرپور ہوگی۔
کاغذی الہام کی وسعت برائے نام ہے اور بے مزہ
اب جو خبر ہوگی‘ خبر کی جس طرح تعبیر ہوگی اس کا ہر پہلو
مرے جیون کی جھڑتی پتیوں کا آسرا ہوگا)عبدالرشید:کیا ہے کچھ پتا چلتا نہیں)(۱۶۶(

اور اس خبر کے ادراک کے لیے ہمیں ان سرحدوں کو توڑنا ہوگا۔ اسی لیے زاہد امروز کا مشورہ ہے کہ
خودرو جنگلو‘ خوب صورت جان ورو اور تمام زندہ چیزو!
نم آلود آنکھوں میں جاگتے ستارے کی طرف ہجرت کرجائو
اور چھوڑ جائو --- انسان اور اس کے خدا کو
برزخ میں خاک ہوجانے کے لیے)زاہد امروز:زمین کے ہنکارے)(۱۶۷(

مگر یہ جو دوسری کائناتوں‘ دوسری دنیائوں کا سفر ہے‘ اس سفر میں ہم راہی کون ہوگا؟ کیا یہ سفر ہر ایک کو اپنے تخیل کی بنیاد پر تنہا کر نا ہوگا؟ راستوں کی کٹھنائیوں کا پاٹنے یہی احساس جب شہزاد احمد کے دل میں جاگزیں ہوتا ہے تو سوال ہوتا ہے کہ
تو کیا سارا سفر پھر سے مجھے کرنا پڑے گا؟
میں جس رستے سے آیا ہوں
وہ رستہ کیا اسی صورت میں ہے
جو میں نے دیکھی تھی!
بہت ممکن ہے
وہ رستہ خود اپنی سمت ہی تبدیل کر بیٹھا ہو

اور میں چلتے چلتے
اجنبی ناآشنا لوگوں میں گھِر جائوں
مرا سارا سفر جو ’’میں‘‘ سے ’’میں‘‘ تک ہے
کسی ایسی طرف کا رخ کرے
جو سمت میرے تجربے میں ہی نہ آئی ہو
یہ ممکن ہے
میں اپنے آپ سے آگے نکل جائوں
مگر یہ بھی تو ہوسکتا ہے
میں اس عکس کے پیچھے لگوں
جو ’’میں‘‘ نہیں ہے
’’تو‘‘ نہیں ہے
اور ہی کچھ ہے
مگر یہ اور ہی کچھ
کیا مرا اپنا کوئی انداز ہے‘ بہروپ ہے
کوئی بھیانک خواب ہے
میں نیند کے اندر سفر کرنے کا عادی ہوں
تو کیا سارا سفر پھر سے مجھے کرنا پڑے گا! (شہزاد احمد:نیند میں سفر)(۱۶۸(

یہ سوال خالی سفر کا ہی سوال نہیں ہے بل کہ شاعر اور بھی کئی سوالات اٹھاتا ہے۔ وہ سوال جو ایک نئی دنیا کی تشکیل میں‘ اُس کے خوابوں کی دنیا کی تشکیل میں معاون ہوں گے۔ ایک سوال تو یہ ہے کہ نئی دنیائیں بنا بھی لو تو سنبھالو گے کہاں کہ

ستارے مانگتے کیوں ہو
اگر چاہو تو مٹھی بھر ستارے میں تمھیں دے دوں
مگر تم یہ ستارے لے کر آخر کیا کروگے
کہاں رکھو گے ان کو
ان کی خاطر کون سے کمرے بنائو گے)شہزاد احمد:بند مٹھی)(۱۶۹(

سوالات کا تسلسل آگے بڑھتا ہے تو نصیر احمد ناصر کے سامنے اک نئی بات آتی ہے کہ رات اندھیاری نہیں بل کہ اس میں نیلاہٹ ہے لیکن وہ اس نیلے پن کی وجہ نہیں جان پاتے۔ وہ سوال کرتے ہیں کہ ہر جانب اندھیرے ہی کی حکم رانی کیونہے؟ وہ اس معلوم کائنات سے باہر نکل جانا چاہتے ہے لیکن پھر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ کائنات کے دوسری جانب بھی اندھیرا ہی ہے یا روشنی؟ یا وہاں کسی اور قسم کے اندھیارے اور اجالے ہیں؟

اندھیرے کی بارش ہوتی ہے
اور ہم اپنے لیے
ایک روشن خواب کی پناہ مانگتے ہیں
اور نہیں جانتے
کہ مصور کے رنگوں میں اتر کر!
رات نیلی کیوں ہوجاتی ہے
اندھیرا روشنی کی آہٹ پانے ہی غائب ہوجاتا ہے

کونوں کھدروں اور سوراخوں میں گھس جاتا ہے
بعض سوراخ تو روحوں کے آرپار ہوتے ہیں
جن میں سے گزر کر
اندھیرا دوسری جانب جانکلتا ہے
کیا دوسری جانب بھی اندھیرا ہے
یا وہاں بھی اسی طرح
کسی بڑے چھید کی اتھاہ گہرائی میں
ایک روشنی کا گماں
دوسرے گمان میں گم ہوتا رہتا ہے
کیا وہاں بھی
ایک تاریکی دوسری تاریکی سے
اسی طرح لذت کشید کرتی ہے
جس طرح ہم
اپنی اداسی کی اذیت سے لطف اندوز ہوتے ہیں)نصیر احمد ناصر:اندھیرے کا گیت)(۱۷۰(

ہمیں جو زندگی دی گئی آخر اس کا مقصد کیا ہے؟ کیا صرف رائگانی ہی اس کا مطمعٔ نظر ہے؟ یا اس میں کچھ اور مقصد پنہاں ہے؟

کیا زندگی صرف اس لیے ہے
کہ ہم ایک بے مہلت رات کے انت پر
آنسوئوں کے چراغ روشن کریں
اور شہابِ ثاقب کی طرح جل بجھ کر
نامتناہی اندھیروں کے غبار میں گم ہوجائیں؟)نصیر احمد ناصر:کائنات کا آخری گیت)(۱۷۱(

پھر ایک اہم سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کائنات کام کیسے کرتی ہے کہ اس میں ٹکرائو اور تصادم ہی ہے۔ ہر شے تغیر پذیر ہے۔ کیا تغیر ہی کائنات ہے ؟ کیوں کہ اس جہان کی حدود نہ تو دیواروں کی صورت دکھائی دیتی ہیں نہ ہی کوئی چھت اور دروازہ۔

یہ کیسا ٹوٹتا بنتا جہاں ہے
جس کی دیواریں کبھی قائم نہیں رہتیں
کبھی چھت ہی نہیں ہوتی
کبھی دروازے ہوتے ہیں
مگر ان میں گزرنے کے لیے رستہ نہیں ہوتا)شہزاد احمد:یہ کیسا ٹوٹتا بنتا جہاں ہے)(۱۷۲(

درج بالا تمام تر مباحث کا حاصل یہ ہے کہ جدید اردو نظم کے شعرا قدیم علوم کے ساتھ ساتھ علومِ جدیدہ کا بھی بہتر فہم رکھتے ہیں۔ وہ کائنات‘ انسان اور خدا کے تعلقات کو جاننے اور ان کی تفہیم کرنے کے لیے بے قرار دکھائی دیتے ہیں اور تلاش کے اس سفر میں انھیں جو کائنات دکھائی دیتی ہے وہ نہ صرف یہ کہ سائنسی اصولوں کا بیانیہ ہے بل کہ وہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ جانے کا تمنائی ہے۔ وہ کائنات کی دریافت کا ایک نیا آہنگ بھی اپناتے ہیں۔ معراجِ انسانی کے لیے دوسرے سیاروں تک رسائی‘ آسمان و زمین کی حقیقی حیثیت‘

تخلیق و پیدایش اور موت کے مختلف مراحل‘ جینیاتی علوم اور ان کی کاری گریاں‘ بدلتے ہوئے آفاقی تناظرات‘ حیاتیاتی اور کیمیائی سطح پر آنے والی تبدیلیاں وغیرہ ان کے تصور و تخیل کی آنکھ سے اوجھل نہیںہیں۔ وہ موت و حیات پر بھی سوالات اٹھاتے ہیں کہ جسم کی موت کیوں کر واقع ہوتی ہے۔ وہ اس بات کا ادراک کرتے ہے کہ محض انسان ہی آمادۂ موت نہیں بل کہ تمام تر اجرامِ فلکی بھی موت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس خرابے میں ہر شے دوسری شے سے زندگی کی خواہاں ہے ۔ چوں کہ کائناتی مادہ اور توانائی کی کل مقدار ہمیشہ سے ایک سی ہی ہے تو وہ اپنی توانائیوں کو مادی تبدیلی کی صورت دیکھتے ہوئے موت سے بھی مفر کے خواہاں ہیں۔

جینیاتی سطح پر وہ ایسے افراد کا خواب بھی دیکھتے ہیں جن کے خصائص انسان اپنی مرضی سے پیدا کرسکے گا اور یہ کائنات حقیقی معنوں میں انسان کی مطیع ہوکر اسے نیابتِ الٰہی کے مقام پر فائز کرے گی۔تاہم موجودہ دور تک ‘ دوسرے سیاروں تک رسائی کے باوجود‘ ہم ابھی تک کہیں اور اپنے جیسی زندگی کی تلاش میں ناکام رہے ہیں۔ تو شاعر جہاں اپنی جڑوں کی تلاش کا متقاضی دکھائی دیتا ہے وہیں اُن سیاروں پر زندگی کے بیج بکھیرنے کی تڑپ بھی اس میں نظر آتی ہے۔ کائنات پر غوروخوض جب اُسے بتاتا ہے کہ جنس کے بغیر بھی پیدایش ہوتی ہے اور مادہ سے زندگی کی توانائی تخلیق ہوسکتی ہے تو پھر اُسے اس بات سے سابقہ پڑتا ہے کہ ہم اپنی مرضی کی نئی کائنات کیوں اور کیوں کر پیدا کر پائیں گے۔ کیا تمام سائنسی اصول حقیقت کا درجہ رکھتے ہیں یا ابھی ستاروں کی گرد کی طرح بکھرے ذرّے ہیں جنھیں جذبِ باہم سے مجسم ہو کر نئی دنیا کی تخلیق کرنی ہے؟ یہ تخلیق انسان کو خدا سے جا ملائے گی یا پھر انسان ہی حاکمِ کُل بن کر خُدا کی ذات سے ماورا ہونے کا اعلان کردے گا؟ وہ اس کائنات کو اس کے امکانات کی تمام تر وسعتوں کے باوجود‘ جو کہ ابھی تک اُس کے محسوسات سے باہر ہے‘ اپنے تخیل اور علم کی بنیاد پر ایک ادنیٰ سے نقطے میں یوں سمونے کے متمنی ہیں جیسے کائنات آنکھ کے چھوٹے سے تل میں سما جاتی ہے۔ اُسے تمام تر سماعتیں اور بصارتیں بھی دھوکا دکھائی دیتی ہیں جیسے کہ یہ زمین‘ آسمان‘ افلاک بھی دھوکے کی حیثیت ہی رکھتے ہیں۔ یہ جیسے دکھائی دیتے ہیں ان کی حقیقت ویسی نہیں ہے بل کہ ان کی گہرائی میں آج بھی ڈھیروں راز دفن ہیں جنھیں وہ رفتہ رفتہ اجاگر کررہے ہیں۔ جدید اردو نظم کے شعرا کا دماغ اُن رازوں تک پہنچ کر انھیں اپنی مرضی سے تبدیل کرنے اور اک نئی دُنیا پیدا کرنے کا عزم لیے ہوئے ہے۔

حوالہ جات:

ا۔ شہاب صفدر: نیلگوں‘ فیصل آباد‘ مثال پبلشرز‘ ۲۰۱۳ء‘ ص۱۳۴
۲۔ ایوب خاور: گُلِ موسمِ خزاں‘ لاہور‘ الحمد پبلی کیشنز‘ ۲۰۱۳ء‘ ص ۱۸۹
۳۔ وزیر آغاز، ڈاکٹر، لامتناہیت کا لمس، مشمولہ: سپوتنک، لاہور: جلد ۱۱، شمارہ ۷، جولائی ۲۰۰۰ء، ص۲۴
۴۔ ریاض احمد، شہزاد احمد علمی شعور کی تخلیقی جہت،مشمولہ: سپوتنک، لاہور: جلد ۱۱، شمارہ ۷، جولائی ۲۰۰۰ء، ص۳۲
۵۔ مبین مرزا، ساز سخن بہانہ ایست، مشمولہ: سپوتنک، لاہور: جلد ۱۱، شمارہ ۷، جولائی ۲۰۰۰ء، ص۸۳۔۸۶
۶۔ فوزیہ چودھری، ڈاکٹر، شہزاد احمد کٹھن منزلوں کا شاعر، مشمولہ: وجدان، لاہور: شمارہ ۱۸،اپریل ۲۰۰۹ء، ص۸۱
۷۔ جاویدشاہین، پیش لفظ، وسیع کینوس کی شاعری، مشمولہ:مٹھی میں ترا وعدہ، لاہور:خواب پبلشرز،۱۹۹۶ء،ص ۱۳
۸۔ جاوید شاہین: مکتوب بنام ڈاکٹر سعید احمد، مؤرخہ ۹/مارچ ۲۰۱۲ء
۹۔ گوہرنوشاہی،ڈاکٹر،تعارف،آٹھ غزل گو،(مرتبہ:جاوید شاہین)، لاہور:مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۶۸ء،ص ۶۲
۱۰۔ تعارف :ڈاکٹر زکریا‘حسنین بخاری، زباں اور مکاں۔دو جزیرے، لاہور: سعادت آرٹ پریس، ۱۹۹۳ء‘ ص۱۰
۱۱۔ آغا سہیل، دیباچہ مشمولہ: زماں اور مکاں ___دو جزیرے، ص۱۳
۱۲۔ احمد ندیم قاسمی، تاثرات مشمولہ: آشعوری سیارگاہیں، لاہور‘ محمد پبلشرز‘ ۱۹۹۶ء‘ص۹
۱۳۔ وزیر آغا،ڈاکٹر: آراء مشمولہ: آشعوری سیارگاہیں، ص۱۵
۱۴۔ ڈاکٹر نعیم احمد، کائناتی شعور کا ترجمان مشمولہ: صفر ایک،لاہور‘ محمد پبلشرز‘ ۲۰۰۲ء‘ ص۳۲
۱۵۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ‘ لاہور‘ الحمد پبلی کیشنز‘ ۱۹۹۷ء‘ ص۹۷۔۹۶
۱۶۔ سیّد مبارک شاہ، مدارنارسائی میں، لاہور: الرزاق پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء‘ ص۴۲
۱۷۔ زکریا‘ خواجہ محمد (مرتب): انتخابِ زریں نظم‘ لاہور‘ سنگت پبلیشرز‘ ۲۰۰۷ء‘ ص ۹۹
۱۸۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ‘ ص۱۸۴
۱۹۔ ایضاً‘ ص۹۹۔۹۸
۲۰۔ نصیر احمد ناصر: تیسرے قدم کا خمیازہ‘ لاہور‘ سانجھ پبلیشرز‘ ۲۰۱۳ء‘ ص۲۷
۲۱۔ نصیر احمد ناصر: زرد پتوں کی شال‘ لاہور‘ سانجھ پبلشرز‘ ۲۰۱۳ء‘ ص ۹۳
۲۲۔ زاہد امروز: کائناتی گرد میں عریاں شام‘ لاہور‘ سانجھ پبلیشرز‘ ۲۰۱۳ء‘ ص۲۳۔ ۲۲
۲۳۔ نصیر احمد ناصر: عرابچی سوگیا ہے‘ لاہور‘ تسطیر پبلشرز‘ ۲۰۰۲ء‘ ص۴۶
۲۴۔ زاہد امروز: خود کشی کے موسم میں‘ کراچی‘ آج پبلشرز‘ ۲۰۰۹ء‘ ص ۸۳
۲۵۔ اظہر غوری: اظہر غوری کی نظمیں (غیر مشروط محبت) ‘لاہور‘ملٹی میڈیا افیئرز‘ ۲۰۰۰ء‘ ص۲۰۹
۲۶۔ شہریار: کلیاتِ شہریار‘ لاہور‘ سنگِ میل پبلی کیشنز‘ ۲۰۰۸ء‘ ص ۲۵۴

۲۷۔ ڈاکٹر صفی حسن، اگر ہم دو ر سے دیکھیں، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء‘ص۱۰۸
۲۸۔ زاہد امروز: خود کشی کے موسم میں‘ ص ۱۰۲
۲۹۔ سیّد مبارک شاہ، مدارنارسائی میں، لاہور: الرزاق پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء‘ ص۴۲
۳۰۔ جواز جعفری: مٹھی میں تیرا وعدہ‘ لاہور‘ خواب پبلشرز‘ ۱۹۹۶ء‘ ص ۱۰۵۔۱۰۶
۳۱۔ حسین صمدانی : بارز خواب‘ لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲ء‘ ص۳۳۔۳۲
۳۲۔ شہزاد نیئر: برفاب‘ لاہور‘ کاغذی پیرہن‘۲۰۰۸ء‘ص ۱۶۔۱۵
۳۳۔ ایضاً‘ص ۴۱۔۴۲
۳۴۔ سیّد مبارک شاہ:مدارنارسائی میں‘ص۵۱
۳۵۔ جواز جعفری: مٹھی میں تیرا وعدہ‘ص ۷۴۔۷۳
۳۶۔ اظہر غوری: اظہر غوری کی نظمیں (غیر مشروط محبت) ‘ ص۴۰۲
۳۷۔ ایضاً‘ص ۱۲۱
۳۸۔ افضال احمد سید: مٹی کی کان‘ کراچی‘ آج پبلشرز‘ ۲۰۰۹ء‘ ص ۱۲۵۔۱۲۴
۳۹۔ شہاب صفدر: نیلگوں‘ ص۱۳۲
۴۰۔ افضال فردوس: گھر یاد آیا‘ لاہور‘ الحمد پبلی کیشنز‘ ۲۰۰۴ء‘ ص ۱۷۷۔۱۷۶
۴۱۔ سلیم الرحمان: شام کی دہلیز‘ لاہور‘ لوگ پبلشرز‘ ۱۹۹۳ء‘ ص۹۸
۴۲۔ افتخار نسیم: نرمان‘ فیصل آباد‘ ہم خیال پبلشرز‘ ۱۹۹۴ء‘ ص۷۹۔۷۸
۴۳۔ اظہر غوری: اظہر غوری کی نظمیں (غیر مشروط محبت) ‘ص ۱۲۰
۴۴۔ حسنین بخاری: صفر ایک‘ ص۱۳۲
۴۵۔ زاہد امروز: خود کشی کے موسم میں‘ ص ۷۹۔۷۸
۴۶۔ نصیر احمد ناصر: تیسرے قدم کا خمیازہ‘ص۷۷۔۷۶
۴۷۔ حسنین بخاری:زماں اور مکاں___دو جزیرے، لاہور: سعادت آرٹ پریس، ۱۹۹۳ء‘ ص ۲۲
۴۸۔ محبوب الدین محبوب، ڈاکٹر، سائنسی نظم ”کیمیا“مشمولہ : نظم کائنات،ماہنامہ، کراچی: مارچ ۲۰۱۱ء، ص۸
۴۹۔ نصیر احمد ناصر: تیسرے قدم کا خمیازہ‘ ص۸۱۔۸۰
۵۰۔ جواز جعفری: مٹھی میں تیرا وعدہ‘ ص ۹۵
۵۱۔ نصیر احمد ناصر: تیسرے قدم کا خمیازہ‘ص۸۱
۵۲۔ ایضاً‘ ص۱۰۰
۵۳۔ ایضاً‘ ص۹۶
۵۴۔ ایضاً‘ ص۱۶۰۔۱۵۹
۵۵۔ شہزاد احمد: مٹی جیسے لوگ‘ لاہور‘ ملٹی میڈیا افئیرز‘ ۲۰۰۹ء‘ ص۱۱۵۔۱۱۴
۵۶۔ جواز جعفری: مٹھی میں تیرا وعدہ‘ ص ۷۶
۵۷۔ ایضاً‘ص ۱۳۹
۵۸۔ نصیر احمد ناصر: عرابچی سوگیا ہے‘ ص۳۷
۵۹۔ جواز جعفری: عمرِ رواں سے پرے‘ لاہور‘ فکشن ہائوس‘ ۲۰۱۴ء‘ص ۵۰
۶۰۔ نصیر احمد ناصر: عرابچی سوگیا ہے‘ ص۳۸۔۳۷

۶۱۔ عبدالرشید: افتخار جالب کے لیے نوحہ اور دوسری نظمیں‘ لاہور‘ ملٹی میڈیا افئیرز‘ ۲۰۰۶ء‘ ص ۵۰
۶۲۔ جواز جعفری: مٹھی میں تیرا وعدہ‘ ص ۱۲۳۔۱۲۲
۶۳۔ ایضاً‘ص ۷۶۔۷۵
۶۴۔ جواز جعفری: عمرِ رواں سے پرے‘ ص۷۰۔۶۹
۶۵۔ ایضاً‘ص ۴۵
۶۶۔ اختر حسین جعفری: آئینہ خانہ‘ لاہور‘ مطبوعات پبلی کیشنز‘ ۱۹۸۸ء‘ ص۱۵۴
۶۷۔ عامر سہیل: شہیدِ عشق‘ لاہور‘ سانجھ پبلیشرز‘ ۲۰۰۹ء‘ ص۱۱۸۔ ۱۱۷
۶۸۔ ایضاً‘ص۱۱۸
۶۹۔ شہزاد احمد: مٹی جیسے لوگ‘ ص۸۷۔۸۶
۷۰۔ زاہد ڈار: تنہائی‘ لاہور‘ سنگِ میل پبلی کیشنز‘ ۱۹۸۸ء‘ ص ۱۲۰
۷۱۔ جواز جعفری: عمرِ رواں سے پرے‘ ص ۶۴
۷۲۔ ایضاً‘ ص۷۵
۷۳۔ شہزاد احمد: مٹی جیسے لوگ‘ ص۱۰۱
۷۴۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ‘ لاہور‘ ص۳۴
۷۵۔ زاہد امروز: کائناتی گرد میں عریاں شام‘ ص۱۵
۷۶۔ شاہین مفتی: کنارہ کس نے دیکھا ہے‘ کراچی‘ اکادمی بازیافت‘ ۲۰۰۹ء‘ ص۸۹
۷۷۔ نصیر احمد ناصر: تیسرے قدم کا خمیازہ‘ ص۳۳
۷۸۔ جواز جعفری: مٹھی میں تیرا وعدہ‘ ص ۹۶۔۹۵
۷۹۔ زاہد امروز: کائناتی گرد میں عریاں شام‘ ص۲۳
۸۰۔ نصیر احمد ناصر: تیسرے قدم کا خمیازہ‘ ص۲۶
۸۱۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ‘ ص۳۷
۸۲۔ اختر حسین جعفری: آئینہ خانہ‘ ص۱۴۴
۸۳۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ‘ ص۳۳
۸۴۔ شہزاد احمد:آنے والا کل‘ لاہور‘ ملٹی میڈیا افئیرز‘ ۲۰۰۵ء‘ ص۱۷۹
۸۵۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ‘ ص۴۹
۸۶۔ شاہین مفتی: کنارہ کس نے دیکھا ہے‘ ص۲۷۱
۸۷۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ‘ ص۹۲
۸۸۔ شاہین مفتی: کنارہ کس نے دیکھا ہے‘ ص۲۸۰
۸۹۔ عبدالرشید: انی کنت من الظالمین‘ لاہور‘ سانجھ پبلشرز‘ ۲۰۱۱ء‘ ص ۸۵۔۸۴
۹۰۔ ایضاً‘ص ۸۹
۹۱۔ ایضاً‘ ص ۹۰
۹۲۔ شاہین مفتی: کنارہ کس نے دیکھا ہے‘ ص۳۳۸
۹۳۔ عبدالرشید: انی کنت من الظالمین‘ص ۳۷
۹۴۔ ایضاً‘ ص ۵۰۔ ۴۹
۹۵۔ جواز جعفری: مٹھی میں تیرا وعدہ‘ ص۹۶
۹۶۔ خالد علیم: بغداد آشوب ‘ لاہور‘ اقدام پبلی کیشنز‘ ۲۰۰۳ء‘ ص ۴۹۔۴۸

۹۷۔ اختر حسین جعفری: آئینہ خانہ‘ ص ۹۲
۹۸۔ زاہد امروز: کائناتی گرد میں عریاں شام‘ ص۸۴
۹۹۔ ایضاً‘ ص۲۲
۱۰۰۔ زاہد ڈار: تنہائی‘ ص
۱۰۱۔ زکریا‘ خواجہ محمد (مرتب): انتخابِ زریں نظم‘ ص ۲۷۰
۱۰۲۔ شہزاد احمد:آنے والا کل‘ ص۱۸۱
۱۰۳۔ نصیر احمد ناصر: عرابچی سوگیا ہے‘ ص۴۵
۱۰۴۔ خالد علیم: بغداد آشوب ‘ ص ۵۰
۱۰۵۔ ایضاً‘ ص ۵۱
۱۰۶۔ شہزاد احمد:آنے والا کل‘ ص۱۸۲
۱۰۷۔ عابد ودود: کڑی دھوپ کا مسافر‘ راولپنڈی‘ حرف اکادمی‘ ۲۰۰۳ء‘ ص۱۶۳
۱۰۸۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ‘ ص۵۸۔۵۶
۱۰۹۔ زاہد ڈار: تنہائی‘ ص ۱۹۴
۱۱۰۔ اختر حسین جعفری: آئینہ خانہ‘ ص۱۳۹
۱۱۱۔ جواز جعفری: عمرِ رواں سے پرے‘ ص ۷۶
۱۱۲۔ زکریا‘ خواجہ محمد (مرتب): انتخابِ زریں نظم‘ ص ۱۰۳
۱۱۳۔ شہزاد احمد: مٹی جیسے لوگ‘ ص۱۱۱
۱۱۴۔ نصیر احمد ناصر: عرابچی سوگیا ہے‘ ص۵۶
۱۱۵۔ ایضاً‘ ص۸۷۔۸۶
۱۱۶۔ جواز جعفری: مٹھی میں تیرا وعدہ‘ ص ۱۲۳
۱۱۷۔ ایضاً‘ ص ۱۳۹
۱۱۸۔ ایوب خاور: گُلِ موسمِ خزاں‘ ص ۹۲
۱۱۹۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ‘ ص۵۰
۱۲۰۔ اشفاق حسین: آشیاں گم کردہ‘ لاہور‘ وجدان پبلی کیشنز‘ ۲۰۰۹ء‘ ص ۱۷۴
۱۲۱۔ اظہر غوری: اظہر غوری کی نظمیں (غیر مشروط محبت) ‘ ص۴۰۳
۱۲۲۔ احمد صغیر صدیقی: تجرید‘ کراچی‘ شمع بُک ایجنسی‘ ۲۰۰۶ء‘ ص۳۵
۱۲۳۔ زکریا‘ خواجہ محمد (مرتب): انتخابِ زریں نظم‘ ص ۱۰۱
۱۲۴۔ زاہد ڈار: تنہائی‘ ص ۱۱۳
۱۲۵۔ جواز جعفری: عمرِ رواں سے پرے‘ ص ۷۶
۱۲۶۔ شہزاد احمد:آنے والا کل‘ ص۱۸۳
۱۲۷۔ ایضاًص۱۸۳
۱۲۸۔ جواز جعفری: عمرِ رواں سے پرے‘ ص ۴۵
۱۲۹۔ شہزاد احمد:آنے والا کل‘ ص۱۸۴
۱۳۰۔ ایضاً‘ص۱۸۶
۱۳۱۔ ایضاً‘ ص۲۱۱
۱۳۲۔ ایضاً‘ ص۲۲۱
۱۳۳۔ شاہین مفتی: کنارہ کس نے دیکھا ہے‘ ص۱۲۰

۱۳۴۔ ایضاً‘ ص۱۸۰
۱۳۵۔ فیض احمد فیض:نسخہ ہائے وفا‘ لاہور‘ مکتبہ کارواں‘ س ن‘ ص۸۹
۱۳۶۔ زاہد امروز: کائناتی گرد میں عریاں شام‘ ص۱۶
۱۳۷۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ‘ص۷۰۔۷۱
۱۳۸۔ عبدالرشید: افتخار جالب کے لیے نوحہ اور دوسری نظمیں‘ ص ۵۰
۱۳۹۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ‘ ص۹۲
۱۴۰۔ زاہد امروز: کائناتی گرد میں عریاں شام‘ ص۶۹
۱۴۱۔ جواز جعفری: مٹھی میں ترا وعدہ‘ ص۹۷
۱۴۲۔ نصیر احمد ناصر: تیسرے قدم کا خمیازہ‘ ص۷۶
۱۴۳۔ اختر حسین جعفری: آئینہ خانہ‘ ص ۱۰۴
۱۴۴۔ ایضاً‘ ص ۳۹
۱۴۵۔ ایوب خاور: گُلِ موسمِ خزاں‘ ص ۱۳۴
۱۴۶۔ نصیر احمد ناصر: تیسرے قدم کا خمیازہ‘ ص۴۶۔۴۵
۱۴۷۔ عبدالرشید: بنکاک میں اجنبی‘ لاہور‘ ملٹی میڈیا افئیرز‘ ۲۰۰۵ء‘ ص ۱۹
۱۴۸۔ عبدالرشید: افتخار جالب کے لیے نوحہ اور دوسری نظمیں‘ ص ۶۴
۱۴۹۔ نصیر احمد ناصر: زرد پتوں کی شال‘ص ۶۲
۱۵۰۔ زاہد ڈار: تنہائی‘ ص ۱۹۳
۱۵۱۔ یوسف ظفر: کلیاتِ یوسف ظفر مرتبہ ڈاکٹر تصدق حسین راجا‘ اسلام آباد‘ روداد پبلی کیشنز‘ ۲۰۰۵ء‘ ص ۲۵۰
۱۵۲۔ جواز جعفری: موت کا ہاتھ کلائی پر ہے‘ لاہور‘ فکشن ہائوس‘ ۲۰۰۴ء‘ص۹۳
۱۵۳۔ زاہد امروز: کائناتی گرد میں عریاں شام‘ ص۱۶۔۱۵
۱۵۴۔ ایضاً‘ ص۷۰
۱۵۵۔ ایضاً‘ ص۹۶
۱۵۶۔ زکریا‘ خواجہ محمد (مرتب): انتخابِ زریں نظم‘ ص ۳۰۳
۱۵۷۔ ایضاً‘ ص ۳۳۹
۱۵۸۔ زاہد ڈار: تنہائی‘ ص ۱۳
۱۵۹۔ ایضاً‘ ص ۱۴
۱۶۰۔ ایضاً‘ ص ۵۶
۱۶۱۔ ایضاً‘ ص ۶۶۔ ۶۵
۱۶۲۔ شہزاد احمد:آنے والا کل‘ص۱۸۵
۱۶۳۔ عبدالرشید: انی کنت من الظالمین‘ ص ۵۳۔ ۵۲
۱۶۴۔ نصیر احمد ناصر: تیسرے قدم کا خمیازہ‘ ص۴۸
۱۶۵۔ مبارک احمد: کلیاتِ مبارک‘ لاہور‘ مبارک پبلشرز‘ ۱۹۹۹ء‘ ص ۳۷۵
۱۶۶۔ عبدالرشید: انی کنت من الظالمین‘ ص ۷۴
۱۶۷۔ زاہد امروز: کائناتی گرد میں عریاں شام‘ص۲۴
۱۶۸۔ شہزاد احمد: مٹی جیسے لوگ‘ ص۹۵۔۹۴
۱۶۹۔ شہزاد احمد:آنے والا کل‘ ص۱۸۲

۱۷۰۔ نصیر احمد ناصر: تیسرے قدم کا خمیازہ‘ ص۶۸۔۶۷
۱۷۱۔ ایضاً‘ ص۸۱
۱۷۲۔ شہزاد احمد: مٹی جیسے لوگ‘ ص۸۳

باب چہارم

جدیداُردو نظم ‘سماجی سائنسز اورتفہیمِ کائنات

حیاتیات و کیمیا وغیرہ جیسے علوم انسان اور کائنات کے تعلق کو مادی سطح پر بیان کرتے ہیں جب کہ سماجی علوم ان حدود سے ہٹ کر تکوینِ کائنات کو سمجھنے کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ یہ علوم بھی تعقل و مشاہدہ کے پروردہ ہیں مگر دانش کی رنگا رنگی ہر فرد کے مختلف احساسات کی ترجمانی مختلف سطح پر کرتی ہے اور یہ مختلف آرا کے حامل افراد مل کر اس کائنات کے سینے میں سما جاتے ہیں۔ ان کے مقاصد مشترکہ ہیں اسی لیے گرے اور گردوزے معاشرہ کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ

’’معاشرہ افراد کا ایسا گرہ ہے جو اپنے کسی خاص مقصد کی تکمیل کے لیے اکٹھے ہوجاتے ہیں۔‘‘

یہ مقاصد مذہبی‘ سیاسی‘ سماجی‘ معاشی‘ معاشرتی الغرض کسی بھی نوع کے ہوسکتے ہیں اور اپنے گروہ کے ساتھ رہتے ہوئے فرد ‘ان کی تکمیل بہتر طور پر کرنے کی توقع رکھتا ہے۔ افراد کے بڑے بڑے گروہ ہمیں مختلف مذاہب‘ تہاذیب اور ممالک کی صورت میں جلوہ گر دکھائی دیتے ہیں اور اپنے اپنے تناظر میں اس کائنات کو سمجھنے اور کائنات‘ انسان اور خدا کے تعلق کو واضح کرنے کی سعی کرتے ہیں۔زیرِ نظر باب میں یہ جاننے کی کوشش کی جائے گی کہ سماجی سائنسز کے نظریات اور جدید اردو نظم کے شعرا میں کس قسم کا تعلق پایا جاتا ہے اور وہ ان نظریات کے مطابق کائنات کو کیسا دیکھتے ہیں۔ وہ سماجی علوم کی پیدا کردہ تکوین کو مانتے ہیں یا اُس سے بغاوت کا رویہ ان کا وطیرہ ہے اور اس بغاوت کی بہ دولت وہ کسی نئی جہت میں آگے بڑھنے کا عزم رکھتے ہیں۔کائنات کو سمجھنے کی یہ کوششیں آفاقی حیثیت رکھتی ہیں۔ دنیا کی کوئی بھی زبان اور ادب ایسا نہیں ہے جن میں ان عناصر پر بحث نہ کی گئی ہو تو پھر کیسے ممکن ہے کہ جدید اردو نظم کے شعرا نے اس پر طبع آزمائی نہ کی ہو کہ جو خود اس گنگا جمنی تہذیب کی پیداوار ہیں۔

’’اردو پر ہر تہذیب اور ماحول کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ اردو تو ہماری گنگا جمنی تہذیب کی بہترین علامت ہے۔ اور اردو شاعری پر ہندو تہذیب‘ ماحول اور ہندوستان کی ملی جُلی تہذیب کا خاصا اثر دکھائی دیتا ہے۔‘‘(۱)

سماجی سائنسز کے حوالے سے دیکھا جائے تو ہم پر یہ واضح ہوتا ہے کہ ان علوم کے نزدیک کل کائنات ہماری زمین ہی رہی ہے جس کا مرکز انسان کو قرار دیا گیا۔ ان سماجی علوم میں انسان کے ذہنی ارتقا کو سمجھنے کی کوشش سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس ذہنی ارتقا کی بہ دولت ہی انسان تفکر کے قابل ہوا اور اس نے خالق کے ساتھ اپنے رشتوں کو سمجھنے

کی کوشش کی۔ ان کوششوں کے دوران مینجیسے جیسے یہ کائنات اس کی گرفت میں آتی گئی وہ ویسے ہی نظریات بھی بناتا چلا گیا۔ اس کے ذہن نے جب اُسے مخلوق کی صورت میں دکھایا تو پھر خالق کی تلاش اس کا مقصد ٹھہری۔ اس تلاش نے اسے دیویوں اور دیوتائوں کی صورت میں نئے نظریے دیے۔ پھر ان دیوی دیوتا کو مخصوص ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے دکھا کر ان کی خوشی کے حصول کی کوشش انسانی خاصہ بنی کہ وہ ان کی ناراضی سے بچیں اور انھیں خوش رکھیں تا کہ وہ دیوی دیوتا انھیں عذاب سے بچائیں اور اپنی رحمتوں کے دامن میں سمیٹ لیں ۔ پھر ان دیوی دیوتائوں کو خوش کرنے کے لیے مختلف طرح کی رسومات اختراع کی گئیں اور رفتہ رفتہ یہ رسومات مذہبی شعائر کی صورت اختیار کرگئیں۔ یہ رسومات و شعائر مختلف انداز کے ہیں جن میں جسمانی اور جذباتی قربانی تک شامل ہے۔ یہ قربانیوں کا سلسلہ تمام مذاہب و تہاذیب میں تقریباً آج بھی موجود ہے۔ تمام انسانی رسومات کے پیچھے ایسے ہی روّیے نظر آتے ہیں۔ جب ہم سماجی سائنسز میں کائناتی شعور کی بات کرتے ہیں تو اس سے مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ ان رسوم و رواج کو انسان کس حیثیت سے دیکھتا ہے اور کس طرح ان کی مدد سے وہ اس کائنات اور اس کے خالق کے ساتھ اپنا تعلق قائم رکھنا چاہتا ہے۔ انھی نظریات کی بنیاد پر وہ اخلاقی‘ سیاسی اور سماجی قوانین بھی اخذ کرتا ہے۔ اور ان قوانین کی بجا آوری کو ہی کامیابی کی ضمانت سمجھتا ہےیہ انسانی روّیے سیاست‘ سماج‘ معاشرت‘ معیشت‘ تہذیبی اقدار‘ معیارِ انسانی اور جمالیاتی افکار کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔

کائنات کی تفہیم کے لیے کی گئی ابتدائی کوششوں نے ابتدائی طور پر اساطیر کی شکل اختیار کی جس پر تفکر نے مختلف مذاہب کی داغ بیل ڈالی۔ مختلف تہاذیب اپنی اپنی علاحدہ اساطیر رکھتی ہیں۔ ان اساطیر میں بعض مشترک عناصر بھی پائے جاتے ہیں ۔ بعض جگہ جو صرف نام کی تبدیلی کے ساتھ ہی ایک عنصر ان تمام خصوصیات کا نمائندہ بن جاتا ہے جیسا کہ کوئی دوسرا عنصر کسی اور تہذیب کی اسطورہ میں پایا جاتا ہے۔ اس مقالہ میں تمام تہاذیب اور ان کی اساطیر کو سمونا تو ممکن نہیں تاہم کائناتی حوالے سے جدید نظم میں برتے گئے ان عناصر کی وضاحت کی سعی ضرور کی جائے گی۔کیوں کہ ان اساطیر میں ابتدائی تہاذیب کے ان عناصر کی باز گشت سنائی دیتی ہے جن کی مدد سے اولین انسان نے اس کائنات کو سمجھنے کی کوشش کی اور مختلف کرداروں کو مختلف کام سونپ کر نظامِ ہستی کی پیش کش کی۔ ایسا ہی اک بیانیہ مبارک احمد کے ہاں ملاحظہ ہو

زمیں کو چھوکر
نظر ستاروں کی سمت دوڑی
مگر طویل اور اداس عمروں کے فاصلے درمیاں پڑتے تھے
سفر مسلسل سفر تھا‘ کٹتی مسافتوں میں
نظریہ وہم و گماں کے سایوں کا بوجھ بے وزن تھا‘ خلا میں
ستارے بے انت فاصلوں پر
مہیب صحرا کا عکس تھے‘ عکس میں سرابوں کی جھلملاہٹ نے بے حساب و شمار دوری کو ایک سو ایک قدم پہ لانے کا
شعبدہ اس طرح دکھایا کہ عقل نے حیرتوں کے پیراہنِ دبیزوعریض میں اپنا منھ چھپایا‘

اور انگلیاں سر سے اونچی مالائوں پر پھسلنے لگیں‘ قدم بے محابا آگے بڑھے مگر فاصلے
وہی پہلے فاصلے تھے
کئی خدائوں نے‘ دیوتائوں نے اور فرشتوں نے دوریوں سے ہزار قربت کے گیت گائے
مگر بدن اور روح کی تشنگی وہی پہلی تشنگی تھی
سفر مسلسل سفر تھا پھر بھی
مگر طویل اور اداس عمروں کے فاصلے درمیاں لٹکتے رہے خوشی کی گھڑی نہ آئی
ستارے جیسے پرانی مالا کے بکھرے دانے تھے‘ پھیلے صحرا کا عکس اب مٹ چکا تھا یکسر
پلٹتا لمحہ شکستِ آشفتگی تھا‘ جشنِ مراجعت تھا
نظر ستاروں سے لوٹ آئی
زمیں نگاہیں جھکائے شرما رہی تھی اور منتظر کھڑی تھی‘ سرکتے بادل‘ پھسلتے لمحے‘
ڈھلکتے ملبوس کی کہانی سنا رہے تھے
نظر سے پردے ہٹے‘ ابد نے ازل کو چھیڑا‘ زمیں برہنہ تھی‘ اور نظر تھی
زمیں کو چوما
تو اشک آنکھوں میں تھرتھرائے)مبارک احمد()۲(

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ ہر تہذیب کی اپنی اساطیر ہیں۔ ان تمام اساطیر کو ایک مرکز پر اظہر غوری نے ایک طویل نظم میں بیان کیا ہے۔ اگرچہ نظم طویل ہے لیکن کیوں کہ تقریباً تمام اہم اساطیر کو بیان کرتی ہے لہٰذا قابلِ توجہ ہے۔ ذرا اس پر غور کریں تو خدا‘ انسان اور تخلیق کے تمام تر مظاہر کی خوب صورت پیش کاری اس میں نظر آئے گی۔

)زن ومرد خود کو مخلوق کہلوانا پسند کرتے رہے ہیں‘ اسی لیے
سب سے بہتر خالق کی تلاش ہمیشہ سب سے بڑا مسئلہ رہی ہے
افسوس کہ کوئی ایسا کیلنڈر نہیں جو
کرۂ ارض کے بننے یا انسان کے معرضِ وجود میں آنے کا پتا دے سکے‘ پھر بھی
میرے ذہن سے خیالات اور حقائق کا جھرنا یوں پھوٹتا ہے‘ جیسے
شمسی آندھی سورج کی مقناطیسی لہروں کے گرد دائرے میں گھومتی ہے‘ اور
خلا میں موجوں کی صورت بہت دور تک بہتی چلی جاتی ہے
میرے اردگرد بے تُکی اساطیر کا انبار لگا ہے
)میں جس میں سے اپنی تحقیق و تخلیق کی راہ ہموار کررہا ہوں(
تحقیق کے نتیجے میں ہر بار ایک نہ ایک نئی کہانی ہی سامنے آتی ہے:
بابلی عقیدے کے مطابق ابتدا میں کائنات بے آب و گیاہ تھی
یہودا نے زمین و آسمان کو بنایا
زمین کی مٹّی سے انسان کو گھڑا‘ اُس کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا‘ پھر
مشرق کی طرف باغِ عدن بنایا‘ جس میں ہر قسم کے درخت تھے‘ شجرِحیات اور نیک و بد کی پہچان کا درخت بھی
بیچ میں ایک دریا تھا‘ جو باغ سے نکل کر چار حصّوں میں بٹ جاتا:
جیجوں‘ سیحوں‘ دجلہ اور فرات
پھر سب پرند چرند پیدا کیے‘ آدم نے اُن کے نام رکھّے
پھر حوّا کو آدم کی پسلی سے پیدا کیا

یہودیوں کے خدا نے اپنے آخری حکم میں
بیویوں اور مائوں کو مویشیوں اور جایداد کے برابر مرتبہ دیا
مَردوں کوباقاعدہ یہ دُعا مانگنی پڑتی تھی:
’’ اے خدا میں تیرا ممنون ہوں کہ تو نے مجھے کافر یا عورت نہیں بنایا‘‘
تحقیق کے نتیجے میں ہر بار ایک نہ ایک نئی کہانی ہی سامنے آتی ہے:
بعل‘ پورے کنعان میں افزایش ‘ زرخیزی اور بارش کا دیوتا مانا جاتا
اُس کے برعکس یم دیوتا سمندر‘ موت اور تخریب کی علامت تھا
تجربہ بتاتا ہے کہ سمندر اہلِ کنعان کا دُشمن تھا
دراصل جہاز رانوں کی قوم کو دن رات خوف ناک موجوں سے نبرد آزما رہنا پڑتا
چوں کہ درختوں‘ سبزہ زاروں‘ پھلوں‘ پھولوں‘ کھیتوں‘ مویشیوں‘ اور
انسانوں کو لازماً موت کا مزہ چکھنا ہوتا تھا‘ لہٰذا
بعل اور یم کی جنگ واقعتا تخلیق اور تخریب کی طاقتوں کی جنگ تھی
ہر سال خزاں کے موسم میں موت غالب آجاتی‘ اور پھر
موسمِ بہار کی آمد پر بعل دیوتا دوبارہ زندہ ہوجاتا
تخلیق و تخریب کا یہ نظام ابدی سمجھا جاتا تھا اور موجوداتِ عالم کا سبب بھی
تحقیق کے نتیجے میں ہر بار ایک نہ ایک نئی کہانی ہی سامنے آتی ہے
پان کو‘ اٹھارہ ہزار برس تک انڈے جیسے ہون تون میں پرورش پاتا رہا
اندرونی تاریک حصّہ زمین بنا اور بیرونی چمکیلا حصّہ آسمان
مزید اٹھارہ ہزار برس تک روزانہ آسمان دس فٹ اونچا‘ اور
زمین دس فٹ نیچے ہوتی چلی گئی
پان کو کا قد بھی روزانہ دس فٹ بڑھتا گیا
جب زمین اور آسمان میں تیس ہزار میل کا فاصلہ ہوا تو پان کو مرگیا‘ تب
اُس کے بدن کے حصّے قدرتی عناصر میں تبدیل ہوگئے
سر سے پہاڑ بن گئے‘ داہنی آنکھ سورج اور بائیں چاند بنی
سانس سے ہوا اور بادل بنے‘ آواز گرج چمک بن گئی
اس کے خون سے دریا اور سمندر بنے
رگوں اور پٹھّوں نے زمین کی تہوں کی شکل اختیار کرلی
اس کے گوشت سے زمین اور ہریالی وجود میں آئی
سر کے بالوں سے ستارے اور جوئوں سے سیّارے بنے
دانتوں اور ہڈیونسے دھاتیں بنیں
اس کا پسینہ بارش میں تبدیل ہوگیا‘ اور
اس کے بدن سے لپٹی جونکوں سے مختلف جان دار پیدا ہوئے
تحقیق کے نتیجے میں ہر بار ایک نہ ایک نئی کہانی ہی سامنے آتی ہے:
نوکوا دیوی نے پیلی مٹّی کو پیٹ پیٹ کر آدمی بنائے
یہ بڑی محنت کا کام تھا‘ سارا دن اسی میں صرف ہوجاتا‘ لہٰذا
اس نے ایک رسّی لی اور اسے کیچڑ میں بھگودیا‘ جس سے ٹپکتے ہوئے قطرے آدمی بنے
تحقیق کے نتیجے میں ہر بار ایک نہ ایک نئی کہانی ہی سامنے آتی ہے:

آریائوں کی رگ وید کا کردار اِندر دیوتا دھرتی اور آکاش کا بیٹا تھا
اُس کی پیدایش کے وقت زمین آسمان آپس میں جڑے ہوئے تھے
اُس نے دھرتی کی چھاتی سے نکلا ہوا سوم رس پیا
اس کی طاقت کے خوف سے آسمان زمین سے دور چلا گیااور بیچ میں اُس کا راج ہوگیا
تحقیق کے نتیجے میں ہر بار ایک نہ ایک نئی کہانی ہی سامنے آتی ہے:
ازل سے دُنیا کے سمندر پر کنول کا پھول اُگا
جس میں انوم دیوتا نے جنم لیا
اس کی اولاد نے سینڈوچ کی طرح جُڑے ہوئے زمین اور آسمان کو الگ کیا
تحقیق کے نتیجے میں ہر بار ایک نہ ایک نئی کہانی ہی سامنے آتی ہے:
نارائن ایک ہزار برس تک سمندر پر تیرتے انڈے میں لیٹا رہا‘ پھر
اُس کی ناف سے کنول کا پھول اُگا جو ہزار سورجوں سے زیادہ چمک دار تھا
اور جس میں ساری کائنات سماسکتی تھی
اس کنول سے برہما نکلا (جس میں نارائن کی طاقت تھی(
جس سے دُنیا کی تمام چیزیں پیدا ہوئیں‘ جنھیں شکل اور نام دیے
تحقیق کے نتیجے میں ہر بار ایک نہ ایک نئی کہانی ہی سامنے آتی ہے:
ہندی دیو مالا کے خالق برہما نے دنیا کو پیدا کیا تو
پہلے مختلف عناصر سے سورج‘ چاند‘ ستاروں‘ پہاڑوں اور جنگلوں کی
اور بالآخرآدمی کی صورت بنائی
عورت وضع کرنے کے موقع پر تمام ٹھوس عناصر صرف ہوچکے تھے‘ چناں چہ
اس تخلیق کے لیے اسے عجیب و غریب خمیر تیّار کرنا پڑا
اس مجموعۂ اضداد میں بہت سے مجرّد اجزا شامل تھے
چاند کی گولائی‘ سورج کی کرنوں کی چمک دمک‘ ہوا کے جھونکوں کی متلوّن مزاجی‘
کُہر کے آنسو‘ گھاس کی تھرتھراہٹ‘ بیلوں کے پیچ و خم‘
درختوں کے سوتوں میں چمٹنے اور لپٹنے والی وہ قوّت‘ جو ایک درخت کو دوسرے سے ملا دیتی ہے
روئیں کی نرماہٹ‘ نرسل کی نازک بدنی‘ پھولوں کا مخمل
پروں کی سبک رفتاری‘ قُمری کی چہک‘ شور مچانے والے پرندوں کی دماغ چٹ بکواس
مور کی خود پسندی‘ غزالِ رعنا کی شوخیٔ چشم‘ خرگوش کی بزدلی‘
باگھ کی بے رحمی‘ سانپ کا زہر
شہد کی مٹھاس‘ آگ کی گرم جوشی‘ برف کی ناگوار سردمہری اور ہیرے کی کنی کی سختی
آدمی عورت کو پاکر خوشی کے مارے باغ باغ ہوگیا کہ
رفیقۂ حیات اس کے رنج و غم کی شریکِ حال رہے گی‘ لیکن
کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اُس نے کہا: ’’اے برہما!
آپ کی عطا کردہ مخلوق نے تو میری زندگی اجیرن کردی ہے
یہ لگاتار توجّہ کی طالب ہے‘ یکساں کلکلاتی اور بکواس کرتی رہتی ہے
ہردم پاس و لحاظ چاہتی ہے
بے وجہ روتی دھوتی اورچیختی رہتی ہے‘ بے حد کاہل اور آرام طلب ہے‘‘

شکایت سُن کر برہما نے عورت کو آدمی سے واپس لے لیا
چند روز کے بعد آدمی پھر عرض پرداز ہوا: ’’میرے مالک!
عورت کے بغیر میری زندگی تو سُنسان اور بے یارومددگار ہوگئی
میں تنہائی سے اُکتا اور گھبرا گیا ہوں
مجھے اُس کا ہنسنا‘ بولنا اور دل لُبھانا یاد آتا ہے
اُس کا پیار‘ چائو اورچمٹنا ترساتا ہے
میں عورت کی رفاقت میں آسودگی محسوس کرتا اور میرا غم غلط ہوجاتا تھا
اُس کے باعث مجھے تاریکی میں اجالا محسوس ہوتا تھا
اس کی شیرینی سے میری تمام تلخیاں دور ہوجاتی تھیں
اب میں اُس کے لیے رات دن تڑپتا رہتا ہوں‘‘
یہ سب کچھ سُن کر برہما مُسکرایا اور دوبارہ عورت کو مرد کے حوالے کردیا
بہ مشکل کچھ ہی دن گزرے ہوں گے کہ آدمی ایک بار پھر حاضر ہوا‘ اور
ہاتھ جوڑ کر التجا کرنے لگا: ’’میرے مالک!
عورت خوشی دینے سے زیادہ مجھے مصیبت میں گرفتار رکھتی ہے
مجھے اس سے نجات دلائیے‘‘
برہما نے جھنجھلاکر کہا:’’چلو اپنا راستہ لو‘ اور نباہ کی حتّی المقدور کوشش کرو‘‘
آدمی نے گڑگڑا کر عرض کی: ’’اے میرے مالک! میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتا‘‘
برہما نے جواب دیا:’’مگر تم اس کے بغیر بھی زندہ نہیں رہ سکتے‘‘
پس مرد اور عورت کے ساتھ دنیا کا آغاز ہوگیا اور اُن کے سبب
محبت و نفرت‘ رشک و رقابت‘ رنج و راحت‘ وفاداری و بے وفائی اور
رومان کی سیاہ کاری کا دور دورہ ہوگیا
میں خواہ ایک ہی موضوع پر باربار تحقیق کروں
اُس کے نتیجے میں ایک نہ ایک نئی کہانی ہی سامنے آتی ہے :
چار ارب برس قبل زندگی کا آغاز ہوا
ساٹھ ہزار برس متواتر بارشوں کے باعث
کرۂِ ارض کا درجۂِ حرارت کم ہوتا ہوا موجودہ ماحول تک پہنچ کر ٹھہر گیا
آتش فشاں لاوا جما تو زمین مختلف جغرافیائی خطّوں میں تقسیم ہوتی چلی گئی
نشیبی خطّوں میں جھیلیں اور سمندر وقت کے ساتھ ساتھ اپنی حدود کا تعین کرتے رہے
جہاں جہاں زندگی کی ابتدا ہوئی ‘ وہاں آبی نباتات نے فضا تشکیل دی
پھر تیرتی ہوئی مخلوق آہستہ آہستہ خشکی تک پہنچ کر
رینگنے‘ چلنے پھرنے‘ چوکڑیاں بھرنے اور اُڑنے لگی
برِّ اعظم ایک دوسرے سے ٹکراتے اور سرکتے رہے
تب زمینی فضا میں آکسیجن عنقا تھی
تب کائنات کی تابکاری بلاروک ٹوک زمین پر آکر اصل توانائی کی طرح
مختلف کیمیائی مادوں کو آپس میں ملا کر پیچیدہ کلاں سالمے بناتی تھی‘ جو
اپنے آپ کو دو بالکل ایک جیسے حصّوں میں تقسیم کرنے کی
زبردست اور حیرت انگیز صلاحیّت رکھتے تھے

تب زندگی کے آثار مکمل ہوئے اور ارتقا کا طویل عمل شروع ہوگیا
پہلے پہل یک خلوی نامیے کا ایک پیچیدہ تر کثیر الخلوی نامیے کے ساتھ انسلاک ہوا
اور پھر نباتات کی ضیائی تالیف سے آکسیجن بننے کے بعد
کوئی نئی زندگی وجود پذیر نہیں ہوسکتی تھی، حتّٰی کہ
کوئی نیا جرثومہ یا وائرس بھی جنم نہیں لے سکتا تھا
فضا نے ایسے حیوانوں کی نشوونما کو موقع فراہم کردیا ، جو
پھیپھڑوں کے ذریعے سانس لے سکتے تھے
سبھی کو ضرررساں کائناتی تاب کاری کے خلاف حفاظتی چھت مل گئی
دن بہ دن انسانی دماغ بھی نسبتاً بڑا ہونے لگا
) میں جس موضوع کو پسند کروں، اُس پر تحقیق کرتا ہوں، اور
جس مواد کو ضروری خیال کروں، اُسے خلق کرتا ہوں
زن و مرد خود کو مخلوق کہلوانا پسند کرتے رہے ہیں
کبھی فقط حیوان، کبھی حیوانِ ناطق، کبھی سماجی حیوان
کبھی اخلاقی حیوان، کبھی زرعی حیوان، کبھی صنعتی حیوان،
کبھی تکنیکی حیوان، کبھی سائنسی حیوان اور کبھی اشرف المخلوقات
اسی لیے سب سے بہتر خلاق کی تلاش ہمیشہ سب سے بڑا مسئلہ رہی ہے
میں جیسا چاہوں، وہی کیلنڈر نافذالعمل کرسکتا ہوں
میری طرح جو بھی چاہے کرۂ ارض کے بننے یا انسان کے معرضِ وجود میں آنے کا پتا پاسکتا ہے
میرے ذہن سے خیالات اور حقائق کا جھرنا یوں پھوٹتا ہے، جیسے
شمسی آندھی سورج کی مقناطیسی لہروں کے گرد دائرے میں گھومتی ہے، اور
خلا میں موجوں کی صورت بہت دور تک بہتی چلی جاتی ہے
میں بے تُکی روایات اور اساطیر کے انبار میں سے
اپنی تحقیق و تخلیق کی راہ ہموار کرچکا ہوں، یعنی
خواہ کوئی آواگون یا تناسخ پر ہی کیوں نہ یقین رکھتا ہو، تاہم
ہمیں یہ ز ندگی صرف ایک ہی مرتبہ ملتی ہے، اور
ہم دوبارہ کبھی زندگی کی طرف لوٹ کر نہیں آسکیں گے
بہ ہر حال یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اب ہم زندہ ہیں
تاکہ ایک دوسرے سے غیر مشروط محبت کر سکیں) (اظہر غوری:اساطیر)(۳(

یہ کائنات کو سمجھنے کی ابتدائی کوششوں کا اظہار ہے کہ جب انسان نے اپنے گرد پھیلی اس وسیع و عریض سرزمیں کو دیکھا کہ جو اس کے نزدیک کل کائنات تھی تو اس کی سوچ نے سب سے پہلے بے انت آسمان کو دیکھا جو ہمیشہ اُس کے ہم راہ رہتا تھا۔ دوسرا احساس اس پر چمکتے دمکتے عناصر جو سورج، چاند اور تاروں کی صورت میں جلوہ گر تھے۔ جو دن رات کے مختلف اوقات کو اپنی روشنی سے جگمگاتے تھے اور انسانوں کے مطابق ، ان کی اس لگی بندھی روایت میں کسی بھی قسم کی در آنے والی تبدیلی انسان پر اثر انداز ہوتی تھی۔ وہ انھی سے سعد و نحس کے شگون لیا کرتا تھا۔ ان عناصر میں زمین ماں اور

آسمان یا سورج باپ کی صورت دکھائی دیتے رہے۔ وید انتیوں کے ہاں تخلیقِ کائنات کے بعد انسان کا ظہور اہم گردانا گیا۔ اور انسان کو اس دنیا میں ایک جنم چکر میں الجھنے کے لیے چھوڑ دیا گیا جہاں اُسے مختلف زندگیوں سے گزر کر واپس اپنی اصل کی طرف لوٹنے کی ذمہ داری تفویض کی گئی۔ ایک سے دوسری‘ دوسری سے تیسری اور تیسری سے چوتھی زندگی کا یہ سلسلہ اپنی اصل تک آپہنچے تک جاری و ساری رہتا ہے۔

روحوں کے چھید
لمحہ بہ لمحہ بڑھتے رہتے ہیں
اور زندگی دن اور رات کے درمیان
رینگتے‘ لہراتے سایوں کی طرح
ایک جانب سے دوسری جانب
دوسری سے تیسری۔۔۔تیسری سے چوتھی
چوتھی سے پانچویناور پھر ۔۔۔ شش جہت
اور اسی طرح لامتناہی ابعاد میں
خاموشی سے گھٹنوں کے بل چلتی رہتی ہے   )نصیر احمد ناصر:اندھیرے کا گیت)(۴(

اس زندگی کی ابتدا کی طرح اس کی انتہا بھی تفکر میں شامل رہی۔ ایک اسطورہ کے مطابق یاجوج ماجوج ایک ایسی قوم ہیں جو انسانوں پر دھاوا بول کر انھیں تباہ و برباد کردینے پر آمادہ ہیں۔ وہ ہر رات انسانوں کے اور اپنے درمیان موجود دیوار کو اپنی زبانوں سے چاٹ چاٹ کر ختم کردینے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ رات بھر چاٹتے رہتے ہیں اور جب دیوار تھوڑی سی باقی رہ جاتی ہے تو سو جاتے ہیں کہ باقی کام بعد میں کریں گے۔ ان کے کام چھوڑتے ہی یہ دیوار پھر سے پہلے جتنی ہوجاتی ہے اور جس دن انھوں نے اپنے کام کو درمیان میں نہ چھوڑا ‘ اُس دن یہ دیوار کو چاٹ کھائیں گے اور وہی قیامت کا دن ہوگا۔نذرمحمدراشد اپنے عزائم کو اسی اسطورہ سے مربوط کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

کرچکا ہوں آج عزمِ آخری۔
شام سے پہلے ہی کردیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صُبح ہونے تک وہ ہوجاتی تھی دوبارہ بلند   )ن۔م۔راشد:خود کشی)(۵(

کائنات کو جاننے کی کوشش میں تاریخ کا کردار بھی بنیادی اہمیت رکھتا ہے اس پر فلسفیانہ انداز میں روشنی ڈالتے ہوئے عبداللہ حرم زئی ‘ محمدآفتاب کی کتاب ’’ہماری حقیقت، سائنس، انسان اور کائنات‘‘ کے حوالے سے رقم طراز ہیں:۔

’’مسلم صوفیا نے کائنات کی جاودانی حرکت کا نظریہ پیش کیا جس میں ہر لمحہ دنیا کی تخلیقِ نو ہو رہی ہے۔ اس نظریہ کے مطابق کائنات ہر لمحہ تخلیق ہو رہی ہے اور ہر اگلے لمحے منہدم ہو رہی ہے۔ یہ عمل مسلسل جاری ہے۔ اس نظریہ کو سب سے پہلے ۱۲ ویں صدی عیسوی میں عین القضاۃ ہمدانی (Aynal Quadat Hamdani) نے متعارف کروایا۔ ان کے مطابق جو شے وجود میں آتی ہے وہ اگلے لمحے ہی مٹ جاتی ہے پھر وجود میں آتی ہے اور پھر مٹ جاتی ہے۔ کائنات میں گویا وجود اور عدم کا یہ سلسلہ ہر لمحہ چلتا رہتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو ایک بار ہی نہیں پیدا کیا بل کہ وہ اُسے ہر لمحے تخلیق کر رہا

ہے۔وہ اس کا مستقل خالق ہے۔ ہر شے اس کے الوہی تعلق سے وابستہ ہے اور ہر لمحہ اسی تعلق سے وجود حاصل کر رہی ہے۔ اس تعلق کی لمحہ بہ لمحہ تجدید ہوتی رہتی ہے---
اس طرح’’Quantum Fluctuations اَمرِ ُکن‘‘کی وہ لطیف و قوعات ہیں جو ذات باری تعالیٰ کی صفت بدیع السموات و الارضکو دوام بخشتے ہیں۔ بدیع و خلق کی صفات کبھی معطل نہیں ہو سکتیں کائنات کی تخلیق کوئی ماضی کا واقعہ نہیں نہ ہی ہم مردہ Dead کائنات میں رہتے ہیں۔ کائنات کی اُس حیی و قیوم ذات سے مسلسل وابستگی ہی اُس کے ہونے کی دلیل ہے کائنات کو ماضی کا واقعہ سمجھنا تصور زمان کو نہ سمجھنے کے باعث پیدا ہوتا ہے۔ علامہ اقبال کا یہ کہنا کہ دما دم آرہی ہے صدائے کن فیکون اسی باعث تھا۔‘‘(۶(

کائنات کی تفہیم کے لیے ایسا ہی ایک بنیادی اور اہم ذریعہ برہما کے خواب کی اسطورہ کی صورت میں موجود ہے۔ اس کے مطابق برہما نے یہ دنیا تخلیق کی۔ تخلیق کے بعد برہما ایک لمبی نیند سوجاتا ہے اور اس دوران وہ ایک نئی دنیا کا خواب دیکھتا ہے۔ خواب سے اٹھتے ہی وہ اس کائنات کو تہس نہس کردیتا ہے اور خواب کے مطابق نئی دنیا تشکیل دیتا ہے۔ لہٰذا ہماری دنیا خواب سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ خوابوں کا یہ سلسلہ ازل تا ابد یوں ہی جاری و ساری رہنے والا ہے۔

ہم جن کلاں خوابوں کی بات کرتے ہیں
خدا کی نظر میں وہ سب کلیشے ہیں
دنیا ایک چھوٹے سے خواب سے شروع ہوئی تھی
اور بالآخر
ایک بڑی تباہی سے دوچار ہے)نصیر احمد ناصر:کاغذ کی تنہائی)(۷(

پہلے باب میں اس امر پر تفصیلی بحث کی جا چکی ہے کہ کس طرح اساطیر نے انسان کو مذاہب کی طرف مائل کیا۔ تمام مذاہب کی اس کائنات کے بارے میں اپنی اپنی رائے اور اپنا اپنا نظریہ ہے۔ سامی مذاہب کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو جنت میں پیدا کیا اور پھر اُن کی پسلی سے حضرت حواؑ کو پیدا کیا ۔ یہ اولین جوڑا گناہ کی پاداش میں جنت سے نکالا گیا اور اس کا ٹھکانہ یہ زمین ٹھہری۔ اس گناہ کا سبب عورت کا بہلاوہ اور شیطان کا بہکاوہ تھا۔ اسی لیے اظہرغوری عورت سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ

بہت زیادہ تاسف نہیں ہے کہ
میں نے ہر جنّت میں تمھیں اپنی پسلی سے تخلیق کیا‘ مگر
تم گروہِ شیطان سے مل کر میری بربادی سوچتی ہو)اظہر غوری:دائرے)(۸(

انسان اپنے گناہ کی سزا میں اس دنیا میں بھیج تو دیا گیا لیکن آخر اُسے واپسی کا سفر اختیار کرنا تھا ۔ وہ سفر جس کی منزل وہی مقام تھا جہاں سے اُسے نکالا گیا لیکن اس دنیا میں اُسے تقدیر کی جکڑ بندیوں میں الجھا دیا گیا۔

مگر افسوس
عہدِ کم نظر میں دیکھنا
اور دیکھ کر اظہار کرنا
جس کو آیا ہے
اُسے لب بستۂ تقدیر پایا ہے۔)شہاب صفدر:آخری دستک)(۹(

اور یہ تقدیر کی بندش کوئی عام بندش نہیں ہے بل کہ عبدالرشید کے بہ قول اس کاعالم یہ ہے کہ

خود نگر لیکن تماشے کی طرح بکھرا ہوا
میں زمیں کی ٹوٹی محرابوں کے اندر قید ہوں (عبدالرشید:گر ہے کوئی آواز دے)(۱۰)

یہی وہ آدم تھا جو جنت سے نکالا گیااور اُس پر تقدیر کی صورت یہ بلائیں مسلط کردی گئیں۔ لیکن ان بلائوں کی اصلیت کیا تھی؟ کیا یہ اُس اولین گناہ کی پاداش کا صلہ تھا؟

کہیں یہ تو نہیں
آدم نے جنت میں
یہی ساری بلائیں (جو زمیں پر چھاچکی ہیں)
خود بنائی ہوں
اسی باعث خدا نے
خاک پر پھینکا ہو اُس کو (شہزاد احمد:ڈرو اُس وقت سے)(۱۱)

انبیا کے جس سفر کی ابتدا حضرت آدمؑ سے ہوئی اس کی انتہا حضرت محمدؐ پر ہوئی۔ وہ نبی کہ جسے غارِ حرا میں پہلا سبق لفظ ’’اقراء‘‘ کی صورت میں دیا گیا ہے۔ افتخارنسیم اُس تاریخی واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ

یاد ہے تم نے کہا تھا کہ پڑھو
یاد ہے تم نے کہا تھا کہ لکھو
یاد ہے تم نے بھلا کب یہ سب سکھایا تھا مجھے
اور میں سوچ کی اس غار کے اندر
کب سے بیٹھا ہوا
مالکِ کون و مکان
ہست اور بود کے بارے میں پریشان رہا
اور پھر اندھی گھپا کے اندر
روشنی پھوٹی تو ظاہر یہ ہوا
آنسوئوں کے لیے دامن ہو ضروری تو نہیں
دید کے واسطے آنکھیں ہوں ضروری تو نہیں (افتخار نسیم:وحی)(۱۲)

لیکن سفر کی انتہا تو موت ہے۔ زندگی لمحہ بہ لمحہ موت سے ہم آغوش ہونے کو بے تاب ہے۔ ہم اس کھیل کا حصّہ ہیں اوراعجاز رضوی اسے انوکھا کھیل قرار دیتے ہیں۔

کیسا انوکھا کھیل ہمارے ہاتھ لگا ہے
یک دم مرنا
دھیرے دھیرے جی اٹھنا (اعجاز رضوی:قومی کھیل)(۱۳)

اور یہ موت صرف انسانوں یا ذی روح اشخاص کے لیے نہیں ہے بل کہ ہر شے جو دنیا میں موجود ہے اُسے آخر موت سے ہم کنار ہونا ہے کہ یہ موت ہی کائنات کا حسن ہے۔

خود کشی کے حُسن سے معمور یہ دُنیا
قریب المرگ لیکن خوب صورت ہے (عبدالرشید:بانس کا جنگل)(۱۴)

اعجاز رضوی کہتے ہیں کہموت کایہ سفر جاری رہتا ہے اور موت سے زندگی اور زندگی سے موت کا انداز جاری و ساری رہتا ہے اوریہی زندگی کے تسلسل کا بھی باعث ہے

لوگ پیدا ہوتے ہیں
لوگ مرتے رہتے ہیں
زندگی نہیں مرتی
زندگی نہیں جیتی
لوگ جیتے رہتے ہیں
لوگ مرتے رہتے ہیں (اعجاز رضوی: سوال)(۱۵)

مگر موت ہی اختتام نہیں ہے بل کہ اس موت سے آگے بھی زندگی ہے اور وہ زندگی ابدی زندگی ہے۔ وہ زندگی اس زمینی زندگی کے اعمال کا بدلہ ہے جو جنت یا جہنم کی صورت میں ملنا ہے۔ لیکن کیا جنت بھی کوئی حقیقت ہے یا محض مفروضہ کہ آج تک کسی نے اُس کا حقیقی تجربہ کرکے اُس سے آگاہ نہیں کیا۔ اسی لیے احمد فقیہہ سوال کرتے ہیں کہ

فلک پر کس نے دیکھی ہے
کون یہ تصدیق فرمائے کہ جنت ہے
مگر نقشِ قدم ماں کا' جہاں میں وہ حقیقت ہے
جو خود سے خود ہی اپنے حُسن کے مرہونِ منت ہے (احمد فقیہہ: مجھ سا کافر بھی اس نقش پہ ماتھا ٹیکے)(۱۶)

اساطیر میں اس زمین اور زندگی کے ساتھ ساتھ جنت اور جہنم یا اس دنیا کے اعمال کے بدلے کا تصور بھی پایا جاتا ہے۔ تاہم حسنین بخاری تصوراتی سطح پر کائنات کی سیر کرتے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جنت تو محض ہماری اپنی ہی سر زمین ہے۔اس سلسلے میں''کہکشانی پازیبیں'' کی ایک خوبصورت نظم ''سفر نامہ'' ملاحظہ کیجیے:

جنت ہے بس ایک جہاں میں جس کو لوگ زمیں کہتے ہیں
اہلِ نظر اس کے ہر پتھر کا یاقوت نگیں کہتے ہیں
اہلِ محبت اپنی زباں میں اس کو خلا بریں کہتے ہیں
خوشبو، باغ، طراوت، پنچھی
چشمے، جام، بہاریں، تتلی
ہر منظر موجود یہاں ہے
جذبوں کا سیلاب رواں ہے
اکثر سوچتا رہتا ہوں
چاروں جانب دوزخ ہیں اور بیچ میں ان کے جنت ہے
یہ جنت برباد ہوئی تو کیا ہو گا؟ (حسنین بخاری: سفر نامہ)(۱۷)

مگر جہنم تو یہ زندگی بھی بن جاتی ہے۔ کہ اس دنیا میں بھی تو اعمال کا بدلہ دینا پڑتا ہے اور افضال احمد سید کے بہ قول کبھی کبھار تو جہنم یوں ظاہر ہوتا ہے:

مرنے کے بعد مجھے جہنم میں دفن کیا گیا
مجھے جس قبر میں داخل کیا گیا
وہاں ایک آدمی پہلے سے موجود تھا
یہ وہی آدمی تھاجسے میں نے قتل کیا تھا

جب قاتل اور مقتول ایک ہی قبر میں جمع ہوجائیں
اصل جہنم وہیں سے شروع ہوتا ہے)افضال احمد سیّد: جہنم)(۱۸(

جہنم کی ضد جنت ہے۔ جہاں جہنم تکالیف کا گڑھ ہے وہیں جنت آسایشوں کا گھر ہے۔
یوسف ظفر کے نزدیک جنت کا نظارہ کچھ یوں ہے کہ

مسافر! وہاں بادلوں میں نہاں ' ایک جنت نشاں ہے ٹھکانا
جہاں ریشمیں راگ سستارہے ہیں' جہاں ہے بہاروں کا رنگیں شبستاں
جہاں کاخ در کاخ بوئے غزل خواں
سحر کے لیے کھولتی ہے دریچے
جہاں شاخ در شاخ گل جھانکتے ہیں
وہاں چاند تاروں کے نیچے
مسافر وہاں زندگی گا رہی ہے جوانی کی لے پر محبت کا گانا
مگر تم نہ جانا وہاں تم نہ جانا)یوسف ظفر:منزل)(۱۹(

حسنین بخاری اپنی ایک نظم ''آشعوری منطقے'' میں بنی نوعِ انسان سے مخاطب ہو کر انھیں عقل کی پیروی کا درس دیتے ہیں تاکہ اس عقل کو معیار بناکر بہتر کائناتی تفہیم ہو سکے اور ہم اپنی دنیا کو بہتری کے سفر پر گام زن کر سکیں۔

''ہزاروں برس کے پرانے ہڑپوں کے
مردہ مکینو!
تمہیں کیا خبر ہے بھلا
آشعوری سماوات کے منطقوں کی
جہاں جگنوؤں کے کروڑوں حسیں کارواں
روشنی کے سمندر بہاتے اڑے جا رہے ہیں
یہی آنے والی رتوں کے پیمبر ہیں
جن کے وسیلے سے انساں
نئی منزلیں دیکھ لے گا
یہ مانا
ابھی تک ضروری ہیں
تحت الشعوری جہاں کی تہیں کھودنا بھی
مگر خوبرو آشعوری جزیرے
بسانے کی خاطر
توہم کی ساری پرانی فصلیں
گرانا پڑیں گی
خرد کی سبھی مشعلیں خون دل سے
جلانا پڑیں گی'' (حسنین بخاری: آشعوری منطقے)(۲۰(

جب انسان ذہنی طور پر بالغ نظر ہوجاتا ہے تو اُس کے ذہن میں بہت سے سوالات ابھرنے لگتے ہیں اور اُنھی کائناتی سوالات کے جوابات کی تلاش میں وہ فلسفے کا سہارا لیتا ہے۔ فلسفہ زندگی اور کائنات کو سمجھنے کی تعقلی سطح ہے۔ اور یہ تعقلی سطح بہت سے اسراروں سے پردہ اٹھاتی ہے۔

سوالوں جوابوں کی الجھن سے گزرے
تو ہم پر کھلاہے
محبت کی تقویم میں دوسرا کوئی شامل نہیں ہے
یہ ہم ہیں جو اپنے ہی سائے کو اپنی رفاقت کا
اک معجزہ جانتے ہیں
کہاں خود کو پہچانتے ہیں
اس لیے دامن وقت پر ان پھسلتے ہوئے
آنسوئوں کو
چشمِ عشاق کے آبلے ہی سمجھ
زمیں اس تعفن سے بے زار ہے
ہوا جس کو عادت کی تکرار ہے
سنا ہے اس آبلے سے سمندر بنانے کو تیار ہے
آسمانوں کا سورج اسی آبلے ہی کی تفہیم ہے
زماں سے مکاں تک اسی روشنی کا بدن شاخ دونیم ہے
یہی بس محبت کی تقسیم ہے)شاہین مفتی: لا +لا = لا)(۲۱(

انسان کی عقل اس نتیجے تک پہنچتی ہے کہ درحقیقت خواب بنیادی ضرورت ہیں۔ انسان نے خواب دیکھنا شروع کیا تو اپنے اجداد کی روحوں کو زندہ سمجھ کرارواح پرستی کے مذاہب کی بنیاد رکھی۔ یہ خواب زندگی کو رنگ دینے کا باعث بنتے ہیں اور ہر شخص کے خواب انفرادی حیثیت رکھتے ہیں ۔ یہ خواب انفرادی سطح بھی رکھتے ہی اور گروہی سطح بھی کہ

خواب اور خواہش میں
فاصلہ نہیں ہوتا

بے شمار نسلوں کے
خواب ایک سے لیکن
نیند اور جگراتا
ایک سا نہیں ہوتا)نصیر احمد ناصر:پانی میں گم خواب)(۲۲(

یہ خواب ہمیشہ شرمندۂِ تعبیر نہیں ہوپاتے لیکن تاریخ ہر صورت میں انھیں محفوظ و مامون رکھتی ہے۔ ان خوابوں کی روشنی میں جب انسان خود پر غور کرتا ہے تو خود کو ہی کائنات کا حاصل سمجھتا ہے۔وہ روزِ الست میں خُدا کو بے پردہ دیکھتا ہے اور پھر فلسفۂِ وحدت الوجود کی صورت اُسی کو کائنات کی ہر شے میں پاتا ہے۔اختر حسین جعفری کا ہاں اس کا بیان دیکھیے:

ہوا نے بھید سبھی موسموں کے کھول دیے
شہادتوں کا ہر اک نقش منحرف نکلا
رخِ بشر سے جو پردہ ہٹا تو جھولے میں
وہی تھا چہرہ جو صبحِ ازل میں دیکھا تھا

)اختر حسین جعفری:ہوا نے بھید سبھی موسموں کے کھول
دیے)(۲۳(
پھر اک نیا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ جب خدا خود ہی سب کچھ تھا تو پھر تخلیقِ کائنات اور تخلیقِ انسان کا مقصد کیا تھا؟ تو پھر خُدا کی یہ بات سامنے آتی ہے کہ ’’میں نے جن و انس کو پیدا کہ میں پہچانا جائوں‘‘۔ تو پھر جواب میں افضال احمد سیدانسان کو اک جال کی صورت قرار دیتے ہینکہ جس میں تمام حقائق کو جکڑا جاسکتا ہے۔
تمھارے جسم کے سوا میرے پاس کوئی جال نہ تھا
جس سے ڈوبتی ہوئی زندگی کو پکڑ سکتا ہے)افضال احمد
سیّد:برفانی چڑیوں کا قتل)(۲۴(
جسم کا یہ قید خانہ روح کی بالیدگی کے ساتھ قائم رہتا ہے لہٰذا عبدالرشید کے مطابق روح کے جسم سے جُدا ہوتے ہی جسم بے کار گندے کپڑوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے جسے کوئی بھی سنبھالنے کو تیار دکھائی نہیں دیتا ۔
گھروندوں سے لٹک کر جسم پر بھری ہوئی زردی کے چھینٹے
جب قمیصوں کالروں‘ بستر کی شکنوں سے چپک جاتے
تو کپڑوں کو اٹھاکر پھینکتے
کہتے رہے اب کون بھیگے پیرہن پہنے)عبدالرشید:وہ سب رخصت ہوئے)(۲۵(
جب جسم ہی حقیقت ہے اور وہ بھی بے کار تو پھر آخر اس کا حاصل کیا ہے؟ کیا انسان راستوں کے لیے تخلیق ہوا ہے؟ کیا اُس کی ریاضت کا کوئی حاصل‘ کوئی منزل نہیں؟ اُس کے بس میں صرف امکانات ہیں اور وہ ان امکانات کے سہارے ہی یہ زندگی گزارتا ہے۔اسی گنجلک احساس کو بیان کرتے ہوئے عبدالرشید رقم طراز ہیں کہ
میں رستے میں بیٹھا ہوں
رستہ ہی منزل ہے‘ منزل جو امکان ہے
او رامکان کافی تسلی نہیں)عبدالرشید:دن کا خیمہ)(۲۶(
سماجی سائنسز میں تاریخ وہ علم ہے جو انسان کی تمام تر کوششوں کو محفوظ کیے ہوئے ہے۔ جدید اردو نظم کے شعرا تاریخی حقایق اور انسانی بازیافت کا گہرا احساس رکھتے ہیں۔اُن تمام نظموں کا احاطہ یہاں ممکن نہیں لیکن مثال کے لیے چند نمائندہ نظموں کے کچھ ٹکڑے یہاں بیان کیے جائیں گے۔ ایسی ہی ایک نظم کی ابتدا میں ڈاکٹر جواز جعفری بندر سے انسان تک کے ارتقائی سفر کا جائزہ لیتے ہیں اور تہذیبی عناصر کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:
ان دنوں
’’شعور‘‘ ابھی دودھ پیتا بچہ تھا
جو ماں کی قحط زدہ چھاتیوں کے بیچ پڑا
اونگھتا رہتا!
ہم نے جنگل سے دور دریا کے ہمسائے میں
اپنے ماضی کی طرف پُشت کر کے
شہر بسائے
آنے والے دنوں کے لیے

آسمانوں سے نئے نسب نامے خریدے
اور پسماندگان سے نفرت کرنا سیکھا

ہم گھڑنے
بنانے میں ماہر ہوئے
اجارہ داریوں کی خاطر
لشکر تشکیل دیے
اور مذہب اور ریاست جیسے کارگر ہتھیار ایجاد کیے!
ہم نے اپنے جنگلی عزیزوں کی
ذہنی پسماندگی کو قائم رکھ کر
اپنے ’’اشرف المخلوقاتی‘‘ اعزاز کا دفاع کیا۔)جواز جعفری: وائلڈ لائف اور تیسری دنیا)(۲۷(

وقت ایسی برتر قوت ہے جو اس کائنات کا نظام چلاتا ہے اور اشیا کے مقام بدلتا رہتا ہے۔ یہی وہ طاقت ہے جو عروج و زوال کو اپنے سینے میں محفوظ کر لیتا ہے۔اور یہی علم تاریخ کہلاتا ہے جو تمام حقائق کا گواہ ہے۔ بہ قول نصیر احمد ناصر:

وقت کے نورانیے میں
تہذیبیں زوال کی سیاہی اوڑھ لیتی ہیں
لیکن اکاس گنگا کے
ان گنت ان بجھ ستارے
لُک چھُپ لُک چھُپ
کھیلتے رہتے ہیں! (نصیر احمد ناصر: ابدی کھیل)(۲۸(

امجد اسلام امجدؔعہدِ حاضر کے ایک ممتاز ادیب ہیں جنھوں نے شاعری کے ساتھ نثری میدان میں بھی اپنی خدمات کا لوہا منوایا ہے۔ اگرچہ ان کی شاعری کا بیش تر حصّہ رومانوی رنگ لیے ہوئے ہے اور محبت کی انھی فضائوں کے بہ دولت وہ نوجوانوں کے پسندیدہ شعرا میں سے ہیں۔ لیکن انھوں نے اپنی ایک طویل نظم ’’ایک انوکھی کہانی‘‘ میں جہاں انسانی زندگی کے ارتقا کے مختلف مراحل پر مختلف سوالات اٹھائے ہیں وہ اپنی خوب صورتی اور دل کشی کے باعث یقینا اس قابل ہیں کہ انھیں اس مقالہ کا حصّہ بنایا جائے۔ نظم کی ابتدا میں وہ معروف انگریز سائنس دان JAMES JOYCE کے کائنات کی وسعت اور انسانی بے توقیری کے نظریے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اربوں‘ کھربوں‘ تاروں اور سیّاروں کی اس
بھیڑ میں رُک کر دیکھ سکیں تو
اپنی زمیں کی ساری وسعت اور پھیلائو
دنیا بھر کے صحرائوں میں پھیلی ریت کا ذرّہ یا
ممکن ہے اس سے بھی کم ہو!
لیکن پھر بھی
اس موہوم سے ذرّے اندر
کیسی کیسی دنیائیں اور کیا کیا منظر بستے ہیں! (امجد اسلام امجد:ایک انوکھی کہانی)(۲۹(

یہیں سے پھر وہ تخیل کے سفر پرآگے بڑھتے ہوئے اس وسیع و عمیق کائنات میں نسلِ انسانی کے مقام اور سورج کی اہمیت کی طرف اس انداز میں اشارہ کرتے ہیں:

دیکھنے والی آنکھیں روز بدل جاتی ہیں‘ منظر بُجھتے رہتے ہیں
لیکن ہر منظر کے اندر اپنا ایک تماشا ہے
دیکھنے والی سب آنکھوں کی اپنی اپنی دنیا ہے!
سورج کی شرطوں پر چلتا یہ جو ہمارا
جلتا بجھتا سیّارا ہے
اب تک کے معلوم جہانوں کی یہ واحد آبادی ہی
آدم کا اور اس کی ساری نسلوں کا گہوارا ہے (امجد اسلام امجد:ایک انوکھی کہانی)(۳۰)

پھر وہ نسلِ انسانی کے مذہب ‘ رنگ‘ نسل اور جغرافیائی بنیادوں پرمختلف گروہوں میں تقسیم ہوجانے پر نوحہ کناں ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں اقوامِ عالم اور دیگر اداروں کا اپنے اپنے مفادات کے تناظر میں اس دنیا کے لیے کیا گیا ہر فیصلہ یقینا سوچ کے در وا کرتا ہے اور خُدا کی ذات پر سوال اُٹھتا ہے کہ وہ ہے تو دُنیا پھر ایسی کیوں ہے؟ لیکن حتمی نتیجہ یہ نکلتا ہے

شاید یہ سب ٹھیک ہو لیکن
دل کہتا ہے
اس سارے سنسار سے اوپر
اور کوئی بھی تو رہتا ہے
جس کے حُکم سے وقت کا دھارا
رُکتا بھی ہے اور بہتا ہے (امجد اسلام امجد:ایک انوکھی کہانی)(۳۱)

اس کے بعد وہ اس سارے تسلسل کو ‘ ان سارے سوالات کو‘ عصری تقاضوں اور ان کے مطابق کیے جانے والے فیصلوں کو ایک کہانی کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔ اس تمثال کا حاصل یہ ہے کہ انسان ہی کائنات کا مرکزی کردار ہے۔ ہر علت و معلول اسی کے گرد‘ سرگرداں ہے۔ انسان ہی وہ ہستی ہے جس کی خاطر دنیا تخلیق کی گئی۔ اگر انسان اور انسانیت قائم رہے تو یہ دنیا بھی قائم رہ سکتی ہے۔ لیکن اس کہانی کے اختتام پر وہ پھر ایک خوب صورت سوال کرتے ہیں کہ کیا یہ واقعی ہی اک کہانی ہے؟ ذرا یہ کہانی ملاحظہ ہو:

مکتب کی دیوار پہ چسپاں کرۂِ ارض کا اک نقشہ تھا
اس نقشے پر بنے ہوئے تھے کتنے ہزاروں شہر اور قصبے
نہریں‘ جھیلیں‘ دریا‘ جنگل
گہرے اور منہ زور سمندر‘ ساحل‘ کوہستان‘
برفوں کی بے پایاں وسعت‘ جلتے ریگستان‘
اک دن اک بچّے نے یونہی
کھیل کھیل میں نقشے والا کاغذ یک دم پھاڑ دیا
اور
اک اک کرکے اس کے اتنے ڈھیروں ٹکڑے کر ڈالے
جن کو اب ترتیب سے واپس جوڑ کے رکھنا ناممکن تھا
ٹیچر نے بچے کو ڈانٹا

جب تک سارے ٹکڑے جوڑ کے نقشے کی ترتیب مطابق نہیں کروگے
تم کو چھُٹّی نہیں ملے گی‘
جائو اس کونے میں بیٹھو
اور یہ سارے پُرزے جوڑو‘
سارا نقشہ پھر سے اس کی اصلی شکل میں واپس لائو!
ٹیچر دل میں سوچ رہا تھا‘
کام بہت مشکل ہے لیکن بچّے کی اصلاح کی خاطر اتنی سختی لازم ہے
لیکن اس کی حیرت کی تو حد نہ رہی جب‘ اُس نے دیکھا
بچہ پانچ منٹ میں سارا نقشہ جوڑ کے لے آیا تھا
ہر شے اپنی اصل جگہ پر ٹھیک طرح سے رکھی تھی
اس نے پوچھا‘
’’تم نے اتنے ڈھیروں ٹکڑے اتنے تھوڑے وقت میں آخر
کیسے جوڑ لیے؟‘‘
بچہ بولا:
’’اس نقشے کے پیچھے ایک انسان کا چہرا بنا ہوا تھا
میں نے جب وہ چہرا جوڑا
دُنیا کے نقشے کے ٹکڑے‘ خود ہی جُڑ کر
اپنی جگہ پر آبیٹھے ہیں۔‘‘
کیا یہ ایک کہانی ہے!! (امجد اسلام امجد:ایک انوکھی کہانی)(۳۲(

یہ کہانی ایک سبق دیتی ہے کہ چیزوں کو جوڑنے کے لیے ہمیں انسانوں کو اور ان کے دلوں کو جوڑنا ہوگا۔ اس کائنات کی خوب صورتی انسانیت کی روح میں پنہاں ہیں۔ وہ انسان آج کے عہد کا ہو یا عہدِ قدیم کا وہ اس سفر میں ایک اہم سیڑھی کی حیثیت رکھتا ہے۔ بدلتے وقت کے تناظرات نے انسان کو بدل دیا ہے‘ اُس کی سوچ کو بدل دیا ہے۔ لیکن پھر بھی ہمیں اُس کے ارتقائی سفر کے نقوش کو بھولنا نہیں چاہیے کیوں کہ

ٹھیک ہے کہ آج تک اس کہکشاں سمیت‘ مختلف دائروں میں
دوروقریب کی اور جانے ان جانے زمانوں کی کئی ایک چیزیں موجود ہیں جیسے
آج بھی جادو پر یقین رکھنے والے لوگ کم تعداد میں نہیں
آج بھی جوتشیوں اور عاملوں پر انحصار کرنے والے لوگ کم تعداد میں نہیں
سمجھی ہی نہیں کہ تم مجھ پر جتنا ظاہر ہونا چاہتی ہو
خود میں اُتنی مستور رہتی ہو
منطق کا اصرار ہے میں مان لونکہ سائنسی طرزِ احساس کے متوازی
تم جیسی ماقبل تاریخ اساطیری خواتین کی کوئی کمی نہیں)اظہر غوری: دائرے)(۳۳(

حسنین بخاری جب انسان کی ماہیت پر غور کرتے ہیں تو اسے جوہروں کا جوہر قرار دیتے ہیں یعنی وہ کائنات کا اصل ہے۔

یہ انسان کیا ہے؟
جواہر کا جوہر ہے
جسمانیت اور روحانیت کے مرکب میں

تحلیل ہو کر سوئے ارتقا بڑھ رہا ہے
ازل سے زمانے کو جس کی ضرورت رہی ہے
ابد تک رہے گی
وہ انسانِ کامل بھی جوہر ہے انسانیت کا
سمٹ جائے جوہر
تو دانہ ہے، خلیہ ہے ، ذرّہ ہے، قطرہ ہے
لیکن۔۔ اگر پھیل جائے
تو سرسبز پودا، بشر، مہرو ساگر
سے کم تر نہیں ہے
ہر اک شے کے جوہر کو
نشوونما کے عوامل عطا کر دو، اسباب دے دو
سبب ہے یہی ارتقائے جہاں کا
اسی سے ہے جاری سفر کارواں کا‘‘(حسنین بخاری: جوہر)(۳۴(

مسئلہ صرف یہ درپیش ہے کہ انسان اپنی حقیقت کو خود ہی نہیں سمجھ پا رہا۔ جس کا حل حسنین بخاری یہ نکالتے ہیں کہ اپنی تاریخ اور سابقہ علم کو راہ نما بنا کر آگے بڑھو۔ وہ انسانی تاریخ ‘ انسان کے ذہنی رویوں اور دماغ میں پنپنے والے احساسات کو کمپیوٹر کی ریم قرار دیتے ہیں اور اسے استعمال کرنے پر اکساتے ہوئے کہتے ہیں:

اگر ذہن انسان کے ریم(Ram) کو
تم کشادہ کرو گے
تو سوچوں کی کرنیں نمودار ہو کر
زمیں آسمان کو منور کر یں گی
سماوی کناروں سے آگے
پر اسرار سب وادیوں کو
معطر کریں گی‘‘ (حسنین بخاری: ترسیل)(۳۵(

انسانی زندگی کے خمیر میں وسوسے ہی وسوسے ہیں۔ اور یہی وسوسے اسے خوف میں مبتلا کرتے ہیں ۔ یہ خوف اس کی زندگی کے مناظر کی ازسرِ نو تخلیق کرتے ہیں۔جیسا کہ سلیم شہزاد کہتے ہیں کہ

قسم ہے وہمی آٹے کی
جووسوسے کے پانی سے گندھا ہے
جس سے خوف کی روٹیاں پکتی ہیں کہ شر اُن کے گھر سے لوٹ جائے
قسم ہے منظرِ دوبارہ کی)سلیم شہزاد: قسم ہے کفارے کی۔۳)(۳۶(

انسان کا ماضی تاریخ کی صورت میں محفوظ ہے۔ یہ تاریخ انسان کی ارتقائی منازل کو بیان کرتی ہیں کہ کس طرح اُس نے فطرت کی نیرنگیوں کو پہچان کر انھیں تسخیر کرنے کی کوشش کی ۔ ان کوششوں کے نقوش آج بھی ماہرینِ آثارِ قدیمہ کے ذوق کی نمو کا باعث بنتے ہیں۔

چلتے چلتے
رستے غاروں کے دھانوں پر رُک جاتے ہیں

کتبوں پہ لکھی تحریریں
اَن دیکھے ماضی کی گواہی دیتی ہیں
اُجڑے شہروں میں آوازیں دینے والے
پاگل ہوکر
اپنے ہی جسموں کی دیواروں سے ٹکراتے ہیں
دور کہیں....روحوں کے پامال نگر میں
گم گشتہ تہذیبوں کے اُس پار
چھنا چھن' چھن چھن
.....خاموشی گونج اُٹھتی ہے! (نصیر احمد ناصر:آرکیالوجی)(۳۷(

ازل سے مقابلہ و مسابقت کا ماحول اس کائنات میں گرم رہا ہے۔ یہ تاریخ حادثات و واقعات سے بھری ہوئی ہے لیکن نصیر احمد ناصر کا خیال ہے کہ

صد ہزار سالوں میں
ایک نور لمحے کا
ٹوٹ کر بکھر جانا
حادثہ تو ہوتا ہے
واقعہ نہیں ہوتا)نصیر احمد ناصر:پانی میں گم خواب)(۳۸(

ان ارتقائی منازل سے ہی انسان کی پہچان ہوتی ہے اور انسان کو مختلف گروہوں اور تہاذیب کی صورت جانا جاتا ہے لیکن اخترحسین جعفری اس پہچان ' اس شناخت کو نا پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اک باغی کا روّیہ اپناتے ہوئے یکسانیت کی تعلیم دیتے ہیں۔

گئے زمانے کے راستے پر
پہاڑ' سورج' زمین' دریا
نقوشِ پا' نام' ذات' چہرہ
میں اپنے چہرے سے منحرف ہوں
گئے زمانوں کے راستے پر
سزا کی رُت کے طویل دن کا خطیر ورثہ مرابدن ہے' مرا لہو ہے
میں اپنے ورثے سے دست کش ہوں
)اختر حسین جعفری:ایک خط۔آشنا ورثوں کے نام)(۳۹(

ارتقا کی یہ منزل انسان کی فطرت سے قربت پر شروع ہوئی اور اُس کی تسخیر پر ختم ہوئی۔ اس کی تاریخ میں جنگل کا دور ' پتھر کا دور اور پھر دھات کا دور آیا۔ انھی ادوار کی داستان اختر حسین جعفری کی زبانی سُنیں:

تانبے جیسے کچھ دن تھے
کچھ لوہے جیسی راتیں تھیں
ناپختہ جسموں کو گھیرے
کیا کیا پختہ دھاتیں تھیں
کچھ شیشے' کچھ عکس منور

کچھ پتھر‘ کچھ عکس خفی)اختر حسین جعفری: تانبے جیسے کچھ دن تھے)(۴۰(

گزرے زمانوں کے نقوش اوراقِ تاریخ پر ثبت ہیں۔ فضائیں اُن گزرے زمانوں کی کہانی سُناتی ہیں جو آنکھ سے تو اوجھل ہیں لیکن احساس سے اوجھل نہیں۔ اسی لیے زاہد ڈارسوالاٹھاتے ہیں کہ

اور اب چپ ہے ہوا چپ ہے زمیں
بول اے وقت! کہاں ہیں وہ لوگ
جن کو وہ یاد ہیں ‘ جن کی یادیں
ان ہوائوں میں پریشان ہیں آج)زاہد ڈار)(۴۱(

ان گزرے زمانوں کے نقوش تو برف زاروں اور ریگ زاروں میں ہیں لیکن زاہد ڈار کا تخیل مستقبل پر نظر رکھے ہوئے ہے اور ان کے خیال میںآئندہ زمانوں کی خبر صرف ہوائوں کو ہے۔

برف اور ریت پہ قدموں کے نشاں
جانے والوں کے نظر آتے ہیں
آنے والوں کے نہیں
آنے والوں کی خبر‘ صرف ہوا لاتی ہے (زاہد ڈار)(۴۲(

زمانے میں دور تلک پھیلے تاریخی حقائق میں شہزاد احمداپنی حقیقت کو تلاشنے کی سعی کرتے ہیں۔ وہ موجودات اور عدم موجودات‘ جو اس کائنات کا حصہ رہیں‘ سے اپنا موازنہ کرتے ہیں توکہتے ہیں:

یہ تو مجھے معلوم نہیں‘ میںکون ہوں؟
آئینہ بھی مجھ کو دیکھ کے دھندلا ہوجاتا ہے
دور تلک تصویروں کے سیلاب دکھائی دیتے ہیں
وہ تصویریں جن کو کبھی دیکھا بھی نہیںتھا
لیکن وہ موجود تو تھیں
موجود تو ہیں! (شہزاد احمد:موت سے مکالمہ)(۴۳(

اور پھر یہ موازنہ تاریخ کے پہلو میں نقاب کشائی کی سعی کرتا ہے تو نئے نئے سوالات جنم لینے لگتے ہیں جیسے فیض یہ سوال کرتے ہیں:

آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے کے تلے
آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گزری ہے؟
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی‘ اجداد پہ کیا گزری ہے؟)فیض احمد فیض:موضوع سخن)(۴۴(

یہ سوال تاریخی تناظر میں کائنات کی حقیقت کو جاننے کی بے چینی کا اظہار ہے۔تاریخی غارت گریوں نے اس زمین کے سینے کو بانجھ کر کے رکھ چھوڑا ہے۔ اس کے باوصف انسان کا سفرِ آگہی بیان کی قدرت نہیں پاتا کہ درد ہی اس کی زندگی کا حاصل ہیں اور وہ ایک لایعنی کہانی کا کردار۔

بانجھ زمیں کے حاملہ ہونے کا امکان نہیں ہے
لیکن میں تو گربھ سے ہوں

اور درد کی شدت سے چلاتا ہوں
پھر ہنس دیتا ہوں
کیوں کہ میری کہانی لایعنی ہے)عبدالرشید:بانس کا جنگل)(۴۵(

نگر نگر گھومتا یہ مسافر زمین کو نئے آہنگ سے دیکھتا ہے۔ وہ نہ تو اس زمین سے تعلق توڑتا ہے نہ ہی خالق سے ۔ وہ ان دونوں کے رشتے میں ربط قائم رکھتے ہوئے اک خواہش کا اظہار یوں کرتا ہے:

اگر یہ گھاس کا ٹکڑا پناہ میری ہے
تو پھر تمھارے سوا کیا پناہ میری ہے
میں چاند گھول کے پیالے میں روز پیتا ہوں
تری زمین کی گدڑی کو روز سیتا ہوں
مگر یہ پھٹتی ہوئی ایڑھیاں سنبھلتی نہیں
لہو گرا ہے جہاں سیڑھیاں نکلتی نہیں
ابد کے شہر میں رکنا اگر ضروری ہو
تو میری سانس ترے آستاں پہ پوری ہو)عامر سہیل:زمین کی حمد)(۴۶(

ہماری اس کائنات میں زندگی زمین کی حدود میں قید ہے اور دوسری قید تقدیر کی ہے۔ ہم ان سے آزادی کیوں کر حاصل کرسکتے ہیں؟ یہ ایک اہم سوال ہے جو ذہن کے دریچوں پر دستک دیتا ہے۔

زندگی! ہم تری دہلیز پہ آبیٹھے ہیں
ہاتھ میں کاسۂ تدبیر ہے
آنکھوں میں کسی موسمِ گل رنگ کی خواہش ہے ' لبوں پر
ترے بے مہر زمانوں کے لیے شکوے ہیں' زندگی ہم تری
دہلیز پہ آبیٹھے ہیں)ایوب خاور: زندگی اور موت کے درمیان ایک نظم)(۴۷(

یہ زمین انسان کو تو اپنے سحر میں گرفتار رکھتی ہے لیکن خو د یہ سورج کے سحر میں قید ہے' جو اسے بھاگنے نہیں دیتا۔اعجاز رضوی زمین سے مخاطب ہو کر اپنے محبوب کا ذکر کرتے ہوئے اسی کشش کی بات کرتے ہیں۔

زمیں تیری طرح ہم بھی کسی سورج کے عاشق ہیں
کسی چندا کے شیدائی
زمیں تیری طرح ہم بھی
بہت کچھ اپنے سینے میں لیے پھرتے ہیں آوارہ
نئے لفظوں کا لشکارا)اعجاز رضوی:ہمیں گمنام رہنا ہے)(۴۸(

سلیم الرحمان اپنے لیے خاک کا رشتہ بنیادی تصور کرتے ہیں کہ ہماری زمین کی ہر شے اسی رشتے میں بندھی ہوئی ہے۔ پھر وہ تصورات میں قدیم تہاذیب کی سیر پر روانہ ہوتے ہیں اور انسان سے اس کی پہچان کا سوال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کون سی تیری علامت؟
کون سا تیرا نشاں
کون سی پہچان تیرے خدوخال؟
کون سی تہذیب؟

کس دن کا عروج؟
کون سا لمحہ ترے دن کا زوال؟)سلیم الرحمان: رشتہ خاک کا)(۴۹(

حسن‘ کائنات کا حاصل بھی ہے اور مطمع بھی اور جہاں تک ہماری زمین کا تعلق ہے تو اس کے حسن کا باعث وجودِ انسانی ہے۔ موت اسے اپنے پنجوں میں جکڑنے کو ہے۔ اور جب کبھی ایسا ہوگا تو ہماری زمین کا حسن جاتا رہے گا اور موت بس آخری زندگی کے ختم ہونے کے انتظار میں ہے۔اسی تناظر کو بیان کرتے ہوئے اختر حسین جعفری رقم طراز ہیں:

زمیں کی یہ قوس جس پہ تو مضطرب کھڑی ہے
یہ راستہ ‘ جس پر میں ترے انتظار میں ہوں
زمیں کی اس قوس پر افق پر قطار اندر قطار لمحات کے پرندے
ہمارے حصے کے سبز پتے سنہری منقار میں لیے جاگتی خلائوں میں
اڑ رہے ہیں
زمیں کی اس قوس پر افق پر ہے‘ نابسرکردہ زندگی کی وہ فصل جس کا
ہمیں ہر اک پیڑ کاٹنا ہے
یہ چاند جس پر قدم ہے تیرا
یہ شہد جس پر زباں ہے میری
یہ سبز لمحے‘ یہ کرمکِ شب اسی گلستاں کے موسمِ ابر کے ثمر ہیں
جہاں ہوائوں کے تیز طوفان منتظر ہیں کہ آخری پیڑ
کب گرے گا)اختر حسین جعفری:آخری پیڑ کب گرے گا)(۵۰(

جس طرح بچّے کسی غبارے میں ہوا بھر کر اُس کا منھ کھول دیتے ہیں تو دبائو کے تحت وہ غبارے فضا میں رقص کرنے لگتے ہیں۔ ان کا رقص کسی خاص سمت میں نہیں ہوتا بل کہ صرف دبائو کے تحت ہوا کو دھکیلتے ہوئے جدھر کو جگہ آئے چل پڑتے ہیں۔ شہزاد احمد اجرامِ فلکی کو ایسے ہی شرارتی بچوں کے غبارے قرار دیتے ہیں‘ جو بے سمت رواں ہیں اور بغیر کسی منزل کے ادراک کے بس چلے جا رہے ہیں۔

زمین ہماری
فلک پہ آوارہ پھرنے والے سبھی ستارے
شریر بچوں کے ہیں غبارے)شہزاد احمد:شریر بچوں کے یہ غبارے)(۵۱(

اُن کے خیال مینبچّوں کے غباروں کی طرح ‘ کہ جو تمام ہوا نکل جانے پر آخر بے دم ہو کر گر جاتے ہیں‘ ہماری یہ آسمانی چھت بھی گرنے کو ہے جس کے نتیجے میں سب کچھ ختم ہوجائے گا ۔

ابھی چھت گرے گی
ابھی بام ودر لڑکھڑائیں گے
اور لڑکھڑاتے ہوئے بیٹھ جائیں گے
پھر آسمانوں تلک گرد اڑائیں گے
پھر پلیٹوں پر رکھی ہوی یہ زمیں
کڑکڑانے لگے گی۔)شہزاد احمد: مٹی جیسے لوگ)(۵۲(

چوں کہ دیگر اجرام کی طرح یہ زمین بھی زوال آمادہ ہے لہٰذا اس کے زوال کا خدشہ بھی ہم میں خوف پیدا کرنے لگتا ہے اور اس خوف کے زیرِ اثر ہم دوسرے سیّاروں پر رہایش بارے سوچنے لگتے ہیں۔

زندگی کی دیوار پر ہم اپنا نام
الٹے حروف سے لکھتے ہیں
اور اپنی گمشدگی پر کانپ جاتے ہیں
زمین ہمیں غیر محفوظ لگتی ہے
تو دوسرے سیّاروں پر رہائش کا سوچنے لگتے ہیں)زاہد امروز: مصنوعی رنگوں کے جسم)(۵۳(

یہ زوال بالآخر ہے کیا؟ یہ زوال موت کی لا ینحل آزمایش کی صورت ہے‘ جسے چاہتے نہ چاہتے ہوئے بھی گلے لگانا ہوگا۔ فیض اس کی عکاسی ایک ایسی دوشیزہ کی حجلۂ عروسی کی داستان سے کرتے ہیں جو عہدِ شباب کی نیرنگیوں سے نا آشنا ہے اور یہ آشنائی نا چاہتے ہوئے بھی کرنا پڑتی ہے‘ لیکن اس کے بعد احساسات کی نئی دنیا کھُلتی ہے جیسے موت کے بعد کی نئی انجانی دُنیا۔

کس طرح آئے گی‘ جس روز قضا آئے گا
شاید اس طرح کہ جس طور کبھی اولِ شب
بے طلب پہلے پہل مرحمتِ بوسۂ لب
جس سے کھلنے لگیں ہر سمت طلسمات کے در)فیض احمد فیض: جس روز قضا آئے گی)(۵۴(

نصیر احمد ناصر اس زندگی کو سائنسی انداز میں بیان کرتے ہیں کہ یہ تو ایک کمپیوٹر کی گھڑی کی صورت ہے جس کا چلنا نہ چلنا برابر ہے اور بس ایک کلک (Click) اس کا خاتمہ کردیتی ہے۔ لیکن یہاں یہ بھی یاد رہے کہ خاتمہ اس کا صرف سکرین سے ہوتا ہے اور پیچھے کہیں کمپیوٹر سافٹ وئیر کی گہرائیوں میں یہ مدام چلتی رہتی ہے۔بالکل اسی طرح وہ زندگی کو بھی سمجھتے ہیں جو شاید ہمیں ختم ہوتی دکھائی دیتی ہے لیکن وہ کہیں اور کسی اور صورت میں متمکن اور جلوہ گر ہوتی ہے لیکن ہم اس کا احساس و ادراک نہیں رکھتے۔

زندگی ایک معمولی کمپیوٹر ڈسک میں محفوظ‘
رسٹ واچ چلتی رہے یا رک جائے
سب کچھ فقط ایک کلک (Click) کے ساتھ
شروع ہوتا ہے اور ختم ہوجاتا ہے !!(نصیر احمد ناصر:بے آغاز راستوں کا سفر)(۵۵(

زاہد ڈار زندگی کو آخری راستا قرار دیتے ہیں اور موت سے اس کی ہم کناری کو تاریکی کی اتھاہ گہرائیوں کی صورت دیکھتے ہیں جس میں ہر شے مستورہوجاتی ہے۔

یہ زندگی کا آخری راستہ ہے
اس کے بعد تاریکی ہے اور پھر موت)زاہد ڈار)(۵۶(

اور زندگی کے یہ تمام راستے ایک ہی منزل کی طرف بڑھتے ہیں جو کہ موت کہلاتی ہے۔ جو ایک ازلی حقیقت کا درجہ رکھتی ہے۔یہ آخری مرحلہ ہے چاہے کوئی اُسے آج طے کرے یا کچھ وقت کے بعد۔

زندگی کے تمام راستے

موت کی طرف جاتے ہیں
ایک دن پہلے
یا ایک دن بعد کیا (زاہد ڈار)(۵۷)

فرار کا راستا ‘ کبھی بھی موت سے دور نہیں لے جا سکتا کیوں کہ موت کبھی پیچھا نہیں چھوڑتی۔ زندگی کی معنویت کے ساتھ ہی جکڑ لینے کے لیے یہ اُس کے تعاقب میں چل پڑتی ہے۔تعاقب کا یہ سلسلہ آخری لمحے تک جاری رہتا ہے جب ہر رشتہ ہر رنگ ہر جذبہ ہر شے اپنی موت آپ مر جاتا ہے اور ہم پلٹ کر تکنے کے قابل بھی نہیں رہتے۔ اسی لمحے کو شہزاد احمد یوں بیان کرتے ہیں:

موت نے اب بھی تعاقب نہیں چھوڑا میرا
جس طرف جاتا ہوں‘ وہ ساتھ چلی آتی ہے
جب بھی چلتا ہوں‘ کسی اور کے چلنے کی صدا آتی ہے
میں پلٹ کر نہیں تکتا کہ مرے ساتھ ہے کون؟
مجھے معلوم ہے سایے کی طرح موت مری تاک میںہے (شہزاد احمد:آج تک)(۵۸)

لیکن دوسری طرف ڈاکٹر جواز جعفری موت کو ایک محبوب کے طور پر لیتے ہیں۔ ایک ایسا محبوب جس نے کسی بھی لمحہ زندگی کا ساتھ نہ چھوڑا۔ زندگی تو آخر ایک دن ساتھ چھوڑ جاتی ہے لیکن موت ہمیشہ ساتھ نبھانے والی ہے۔ اسی تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

تمھیں ملنے کے بعد
موت سے مجھے ڈر نہیں لگتا
میں اسے پہلے سے کہیں بہتر طور پر جاننے لگا ہوں
موت ہر لمحہ زندگی کی طرح میرے ساتھ ہے
وہ مرے اندر بھی ہے اور باہر بھی
میں اپنے جنم دن سے
موت کے سفر پر روانہ ہوا
موت میری سچّی دوست ہے
وہ زندگی کی طرح بے وفا نہیں
تم میری موت پر آزردہ مت ہونا (جواز جعفری: تم میری موت پر آزردہ مت ہونا)(۵۹)

چوں کہ موت تسلسل کا نام ہے۔ ہر فرد‘ اولاد کی طلب اس لیے کرتا ہے کہ وہ اپنے نام کو اور خود کو اولاد کی صورت میں زندہ رکھنے کا خواہاں ہے لیکن سلیم الرحمان کے ہاں اس سے تضادی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے کیوں کہ وہ اپنے اجداد کی ہڈیوں میں زندہ رہنے کے آرزومند نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک آسمانی صحائف بھی مردہ نسلوں کی قبروں پر مٹتی تختیاں لکھتے ہیں ۔ اسی لیے وہ ایک باغیانہ روش اختیار کرتے ہیں اور ماضی کی پس ماندگی اور فرسودہ نظریات کی وراثت کو اپنانے سے انکار کرتے ہیں۔

میرے لیے معجزے اور پرانی کتابوں میں لکھی ہوئی ساری سچائیاں
مردہ نسلوں کی تاریک قبروں پہ مٹتی ہوئی تختیاں ہیں
مجھے اپنے اجداد کی ہڈیوں میں کبھی زندہ ہونے کی خواہش نہیں ہے
مجھے اتنا معلوم ہے

میرے اور موت کے درمیاں سانس کا ایک لمحہ ہے
اور عمر کا ایک جھونکا
مرے واسطے زندہ رہنے کا کوئی بہانہ نہیں ہے)سلیم الرحمان:ایک کتبہ)(۶۰(

اسی طرح وہ نئی زندگی کی خواہش کرتے ہیں جہاں ان پرانے لگے بندھے اصولوں سے انحراف کی صورت سامنے آتی ہے۔ وہ شب و روز کے تسلسل کو توڑنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ ان کے ذہن میں جسم کی آزادی کی طلب اور سانس اور تمام تر حسیات سے ماورا ہونے کا خیال بھی جنم لیتا ہے۔

آئو اس دن کو آغاز اور انجام کی زنجیر سے آزاد کریں
آئو اپنے جسموں کو حسیاتی جغرافیے کی
سرحدوں سے باہر لے جائیں
ہوا میں اڑتے ہوئے لمحے کے لفظوں کو چھو لیں
اپنے خیالات کے عکسوں کو دیکھ لیں)سلیم الرحمان:ایک دن میں زندگی)(۶۱(

زندگی اور موت کا چکر چلتا رہتا ہے ۔ وقت کا پہیہ گھومتا رہتا ہے اور اس سے آزادی پالینا ہی در حقیقت ابدیت کو پا لیناہے۔اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نصیر احمد ناصر کہتے ہیں:

موت کے کنویں میں چکر کاٹتے ہوئے
اُس نے زندگی کی لکیر پارکرلی تھی

اور شاید یہیں سے
وہ طویل رات شروع ہوتی ہے
جو نیندوں، رتجگوں اور خوابوں کو
روندتی ہوئی
سمندروں اور زمینوں کو سرایت کرتی ہوئی
ایک ابدی پھیلائو سے جاملی ہے! (نصیر احمد ناصر:رات میری سمجھ میں کبھی نہیں آسکی)(۶۲(

شہزاد احمد کو ہر شے سراب محسوس ہوتی ہے۔ کیوں کہ زندگی عناصر کی ترتیب کا نام اور موت ان کے بکھرائو کا نام ہے اور ہمارے وجود کے یہ ذرّات بکھرنے کو بے تاب ہیں تا کہ وہ اس سرابی کیفیت سے نکل کر حقیقت کا ادراک کر سکیں مگر عجیب عالم ہے کہ ہماری تمنائیں تشنہ رہتی ہیں اور ہم پھر بھی اسی سراب میں گم رہنا پسند کرتے ہیں۔

میرے ذرّے بھی بکھرنے کے لیے ہیںبے تاب
میرے دل میں ہیں ہزاروں گرداب
جس طرف آنکھ اٹھائوں نظر آتے ہیں سراب
اور اس پر یہ تمنا کا عذاب! (شہزاد احمد: گردشیں اتنی زیادہ کیوں ہیں)(۶۳(

ڈاکٹر جواز جعفری بھی زندگی کی اس سرابی کیفیت اور موت کی حقیقت کو اسی طرح سمجھتے ہیں۔ اسی لیے ان کے نزدیک موت کوئی حادثہ نہیں بل کہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے فرار کسی صورت ممکن نہیں ۔ اسی لیے ان کے ہاں اسے قبول کرنے کا انداز بھی کسی دُکھ کی سطح سے ماورا ہے۔اس ماورایت کی وجہ یہ ہے کہ وہ موت کو فنا نہیں بل کہ انتقال

سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی تسلسل کا نام ہے۔ اور ایک کے بعد دوسرے زندگی اور ایک کے بعد دوسری کائنات کی طرف سفر ہی حقیقی حاصل ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

میں زندگی کے سفر پر رواں دواں ہوں
موت میرے تعاقب میں ہے
ایک روز میرے قدم بالآخر تھم جائیں گے
اور موت
مجھے فتح کرکے آگے بڑھ جائے گی!
مجھے جب بُلاوا آئے گا
تو میں تمھارے پاس ٹھہر نہیں پائوں گا
تم میری موت پہ آزردہ مت ہونا
میں مرنے کے بعد بھی یہیں رہوں گا
تمھارے چاروں طرف اور تمھارے قدموں کے نیچے
لوگ مجھے مرتا دیکھ کر روتے ہیں
میں موت پر ہنسنے کا ہنر جانتا ہوں
میں زندگی کی تلاش میں مر رہا ہوں۔ (جواز جعفری: میں زندگی کی تلاش میں مر رہا ہوں)(۶۴)

جدید اردو نظم کے شعرا نے کائنات اور اس کے لوازمات کو نفسیاتی اور جمالیاتی سطح پر بھی پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ عبدالرشید کے ہاں عمر کے ساتھ در آنے والی تبدیلیوں کا نفسیاتی اظہار دیکھیے:

نیند تھی ہمسائیگی کا تپ نہیں تھا
اپنے گرتے بال ماتھے سے ہٹائوں
آئینے کو دیکھ کر تسکین لوں
بیس کی اور تیس کی عمروں کا کتنا فرق ہے (عبدالرشید:سورج کی جڑیں)(۶۵)

افضال احمد سیّد ‘ کائنات کو سمجھنے کے لیے جب خود پر تفکر کرتے ہیں اور اپنی تلاش کے اس سفر میں وہ اپنے تخیّل کی پرواز کی بہ دولت اپنے ماضی سے ہم کنار ہوتے ہیں اور یہ ہم کناری انھیں ماضی کی گلیوں میں لے جاتی ہے جہاں انھیں اپنا پرانا روپ دکھائی دیتا ہے۔

جب بادل کو آسمان پر
اور پنیریوں کو کھیتوں پر پھیلانے کا وقت تھا
میں اپنی تنہائی کو ہتھوڑے سے کوٹ رہا ہوں گا
جب بادل کو کھیتوں پر
اور پرندوں کو خوشوں پر آنے سے روکنے کا موسم رہا ہوگا
میں اپنی تنہائی کو
چاک پر چڑھا کر ایک خوب صورت پیالہ بنا رہا ہوں گا
میرے دوستوں نے اپنے ہاتھ دیواروں میں بو دیے ہوں گے
اور ساحل پر پڑی ہوئی کشتیوں کے پیندے میں اپنے سر
اور سورج کو ڈوبتا دیکھ کر

سڑی ہوئی مچھلی کی طرح پگھل جاتے رہے ہوں گے
انھوں نے بھی زمین کا چقماق جلا کر
شعلے نہیں کاشت کیے)افضال احمد سید:تل زعتر سے نشیب)(۶۶(

فضائوں کا سفر بھی اپنی معنویت میں ایک دل کش تجربہ ہے ۔ یہ تخیلاتی سفر بھی افضال احمد سید کی حسِ جمال کو رگیدتا ہوا نکلتا ہے اور وہ اس کے جمالی تجربے کا اجمالی بیان کچھ یوں کرتے ہیں:

میں نے سمندر سے اس دریا کو الگ کرنا چاہا
جو میری بانہوں میں بہتا تھا
تو مجھے الوداع کہنے والے روٹھ کر چلے گئے
اور ڈوبی ہوئی آواز وں میں مجھے دیکھنے کا شوق ختم ہوگیا
میں نے وحشی بگولوں کی سرزمین میں
دہکتے ہوئے فرش پر
بگولوں سے جنگ کی اور ہوا کو آزاد کرایا
ہوا میرے ساتھ چلنا چاہتی تھی
مگر میرے پائوں کوئلہ ہو چکے تھے)افضال احمد سید:گھاس سے ہریالی کاٹنے کے بعد)(۶۷(

اس نظم میں سمندر کائنات اور دریا انسان ہے ‘ اُس کی رگوں میں دوڑتی ہوئی زندگی ہے وہ زندگی جو تکالیف و آلام کے بگولوں سے بھری اس دُنیا کا مقدّر ہے۔ یہ آلام ‘ ذات سے کائنات کو محیط ہیں۔ یہ داستانِ سفر ہے لیکن سفر تو ہر شے کرتی ہے ‘ ہر کرب سہنے والا اور کرب دینے وال بھی تو سفر آشنا ہی ہے۔ اور یہی اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔

حالانکہ سفر تو انگلی میں چبھ جانے والی
سوئی کی نوک کا بھی ہوتا ہے
اور اس آنکھ کا بھی
جو اسے دل میں جاتا ہوا دیکھتی ہے)افضال احمد سید:اگر کوئی پوچھے)(۶۸(

سامی مذاہب کے مطابق بھی انسانِ اولین کی جمالیاتی تسکین کے لیے رب نے عورت کو خلق کیا۔ اسی تسکین کا احساس جدید اردو نظم کا شاعر کائناتی عناصر سے بھی چاہتا ہے۔ وہ ستارے ہوں یا سیّارے‘ دریا ہوں یا سمندر‘ شاعر ان سے ایک انوکھے موتی‘ ایک انوکھی خوشی کا طالب ہے۔ بہ قول احمد صغیر صدیقی:

بہت دن ہوئے
مجھ کو دھونی رمائے
کنارے پہ لکھی ہوئی ریت پر
نقشِ تخلیق لکھتے
لبوں پر
حروفِ تمنّا سجائے
ریاضت کی حُرمت کی تصدیق کرنے
ستارہ شبِ دیدۂ تر سے نکلے
کوئی جل پری

اب سمندر سے نکلے   )احمد صغیر صدیقی: کُن)(۶۹(
رفعت و بلندی کے وہ مقاماتِ جلیلہ جن پر آج انسان متمکن ہے‘ اُس کی ریاضت سے مملو ہیں۔ کائناتی سیڑھی پر ایک قدم آگے بڑھنے کے لیے اور اس کے نئے پہلو دریافت کرنے کے لیے انسان نے ہمیشہ کسی پُرانے کلیشے کو توڑ کر آگے کی طرف ایک جست بھری ہے۔ ہر دن کے بعد شام جہاں اندھیرا لاتی ہے وہیں یہ تخلیق اور بارآوری کے لیے پانی کا نیا نشیمن بھی وا کرتی ہے اور روح و جسم کا سفر ایک منزل اور آگے بڑھ جاتا ہے۔ اختر حسین جعفری کے ہاں اس کا بیانیہ ملاحظہ ہو:

بے سبب خوف کی سلطنت سے پرے شام کے برتنوں میں ہے پانی نیا
آسمانوں پہ شاداب چہرے کی ضو‘ خاک پر سبز بادل کی پرچھائیاں
روح گزری ہے کس نیلگوں درد سے‘ جسم اُترا ہے کس منزلِ عُمر سے
گرم ماتھے سے شہتیر ٹکرا گیا‘ ایڑیوں سے چمٹنے لگیں سیڑھیاں
)اختر حسین جعفری: خاک پر سبز بادل کی پرچھائیاں)(۷۰(

زاہد امروز کائناتی مظاہر میں روح کی ابدیت کے قائل نظر آتے ہیں۔ یہ روح جو بے انت آسمان کی صورت ہے۔ اسی کی پاکیزگی نروان کہلوائی لیکن اس نے وجود کا سارا رس نچوڑ لیا۔

ہوا روح کے آسماں پر تنے
سرخ سیبوں کے پودے ہلاتی ہے
سیبوں کی جوڑی مجھے دیکھ کر مسکراتی ہے
گہری اداسی کے پھل میرے نروان میں جھولتے ہیں
وہ ان کا رسیلا لہو چوس لیتی ہے   )زاہد امروز: میں اسے خشک کپڑے پہننے سے پہلے ملوں)(۷۱(

مجید امجد کے خیال میں حال ہی وہ مست کردینے والی شراب ہے جو موجودات کے ہر پہلو سے چھلکتی ہے۔ انھی موجودات میں دوڑتی زندگی کا دل کش پیرایۂ اظہار ان کے ہاں یوں ہوتا ہے:

یہ صہبائے امروز‘ جو صبح کی شاہزادی کی مست انکھڑیوں سے ٹپک کر
بدروِ حیات آگئی ہے‘ یہ ننھی سی چڑیاں جو چھت میں چہکنے لگی ہیں
ہوا کا یہ جھونکا جو میرے دریچے میں تلسی کی ٹہنی کو لرزاگیا ہے
پڑوسن کے آنگن میں‘ پانی کے نلکے پہ یہ چوڑیاں جو چھنکنے لگی ہیں
یہ دنیائے امروز میری ہے‘ میرے دل زار کی دھڑکنوں کی امیں ہے
یہ اشکوں سے شاداب دو چار صبحیں‘ یہ آہوں سے معمور دو چار شامیں
انھی چلمنوں سے مجھے دیکھنا ہے وہ جو کچھ کہ نظروں کی زد میں نہیں ہے
)مجید امجد:امروز)(۷۲(

جمالیاتی سطح پر انسان عورت کے قرب سے ہی ذات کی تکمیل کی طرف رواں ہوتا ہے۔ جلتے بجھتے ستارے‘ لہلہاتے باغات اور کھنکتے دریائوں کی مدھر آوا ز اس کے وجود کے بغیر بے معنی ہے۔اسی لیے زاہد ڈار لکھتے ہیں:

دنیا کے فنون کی دل کشی اور خوب صورتی

ایک عورت سے ہے
اگر وہ عورت نہ ہو
تو آج کا دن کچھ بھی نہیں
ماضی اور مستقبل کچھ بھی نہیں

تو سورج اور ستارے چمکتے رہیں یا بجھ جائیں
دریا بہتے رہیں یا رک جائیں
پہاڑ کھڑے رہیں یا دھواں بن کر اڑ جائیں
جنگل اور باغ لہلہاتے رہیں یا جل کر راکھ ہوجائیں
میرے لیے سب برابر ہے (زاہد ڈار)(۷۳)

کائنات کی ہمہ جہتی بھی ایک عجیب بے یقینی ہے۔ کل کیا تھا اور کل کیا ہوگا' یہ سمجھ و فہم سے بالاتر سہی لیکن حال تو اپنا ہے اور بہ قول شاہین مفتی اسے سمیٹ لینا ہی اصل زندگی ہے۔

یہی ایک پل ہے نشاط کا
اسی ایک پل کو سمیٹ لے' گلِ نیلمیں' گلِ نیلمیں
کسے کیا خبر' کسے کیا پتا کہ کتابِ وقت میں پھر کہیں
کوئی ایسی صبح حسین نہ ہو
کوئی خواب زیرِ زمیں نہ ہو
یہ مکاں نہ ہو یہ مکیں نہ ہو
کہیں کوئی حرفِ یقیں نہ ہو
یہی ایک لمحہ حیات کا
یہی ایک پل ہے ثبات کا
اسی ایک پل کو سمیٹ لے' گلِ نیلمیں گلِ نیلمیں (شاہین مفتی: گلِ نیلمیں)(۷۴)

زمانہ حال کی یہ سر خوشی جمالِ حقیقی ہے کہ یہ وقت کے اُس بندھن سے آزاد ہے جس کا تعلق ماضی و مستقبل سے ہے۔ یہ لمحۂ موجود ہی صرف حقیقت ہے کہ یہ ہمیں وقت کے احساس سے ماورا کردیتا ہے۔

تم آنسوئوں سے مسکراسکتی ہو جو چہرے کو شوبھا ہے
لبھاسکتی ہو کیوں کہ ہجر میں جو درد ہے اور اس میں
پوشیدہ جمال' اس آئینے میں قید ایسی سرخوشی
جو وقت کے تابع نہیں (عبدالرشید:دوسری نظم 2)(۷۵)

احساسات و ادراک میں موجود دنیا ہی انسانی تجربات کا حاصل ہے کہ اسے پرکھا جا سکتا ہے اور بہ قول اعجاز رضوی جب ہم اسے پرکھنے لگتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ

بات ہے گزرے وقتوں کی جب
آسماں پر ستارے زمیں پر بشر تھے
رفتہ رفتہ زمانہ بدلنے لگا
آسماں سے ستارے زمیں سے بشر
اور بشر سے بشر دور رہنے لگا (اعجاز رضوی: کل اور آج)(۷۶)

تَن خواہشات کا پروردہ ہے مگر صرف خواہشات کبھی منزل تک نہیں پہنچاتیں کہ سب کچھ سراب ہے یہاں۔

’’گنوسب حسرتیں جو خوں ہوئی ہیں تن کے مقتل میں
صنم دکھلائیں گے راہِ خُدا ایسے نہیں ہوتا
جو تُم کہتے ہو سب کچھ ہوچکا ایسے نہیں ہوتا‘‘ (اشفاق حسین: ایسے نہیں ہوتا)(۷۷(

مادہ پرستی کے اس عہد نے انسان سے انسانیت چھین لی ہے۔ آج وہ جان وروں کے برابر‘ بل کہ اپنی ہوسِ زر اور ہوسِ اقتدار میں دیگر جان وروں سے بھی نیچ ہو چکا ہے۔

آٹے کی چکی کی بستیوں میں
مجھے آدمیوں سے خوف آتاہوگا
میں اس گھاٹ پر نہاتا ہوں
جہاں جان ور نہاتے ہیں)افضال احمد سید:تل زعتر سے نشیب)(۷۸(

وجودِ انسانی کی حقیقت تو ہوا (روح) ہے۔ زندگی اُس کے ہونے سے ہے۔ وہ ہے تو زندگی بھی ہے وہ نہیں تو زندگی بھی نہیں‌ہم سب لوگ جو مختلف جسم رکھتے ہیں ‘ وہ‘ محض دھوکا ہے۔

یہ ہوا کا کھیل ہے
میں بھی نہیں ‘ تو بھی نہیں ہے

میں بھی ہوں‘ تو بھی جہاں ہے
اس جگہ کوئی نہیں
میں بھی نہیں تو بھی نہیں...... (سلیم الرحمان:سانس کی لکیریں)(۷۹(

اختر حسین جعفری کے نزدیک اس کائنات کی پہنائی ‘ انسان سے شکست کھا چکی ہے۔ اب انسان ایک فتح مند کی طرح اپنی فتح کے ڈونگرے بجاتا پھرتا ہے اور اس دنیا کے نظام کو بے فکری سے تہہ و بالا کرنے پر آمادہ ہے۔

قفسِ زنداں کھلا شکست کے بعد
دل سے ہونے لگا رہا کیا کچھ
جذبِ خود سر بھی دردِ باطل بھی
اشکِ معتوب‘ آبِ قاتل بھی
اب ہ وحشی عناں گستہ ہے
عمر بھر جس نے تیز پنجوں سے
قبر کھولی شبِ تاسف میں
اب وہ قاتل پھرے گا بے زنجیر
اب وہ پانی بہے گا بے تعزیر
شہر والو! نہ در کھلے رکھنا)اختر حسین جعفری:قفلِ زنداں کھلا)(۸۰(

توانائی ہی دراصل زندگی ہے۔ سورج میں جب تک حرارت ہے ‘ توانائی ہے ‘ اُس کی زندگی موجود ہے۔ اسی طرح وجودِ انسانی میں بھی حرارت کی توانائی اور زندگی موجود ہے کیوں کہ توانائی کے بغیر نہ مادہ ہوتا ہے نہ ہی زندگی۔زاہد ڈار اس توانائی کو آگ سے تعبیر کرتے ہیں۔

میں بھی ایک انسان ہوں
میرے لیے آگ ہے
سورج بھی اکیلا ہے
آسمان کا ہر ستارہ
بے بس، اکیلا ہے
بنجر اور ویران ہے
پانی کے بغیر
گھاس نہیں اگتی
محبت کے بغیر
پھول نہیں کھلتے
میرے لیے حیرت اور اذیت ہے)زاہد ڈار()۸۱(

زاہد ڈار کہتے ہیں کہہر چیز کا اختتام یقینی ہے۔ جب اختتام کی پابندی عاید ہے تو پھر شوروغوغا بے معنی سی بات ہے

سب انسان مر جائیں گے
یہ دنیا ایک دن ختم ہوجائے گی
لوگ اتنا زیادہ شور کیوں مچاتے ہیں؟)زاہد ڈار()۸۲(

اب تک کی دریافت شُدہ کائنات میں ایک انسان ہی باشعور فرد ہے۔ لیکن اس عمیق کائنات اور اس کے عناصر کے سامنے اس کی یہ تنہائی اسے ہر شے سے متنفر اور خوف زدہ بھی کرتی ہے۔ سورج بھی اُسے اذیت دیتا ہے کہ میرا مسکن تم سے زیادہ وسیع ہے تو انسان یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ اُس کا اپنا مسکن کہاں ہے۔

میں اکیلا ہوں
پرندے اور ستارے کہاں ہیں؟
سورج بھی مجھے اذیت دینے کے لیے نکلتا ہے
نیچے زمین پھیلی ہے
اوپر آسمان چھایا ہے
لوگ ایک دوسرے کے پیچھے چھپ جاتے ہیں
میں سب کے سامنے برہنہ کھڑا ہوں
میرا مکان کہاں ہے؟

کائنات کی بے پناہ وسعتوں میں
مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا)زاہد ڈار()۸۳(

اساطیر اور مذاہب کہتے ہیں کہ انسان خُدا کی تخلیق ہے۔ تو کیا تخلیق ہونا بے کار ہے؟ صرف خالق ہونا ہی سب کُچھ ہے؟ ایسا نہیں ہے بل کہ ہرمخلوق اپنی انفرادیت رکھتی ہے۔ وہ بے مایہ نہیں بل کہ خالق اس لیے اہم ہے کہ اُس کی تخلیقات موجود ہیں۔ جیسے ایک ادیب اگر ادب پارے تخلیق کرتا ہے تو ہی مانا جاتا ہے۔ ایک مصوّر اگر تصویر بناتا ہے تو ہی مصوّر کی قدر کی جاتی ہے۔ انسان بھی حقیر ذرّہ سہی لیکن بے معنی نہیں کہ بادل بلندیوں پر جا کر بھی برسنے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہوتا۔ خلق کی بھی اپنی صلاحیتیں قائم رہتی ہیں۔

بشر ہونے کا یہ مطلب نہیں‘ ہم کچھ نہینہیں
کوئی تخلیق اپنے آپ سے منکر نہیں ہوتی
کوئی ذرّہ‘ کبھی کہتا نہیں ‘ معدوم ہوں میں
جو بادل آسماں کی وسعتوں سے لوٹتا ہے
کیا برسنے کے کبھی قابل نہیں رہتا ؟)شہزاد احمد:بشر ہونے کا مطلب)(۸۴(

آخر مخلوق اور خالق کا یہ تعلق کیا ہے؟ خالق ‘ مخلوق سے اور مخلوق خالق سے ہی اپنی اپنی پہچان پاتے ہیں۔ اگر خالق نہ ہو تو مخلوق نہیں ہوتی اور مخلوق نہ ہو تو خالق نہیں ہوتا۔ شہزاد احمد خود اس سوال کے جواب کے لیے سرگرداں ہینکہ وہ خالق ہیں یا مخلوق؟

تم کہتے ہو!میں
خود اپنی آگ میں جلنے والا اک پتّا ہوں
لیکن ہر اک پتّے کا کوئی درخت تو ہوتا ہے!
مجھے بتائو۔۔ میرا درخت کہاں ہے؟
یا پھر مجھ کو پتّا ہونے کا الزام نہ دو! (شہزاد احمد:میں کس دنیا میں رہتا ہوں)(۸۵(

شہزاد احمد کے دماغ میں پھر یہ سوال گونجنے لگتا ہے کہ

کوئی مجھ کو بتائے
کون ہوں میں اور کہاں ہوں؟)شہزد احمد:کوئی مجھ کو بتائے)(۸۶(

تو پھر اُنھیں اپنے اندر سے آواز سُنائی دیتی ہے کہ

ایک ذرّہ ہوں
مگر رازِ دروں جاننے کی خواہش ہے
وسعتِ کون و مکاں جاننے کی خواہش ہے)شہزاد احمد:گردشیں اتنی زیادہ کیوں ہیں)(۸۷(

کائنات پر تفکر اُنھیں یہ بتاتا ہے کہ کائنات کی ہر شے متحرک ہے۔ زندگی ‘ سفر اور موت اس کا حصّہ ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر تو کائنات کی تمام اکائیاں ایک ہی جیسی ہیں۔ ان میں کوئی فرق نہیں کیوں کہ انسان خود بھی تو اسی تحرک سے گزر رہا ہے۔

گردشیں جتنی ہیں زنجیریں ہیں
اور ہر سمت نظر آتی ہیں یہ زنجیریں
ایک زنجیر تو میں خود بھی ہوں!
میرے اندر
گردشیں اتنی زیادہ ہیں
کہ خود مجھ کو بھی اندازہ نہیں
میں کہ بکھرا ہوا شیرازہ نہیں
پھر بھی میں خود کو اکائی تو نہیں کہہ سکتا)شہزاد احمد:گردشیں اتنی زیادہ کیوں ہیں)(۸۸(

یہ کائنات تو سلسلوں کے ایک تسلسل کا نام ہے۔ ہم اور ہمارا مسکن بھی اس سلسلے کی کڑیوں میں سے ایک چھوٹی سی کڑی ہے تو پھر اتنی وسیع کائنات کے سامنے ہمیں خود کو

ہی متاعِ کل نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس کائنات کی گہرائیاں او ر اصول و ضوابط بھی تو ابھی تک ہمارے ادراک سے ماورا ہیں۔

عجب اک سلسلہ ہے
سلسلہ در سلسلہ ہے
اور ہم چھوٹے سے سیارے میں بیٹھے ہیں
سمجھتے ہیں کہ ان پہنائیوں کا مدعا ہم ہیں
مگر ان وسعتوں کے سحر سے نا آشنا ہم ہیں
)شہزاد احمد: کہاں تک ساتھ دے سکتی ہیں آنکھیں)(۸۹(

اس سوچ کے پیدا ہوتے ہی شاعر کائنات کی رنگینیوں کو تلاش کرنا چاہتا ہے۔ اُسے مٹّی کی جکڑن بُری محسوس ہونے لگتی ہے اور یہ آدمِ خاکی ' خاک سے اپنے رشتے توڑ کر نئی دنیائوں کا طلب گار ہونے لگتا ہے۔

مگر یہ خاک کا پتلا' یہ آدم
صرف اپنے ذہن میں رہتا ہے
مٹّی میں نہیں رہتا
زمین سے اس کا رشتہ
رفتہ رفتہ کٹتا جاتا ہے)شہزاد احمد:گھٹا کھُل کر برسنا چاہتی تھی)(۹۰(

اسی طلب کا اظہار ہمیں ڈاکٹر جواز جعفری کے ہاں بھی دکھائی دیتا ہے کہ وہ ان حدود کو توڑ کر باہر کی دنیا کی طرف جانا چاہتے ہیں اور یہ محسوس کرتے ہیں کہ شاید زندگی وہاں ان کی منتظر ہے۔

یہیں کہیں میری زمین کے ہم سائے میں
مجھے ایک پوشیدہ رستے کی تلاش ہے
جو کسی اَن دیکھی دنیا کی
نقاب کشائی کے لیے
میرا منتظر ہے)جواز جعفری: کسی اور مٹّی کا خواب)(۹۱(

پھر اس سوچ کا حامل' جو جدید انسان ہے' اپنے تخیل اور گمان کے گھوڑے دوڑاتا ہے۔ اپنی عقل کے بل بوتے پر اُس کا ہر خیال حقیقت کا روپ دھارنے لگتا ہے۔ وہ آسمانوں پر تھگلی لگاتا ہے اور گہرے پانیوں کو پایاب اور گھور فضائوں کو تسخیر کر لینے کو ہے کہ اُس کا تخیل اُس کی سب سے بڑی طاقت ہے۔نذر محمد راشد اس کو یوں بیان کرتے ہیں:

نئے آدمی کے گماں بھی یقیں
گماں جن کا پایاں نہیں---
گمانوں میں دانش
برہنہ درختو ں میں بادِ نسیم
برہنہ درختوں کا دل چیرتی---)ن م راشد:نیا آدمی)(۹۲(

جب بھی انسان نے کائنات پر غور کیا تو اُسے کسی نہ کسی صورت خدا کے وجود پر بھی غور کرنا پڑا ہے۔ تمام علوم چاہے ان کا تعلق سائنس سے ہو یا عمرانیات سے' فلسفہ ہو یا اساطیر کا میدان' جمالیات ہو یا علم الانسان' الغرض کسی بھی علم میں وہ خدا کی ذات کے

مباحث سے جان نہ چھڑا سکا۔ پہلا احساس ہمیشہ یہ سامنے رہا کہ آخر خدا کیا ہے اور اس کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی ہے؟ ہر مذہب کے پیروکار اپنے لیے خدا کا چنائو کرتے ہیں۔ فلسفہ کہتا ہے کہ خدا اور مذہب کا تصور در اصل انسان کو اخلاقی گم راہی سے بچا کر انسانی توانائیوں کو معاشرے کی بہبود کے لیے استعمال کرنے کی وجہ سے سامنے آیا۔ خدا کا سوال ہر عہد ، ہر تہذیب اور ہر علم کا بنیادی سوال رہا ہے۔ اسی لیے خدائی مباحث ہمیں سماجی سائنسز میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ان نظریات کا کچھ شعری اظہاریہاں پیش کرنے کی سعی کی جائے گی۔ ہر انسان اپنے لیے کسی نہ کسی صورت اپنی ضروریاتِ زندگی کی بجا آوری کی کوشش کرتا ہے۔ افضال احمد سیّد بھی ایک نظم میں خدا کو زیرِ بحث لاتے ہوئے اسے ضروری خیال کرتے ہیں اور اس انتہائی ضرورت کی تکمیل کے لیے قسطوں پر خریدا ہوا خدا ہی اُن کا حاصل ٹھہرتا ہے۔قسطوں پر اپنی ضرورت کی اشیا خریدنا ایک سماجی پہلو ہے اور یہ نظم سماج میں بقا کے لیے خدا کو بھی ضروریات میں شمار کرنے کا اظہار ہے۔

دعا مانگنے کے لیے آدمی کے پاس ایک خدا کا ہونا ضروری ہے
جو لوگ دوسروں کے خدائوں سے
اپنی دعائیں قبول کرانا چاہے ہیں
وہ اپنی دائیں ایڑی میں گڑنے والی کیل کی چبھن
بائیں میں محسوس نہیں کر سکتے
بعض لوگوں کو خدا ورثے میں ملتا ہے
بعض کو تحفے میں
بعض اپنی محنت سے حاصل کرتے ہی
بعض چُرا لیتے ہیں
بعض فرض کر لیتے ہیں
میں نے خُدا قسطوں پر خریداتھا
قسطوں پر خریدے ہوئے خدا
اس وقت تک دعائیں پوری نہیں کرتے
جب تک ساری قسطیں ادا نہ ہو جائیں
ایک بار
مینخدا کی قسط وقت پر ادا نہ کرسکا
خدا کو میرے پاس سے اٹھا لے جایا گیا
اور جو لوگ مجھے جانتے تھے
انھیں پتا چل گیا
کہ اب نہ میرے پاس خدا ہے
اور نہ قبول ہونے والی دعائیں
اور
میرے لیے اک خدا فرض کرلینے کا موقع بھی جاتا رہا (افضال احمد سید:اگر کوئی پوچھے)(۹۳)

اگر ہم اس نظم کو تھوڑا سا گہرائی سے دیکھیں تو ہمیں اس میں اپنے سماجی رویوں کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے کہ کس طرح ہم پیدایشی طور پر کسی خدا کے ماننے والے ہیں

اور وہ ہمیں ورثے میں ملا ہے۔ کس طرح ہم اسے حرزِ جاں بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر کسی کو بھی مذہب سے نکال باہر کردینے کا رویہّ ہمارے ہاں مستعمل ہے۔ خدا کے بارے مینان ہی نظریات میں بار آوری کو بھی اہمیت حاصل رہی ہے کہ بارش نے زمین کو پیدایش کا مسکن بنایا تو انسان نے اُس کی طاقت کے آگے سر جھکا کر بادل کو خدا بنایا اور خدا کی بجائے دنیا سے محبت کی لیکن زاہد امروز کے بہ قول ہم نہ دنیا سے وفاداری نبھا پائے نہ ہی خدا سے۔

ہم نے بادل سے خُدا تراشا
اور سورج سے دوستی کی
اب ہماری فصیلوں سے
سیلن نہیں سوکھ رہی)زاہد امروز:پارلیمنٹ)(۹۴(

کہا جاتا ہے کہ ’’وفاداری بہ شرطِ اُستواری‘‘ اور سامی مذاہب کے مطابق یومِ الست خدا سے تمام مخلوقات سے اسی اُستواری کا عہد لیا گیا تھا۔ وہ دن تمام ارواح کا رب سے ملاقات کا دن تھا۔ وہ دن جب تک ہمیں آگ (جسمانی توانائی) نہیں بخشی گئی تھی بل کہ ہم تب تک صرف ہوا (روح) تھے۔

خدا کا آگ سے پہلے کا دن
ہمارے وِصال کا دن تھا)افضال احمد سید:برفانی چڑیوں کا قتل)(۹۵(

اُس سے پہلے ہی خدا نے (سامی مذاہب کے مطابق) بہت ہی جلدی سے (لفظ کُن کہہ کر) دنیا کو تخلیق کیا۔ اور اس دورانیے میں بھی ہم خدا سے نا آشنا تھا۔ وہ خدا جس کی روح پانیوں پر تیر رہی تھی۔

جلد اُگ آنے والی فصل کے کٹنے کا زمانہ تھا
ایک اجنبی خدا کی شبہیں
پانی کو میلا کیے جارہی تھیں)افضال احمد سیدبرفانی چڑیوں کا قتل)(۹۶(

اسی طرح عامر سہیل خدا کو اک خالقِ کل کی حیثیت میں دیکھتے ہیں اور مختلف مخلوقات کا ذکر کرتے ہوئے اُس خُدا کو ربوبیت کے مقام پر فائز کرتے ہیں۔

پھُلاہی کے رب
کیکروں‘ جھینگروں اور خاکستری
اور کاہی کے رب

اوامر کے رب اور نواہی کے رب

دودھیا گردنوں کی
صراحی کے رب

آبِ رخسار کی بے پناہی کے رب

روشنائی کے رب
بے گناہی کے رب

آبِ رُخسار کی ----)عامر سہیل:آبِ رخسار کی بے پناہی کے رب!)(۹۷(

ایک اور مقام پر وہ اُس خدا کو پستان سے بہتے دودھ کی دھار سے تشبیہہ دیتے ہیں ۔ گویا خدا قوت‘ طاقت اور زندگی کا استعارہ ہے۔

خدا ---- جیسے پستان کے دودھ کی
دھار سے دودھیا ---- دل
کسی مُلک کی آبرو باختہ
کہنیوں کا مُفصِّل---! (عامر سہیل: ٹھٹھرتی ہوئی موم)(۹۸(

سلیم شہزاد‘ انسان کو بھڑوں سے تشبیہہ دیتے ہیں اور خدا کو ان کا بھڑوا قرار دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر مذہب کے لوگ اپنے اپنے مانے ہوئے خدا کو اپنے تئیں درست قرار دیتے ہیں اور نام نہاد خدائی کے دعوے پر یقین رکھتے ہوئے انسانیت کی رگوں سے لہو نچوڑنے اور کسی دوسرے خدا کے پیروکاروں کو کچل دینے پر کمر بستہ رہتے ہیں۔ عصرِ حاضر میں اسی خدائی جنگ کے نام پر امنِ عالم تباہ کیا جا رہا ہے۔

بھڑوں کے بھڑوے نے
آنکھ ٹکائی
تو مسمار شب اوندھی پڑی تھی
زمین کے کان پہ
جوں تک
نہ رینگی
ہفت افلاک کی ندا
برسی
خاک کے پائوں
سے
ہتھیلیوں کی پشت
ٹکرائی
تو خوابوں کے پنجوں
سے)سلیم شہزاد:بھڑوں کا بھڑوا)(۹۹(

دوسروں کو کچل دینے کا یہ رویّہ بین الاقوامی ہے اور ہر ایک دوسروں کو ایک ہی مقصد کے لیے تلف کرتا ہے کہ اس کے خدا کا بول بالا ہو ۔ جس کے بدلے میں اس کا رب اُس سے خوش ہو کر اُسے اونچا مقام (جنت) عطا کرے۔ مگر سوال یہ اٹھتا ہے کہ ایک ان دیکھی ان جانی جنت کی طلب میں ہم اپنی اس دنیا کو جہنم کیوں بنا رہے ہیں؟

مالک میرے
ایسا کیوں ہے
اک جنت کے وعدے پر تُو
پَل پَل دوزخ میں رکھتا ہے)اعجاز رضوی:ایسا کیوں ہے؟)(۱۰۰(

اعجاز رضوی جب کائنات کے اس پہلو پر غور کرتے ہیں اور مذہبی تعلیمات کو ذہن میں لاتے ہے تو یہ جان کر عجیب سے اضطراب کا شکار ہو جاتے ہیں کہ بہ قول مذاہب‘ تمام اشیا اس لیے تخلیق کی گئیں کہ انسان انھیں تسخیر کرکے اپنے فائدے کے لیے استعمال کرے

لیکن اس کے بر خلاف یہ تمام اشیا انسان کو مسخر کیے جا رہی ہیں۔ کیا یہی خدا کا مقصد رہا ہوگا؟

مالک میرے
دھرتی پر تُو نے بھیجا تھا
دھاتیں‘ پتھر‘ پیڑ‘ پرندے
تونے میرے بعد بنائے
لیکن یہ سب مجھ سے آگے کیوں رہتے ہیں
مجھ پر بھاری کیوں پڑتے ہیں (اعجاز رضوی: ایسا کیوں ہوتا ہے؟)(۱۰۱)

پھرافضال احمد سید‘خدا کو ایک اور تناظر سے دیکھتے ہیں اور ہمارے رویوں پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ ہر وہ طاقت ور شے جو ہماری زندگی کو متاثر کرتی ہے انسان نے اُسے خدا کے درجے پر فائز کر دیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب ایک قوم جنگ میں دوسری قوم پر فتح پا لیتی تو اُس کا خدا بھی فاتح قرار دے دیا جاتا اور مفتوح قوم کے خدا کو دیس نکالا دے دیا جاتا۔ کیا یہ خدا کا اغوا نہیں؟ اسی طرح مفتوح عوام کے ساتھ ان کا خدا بھی بے گار میں پکڑ لیا جاتا اوراُن اقوام کے نزدیک یہ کسی گناہ کی سزا کے طور پر ہوتا کہ خدا ان سے روٹھ چکا ہوتا اور انھیں اس حال کو پہنچاتا۔ بہ جائے عملی کوشش کرنے کے لوگ اپنے خدائوں کو منانا شروع کردیتے کہ وہ اُن پر اس مصیبت کو ٹالے اور انھیں معاف کردے۔ پھر شاعر ایک نکتہ اٹھاتا ہے کہ خالق سے زیادہ اپنی تخلیق کے بارے میں کون بہتر جانتا ہے تو خالق کو چاہیے کہ خود کو لوگوں پر آشکار کردے۔

خُدا مجھ سے ناراض ہوکر کہیں چلا گیا ہے
خُدا کو کہیں اغوا کرنے والے نہ اٹھا لے گئے ہوں
خدا کو کہیں بیگار میں نہ پکڑ لیا گیا ہو
خدا مجھ سے ناراض ہوگیا ہے
میں نے خدا کے درخت سے ایک شاخ توڑ لی تھی
خدا کو کہیں لکڑہارے نہ اٹھا لے گئے ہوں
خدا سے کہیں کلھاڑی کا دستہ نہ بن گیا ہو
خدا مجھ سے ناراض ہوگیا ہے
میں نے خدا کی کتاب سے ایک ورق پھاڑ لیا تھا
خدا پر کہیں بھاری سی جلد نہ لگادی گئی ہو
خدا کو کہیں چھاپہ خانے کے پتھر پر نہ لٹادیا گیا ہو
خدا مجھ سے ناراض ہو گیا ہے
میں نے اس کی مینا کا پنجرہ کھول دیا تھا
خدا مجھ سے ناراض ہوگیا ہے
میں نے اُس کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ لیا تھا
خدا مجھ سے ناراض ہوگیا ہے
میں نے اس کے تکیے پر اپنا سر رکھ دیا تھا
کیا پتا خدا لوٹ کر میرے پاس آرہا ہو
خدا کو کسی نے حشیش کا پودا بنا کر اگادیا ہو

کیا پتا خدا لوٹ کر میرے پاس آرہا ہو
خدا کو کسی نے مشین کے دندانے میں پھنسا دیا ہو
خدا کو کون ڈھونڈ کر میرے پاس لاسکتا ہے
خدا کے سوا
اور کس کو میرا پتا معلوم ہے)افضال احمد سید:خدا مجھ سے ناراض ہو گیا ہے)(۱۰۲(

جب خُدا اور اس کی طرف سے دی گئی سزا کا سوال اٹھتا ہے تو اس کے جواب میں مبارک احمد ہمیں کائنات کے اسرار پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور اس بات کا اعادہ کرتے ہیں کہ ہم تو مجبور اور مقیّد لوگ ہیناور ہمارے لیے سب سے بڑے صیّاد کا کردار زمان و مکاں کے متعلق ہمارے احساسات ادا کرتے ہیں۔

پھیلی زمیں پر بدن کا مقدر سزا ہے
کہ انسان خواہش کے صحرا میں
انکار کی ریت پر
خود ستائی کا اک عارضی نقش ہے
صورتیں اپنی حالت میں قائم نہیں
ہم اسیرِ زمان و مکاں ہیں
یہاں کون آزاد ہے
ہم تو سانسوں کے گنتی کے پابند ہیں
اور میں نے کہا
عرصۂِ زندگی ہم پہ محدود ہے
ہم اسیرِ زمان و مکاں ہیں
مگر حدِّ امکاں میں آزاد ہیں
اور حدوں کا تعین اضافی ہے
یہ تو ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں اور بدلتی رہیں گی
زمان و مکاں کے بدن کا سفر تو فقط ذہن کا عکس ہے
عکس کو پیٹنے سے بھلا کیافائدہ؟)مبارک احمد:زمانہ عدالت نہیں)(۱۰۳(

یہیں ایک اہم سائنسی نکتہ بھی ہاتھ آتا ہے کہ زمان کی حد ہو یا مکان کی‘ یہ سب حدود تو اضافی حیثیتیں ہیں جو کسی نہ کسی دوسری چیز سے منسلک ہیں۔ اور اگر یہ انسلاکی اشیا انسانی احساسات ہوں یا پھر اُس کا تخیل‘ تو پھر یہ تمام چیزیں حدود سے آزاد ہو جاتی ہیں اور ایک نئے انداز میں سامنے آتی ہیں جیسے:

چاند مرے دروازے پر کل رات آیا تھا
اس نے مجھ سے پوچھا تھا
’’جانتے ہو کیا تم سورج کو!
کیا تم اس کے چہرے کو پہچانتے ہو‘‘
چاند کو اپنے دروازے پر
دیکھ کے میں حیران ہوا تھا
مجھ کو یقین نہ آتا تھا

چاند مرے دروازے پر بھی آسکتا ہے
میرے سوئے بھاگ جگاسکتا ہے
میں نے چاند سے پوچھا تھا
’’تم سورج سے کہاں ملے تھے
کب یہ واقعہ پیش آیا تھا
تم دونوں نے آپس میں کیا باتیں کی تھیں
رخصت ہوتے وقت
دوبارہ ملنے کی خواہش
کیا صرف تمھارے دل میں جاگی تھی؟
یا سورج نے بھی
تم کو پھر سے ملنا چاہا تھا؟
کیا اس نے بھی خواہش کا اظہار کیا تھا‘‘!
چاند نے پھر شرمیلی آنکھوں سے مجھے دیکھا
اور کہا تھا
کل سورج سے کہنا
’’وہ دن کب آئے گا
جب ہم وقت کے زندانوں کو توڑیں گے
وہ دن کب آئے گا
جب یہ ساری وسعت سمٹے گی
چاند‘ ستارے‘ سیارے اور کاہکشائیں
پھر سے یکجا ہوجائیں گی
اپنے اندر کھوجائیں گی
بن آنکھوں کے سوجائیں گی‘‘ (شہزاد احمد:وہ دن کب آئے گا)(۱۰۴(

ہمیں یہاں پھر ایک سائنسی نقطۂ نظر دکھائی دیتا ہے جو خدائی ذرّے کی وضاحت کرتا ہے۔ خدائی ذرّے پر تفصیلی بحث اگلے باب میں کی جائے گی۔ مختصراً یہ نظریہ یہ تھا کہ تمام کائنات ابتدا میں ایک ذرّے کی صورت میں تھی جس کی جسامت نہ ہونے کے برابر اور کمیت ناقابلِ پیمایش حد تک زیادہ تھی۔ پھر اُس ذرّے سے مختلف اجسام بنے اور متحرک ہوئے۔ ان اجسام کی حرکت سے انسان ہمیشہ ہی راہ نمائی لیتا رہا ہے۔ کبھی وہ ان سے نیک و بد کے شگون لیتا ہے اور کبھی مستقبل کی اور راستوں کی قیاس آرائی کرتا ہے۔ اسی حرکت سے متعلقہ ایک نظم میناظہر غوری اپنی محبوبہ سے مخاطب ہوتے ہیں اور اس سے شکایت کرتے ہیں کہ اس کی شادی اس کے کردار کی بجائے ستاروں کی حرکت کی بہ دولت ہے۔ عصرِ حاضر میں بھی فلکیات کے یہ نظارے خصوصاً ہندوئوں کے ہاں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اسی تناظر میں وہ اپنی تلاش کا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔

مرتبۂ زوجگی پر فائز ہونے کا حلف اُٹھانے کو
تمھیں کسی بھی دستیاب شے میں
عشق انگیز جمالیات کا احساس ہونا ہی تھا
لہٰذا آٹھویں ہندسے کی ناموافق قرابت سے بچنے کی کوئی تدبیر نہ تھی

مسائلِ زُحل کے مُخترع رخنوں میں
ایسا قِرانِ سیّارگاں تھا کہ ہم عجیب اندیشوں کے گھر میں پابند ہوئے
خوف کی وساطت سے ہمارے مابین غیر یقینی واسطے پُختہ ہوتے رہے
)اظہر غوری: تحلیلِ نفسی)(۱۰۵(

جب ان اجرامِ فلکی نے حرکت شروع کی تو تقسیم در تقسیم کے عمل سے یہ ان گنت تعداد کے حامل ہوگئے جیسے شہد کی مکھیوں کا چھتا‘ جسے دوسرے اجرام نچوڑ لینے کو تیار ہیں۔

چاند آسمان پر شہد کا چھتا ہے
میں اسے ریچھ کے بادلوں کے حملے سے بچانے جارہا ہوں
)افضال احمد سید:تل زعتر سے نشیب)(۱۰۶(

چاند ‘ سورج اور ستاروں کی یہی حرکات دن اور رات کی تخلیق کا باعث بنتی ہیں۔ انھی کے دم قدم سے وقت کی حرکت بھی جاری رہتی ہے۔

ابھی اس پہاڑی کے پیچھے چھپی
رات اپنے ٹھکانوں سے نکلی نہیں ہے
ابھی تیرگی کا سمندر
افق کے کنارے سے اچھلا نہیں ہے
ابھی ساعتوں کے سیہ ناگ
گھڑیوں کی سوئیوں سے لٹکے ہوئے
سرخ آنکھوں کی چنگاریوں سے ہمیں گھورتے ہیں
ابھی وقت کا بھیڑیا سانس روکے ہوئے
خون آلود ٹیلوں کے پیچھے کھڑا
زرد سورج کی اُجڑی ہوئی لاش کا منتظر ہے)نصیر احمد ناصر)SNAPSHOT(:۱۰۷(

رات کی تاریکی‘ نیند کی تاریکی اور موت کی تاریکی ایک جیسی ہیں۔ ہر تاریکی کے بعد روشنی ہے۔ رات کے بعد دن‘ موت کے بعد زندگی اور نیند کے بعد خواب۔ خواب جو اساطیر کا عنوان رہے اور انھی کی بہ دولت ’بہ قولِ فلسفہ و منطق‘ انسان نے روحوں کے مت کو اپنا کر پہلا باقاعدہ مذہب تخلیق کیا۔ خوابوں سے آگے کا یہ منظر کیا ہے اور کیسا ہے؟

کبھی تم نے دیکھا ہے
خوابوں سے آگے کا منظر
جہاں چاند تاروں سے روٹھی ہوئی
رات اپنے برہنہ بدن پر
سیہ راکھ مل کر
الائو کے چاروں طرف ناچتی ہے
کبھی تم نے جھانکا ہے
پلکوں کے پیچھے
تھکی نیلی آنکھوں کے اندر
جہاں آسمانوں کی ساری اُداسی

خلا در خلا تیرتی ہے   )نصیر احمد ناصر:تم نے اُسے کہاں دیکھا ہے)(۱۰۸(

رات کے بیکراں سمندر میں
چاند ' خوابوں کی ڈوبتی نائو
میں مُسافر دُکھی زمینوں کا   )نصیر احمد ناصر)(۱۰۹(

رات اور دن کا سنگم شام ہے۔ شام کے اس سنگم کو بیان کرتے ہوئے نصیر احمد ناصر کہتے ہیں:

ممٹیوں کی اوٹ سے
روز ملنے آتی ہے
شام آفتاب سے   )نصیر احمد ناصر)(۱۱۰(

ٹین کی چھت پہ سوکھنے کے لیے
صُبح پھیلائے دھوپ کی چادر
شام آئے سمیٹنے کے لیے   )نصیر احمد ناصر)(۱۱۱(

ماہرینِ نفسیات اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ دن اور رات کے انسانی احساسات میں بہت واضح فرق ہوتا ہے۔ رات بے نقابی اور بے لباسی کا دور ہے' جس میں اندرونِ ذات بے لباسی کی کیفیت میں آشکار ہو جاتا ہے۔ اسی بات کو شاعر نے رات اور چاند کے تعلق سے اس طرح بیان کیا ہے:

چاند چھپ کے تکتا تھا
رات بالکونی میں
بے لباس بیٹھی تھی   )نصیر احمد ناصر)(۱۱۲(

شام کے وقت غروب ہوتا سورج جھیل کنارے اداس بیٹھا دکھائی دیتا ہے جیسے کوئی بوڑھا جو اپنی زندگی کا دن گزارنے کے بعد بڑھاپے کی شام میں موت کی رات کا منتظر ہو۔

شام کے دُھندلکے میں
جھیل کے کنارے پر
آفتاب بیٹھا تھا!   (نصیر احمد ناصر)(۱۱۳(

اجرامِ فلکی پر غور کرنا دراصل زندگی کے پانیوں کی تلاش کا مرحلہ ہے لیکن ہر تلاش کے بعد بے چینی کا خلا ہاتھ آتا ہے جس کا کوئی انت نہیں۔جیسے زاہد امروز رقم طراز ہیں کہ

میں دریائوں کی تلاش میں آوارہ پھرتا ہوں
اورآبشاروں کی موسیقی گنگناتا ہوں
میں کبھی تراشیدہ پگڈنڈیوں پر نہیں چلتا
کیوں کہ راستہ مجھے خلائوں میں چھوڑ آتا ہے   )زاہد امروز:بے بسی موت کا نوحہ بھیجتی ہے)(۱۱۴(

جیسے رات اور دن کے درمیان سورج کا دروازہ ہے کہ اس کی لہریں ایک سیڑھی کی طرح آنے جانے کا راستا بناتی ہیں بالکل اسی طرح ہم بلیک ہولز کے ذریعے شاید ایک دنیا

سے دوسری دنیا تک رسائی حاصل کر سکیں اور بلیک ہولز ہمارے لیے سیڑھیوں کا کام دیں جن میں جلتے ہوئے یہ ستارے مدھم لالٹینوں کی صورت راہ نمائی کرتے ہیں۔

رات
اور کہرے میں کفنائی ہوئی سنسان لمبی سی گلی
موڑ پر اک گھر کا دروازہ کھلا ہے
تنگ لمبی سیڑھیوں کے پائوں پر
جل رہی ہے ایک مدھم لالٹین! (سلیم الرحمان:دروازہ)(۱۱۵(

تخیل کی پرواز یہ بتاتی ہے کہ شاید ہم اب تک ان حقائق کو سمجھ ہی نہیں پائے ۔ ہم ابھی تک سفر کی ابتدائی منزلوں پر ہیں اور حتمی منزل تو ابھی ان سے بہت آگے ہے کیوں کہ ابھی تک تو ہم زمین کی جکڑن سے ہی آزاد نہیں ہو پائے تو اس مقام کو سفر کا انجام کہنا درست نہیں۔

پیام جتنے صبا نے دیے ‘ غلط نکلے
کہا جو موجۂِ آبِ رواں نے ‘ جھوٹ کہا
سفر کا رنج وہی‘ زیرِ پا زمین وہی
وہی فلک جو کھڑے پانیوں میں دیکھ چکے
وہ ہفت رنگ ستارہ اس آسماں میں نہیں
وہ پھول حلقۂِ دامِ ہوا سے آگے ہے)اختر حسین جعفری)(۱۱۶(

کائناتی وسعتیں اور ان کے راستے ابھی تک ہماری آنکھوں سے اوجھل ہیں۔کیوں کہ ابھی تو ہم آسمان کی حقیقت کو بھی نہیں جان پائے اور حقیقت تو ان افلاک کی قید سے آگے ہے۔

اَن دیکھی دیواروں کا روزن
ناواقف سی شکل کا سایہ
موجِ ہوا پر عکسِ گُلِ تر
بے افلاک دھنک کی چھایا)اختر حسین جعفری: خلوت پیشِ آئینہ)(۱۱۷(

اختر حسین جعفری کے خیال کے مطابق وقت تیز رفتار ریل گاڑی کی صورت اندھے سفر پر آمادہ ہے جس کی کوئی منزل بھی دکھائی نہیں دیتی۔ ہمارے اجسام اس کے راستے میں پڑے ہوئے خاک کے ذرّے ہیں جن پر وقت اپنے نقوش چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔

دھوئیں کے سائے میں تیز رفتار ریل گاڑی
رواں ہے اندھے سفر پہ گویا
سیاہ انجن کے حلقوم سے نکل کر مہیب چیخیں ترے لبوں پر
بکھر گئی ہیں
رواں دواں ساعتوں کے پہیے دلوں کے کچے بدن سے گزرے تو کتنے نیلے
نشان ابھرے ہیں تیرے رخسار پر جبیں پر)اختر حسین جعفری: عکس اور فاصلے)(۱۱۸(

وقت کی اسی بے پناہی کے ساتھ اپنے تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر جواز جعفری خود کو حیرت میں گم پاتے ہیں اور وقت کی زمین میں اپنی جڑوں کو دور تک تاریخی تسلسل میں دیکھتے ہیں۔

میرے اردگرد بچھی بساط
میرے لیے ایک معمّا ہے
میں زمین پر قید زندگی کا پیڑ ہوں
مری جڑیں
وقت میں دور دور تک پیوست ہیں)جواز جعفری: میں زندگی کا پیڑ ہوں)(۱۱۹(

رات کے حسن کا بیان عامر سہیل کے ہاں ایک دل چسپ پیرایۂ اظہار بن جاتا ہے' کیوں کہ رات ملن کا استعارہ بھی ہے۔

اک غبارہ سی اڑتی ہوئی رات ہے
ٹوٹ کے پھر سے جڑتی ہوئی رات ہے
چاند کے موتیوں کا مضافات ہے
جس میں میں اور تو
اور لانبی گھنیری' گھنی گفتگو
موتیوں سی لبوں سے چھنی گفتگو
کاسنی گفتگو
اک شکار ے سے جڑتی ہوئی رات میں
بیچ راہوں سے مڑتی ہوئی رات میں)عامر سہیل:موتیوں کے لبوں سی)(۱۲۰(

زاہد امروز کے مطابقتمام تر اسرار رات کے مہیب سینے میں قید ہیں اگر ہم رات پر اور اس کے اسرار پر فتح حاصل کرلیں تو رات کی یہ برہنگی کائناتی رازوں کو کھول دے گی اور ہمیں زمین کی کم مائیگی کا بہتر ادراک ہو پائے گا اور ہم اپنی زمین کو خود بلیک ہولز کے اندھے کنویں میں پھینک کر نئی دنیائوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔

رات برہنہ ہوجائے
تو زمین کو کائنات کے کنوئیں میں پھینک دینا چاہیے)زاہد امروز:زمین کے ہنکارے)(۱۲۱(

رات کے اسرار ابھی تک کھُل نہ پائے ہیں کیوں کہ انسان اپنی حدوں میں مقیّد ہے اور رات آسمان کی پنہائیوں کے برابر ہے جو انسانی کم مائیگی کا مذاق اڑاتی ہے گویا یہ انسان کے لیے شرمندگی کے باعث خود کشی کا مقام ہے۔

رات ہنستی رہی
جب آسمان موجود تھا
انسان لاانتہا امکانات کے فریب کا اسیر تھا
آنکھ کھولی تو کچھ بھی نہیں تھا
انسان نے شہر کے راستوں پر خود کشی کرلی)زاہد ڈار)(۱۲۲(

وقت کی گردش جاری رہتی ہے اور اس گردش کے ساتھ مختلف موسم آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہ موسم کبھی پگھلائو کے ہوتے ہیں اور کبھی انجماد کے۔ اور یہ وقت کے اس چکر میں آنا جانا لگا رہتا ہے۔

کمرے میں یہ دھواں سا
کیسا ہے ؟ اور کیوں ہے؟
لوہا پگھل رہاہے

پتھر پگھل رہے ہیں
موسم بدل چکا ہے
اب گرمیوں کے دن ہیں
اب آسماں سے سورج
دھرتی کے باسیونپر
نیزے گرارہا ہے
شعلوں کے سرخ نیزے
یہ آگ‘ یہ اجالا
یہ موسموں کا چکر
اور آسماں کی گردش
اک وقت جارہا ہے
اک وقت آرہا ہے)زاہد ڈار)(۱۲۳(

یوسف ظفر کے خیال میں وقت سب سے بڑا محرک ہے‘ ستارے داستانِ قدیم کے داستان گو اورخلا اندھیروں کا نام ہے جس میں ستارے قدیم آسمان کو روشن کرنے کا باعث بنتے ہیں۔

ہر ایک سمت حقائق کے ٹمٹماتے چراغ
ہر ایک سمت ستاروں داستانِ قدیم
یہ روشنی کی صدائیں فضائے تیرہ میں
یہ تیرگی کا سمندر۔ یہ آسمان قدیم
کسے کہوں کہ چراغوں کی ان صدائوں میں
لپک کے آتی ہے میری طرف وہ بادِ سموم
جو ریگ زاروں پہ نقشِ قدم بچھاتی ہوئی
ہر ایک شے کو بناتی ہے ہستیِ معدوم)یوسف ظفر:مستقبل)(۱۲۴(

آخر وہ کون سا راستا ہے جس پر چل کر روشنی ہم تک پہنچتی ہے؟ کیا یہ راستا کوئی حقیقت ہے یا یہ بھی آسمان کی طرح ہی ہماری نظر کا دھوکا ہے جسے ہم نے خود تخلیق کر لیا ہے؟ اگر حقیقتاً کوئی راستا ہے بھی تو اسے کس نے‘ کب‘ کہاں‘ کیسے اور کیوں بنایا؟

مجھے اتنا بتادو
کس نے یہ رستہ بنایا ہے
بہت ممکن ہے یہ رستہ
تمھاری آنکھ کے اندر سے نکلا ہو
تمھاری راہ کی تاریک دنیا کی طرف جاتا ہو
وہ دنیا جس کو تم نے خود بنایا تھا)شہزاد احمد:ٹوٹتے بنتے ہوئے(

انھی راستوں کی حاشیہ پیمائی کرتے ہوئے ڈاکٹر جواز جعفری روشنی (توانائی) کو سب سے بڑا راہ نما سمجھتے ہیں کہ یہ توانائی ہی کائناتی رازوں کو ہم پر منکشف کر سکتی ہے۔ اس بات کا اظہار ڈاکٹر جواز جعفری کی کئی نظموں میں ملتا ہے اور یہ نظریہ جدید سائنس دانوں کے ہاں بھی مروج ہے۔ فرق یہ ہے کہ سائنس دان تو ابھی اس روشنی کی رفتار پر قابو پانے کا سوچ رہے ہیں لیکن شاعر کا تخیل کائناتی قفلوں کو کھلتے ہوئے دیکھ رہا ہے گویا وہ سائنس سے کئی قدم آگے ہے۔

روشنی کے سنہری ہاتھ میں
جادوئی چابی ہے
میری آنکھیں
کائنات کے قفل کھلتے دیکھ رہی ہیں (جواز جعفری: میں زندگی کا پیڑ ہوں)(۱۲۵)

اس کائنات کے مقابلے میں انسان کی کوئی بساط نہیں ہے۔ وہ اس کے رازوں کو ابھی تک جان ہی نہیں پایا تو واشگاف کیا کرے کہ وہ تو ازل و ابد کے درمیان ایک قیدی کی طرح ہے۔ آسمان سے رابطے کی بھی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی کہ حقائق جلوہ گر ہو سکیں۔

وہ جو وقت کی ٹھوکر پہ ہیں
کب سنا پائیں گے احوالِ حزیں
ان کے ہاتھوں میں ہے زنجیرِ ازل
اور پائوں ہیں ابد کی گھات میں

زمیں زادوں کو مژدہ ہو
کہ اب
آسماں سے رابطہ ممکن نہیں
گنبدِ بے در کا درکھولے گا کون؟
اس سکوتِ مرگ میں بولے گا کون؟
بات کرنے کو بھی آخر
اک سلیقہ چاہیے (شاہین مفتی: اک سلیقہ چاہیے)(۱۲۶)

نیند اک راز ہے۔ وہ نیند عام نیند ہو یا موت کی نیند۔ وہ عارضی ہو یا ابدی۔ آخر اس کا ماجرا کیا ہے کہ اس کے لیے زمان و مکان کی حدود کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ یہ کبھی بھی‘ کہیں بھی ‘ کسی کو بھی آلیتی ہے اور اس سے فرار ممکن نہیں رہتا۔اسے کسی راستے کی ضرورت نہیں کہ جس کے واسطے سے یہ وار کر سکے۔ یہ خود آزاد ہے مگر قید کرلینے کی صلاحیت سے مالامال۔

کوئی روزن نہیں‘ شام ہو یا دوپہر ہو
یا پھر رات ہو‘ ابتلا کا مساس
ایسی خنکی کی لہریں ہیں جو دائرہ دائرہ
ٹوٹتی نیند کی برہمی کو سلا دیتی ہیں (عبدالرشید:دن کا خیمہ)(۱۲۷)

ہماری دنیا کے حقائق ہمیں یہ باور کراتے ہیں کہ گویا ساری دُنیا ہی سراب ہے‘ دھوکا ہے کیوں کہ رات کا آنچل ہر اُس چیز کو ڈھانپ کر اندھیرے میں چھپا لیتا ہے جو دن کی روشنی میں دمکتی ہے۔ جیسے اجالے کو تاریکی ‘ تحریک کو سکون اور آواز کو خاموشی اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔

نیم شب‘ چاند‘ خود فراموشی
محفل ہست و بود ویراں ہے
پیکرِ التجا ہے خاموشی
بزمِ انجم فسردہ ساماں ہے
آبشارِ سکوت جاری ہے

چار سو بے خودی سی طاری ہے
زندگی جزوِ خواب ہے گویا
ساری دُنیا سراب ہے گویا   )فیض احمد فیض:سرودِ شبانہ)(۱۲۸(

رات کے ڈھلتے ہی اس کے تمام اسرار بھی چھپ جاتے ہیں۔ اس کے ہم نشین تارے بھی سورج کی گردِ راہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور ان کے نقشِ پا کو سورج کی خاک (روشنی) چھپا دیتی ہے۔

ڈھل چکی رات‘ بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سوگئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگزر
اجنبی خاک نے دھندلادیے قدموں کے سراغ   )فیض احمد فیض: تنہائی)(۱۲۹(

اسی طرح ڈاکٹر جواز جعفری کائنات کو ایک عظیم کوکھ قرار دیتے ہیں جس نے زندگی اور روشنی کو جنم دیا۔ وہ مزید اس بات کی وضاحت بھی کرتے ہیں کہ تمام تر اجسام چاہے وہ جان دار ہیں یا بے جان‘ اسی کوکھ سے پیدا ہوئے۔ اس حوالے سے ان سب کی بنیاد ایک ہی ہے۔

کائنات ایک عظیم کوکھ ہے
)روشنی اور زندگی کو جنم دینے والی(
انسان یا ستارا ہونا
دوباتیں نہیں ہیں!
میں ستاروں کا ماضی ہوں
اور ستارے میرا مستقبل ہیں
ستارے بھی ہماری طرح پیدا ہوتے ہیں
زندہ رہتے ہیں اور مر جاتے ہیں
میں ستاروں کے شمشان گھاٹ کی راکھ ہوں
میرے اندر آگ روشن ہے   )جواز جعفری: کائنات ایک عظیم کوکھ ہے)(۱۳۰(

اگرچہ فیض کی زیرِ نظر‘نظم کا تناظر سیاسی ہے لیکن اس کا بیانیہ آفاقی ہے۔ وہ لوگوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ حالات سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں اگر خوش حالی نہیں رہی تو رُکنے والی تو بد حالی بھی نہیں ہے ۔ وہ اپنی اس بات کی دلیل کے لیے کچھ کائناتی عناصر کی مثال پیش کرتے ہیں۔

ہستی کی متاعِ بے پایاں‘ جاگیر تری ہے نہ میری ہے
اس بزم میں اپنی مشعلِ دل ‘ بسمل ہے تو کیا‘ رُخشاں ہے تو کیا
یہ بزمِ چراغاں رہتی ہے‘ اک طاق اگر ویراں ہے تو کیا
افسردہ ہیں گر ایام ترے‘ بدلا نہیں مسلکِ شام و سحر
ٹھہرے نہیں موسمِ گل کے قدم‘ قائم ہے جمالِ شمس و قمر
آباد ہے وادئِ کاکل و لب ‘ شاداب و حسین گلگشتِ نظر
مقسوم ہے لذتِ دردِ جگر‘ موجود ہے نعمتِ دیدۂِ تر
اس دیدۂِ تر کا شکر کرو‘ اس ذوقِ نظر کا شکر کرو
اس شام و سحر کا شکر کرو‘ ان شمس و قمر کا شکر کرو

)فیض احمد فیض: شورشِ بربط و نے۔ دوسری
آواز)(۱۳۱(
کائناتی اندھیروں (بلیک ہولز) کی حقیقت عام اندھیروں کی طرح ہے کہ روشنی جو بصارت کا باعث ہے‘ یہ تو اس میں بھی دکھائی نہیں دیتا تو ہم ان کی حقیقت کا ادراک کیسے حاصل کریں۔بہ قول نصیر احمد ناصر:

کیسے سمجھائو گے
کہ آنکھوں کے پیچھے
اندھیرے کی کوئی واضح تصویر نہیں ہوتی
یہ تو تیز روشنی میں بھی نظر نہیں آتا)نصیر احمد ناصر:بے آغاز راستوں کا
سفر)(۱۳۲(

تاریکی کی طرح روشنی بھی اک راز ہے۔ اک ایسا راز کہ اس کی کثرت بھی چیزوں کو واضح نہیں ہونے دیتی جیسے شدید روشنی میں آنکھیں چندھیا جاتی ہیں‘ اسی طرح ہم اپنے احساسات کی روشنی میں چندھیانے کے بعد ان کی حقیقت کو جان نہیں پاتے۔

اگر کوئی اچانک روشنی کردے
تو کیا تم دیکھ پائو گے؟
وہ سب چیزیں
جو تاریکی کے گہرے اسودی
محلول میں گم ہیں
سراپا زندگی کا‘
موت کا چہرہ‘
اُداسی کا بدن‘
آواز کے لب‘
درد کے ڈمپل‘ (نصیر احمد ناصر:چندھا)(۱۳۳(

شہزاد احمد آسمان کو ایک کالے بے انت سمندر کی طرح قرار دیتے ہیں جو اپنی ہی گہرائیوں میں گم ہوتا رہتا ہے۔ وقت اس کا گرداب ہے جو چکر میں گھومتا ہے اور چیزوں کے بننے بگڑنے کا سبب بنتا ہے۔

آسمان کالے سمندر کی طرح
اپنی گہرائی میں گرتا ہی چلا جاتا ہے
ایک چکر ہے جو پھرتا ہی چلا جاتا ہے
ایک گرداب ہے جس میں ہر شے
بنتی اور ٹوٹتی شکلوں کی طرح
ریزہ ریزہ ہوئی جاتی ہے)شہزاد احمد:رات تنہا نکل آئی گھر سے)(۱۳۴(

یہ کائنات ایک ذرّے کے کھنڈرات کی صورت ہے جو کہ صدیوں کی کہانی سناتے ہی۔ یہ کہانی ہمیں بتاتی ہے کہ ان کی آغوش میں ایک سرکش فتیلہ بہ صورتِ انسان موجود ہے او ر اپنی سرکشی کی اسی سرشت کے ہاتھوں مجبور ہوکر اس کائنات کو ہی تسخیر کرنا چاہتا ہے۔اسی لیے تو راشد کہتے ہیں:

کھنڈر جو صبحِ ازل کی مانند دیکھتے ہیں

یہ دیکھ کر مضمحل نہیں ہیں
کہ ان کی آغوش کے فتیلے کی روشنی
سرد پڑچکی ہے
وہ اس فتیلے کی
سرکشی کو بھی جانتے ہیں)ن-م-راشد:ویران کشید گاہیں)(۱۳۵(

ہم جس سماجی اور سیاسی عہد سے گزر رہے ہیں یہاں ہر کام کا بنیادی مقصد اپنی رفعت کا جھنڈا لہرانا ہے۔ اسی لیے ہم اس سیاست کے ہاتھوں اپنی اس سرزمین کو بھی پامال کرچکے ہیں اور دیگر دنیاؤں کے بھی تمنائی ہیں۔اعجاز رضوی اس سماجی حیثیت سے مشکوک دکھائی دیتے ہیں کہ انسان کی یہ بڑھتی ہوئی ہوسِ اقتدار زمین کو ایسے تباہ و برباد کردے گی کہ ہم اس کے بھی نہ رہیں گے اور نیا جہان تو ابھی ویسے ہی ہماری پہنچ سے باہر ہے۔

چاند گاڑی سے کیسی نظر آرہی ہے زمیں
دیکھنے دے
عین ممکن ہے اس مرتبہ چاند سے واپسی خواب ہو
عین ممکن ہے اس مرتبہ واپسی ہو بھی جائے تو ہم
اس زمیں پر نہ اُتریں
اور اگر اتفاقاً کہیں کچھ زمیں مل بھی جائے تو ہم
خوف کی وردیوں میں گسے
بے یقینی کے پرچم اٹھائے
اُسی چاند گاڑی میں بیٹھے ہوئے‘ دور بینیں لگائے
کسی اپنے جیسے بشر کی جھلک دیکھنے کی تمنّا کریں
عین ممکن ہے اس ٹور کے بعد یہ چاند گاڑی نہ ہو
اور ہم اُن خلائوں میں یوں ڈولتے پھر رہے ہوں کہ جیسے
کوئی بے ثمر شے زمیں پر پڑی اپنی قسمت پہ روئے
چاند گاڑی کی رفتار یوں مت بڑھائو
اتنی جلدی ہے کیا
دیکھنے دے مجھے اپنے جیسے بشر دیکھنے دے
آخری بار مجھ کو زمیں دیکھنے دے
مجھے اپنا گھر دیکھنے دے)اعجاز رضوی:آخری سفر میں آخری خواہش)(۱۳۶(

ماضی جو موت سے ہم آغوشی اختیا رکرچکا ہے‘ اُس کے آلام کی یاد ہمارے حال کی خوشیوں کو بھی رگید دیتی ہیں اور ہم خوشیوں کی تلاش میں اس دنیا کو چھوڑ جانے کے تمنائی ہیں وہ دُنیا جو ہمارے حسین خوابوں کا مسکن ہو۔

گزرے کل کی مُردہ آنکھیں
آنے والے زندہ کل کی کوکھ سے خوشیاں چاٹ رہی ہیں
ماضی کے اندھے تالاب میں غوطہ زن ہوں
میری آنکھیں مستقبل کو کھوج رہی ہیں
میرے ہاتھ میں خوشیوں کی اک کونپل ہے

میرے دل میں زخموں کے کچھ پھول کھلے ہیں
جن کی خوشبو پل پل بے کل رکھتی ہے
ساعت ساعت تیری مالا جپتی ہے (اعجاز رضوی: بیکل دل کی بات)(۱۳۷)

دوسرے سیّارے کو اپنا مطیع بنا لینا عہدِ حاضر کے انسان کا خواب ہے۔ کبھی وہ مریخ کی طرف بڑھتا ہے تو کبھی چاند کی طرف۔ یہ خلا سمتوں سے ماورا ہے۔ جب ہم زمین پر ہوتے ہیں تو ہمیں رات میں چاند اپنے اوپر محسوس ہوتا ہے جب کہ چاند پر جانے سے ہمیں زمین اوپر دکھائی دیتی ہے۔ اشفاق حسین کے نزدیک جب چاند زمین زادوں کا مسکن بن جائے گا تو؛

چاند تلک اک دن جائیں گے
جا کے وہاں پر بس جائیں گے
ایسے میں جب رات آئے گی
چاند زمیں پر نکلا ہوگا (اشفاق حسین: نیند نہیں آتی ہے)(۱۳۸)

وہ نئی دنیا جو انسانی تمنائوں کا مرکز ہے، اُس پر انسانی دست رس یوں ہو گی کہ وہ معلومہ اصولوں سے انحراف کی صورت پیدا کرنے کے قابل ہوگا۔ جیسے کہ افضال احمد سید روشنی کو واپس بھیجنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔

روشنی جو اس شہر کے کھمبوں پر سرنگوں ہے
میں اسے کوڑے مار مار کر اوپر بھیجوں گا (افضال احمد سید: تل زعتر سے نشیب)(۱۳۹)

مشرق، مغرب، شمال اور جنوب جو ہمیں چار دیواروں کی طرح قید کیے ہوئے ہیں ان سے نکلنا ہوگا۔ جب ہم ان چار سمتوں سے آگے کا سفر کریں گے تو نئی دنیا ہمارے سامنے ہوگی، نئے اسرار کی دُنیا۔ انسان اپنی جولانئِ طبع کے ہاتھوں مجبور ہے۔ وہ ایک جیسے مناظر سے اکتاہٹ کا اظہار کرتا ہے اور نئے مناظر دیکھنے کی خواہش رکھتا ہے جو ان چار سمتوں سے پرے ہیں۔

اس لیے شاید کہ ہم اِن چار دیواروں سے نکلینجن مینرہتے اب ہمیں دن رات کی پہچان ہی باقی نہینہے
اِن آشنا گلیوں سے اُن نا آشنا گلیوں میں جائیں
نت نئے اسرار کھوجیں
روز اک جیسے مناظر تکتے تکتے
تھک گئے، اُکتاگئے ہیں (افتخار نسیم: ہم سفر کرتے ہیں کیوں؟)(۱۴۰)

مرے حصّے کے آسمان نے
یکسانیت اوڑھ لی
اور مری آنکھوں نے آسمان کے نیلے صفحے پر
اپنی بینائی سے اکتاہٹ لکھ دی
اب یہ آنکھیں کسی اور مٹی
اور موسم کا خواب دیکھتی ہیں (جواز جعفری: کسی اور مٹی کا خواب)(۱۴۱)

ہم اس زمین کے باسی ہیں اور زمین ہی ہماری حد ہے۔ اس سے پرے دور کہیں کوئی اور زندگی ہے۔وہاں بھی زندگی کی جولانیاں ہیں۔ سائنس اپنی حد بندیوں کے باعث اس دنیا کو دیکھ نہیں پاتی لیکن شاعر کا تخیل اُسے اُس دنیا کا نظارا دیتا ہے۔ وہاں بھی پھولوں کی مہکار دلوں کو معطّر کرتی ہے لیکن ہماری آنکھیں اُس منظر سے نا آشنا ہیں۔

دور کہیں اک پھول
کھِلتا ہے پر دیکھے کون
آنکھیں مٹّی دھول (نصیر احمد ناصر)(۱۴۲)

ان نئی دنیائوں کے پار جانے کی تمنا کا احساس انتہائی شدت کے ساتھ نصیر احمد ناصر کو بے تاب رکھتا ہے۔وہ ہر حد سے ماورا ہوکر اُس دنیا کی طرف جانا چاہتے ہیں جہاں ابھی تک سائنس کی رسائی نہیں ہے مگر اُن کا تخیل اُس سے بہرہ ور ہے۔

کہیں اُس پار اُترے ہیں
پرندے شام کی چھت پر
ستارہ وار اُترے ہیں (نصیر احمد ناصر)(۱۴۳)

وقت پر، دست رس انسان کاقدیم خواب ہے۔ زاہد امروز اس خواب کی تعمیل کرتے ہوئے خود کو مستقبل کی دنیا سے روشناس کرتے ہیں اور پھر موت کے لمحے سے آگے نکل کر کائنات کی نیرنگیوں کو برہنہ دیکھتے ہیں۔

میں نے رات خواب دیکھا
میری موت آج شام چھ بج کے چھبیس منٹ پر واقع ہوگی
اس وقت بادل، جمے ہوئے سارے آنسو بہادے گا
فضا میں روشنی کانپنے لگے گی
اور آسمانی مخلوق برہنہ دیکھی جاسکے گی (زاہد امروز: قدیم زندگی کی نئی معنویت)(۱۴۴)

سلیم الرحمان بڑھتی ہوئی آلودگی کو فطرت سے ایک جنگ کی صورت میں دیکھتے ہیں اور اس بات کی کسک محسوس کرتے ہیں کہ کیسے ہم اپنے گردو پیش کی کائنات اور بالخصوص اپنی زمین کو بنجر کرتے جا رہے ہیں:

ہم لڑائی میں ہمیشہ ہارنے والے سہی
پھر بھی اس مٹّی خواہش ہی لیے
زخم پر مٹّی ملیں گے
رات بھر میں جی اٹھیں گے
وہ دھکتی آنکھ، اپنے ہاتھ میں نیزہ لیے
صُبح پھر سب کو بلانے آئے گا
شہر کے رستوں پہ ریزہ ریزہ کرکے
پھر ہمیں بکھرائے گا (سلیم الرحمان: شہر اور سورج)(۱۴۵)

فتح و تسخیر کی لگن میں انسان دنیا کی تباہ و برباد کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ افضال فردوس دوسرے کسی انجان سیّارے کی مخلوقات سے مخاطب ہو کر ایک طرف تو اُن کے لیے اچھّی اور نیک تمنائوں کا اظہار کرتے ہیں اور دوسری طرف انسانی بے حسی کا ماتم۔

اس سولر سسٹم میں

یا اور کسی میں
کہیں اگر آباد ہو تم
اور میری آواز کو سن سکتے ہو
اور اس کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے
تو پیارو
آباد رہو‘ دلشاد رہو
امن‘ محبت‘ صلح کی نیک تمنائیں
میری..... اور میرے بچوں کی جانب سے
دنیا والوں کا میں کیا کہہ سکتا ہوں
دنیا ان لفظوں کے معنی بھول چکی ہے)افضال فردوس: خلا میں بسنے والوں کے نام)(۱۴۶(

مکان سے لامکانی کی طرف سفر کا امکان بھی انسان کو کائنات کو جاننے کا طلب گار بناتا ہے۔ وہ مادی حدود سے فرار چاہتا ہے۔ اُس کی خواہشات ہی اُس کا سرمایہ ہیں جو اُسے زمان و مکان کی حدود سے ماورا ہونے پر اُکساتی ہیں۔اسی کا اظہار کرتے ہوئے جاوید انور لکھتے ہیں:

لامکانی کے جزیروں پہ‘ زمانوں سے پرے
یہ کولمبس یہ سکندر تیرے
جانے کس چاند کو چھونے کی طلب میں شب بھر
اپنے چمکیلے لہو کے نیزے
کُند کرتے ہیں تو شب ڈھلتی ہے

ایک دنیا کہ جسے
یہ بسر کربھی چکے
جس کو یہ پیچھے‘ بہت پیچھے کہیں چھوڑ آئے
دھول میں بھول کی صورت‘ لیکن
اب بھی وہ شہد کی مکھی کی طرح
گونجتی رہتی ہے ان کے سر میں
لامکانی کے جزیروں پہ‘ زمانوں سے پرے)جاوید انور:یہ کولمبس یہ سکندر تیرے)(۱۴۷(

اس حوالے سے ڈاکٹر جواز جعفری اپنی ایک نظم میں لکھتے ہیں کہ

میرے پائوں خاک سے بندھے ہیں
اور آنکھیں
دور آسمان پر اپنا رستہ ٹٹولتی ہی
میں وقت کا مسافر ہوں
)کائنات کے افق کی طرف(
وقت اور خلا جڑواں بھائی ہیں
میں خلا کی تاریکیوں میں رستے بچھاتا

ایک ہی وقت میں
اپنے ماضی
اور مستقبل کی طرف روانہ ہوں (جواز جعفری: وقت کا مسافر)(۱۴۸)

ہر شے نئے پن کی تلاش میں ہے۔ جدید انسان ہر شے کو نئی معنویت عطا کرتا ہے اورنصیر احمد ناصر اس کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ ایک ایسی دنیا کی تصویر پیش کرتا ہے جو اس عام دنیا سے مختلف ہے۔

تمھاری آواز
مجھے نمو کے سفر پر اکساتی رہے گی
اور پھر ایک دن ہم
اتر جائیں گے
ان دریائوں کے پار
جہاں راستے ہیں نہ مسافر
دھوپ ہے نہ شام
بس ایک خواب جیسی دھند ہے
اور پہاڑ جیسی رات
جس کے آخری سرے پر
(اور رات کا سرا ہوتا ہی کب ہے)
ایک کچی دیوار پر پوتا ہوا وقت ہے
اور کوسوں دور
کئی راستوں کو رگیدتی ہوئی
ایک سڑک ہے
طویل اور بے نشان---- (نصیر احمد ناصر:رات زندگی سے قدیم ہے)(۱۴۹)

اسی طرح نصیر احمد ناصر دوسرے سیّارے سے دیکھ لیے جانے کی سوچ میں گُم ہیں کیوں کہ دیگر سیّاروں پر انھیں زندگی کے آثار نظر آتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم عالمِ تنہائی میں
کسی نادیدہ ستارے سے دیکھ لیے جائیں
آئو ان کہنہ عمارتوں کے صدر دروازوں سے گزریں
جن پہ استادہ غلام روحیں
گردوغبار سے اٹے جسموں
اور بھر بھری ہڈیوں میں تبدیل ہوچکی ہیں (نصیر احمد ناصر:ایک تصویر زا نظم کا اسپکٹروگرام)(۱۵۰)

نصیر احمد ناصر کے بہ قول زمین کی اس زندگی کو انسان نے خود اس طرح تباہ کردیا ہے کہ اب سانس لینے کی فُرصت بھی میسر نہیں ہے اور اس کے لیے بھی اسے دوسرے سیّاروں کا سفر اختیار کرنا ہوگا۔

ہمیں اب سانس لینے کے لیے بھی
دور کے دیسوں کی جانب ہجرتیں کرنی ہیں

پرانا دور پھر سے لوٹ آیا ہے
تلاشِ رزق میں نکلے ہوئے
انسان صدیوں کے تصادم سے گزر کر
اجنبی خطوں میں خوش حالی کے پیچھے بھاگتے ہیں)نصیر احمد ناصر:امیگریشن)(۱۵۱(

زندگی کی اس درماندگی سے اکتایا ہوا شاعر اُس نئی دنیا کا طلب گار ہے جہاں غم و آلام کا گزر نہ ہو۔ لیکن ایک مسئلہ یہ آن پڑتا ہے کہ وہ اُس دنیا کی طرف جانے والوں راستوں سے نا آشنا ہے جہاں زندگی کی نئی قسم اور نیا آہنگ انسانیت کو خوش آمدید کہے۔اسی لیے نذر محمد راشد رقم طراز ہیں:

کاش بتلادے کوئی
مجھ کو بھی اس وادیٔ پنہاں کی راہ
مجھ کو اب تک جستجو ہے
زندگی کی تازہ جولاں گاہ کی)ن۔م۔راشد:وادیٔ پنہاں)(۱۵۲(

نئی دنیا کی یہی طلب راشد کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اس کی تلاش میں نکلیں اور تلاش کا یہ سفر وہ اپنے گھر اپنی مٹی سے سوال کرکے شروع کرتے ہیں۔

ریگ ‘ اے صحرا کی ریگ
مجھ کو اپنے جاگتے ذرّوں کے خوابوں کی
نئی تعبیر دے)ن۔م۔راشد:دل‘ مرے صحرانوردِ پیردل)(۱۵۳(

اُن دنیائوں کا راستا نا معلوم سہی لیکن راشد اُن دنیائوں کے احساسات ضرور رکھتے ہیں ۔ وہ دنیائیں جو اُن کے تصوّر میں بستی ہیں۔ وہ دنیائیں جو زمان و مکان کی سرحدوں سے پرے ہیں۔ انھی دنیائوں کی تلاش اور معرفت کے سفر میں راشد خود کو اس نگری کا شہزادہ محسوس کرتے ہیں۔

ہاں مگر اتنا تو ہے‘
میری دنیا کو مٹاکر ہوچلی ہیں آشکار
اور دنیائیں مقام ووقت کی سرحد کے پار
جن کی تو ملکہ ہے میں ہوں شہریار! (ن۔م۔راشد:ہونٹوں کا لمس)(۱۵۴(

اجنبی دنیا کے طرزِ معاشرت کا جو خاکہ نصیر احمد ناصر کے ہاں ابھرتا ہے اس کا اظہار اُس اجنبی دُنیا کے باسی سے کی گئی گفت گو سے اُجاگر ہوتا ہے۔ ایسی دنیا کہ جس کے گھر ‘ گیت‘ اندازِ معاشرت سب ہی کچھ جدّت کا حامل ہوگا اور ہم سے بہت ہی مختلف۔

اجنبی‘ کس خواب کی دنیا سے آئے ہو؟
تھکے لگتے ہو
آنکھوں میں کئی صدیوں کی نیندیں جاگتی ہیں
فاصلوں کی گرد پلکوں پر جمی ہے
اجنبی! کیسی مسافت سے گزر کر آرہے ہو
کون سے دیسوں کے قِصّے
درد کی خاموش لے میں گارہے ہو
دور سے نزدیک آتے جارہے ہو

اجنبی آئو!
کسی اگلے سفر کی رات سے پہلے
ذرا آرام کرلو
پھر سنیں گے داستاں تم سے انوکھی سرزمینوں کی
ہوا میں تیرتے رنگیں مکانوں کی‘ مکینوں کی
پڑائو اک جنم کا ہے
الائو تیز ہونے دو
محبت خیز ہونے دو
شناسا خواہشوں کی خوشبوئیں جلنے لگی ہیں
اجنبیت۔ ۔ قربتوں کے لمس میں سرشار
گم گشتہ زمانے ڈھونڈتی ہے
زندگی دکھ درد بھی قرنوں پرانے ڈھونڈتی ہے!!
)نصیر احمد ناصر:اجنبی‘ کس خواب کی دنیا سے آئے ہو)(۱۵۵(

زمین ‘ معراجِ انسانی کے سفر کی ایک منزل ہے جس پر اُس نے قابو پا لیا ہے۔ شاعر زمین کو ایک محبوب عورت کی شکل میں دیکھتا ہے اور اس کی محبت پاشیوں پر اُس کا شُکر گزار بھی۔ لیکن وہ ایک ایسا آوارہ گرد ہے جسے ابھی سفر کو جاری رکھنا ہے۔ اسی لیے وہ اس مہربان عورت (زمین) سے کہتا ہے:

مجھے اذنِ سفر دے مہرباں عورت!
میں عمروں کا تھکا ہارا مسافر ہوں۔۔‘
تری چھتنار چھائوں میں
چلا آیا ہوں پل بھر کے لیے
اگلا سفر مجھ کو صدائیں دے رہا ہے
راستے پھر سے مجھے آواز دیتے ہیں!

میناپنا جسم اوڑھے کب سے بیٹھا ہوں
مجھے پہچان ‘ مجھ کو آشنائی دے
مجھے قیدِ بدن سے اب رہائی دے
مجھے لمبی جدائی دے
مجھے اس ہجر لمحے کی بشارت دے
جو ملتا ہے
ابد کے اس کنارے پر
کسی روشن ستارے پر
زمینی خواہشوں سے ماورا کردے
مجھے اپنے دکھوں کی انتہا کردے!!
مرے اگلے سفر کی ابتدا کردے!!!
)نصیر احمد ناصر:سفر مجھ کو صدائیں دے رہا ہے)(۱۵۶(

شہزاد احمد کائنات کی بے پناہی کے قائل ہیں۔ اُنھیںایک ہی ذرّے میں ڈھیروں کائناتیں بھی رقصاں محسوس ہوتی ہیں اور وہی ایک ذرّہ ان کا مطمعِ نظربھی ہے۔ ایک عملی سائنس دان کی طرح وہ بھی اُس ذرّے کے سحر میں مبتلا ہیں۔

کسی ایسے زمانے کی طرف جانے کی خواہش ہے
جہاں سارے زمانے' سارے رستے ایک ہوجائیں
جہاں ذرّوں کے اندر کائناتیں رقص کرتی ہوں
جہاں بس ایک لمحے میں کئی صدیاں گزرتی ہیں (شہزاد احمد: زمانے ان گنت گزرے)(۱۵۷)

مستقبل کی دنیا کو ہم ایک چھوٹے سے گھر کے ایک کونے میں بیٹھ کر سوچ رہے ہیں۔ لیکن ہمیں تو یہ بھی نہیں پتا کہ کیا ہمارے حصّے میں صرف سوچ ہی رہے گی اور دوسری دنیائوں سے ہمیں کوئی دستک بھی موصول نہیں ہوگی یا نہیں۔

لیکن میں
جو اپنے گھر کے اک کونے میں بیٹھا ہوں
اور سوچ رہا ہوں
مستقبل میں کیا ہوگا؟
کیا ایسے ہی
اپنے پاگل پن کی انگلی تھامے
اپنے گھر کے اس چھوٹے سے لان میں
گھومتے گھومتے میں تھک جائوں گا!
اور مرے دروازے پر
دستک بھی نہیں ہوگی (شہزاد احمد: دستک بھی نہیں ہوگی)(۱۵۸)

تفکراتِ انسانی کائنات کو سمجھنے کی کوشش میں بہت سے سوالات کو جنم دیتے ہیں۔ وہ آفاقی سوالات جن کا مقصد کائنات کی تفہیم ہے اور وہ سماجی سائنسز سے تعلق رکھتے ہیں ساقی فاروقی کے ہانکچھ یوں سامنے آتے ہیں:

یہ ناچتی زمین یہ رفتار کس لیے
لوٹتی لہریں
ڈوبتا سورج
بھاگتی شام
ہر سمت یہ زوال کا اقرار کس لیے
سوچتی آنکھیں
ٹوٹتے رشتے
بھولتے نام
یہ سب طلسم کیا ہیں یہ اسرار کس لیے (نیا آدمی پرانا سوال)(۱۵۹)

جب شاہین مفتی کی نظر کائنات کی دیگر اشیا پر پڑتی ہے تو اُنھیں ہر شے میں سوال ہی سوال دکھائی دیتے ہیں اور وہ ان کی حقیقت جاننے کے لیے بے تاب ہو جاتی ہیں۔

دھرتی اتنی میلی کیوں ہے؟
اور سورج چمکیلا کیوں ہے؟
آندھی اتنی پاگل کیوں ہے؟

اور بادل جوشیلا کیوں ہے؟
قوسِ قزح کا ریشمی آنچل
اتنا رنگ رنگیلا کیوں ہے؟
تارے اتنے مدھم کیوں ہیں؟
راتیں اتنی کالی کیوں ہیں؟
چاند!
تو اتنا پیلا کیوں ہے؟)شاہین مفتی:؟)(۱۶۰(

یہی سوالات جب شہزاد احمد کے ہاں آتے ہیں تو شدت اختیار کر جاتے ہیں جیسے:

ہماری روشنی میں گرد کیوں ہے
نئے سورج کا چہرہ زرد کیوں ہے
ہمارا خون اتنا سرد کیوں ہے
ہمارا دل مجسم درد کیوں ہے)شہزاد احمد: بہت بے آبرو ہونے کے دن ہیں)(۱۶۱(

ایک اہم سوال یہ بھی سامنے آتا ہے کہ انسان کا یہ دعوا ہے کہ اس نے کائنات کو تسخیر کر لیا ہے لیکن کیا واقعی ہی وہ اس بازی کا فاتح ہے یا مفتوح ہونا اس کا مقدر؟ کیوں کہ وہ تو یہ جیتی بازی بھی ہارا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

میں کس دنیا میں رہتا ہوں
میرے چاروں طرف یہ تہ در تہ بے زاری کیوں ہے؟
اس دنیا سے بھاگنے کی تیاری کیوں ہے؟
جو بازی ہم جیت چکے تھے
ہاری کیوں ہے؟)شہزاد احمد:میں کس دنیا میں رہتا ہوں)(۱۶۲(

آخر کون ہے ایسا جو' ان تمام تر حقائق سے پردہ اٹھا سکتا ہے ۔ وہ فرد کہ جس کے سامنے تاریکی بھی اپنے سیاہ دامن کی اوٹ سے حقیقت کی روشنی کو سامنے لے آئے

یہ چاروں اور پھیلی تیرگی کس لیے؟
مگر وہ کون ہے جو تیرگی ہے!
تیرگی کے سارے رنگوں کی حلاوت سے شناسا ہے
مگر پھر بھی وہ پیاسا ہے۔)شہزاد احمد:خاک بھی تو روشن ہے)(۱۶۳(

کیا ہم فلک کی گہرائیوں' اس کی سچائیوں کو جان چکے ہیں؟ کیا ہمارے علاوہ بھی کہیں کوئی اور موجود ہے؟ ہم تو اس معلومہ کائنات سے بھی بے بہرہ ہیں تو پھر کیا کوئی اور ہے جو ہم سے برتر ہو اور ہماری موجودگی سے آشنا بھی ہو؟کائنات کے ہر لمحہ بدلتے تناظرات ہر حساس انسان کو ہر لمحہ ورطۂ حیرت میں مبتلا رکھتے ہیں۔

ہم نے صدیوں تک ان تاروں اور سیاروں کو
فلک کے خیمے کے رخنے ہی جانا تھا
ہم نے اس وسعت کو کب پہچانا تھا
جس کے بارے میں اب سوچ کے ڈر لگتا ہے
کیا ہم اتنے بڑے جہاں میں تنہا ہیں
کیا کسی جانب کوئی اور نہیں ہے؟
جس کو یہ معلوم ہو

ہم موجود ہیں---)شہزاد احمد:اتنا بڑا جہاں ہے)(۱۶۴(

جب دھرتی سے شہزاد احمد کو کوئی جواب نہیں ملتا تو پھر وہ آسمان سے ہی سوال کر کے اس کے گم نام گوشوں کا علم حاصل کرنے کی سعی کرتے ہیں اور آسمان سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:

آسماں ترے پرے کیا ہے۔ بتا
دوسری سمت جو عالم ہے
وہ کس رنگ کا ہے
کیا اُدھر بھی ہے وہی کُچھ
جو ادھر ہے موجود)شہزاد احمد: اس قدر کھیل نہ کھیلے جاتے)(۱۶۵(

پھر دیکھنا یہ بھی ہے کہ ان میں اہم کون ہے؟ آسمان یا زمین؟ کون ہے جو ہمیں اس راز تک پہنچا سکے کہ ہم زمین کے اوپر ہیں یا آسمان کے نیچے۔ جب ہم خود کو موجود رکھ کر بھی اپنی موجودگی کو نہیں جان سکتے تو پھر حقیقت کیا جانیں؟

یہ کیا طلسم ہے‘ کیاراز ہے‘ کہاں ہیں ہم؟
تہِ زمیں ہیں کہ بالائے آسماں ہیں ہم؟
کہ ایک خواب میں بے مدعا رواں ہیں ہم؟)ن۔م۔راشد: زندگی‘ جوانی‘ عشق‘ حسن)(۱۶۶(

جب ہم ان باتوں کو جان پائیں گے تو ہمارا ضمیر شاید کچھ اطمینان پائے۔ اس کے لیے ہمیں اپنی حقیقت کی طرف لوٹنا ہے لیکن وہ راستا کہاں ہے جو ہمیں منزل تک پہنچائے؟

بتا وہ راستہ کہاں ہے جس سے پھر
جنوں کے خواب‘
یا خرد کے خواب‘
یا سکوں کے خواب‘
لوٹ آئیں گے
بتا وہ راستہ کہاں؟)ن۔م۔راشد:بے مہری کے تابستانوں میں)(۱۶۷(

الغرض انسان نے سماجی سطح پر کائنات کو اور خود کو سمجھنے کی خاطر خواہ سعی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُسے سماجی حیوان کہا جاتا ہے۔ سماج بنانے اور اس کے اصول و ضوابط مرتب کرنے میں ہمیشہ انسان کے تصوّرِ کائنات نے اس کی مدد کی ہے۔ مختلف سماجی علوم کے ماہرین نے جو جو کائناتی نظریات پیش کیے ہیں جدید اردو نظم کے شعرانے ان نظریات کو اپنی تخلیقی کاوشوں میں جگہ دی ہے اور خدا ‘ انسان اور کائنات کے تعلقات کی سعی کی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے لگے بندھے سماجی نظریات کو ہی نظم میں سمو کر رکھ دیا ہے بل کہ وہ سیاسی و سماجی نظریات پر تنقید بھی کرتے ہیں اور انھیں غلط قرار دے کر ایک انسانی کائنات کا خواب دیکھتے ہیں ۔ وہ کائنات ‘ وہ دنیا‘ وہ جہان جہاں انسانیت ہی معراجِ انسانی کا سبب قرار پائے اور تمام انسان برابر ہوں۔ اگر ایساہونا اس دنیا پر ممکن نہیں تو انھیں نئی دنیا چاہیے جو ان سماجی اصولوں کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔اسی لیے جدید اردو نظم کے شعرا اس معلومہ کائنات اور اس کے اجرام سے پرے دیکھنے کے خواہاں ہیں اور اپنے تخیل کی بنیاد پر وہاں موجود دنیائوں کو نہ صرف دیکھتے ہیں بل کہ ان سے دوستانہ روابط استوار کرنے کے بھی تمنائی ہیں۔ ان کا تخیل‘ اُن‘ اَن دیکھی دنیائوں کی

سیرکرواتا ہے اور اُنھیں اَن دیکھی مخلوقات سے گفتگو پر اکساتا ہے جو ابھی تک سائنس کی دست رس سے باہر ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ طاہرہ پروین: تنقیدی اور تہذیبی مطالعے‘ نئی دہلی‘ قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان‘ ۲۰۰۷ء‘ ص۳۰
۲۔ مبارک احمد: کلیاتِ مبارک‘ لاہور‘ مبارک پبلشرز‘ ۱۹۹۹ء‘ ص ۴۰۱
۳۔ اظہر غوری : اظہر غوری کی نظمیں(غیر مشروط محبت)‘ لاہور‘ ملٹی میڈیا افئیرز‘ ۲۰۰۰ء‘ ص۴۱۳۔۴۰۷
۴۔ نصیر احمد ناصر: تیسرے قدم کا خمیازہ‘ لاہور‘ سانجھ پبلیشرز‘ ۲۰۱۳ء‘ ص۶۹۔۶۸
۵۔ راشد‘ ن م: کلیاتِ راشد‘ مرتبہ خالد شریف‘ لاہور‘ ماورا پبلشرز‘ س ن‘ ص۱۱۱
۶۔ عبداللہ حرم زئی، ڈاکٹر، دام شعور___ سائے سراب التباس، لاہور: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۲ء، ص۴۰
۷۔ نصیر احمد ناصر: تیسرے قدم کا خمیازہ‘ ۲۰۱۳ء‘ ص۹۸
۸۔ اظہر غوری: اظہر غوری کی نظمیں (غیر مشروط محبت)‘ ص۲۰۸۔۲۰۷
۹۔ شہاب صفدر: نیلگوں‘ فیصل آباد‘ مثال پبلشرز‘ ۲۰۱۳ء‘ ص
۱۰۔ عبدالرشید: بنکاک میں اجنبی‘ لاہور‘ ملٹی میڈیا افئیرز‘ ۲۰۰۵ء‘ ص ۱۸
۱۱۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ‘ لاہور‘ الحمد پبلی کیشنز‘ ۱۹۹۷ء‘ ص۱۳۴۔۱۳۳
۱۲۔ افتخار نسیم: نرمان‘ فیصل آباد‘ ہم خیال پبلشرز‘ ۱۹۹۴ء‘ ص۸۰
۱۳۔ اعجاز رضوی: بہت سے دُکھ ہیں‘ لاہور‘ ادراک پبلی کیشنز‘ ۱۹۹۷ء‘ ص ۱۸
۱۴۔ عبدالرشید: بنکاک میں اجنبی‘ ص ۱۲۲
۱۵۔ اعجاز رضوی: بہت سے دُکھ ہیں‘ ص ۳۵
۱۶۔ احمد فقیہہ: حرفِ انکار‘ لاہور‘ الحمد پبلی کیشنز‘ ۲۰۱۱ء‘ ص ۲۴
۱۷۔ حسنین بخاری، کہکشانی پازیبیں، لاہور: سعادت آرٹ پریس، ۱۹۹۲ء‘ص۹۶
۱۸۔ افضال احمد سید: مٹی کی کان‘ کراچی‘ آج پبلشرز‘ ۲۰۰۹ء‘ ص ۲۱۱
۱۹۔ یوسف ظفر: کلیاتِ یوسف ظفر مرتبہ ڈاکٹر تصدق حسین راجا‘ اسلام آباد‘ روداد پبلی کیشنز‘ ۲۰۰۵ء‘ ص ۲۷۲
۲۰۔ حسنین بخاری، آشعوری سیارگاہیں، لاہور: محمد پبلشرز، ۱۹۹۶ء‘ ص ۱۰۸

۲۱۔ شاہین مفتی: کنارہ کس نے دیکھا ہے‘ کراچی‘ اکادمی بازیافت‘ ۲۰۰۹ء‘ ص۲۹۲
۲۲۔ نصیر احمد ناصر: پانی میں گم خواب‘ لاہور‘ تسطیر پبلشرز‘ ۲۰۰۲ء‘ ص ۳۶۔۳۵
۲۳۔ اختر حسین جعفری: آئینہ خانہ‘ لاہور‘ مطبوعات پبلی کیشنز‘ ۱۹۸۸ء‘ ص۱۵۴
۲۴۔ افضال احمد سید: مٹی کی کان‘ص ۷۹
۲۵۔ عبدالرشید: انی کنت من الظالمین‘ لاہور‘ سانجھ پبلشرز‘ ۲۰۱۱ء‘ ص ۴۱
۲۶۔ ایضاً‘ ص ۹۳
۲۷۔ جواز جعفری: مٹھی میں تیرا وعدہ‘ لاہور‘ خواب پبلشرز‘ ۱۹۹۶ء‘ ص ۱۰۷۔۱۰۶
۲۸۔ نصیر احمد ناصر: تیسرے قدم کا خمیازہ‘ ص۷۸
۲۹۔ امجد اسلام امجد: ساحلوں کی ہوا‘لاہور‘ جہانگیر بک ڈپو‘۲۰۰۰ء‘ ص ۸۳۔۸۲
۳۰۔ ایضاً‘ ص ۸۳
۳۱۔ ایضاً‘ ص ۸۳
۳۲۔ ایضاً‘ص ۸۷۔۶۸
۳۳۔ اظہر غوری: اظہر غوری کی نظمیں (غیر مشروط محبت) ‘ ص۲۰۹
۳۴۔ حسنین بخاری: آشعوری سیارگاہیں‘ص ۱۲۵۔۱۲۶
۳۵۔ ایضاً‘ص ۱۲۴
۳۶۔ سلیم شہزاد: قسم ہے کفارے کی‘ لاہور‘ بک ہوم‘ ۲۰۰۹ء‘ ص ۱۲۶
۳۷۔ نصیر احمد ناصر: پانی میں گم خواب‘ لاہور‘ تسطیر پبلشرز‘ ۲۰۰۲ء‘ ص ۹۶
۳۸۔ ایضاً‘ ص ۳۷۔۳۶
۳۹۔ اختر حسین جعفری: آئینہ خانہ‘ ص ۲۵
۴۰۔ ایضاً‘ ص۱۱۳
۴۱۔ زاہد ڈار: تنہائی‘ لاہور‘ سنگِ میل پبلی کیشنز‘ ۱۹۸۸ء‘ ص ۱۸۸
۴۲۔ ایضاً‘ص ۱۹۷
۴۳۔ شہزاد احمد:آنے والا کل‘ لاہور‘ ملٹی میڈیا افئیرز‘ ۲۰۰۵ء‘ ص۲۱۵
۴۴۔ فیض احمد فیض:نسخہ ہائے وفا‘ لاہور‘ مکتبہ کارواں‘ س ن‘ ص۸۴
۴۵۔ عبدالرشید: بنکاک میں اجنبی‘ ص ۱۲۵
۴۶۔ عامر سہیل: دجلۂِ دل‘ لاہور‘ بک ہوم‘ ۲۰۱۴ء‘ ص ۹۲۔۹۱
۴۷۔ ایوب خاور: گُلِ موسمِ خزاں‘ لاہور‘ الحمد پبلی کیشنز‘ ۲۰۱۳ء‘ ص ۴۵
۴۸۔ اعجاز رضوی: بہت سے دُکھ ہیں‘ ص ۵۹
۴۹۔ سلیم الرحمان: شام کی دھلیز‘ لاہور‘ لوگ پبلشرز‘ ۱۹۹۳ء‘ ص۵۷
۵۰۔ اختر حسین جعفری: آئینہ خانہ‘ ص۱۲۲۔۱۲۱
۵۱۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ‘ ص۱۵۳۔۱۵۲
۵۲۔ شہزاد احمد: مٹی جیسے لوگ‘ لاہور‘ ملٹی میڈیا افئیرز‘ ۲۰۰۹ء‘ ص۱۲۲
۵۳۔ زاہد امروز: خود کشی کے موسم میں‘ کراچی‘ آج پبلشرز‘ ۲۰۰۹ء‘ ص ۹۹
۵۴۔ فیض احمد فیض:نسخہ ہائے وفا‘ ص۵۰۶
۵۵۔ نصیر احمد ناصر: تیسرے قدم کا خمیازہ‘ص۷۴
۵۶۔ زاہد ڈار: تنہائی‘ص ۱۷
۵۷۔ ایضاً‘ ص ۸۱

۵۸۔ شہزاد احمد:آنے والا کل‘ لاہور‘ ص۱۹۱
۵۹۔ جواز جعفری:عمرِ رواں سے پرے‘لاہور‘ فکشن ہائوس‘ ۲۰۰۴ء‘ص۱۵۲
۶۰۔ سلیم الرحمان: شام کی دھلیز‘ ص۱۶
۶۱۔ ایضاً‘ ص۹۷
۶۲۔ نصیر احمد ناصر: تیسرے قدم کا خمیازہ‘ ص۹۵۔۹۴
۶۳۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ‘ ص۵۳
۶۴۔ جواز جعفری:عمرِ رواں سے پرے‘ص۱۵۴
۶۵۔ عبدالرشید: انی کنت من الظالمین‘ ص ۹۵
۶۶۔ افضال احمد سید: مٹی کی کان‘ ص ۲۳
۶۷۔ ایضاً‘ ص ۲۳
۶۸۔ ایضاً‘ ص ۲۳۹
۶۹۔ احمد صغیر صدیقی: تجرید‘ کراچی‘ شمع بُک ایجنسی‘ ۲۰۰۶ء‘ ص۱۲
۷۰۔ اختر حسین جعفری: آئینہ خانہ‘ ص ۱۱۰
۷۱۔ زاہد امروز: کائناتی گرد میں عریاں شام‘ لاہور‘ سانجھ پبلیشرز‘ ۲۰۱۳ء‘ ص۸۵
۷۲۔ زکریا‘ خواجہ محمد (مرتب): انتخابِ زریں نظم‘ لاہور‘ سنگت پبلیشرز‘ ۲۰۰۷ء‘ ص ۲۰۷۔ ۲۰۶
۷۳۔ زاہد ڈار: تنہائی‘ لاہور‘ سنگِ میل پبلی کیشنز‘ ۱۹۸۸ء‘ ص۹۴۔ ۹۳
۷۴۔ شاہین مفتی: کنارہ کس نے دیکھا ہے‘ ص۲۸۲
۷۵۔ عبدالرشید: انی کنت من الظالمین‘ ص ۵۲
۷۶۔ اعجاز رضوی: بہت سے دُکھ ہیں‘ ص ۱۹
۷۷۔ اشفاق حسین: آشیاں گم کردہ‘ لاہور‘ وجدان پبلی کیشنز‘ ۲۰۰۹ء‘ ص ۶۵
۷۸۔ افضال احمد سید: مٹی کی کان‘ ص ۱۹
۷۹۔ سلیم الرحمان: شام کی دھلیز‘ ص۱۷
۸۰۔ اختر حسین جعفری: آئینہ خانہ‘ ص ۱۱۲۔۱۱۱
۸۱۔ زاہد ڈار: تنہائی‘ ص ۸۲
۸۲۔ ایضاً‘ ص ۸۷
۸۳۔ ایضاً‘ ص ۸۹۔ ۸۸
۸۴۔ شہزاد احمد:آنے والا کل‘ لاہور‘ ص۱۸۷
۸۵۔ شہزاد احمد: مٹی جیسے لوگ‘ ص۸۰
۸۶۔ ایضاً‘ ص۸۸
۸۷۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ‘ ص۵۴
۸۸۔ ایضاً‘ ص۵۵۔۵۴
۸۹۔ ایضاً‘ ص۷۱
۹۰۔ ایضاً‘ ص۱۱۳۔۱۱۲
۹۱۔ جواز جعفری:عمرِ رواں سے پرے‘ص۷۰
۹۲۔ راشد‘ ن۔م: کلیاتِ راشد‘ ص۵۱۵
۹۳۔ افضال احمد سید: مٹی کی کان‘ ص ۲۴۱۔۲۴۰

۹۴۔ زاہد امروز: خود کشی کے موسم میں، ص ۴۵
۹۵۔ افضال احمد سید: مٹی کی کان، ص ۷۸
۹۶۔ ایضاً، ص ۷۸
۹۷۔ عامر سہیل: غدر کے پھول، لاہور، سانجھ پبلشرز، ۲۰۱۰ء، ص ۱۴۳۔۱۴۲
۹۸۔ عامر سہیل: غدر کے پھول، لاہور، سانجھ پبلشرز، ۲۰۱۰ء، ص ۱۷۴
۹۹۔ سلیم شہزاد: قسم ہے کفارے کی،ص ۱۰۹
۱۰۰۔ اعجاز رضوی: بہت سے دُکھ ہیں، ص ۲۷۔۲۶
۱۰۱۔ ایضاً، ص ۲۷
۱۰۲۔ افضال احمد سید: مٹی کی کان،ص ۲۵۳۔۲۵۲
۱۰۳۔ مبارک احمد: کلیاتِ مبارک، ص ۳۸۸
۱۰۴۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ، ص
۱۰۵۔ اظہر غوری: اظہر غوری کی نظمیں (غیر مشروط محبت) ، ص۲۹۰
۱۰۶۔ افضال احمد سید: مٹی کی کان، ص ۲۴
۱۰۷۔ نصیر احمد ناصر: پانی میں گم خواب، ص ۸۰۔۷۹
۱۰۸۔ ایضاً، ص
۱۰۹۔ نصیر احمد ناصر: زرد پتوں کی شال، لاہور، سانجھ پبلشرز، ۲۰۱۳ء، ص ۹۵
۱۱۰۔ ایضاً، ص ۸۳
۱۱۱۔ ایضاً، ص ۵۱
۱۱۲۔ ایضاً، ص ۲۶
۱۱۳۔ ایضاً، ص ۲۵
۱۱۴۔ زاہد امروز: خود کشی کے موسم میں، ص ۲۶
۱۱۵۔ سلیم الرحمان: شام کی دہلیز، ص۳۹
۱۱۶۔ اختر حسین جعفری: آئینہ خانہ، ص ۶۱
۱۱۷۔ ایضاً، ص ۱۰۵
۱۱۸۔ ایضاً، ص۱۲۵
۱۱۹۔ جواز جعفری: عمرِ رواں سے پرے،ص۴۵
۱۲۰۔ عامر سہیل: شہیدِ عشق، لاہور، سانجھ پبلیشرز، ۲۰۰۹ء، ص۱۵۷
۱۲۱۔ زاہد امروز: کائناتی گرد میں عریاں شام، ص۲۳
۱۲۲۔ زاہد ڈار: تنہائی، ص ۵۹
۱۲۳۔ ایضاً، ص ۱۰۷
۱۲۴۔ یوسف ظفر: کلیاتِ یوسف ظفر مرتبہ ڈاکٹر تصدق حسین راجا،ص ۴۷
۱۲۵۔ جواز جعفری: عمرِ رواں سے پرے،ص۴۵
۱۲۶۔ شاہین مفتی: کنارہ کس نے دیکھا ہے،ص۳۴۷
۱۲۷۔ عبدالرشید: انی کنت من الظالمین، لاہور، سانجھ پبلشرز، ۲۰۱۱ء، ص ۹۲
۱۲۸۔ فیض احمد فیض:نسخہ ہائے وفا، ص۳۳
۱۲۹۔ ایضاً، ص۶۵
۱۳۰۔ جواز جعفری:عمرِ رواں سے پرے،ص۸۵

۱۳۱۔ فیض احمد فیض:نسخہ ہائے وفا، ص۱۲۳
۱۳۲۔ نصیر احمد ناصر: تیسرے قدم کا خمیازہ، ص۷۳۔۷۲
۱۳۳۔ نصیر احمد ناصر: عرابچی سوگیا ہے، لاہور، تسطیر پبلشرز، ۲۰۰۲ء، ص۱۹
۱۳۴۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ، ص۹۱۔۸۹
۱۳۵۔ راشد، ن۔م: کلیاتِ راشد، مرتبہ خالد شریف، ص۵۲
۱۳۶۔ اعجاز رضوی: بہت سے دُکھ ہیں، ص ۶۶۔۶۵
۱۳۷۔ ایضاً، ص ۸۴
۱۳۸۔ اشفاق حسین: آشیاں گم کردہ، ص ۱۷۵
۱۳۹۔ افضال احمد سید: مٹی کی کان، ص ۲۴
۱۴۰۔ افتخار نسیم: نرمان،ص۱۳۰
۱۴۱۔ جواز جعفری:عمرِ رواں سے پرے،ص۶۹
۱۴۲۔ نصیر احمد ناصر: زرد پتوں کی شال، ص ۱۱۹
۱۴۳۔ ایضاً، ص ۱۰۶
۱۴۴۔ زاہد امروز: خود کشی کے موسم میں، ص ۴۳
۱۴۵۔ سلیم الرحمان: شام کی دہلیز، ص۵۵
۱۴۶۔ افضال فردوس: جب سارا کاجل بہہ جائے، لاہور، دستاویز مطبوعات، ۲۰۰۰ء، ص۱۲۵
۱۴۷۔ جاوید انور: اشکوں میں دھنک، لاہور، الحمد پبلیشرز، ۱۹۹۴ء، ص۳۲۔۳۱
۱۴۸۔ جواز جعفری:عمرِ رواں سے پرے،ص۶۴
۱۴۹۔ نصیر احمد ناصر: تیسرے قدم کا خمیازہ، ص۲۱
۱۵۰۔ ایضاً، ص۳۱۔۳۰
۱۵۱۔ نصیر احمد ناصر: عرابچی سوگیا ہے،ص۵۲۔۵۱
۱۵۲۔ راشد، ن۔م: کلیاتِ راشد، مرتبہ خالد شریف، ص۲۷۳
۱۵۳۔ ایضاً، ص۶۰
۱۵۴۔ ایضاً، ص۶۷
۱۵۵۔ نصیر احمد ناصر: عرابچی سوگیا ہے، ص۷۷۔۷۶
۱۵۶۔ ایضاً، ص۸۰۔۷۸
۱۵۷۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ، ص۴۰
۱۵۸۔ ایضاً، ص۶۱
۱۵۹۔ ساقی فاروقی: زندہ پانی سچا، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء، ص ۸۸
۱۶۰۔ شاہین مفتی: کنارہ کس نے دیکھا ہے، ص۱۳۰
۱۶۱۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ، ص۵۲
۱۶۲۔ شہزاد احمد: مٹی جیسے لوگ، لاہور، ص۷۹
۱۶۳۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ، ص۴۶
۱۶۴۔ ایضاً، ص۷۳
۱۶۵۔ ایضاً، ص۱۰۶
۱۶۶۔ راشد، ن۔م: کلیاتِ راشد، مرتبہ خالد شریف، ص۵۰
۱۶۷۔ ایضاً، ص۵۱۲

باب پنجم

جدید اُردونظم ،طبیعیات اور ما بعدالطبیعیات

کائنات فہمی میں تعقل اور سائنس کی سطح پرجن علوم نے سب سے زیادہ اہم کردار ادا کیا ہے وہ ہیں ریاضی‘ فلکیات اور طبیعیات۔ مابعدالطبیعیات نے مذہبی تناظر میں کائنات کی تفہیم کا بیڑا اٹھایا۔ابتدائی کوششیں فلکیاتی مطالعہ سے شروع ہوئیں اور ریاضیاتی کلیوں کی مدد سے اس کی ترقی کی گئی۔ بعد ازاں کائناتی مطالعہ ایک خاص علم تصوّر کیا جانے لگا جس کا زیادہ تر تعلق علمِ ریاضی اور طبیعیات سے ہے۔ جو چیزیں تجربے کی زد میں آتی ہیں انھیں طبیعیات کے تحت سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور تجربے سے باہر اشیا کو ریاضیاتی تناظر میں سامنے لایا جاتا ہے۔

نیوٹن اپنے بارے میں کہتا ہے کہ

’’مجھے نہیں معلوم کہ دنیا میرے متعلق کیا سمجھتی ہے۔ لیکن میں تو اپنے آپ کو ایک چھوٹے سے بچّے کی طرح سمجھتا ہوں جو ساحل پر بیٹھا چند خوش رنگ سیپیوں سے کھیل رہا ہو جب کہ اُس کے سامنے حقائق کا ایک گہرا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہو۔ وہ سمندر جس کی تھاہ میں نہ جانے کیا کیا بھرا ہوا ہے۔‘‘(۱)

دُنیا کی تقریباً تمام اقوام اور قبائل نے کائنات کے آغاز کے بارے میں اپنی اپنی بساط کے مطابق تحقیق کی ہے۔ سید قاسم محمود شاہ نے انسائیکلو پیڈیا فلکیات میں ان نظریات اور ان کے کرداروں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب کا عقیدہ یہ رہا ہے کہ کائنات کو ایک قادرِ مطلق یعنی خدا نے پیدا کیا ہے۔ اس عقیدے سے ہٹ کر تجسس کا مارا‘ انسان ‘ حقیقت کو اپنی آنکھ سے دیکھنے کی تمنا میں کھوج لگاتا رہا ہے۔ دو تین ہزار سال قبل مسیح میں مصریوں‘ ہندیوں اور اہلِ بابل نے کائنات کی ابتدا کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنے کی کوشش کی تھی۔ کائنات کو جاننے کی یہ روش ان تمام

تہاذیب میں بھی قائم رہی ہے جو اپنے علم اور عقل و دانش کو استعمال کرنے کے حق میں رہی ہیں۔ قدیم مصریوں کے خیال میں ہماری یہ کائنات ایک مستطیل ڈبّے کی صورت میں تھی جس کے قاعدے کے وسط میں مصر واقع تھا۔ آسمان کو وہ ایک ایسی چادر سمجھتے تھے جسے چار پہاڑوں پر اس طور رکھا گیا ہوکہ ہر کونے کے نیچے ایک پہاڑ ہو۔ ستاروں کو آسمان میں ڈوری کے ذریعے لٹکتے ہوئے چراغ سمجھا جاتا تھا۔

سورج کے بارے میں ان کا یہ خیال تھا کہ زمین کے گرد اگرد ایک دریا بہہ رہاہے جس میں ایک بڑی سی کشتی ڈولتی چلی جارہی ہے اور اس کشتی میں ایک بہت ہی چمک دار بڑی سی طشتری رکھی ہے جو سورج ہے۔ ستاروں کے بارے ان کا خیال تھا کہ بڑی تعداد میں اکٹھے ہوکر یہ جھمکے بن جاتے ہیں۔اہلِ بابل کے نظریات بھی کچھ ایسے ہی تھے لیکن بعد ازاں انھوں نے سائنسی بنیاد پر کچھ معلومات اکٹھی کیں اور اجرامِ فلکی پر غور کرتے ہوئے علمِ فلکیات کی مدد سے سورج اور چاند کے مقام کا قبل از وقت ادراک کرنا شروع کردیا۔

اہلِ یونان نے سب سے پہلے باقاعدہ سائنسی نقطۂ نظر سے اس کائنات کو سمجھنے کی کوشش کی۔قدیم یونانی فلسفیوں اور سائنس دانوں نے پتا چلایا کہ کائنات کا نظام ‘ قوانینِ فطرت کے تحت چل رہا ہے اور یہ کوئی ایسی مافوق الفطرت شے نہیں ہے کہ جسے سمجھا نہ جاسکے یا جسے سمجھنے کے لیے محض روحانی واردات اور وجدان کی ضرورت ہو۔ ثالیس ملطی اس نتیجے پر پہنچا کہ تمام اشیا پانی سے بنی ہیں۔ انکسامیندر نے پتا چلایا کہ اجرامِ فلکی قطبی تارے کے گرد گھومتے ہیں۔ انکساغورث نے یہ انکشاف کیا کہ دیگر اجرامِ فلکی کی تشکیل میں بھی وہی مادہ استعمال ہوا ہے جس سے زمین بنی ہے۔ سب سے پہلے ارسطاخوس نے یہ بات کہی کہ سورج کے گرد زمین بیضوی مدار میں گھومتی ہے۔ اس نے ستاروں اور سورج کو غیر متحرک بھی قرار دیا۔

بطلیموس کا یہ نظریہ تھا کہ زمین کائنات کا مرکز ہے اور تمام اجرامِ فلکی اس کے گرد گھومتے ہیں۔ تقریباً پندرھویں صدی تک اس کے نظریات کا دور دورہ رہا۔ کاپرنیکس نے سب سے پہلے اس کے نظریات پر قدغن لگائی اور یہ کہا کہ ہماری معلومہ کائنات کا مرکز زمین نہیں بل کہ سورج ہے۔ جرمنی کے کانٹ نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ ہمارے نظامِ شمسی کے ارکان باریک ذرّات پر مشتمل ایک گھومتے ہوئے دائرے کی کثافت سے تشکیل پاتے ہیں۔

بعد ازاں فرانس کے لاپلاس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ زمانۂ قدیم کا ایک ایسا ہی گولا پھٹا جس سے کثیف مادے پیدا ہوئے اور انھوں نے سیاروں کی شکل اختیار کر لی۔ اس سے آگے بڑھتے ہوئے ہبل نے کہا کہ وہ منجمد مادہ جس سے ہمارے اجرامِ فلکی کی تشکیل ہوئی ہے شروع میں تمام کائنات میں یکساں طور پر پھیلا ہوا تھا۔ اس ذرّات کے پھیلے ہوئے سمندر میں ایک تجاذبی قوّت پیدا ہوئی جس کی بہ دولت توازن قائم رکھنے کے لیے ہر ذرّے نے اپنے ہمسایہ ذرّات کے ساتھ ایک تجاذبی توازن قائم کیا۔ اگر کوئی ذرّہ اس دوران مینااپنی ابتدائی حالت سے ہل گیا تو پھر اس کے لیے اپنا توازن قائم رکھنا ممکن نہ رہا۔ اسی قوّتِ تجاذبہ کی بہ دولت ان ذرّات نے اکٹھے ہوکررقیق مادی اجسام کی شکل اختیار کرلی اور ہر چیز نے کسی مخصوص محور میں گھومنا شروع کردیا۔

اس تجاذبی قوّت کے بڑھنے سے یہ رقیق مادہ پہلے ٹھوس شکل میں آیا اور پھر یہ مواد بیضوی شکل اختیار کرتا چلا گیا۔ گردش کے ساتھ ساتھ ان اجسام کا چپٹا پن بڑھتا چلا گیا۔

گردش اور قوّتِ انجذاب کے مجموعی ردِّ عمل کے طور پر یہ اجسام سکڑنے لگے اور اس سکڑائو کی بہ دولت یہ اجسام بالکل چپٹے پن کا شکار ہو گئے اور مزید تقسیم ہوتے چلے گئے۔ بعدا زاں جارج گیمو نے اپنا فلکیاتی نظریہ پیش کیا جس کی مدد سے اجرامِ فلکی کی عمر کا اندازہ لگانے اور کائنات کے نقطۂ آغاز کا پتا لگانے کی کوششیں کی گئیں۔

کائنات کو سمجھنے کی کوششیں ایک لمبے عرصے تک عیسائیت کے زیرِ اثر رہیں۔ اس عہد میں پوپ ہی سب سے مقتدر ہستی گردانا جاتا تھا لہٰذا اس کی مرضی اور منشا کے خلاف کسی قسم کی‘ کوئی بھی بات ناقابلِ معافی جرم سمجھی جاتی تھی۔ تقریباً سولھویں صدی عیسویں کے وسط تک یہی اندازِ نظر اپنایا جاتا رہا اور اسی سے ملتے جُلتے نظریات پیش کیے جاتے رہے۔ بعد ازاں عملی تجربات اور کائنات کے بارے میں انسانی علم کی ترقی و ترویج نے نئے راستے کھولے۔ ان راستوں پر چلنا کوئی کارِ آسان نہیں تھا۔ پولینڈ کا سائنس دان کوپر نیکس وہ پہلا فرد تھا جس نے ۱۵۴۳ء میں کائناتی تناظر میں اپنا نیا نظریہ پیش کرتے ہوئے زمین کی مرکزیت کا نظریہ ہمیشہ کے لیے دفن کردیا۔ (۲(

انسانی کی کائناتی تفہیم کی کوششیں اس کی ضروریات کے تناظر میں بدلتی چلی گئیں۔ کبھی چاند ستارے اُس کے لیے محض راستا دکھانے کا باعث تھے‘ لیکن بعد میں وہ انسانی سوچ کا مرکزی نقطہ بن گئے۔ انسانی اقدار و تعلقات کی تبدیلیوں نے بھی اسے اپنی سوچ بدلنے پر مجبور کیا۔ پہلے پہل کا انسان صرف زراعت سے متعلق تھا‘ پھر تجارت اس کی زندگی کا خاصہ بنی اور جدید تر ذرایع آمدورفت نے دنیا سے اس کا رابطہ آسان کردیا۔ ان روابط نے بھی ذہنی تبدیلی اور بلوغت کی داغ بیل ڈالی۔ کیوں کہ ان اسفار نے سوچ کے بہت سے نئے در وا کیے۔ مغربی استعمار اور تسلط کے نتیجے میں دنیا ایک رزم گاہ کی صورت اختیار کرگئی۔ وسائل کا حصول اس جنگ کا بنیادی مقصد بنا۔ اسی لیے تاجر طبقے کو اقتدار کی جنگ میں جاگیردار طبقے سے واسطہ پڑا۔ پوپ کی مرکزیت کی حامل دنیا بکھر کر رہ گئی۔ یہ مقابلہ و مسابقت کا پہلوصرف میدانِ جنگ ہی نہیں بل کہ نظریاتی محاذ پر بھی وقوع پذیر اور روز افزوں ہوتا گیا۔ اسی لیے جاگیردارانہ دور کے مابعدالطبیعاتی‘ غیر سائنسی اور نیم مذہبی نقطۂ نگاہ کے بجائے اب ایک مکمل سائنسی اور تجرباتی نقطۂ نگاہ کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔

یہ تجرباتی اور انقلابی نقطۂ نگاہ کوپرنیکس‘ ‘ گلیلیو‘ نیوٹن اور ڈیکارٹ نے فراہم کیا۔اس تجربی سائنسی نقطۂ نگاہ اور کائناتی نظریہ کی تحریک سے سائنسی علوم نے بے حد ترقی کی اور فطرت پر قابو پانے کی جنگ تیز تر ہوگئی۔ فلکیات میں بھی دریافتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ خصوصاً دوربین کی ایجاداور استعمال نے بہت سے نئے در وا کیے۔

سپیکٹرومیٹر اور دیگر نت نئے آلات نے انسان کی تجرباتی سطح کو بڑھادیا۔ اسی لیے نیوٹن نے اس کائنات کو کامل‘ تغیر پذیر اور ہمیشہ رہنے والی قرار دیا۔بعد ازاں مزید تجربات و مشاہدات نے یہ ثابت کیا کہ ہماری کائنات ابھی ہماری دست رس سے باہر کہ ابھی تک تو ہم اپنی اس زمین کو بھی نہیں سمجھ پائے جو لاکھوں کروڑوں کہکشائوں میں سے ایک کہکشاں کے لاکھوں کروڑوں نظام ہائے شمسی میں سے ایک چھوٹے سے نظام کا ایک نسبتاً چھوٹا حصّہ ہے۔ نیز انسان نے ستاروں اور سیاروں کی کھوج لگانے کے بھی نئے نئے انداز سیکھ۔

گو ہماری یہ کائنات بہت وسیع ہے لیکن انسان کی قوت ادراک بھی اس کے مسلسل عمل سے برابر بڑھتی رہتی ہے۔ سائنسی تجربات و مشاہدات سے انسان نے نہ صرف اب تک اس

وسیع کائنات کے بارے میں علم حاصل کیا ہے بل کہ وہ اسے اپنی مرضی کے قالب میں ڈھالنے پر بھی کوشاں ہے۔ اس نے یہ جان لیا ہے کہ کائناتی پیمانے پر تبدیلی کا عمل مسلسل جاری ہے۔ کچھ ماہرین اسے آگے کی طرف حرکت قرار دیتے ہیں اور کچھ واپسی کی طرف حرکت کہتے ہیں۔ اس تبدیلی ہی کی وجہ سے کائناتی مادہ مسلسل اور نت نئے روپ دھارتا رہتا ہے۔ عظیم فاصلوں میں پھیلے ہائیڈروجن کے چار نیوکلیائی مل کر ہیلیم کے نیوکلیس میں بدل جاتے ہیں۔ اس عمل کو FUSION REACTION کہا جاتا ہے جب کہ اس کا الٹ عمل جس میں بڑے مرکزے ٹوٹ کر چھوٹے نیوکلیس بناتے ہیںFISSION REACTION کہلاتا ہے۔

کائناتی تبدیلیاں بنیادی طور پر ان ہی عوامل کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ ان عوامل میں اولذکر کی ابتدا کے لیے انتہائی شدید توانائی کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ ثانی الذکر کی بہ دولت شدید قسم کی توانائی پیدا ہوتی ہے جسے آج ہم ایٹم بم' ہائیڈروجن بم اور نائیٹروجن بم کے ساتھ ساتھ بجلی پیدا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

بعد ازاں جدید سائنسی تحقیقات کا زمانہ ہے۔ اس دورانیے میں ریاضی' طبیعیات اور فلکیات کے امتزاج سے کائنات کو سمجھنے کا جدید رویہ پیدا ہوا۔ نیوٹن کے افکار کے بعد ہیزن برگ کا نظریہ غیر یقینیت وہ قلیدی نکتہ تھا جس نے ہمارے کائناتی تناظرات کو بدل دیا۔ عہدِ جدید میں عظیم دھماکے کے بنیادی ذرّے کو خدائی ذرّے کا نام دے کر کسی نہ کسی صورت خدا کے وجود کا ادراک سائنس کے حصّے آیا۔ اس سلسلے میں عہدِ حاضر کے معروف ریاضی دان اسٹیفن ہاکنگ کے نظریات آج دنیا پر چھائے ہوئے ہیں۔ ان نظریات کا مختصر تعارف تو باب اول میں کروایا جا چکا ہے تاہم جہاں جہاں ضرورت پڑی دوبارہ سے ان کی بازیافت کی جائے گی۔

ڈاکٹر طاہر القادری اپنی تصنیف ''اسلام اور جدید سائنس''میں سائنسی حوالوں سے کائنات کے اختتام اور نظریۂ قیامت پر اس کا انطباق کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ انجام کائنات سے متعلقہ سائنسی تحقیقات ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتی ہیں:ہماری مادی کائنات جس کا آغاز آج سے کم و بیش ۱۵ ,ارب سال پہلے اولین عظیم دھماکے (Big Bang) کی صورت میں ہوا تھا، اس کا انجام آج سے تقریباً ۶۵ ارب سال بعد کائنات کے آخری عظیم دھماکے (Big Crunch) پر ہوگا۔ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب ہماری پھیلتی ہوئی کائنات اپنی نصف عمر گزار لینے کے بعد کشش باہمی کی وجہ سے سکڑاؤ کا شکار ہو جائے گی۔ باہر کو پھیلتی ہوئی کہکشاؤں کی رفتار کم ہو جائے گی۔ حتیٰ کہ وہ رک جائیں گی اور پھر مرکز کی سمت اندرونی انہدام کا شکار ہو جائیں گی اور آپس میں ٹکرا کر مکمل طور پر تباہ ہو جائیں گی۔یہ ٹکراؤ (یعنی بگ کرنچ) بگ بینگ جیسے انتہائی عظیم اولین دھماکے کی طرح ہو گا۔ تمام اجرام سماوی کا مادہ سیاہ شگافوں میں جا گرے گا اور کائنات کی تمام ہائیڈروجن (Hydrogen) اور ہیلیم (Hylium)ستاروں کی تھرمو نیو کلیائی آگ میں جل کر ختم ہو جائیں گی۔ کوئی نیا ستارہ پیدا نہیں ہو گا اور کائنات مردہ ستاروں، شہابیوں، چٹانوں اور انہی جیسے دوسرے کائناتی ملبے پر مشتمل ہو گی۔جب کائنات کی عمر۲۷(۱۰) سال ہو جائے گی تو وہ بہ کثرت ایسے سیاہ شگافوں پر مشتمل ہو گی جو مردہ ستاروں کے جھرمٹ میں گھرے ہوئے ہوں گے۔ کچھ عرصہ مزید گزرنے کے بعد تمام کہکشائیں گھومتی ہوئی ایک دوسرے کی طرف آئیں گی اور آپس میں ٹکراتے ہوئے بڑے کائناتی سیاہ شگافوں (Super Galactic Black Holes) پر منتج ہوں گی۔ آخر کار۱۰۶ (۱۰) سال گزرنے کے بعد وہ عظیم سیاہ شگاف بخارات بن کر ایسے ذرات

اور شعاع ریزی کی صورت میں بھڑک اٹھیں گے جو ایک ارب میگا واٹ ہائیڈروجن بم کے دھماکے کے برابر ہو گی۔تباہی و بربادی کا یہ عمل آج سے ۶۵ ارب سال بعد شروع ہو گا اور ۱۴۰(۱۰)سال بعد مکمل ہو گا۔بالآخر یہ عمل پوری کائنات کو ایک عظیم سیاہ شگاف یا ناقابلِ دید بنا دے گا اور شاید تمام مادہ، توانائی، مکان اور زمان اس میں سمٹ جائے اور وہ دوبارہ سے سکڑتے ہوئے چھوٹی ہو کر 'اکائیت' اور صفر جسامت بن جائے گی اور لاشئی اورغیر موجود (Nothing naght) ہو جائے گی۔ ''(۳(

خدائی ذرّہ کی دریافت نے سائنس اور مذہب کے درمیان خلیج کو پاٹنے میں اہم کردار ادا کیا اور کائنات کو سمجھنے کی مذہبی ترویجات بھی سائنس دانوں کے ہاں جگہ پانے لگیں۔ کوانٹم طبیعیات کے مطالعہ کے دوران مینبہت سے ایسے عوامل سامنے آئے جن کے اسباب و علل کو تجرباتی سطح پر ثابت کرنے میں طبیعیات کے ساتھ ساتھ مابعدالطبیعیاتی سطح کو بھی سامنے رکھنا پڑا۔ مابعدالطبیعیات ' عمومی تجرباتی سطح سے اوپر کی بات ہے۔ اسے اگر روحانیاتی سطح کہا جائے تو بھی غلط نہ ہوگا۔ طبیعیات کے بعد بل کہ اس سے بھی پہلے کائنات کو سمجھنے کا انداز مابعد الطبیعیاتی رہا ہے جس کی ضرورت ابتدائی عہد سے لے کر آج تک محسوس کی جاتی رہی ہے۔ یاد رہے کہ ہر مذہب کی ایک اپنی مابعداطبیعیاتی سطح اور انداز ہے۔ ہر ایک کے اپنے اپنے اصول و ضوابط اور قوانین ہیں جن کا بیان عموماً مذہبی اساطیر کی صورت میں کیا گیا ہے۔ اگر ان اساطیر اور متصوفانہ افکار کا تفصیلی تعارف بھی کروایا جائے تو اس کے لیے ایسے کئی مقالات کی ضرورت ہوگی کیوں کہ افراد کے اس سلسلے میں ہر ایک کے تجربات' انفرادیت کے حامل ہیں۔ ان افکار کا مختصر تعارف پہلے باب میں کروانے کی کوشش کی گئی ہے تاہم جہاں کہیں ضروری محسوس ہوا وہاں ساتھ ساتھ ان کی وضاحت بھی کردی جائے گی۔ یاد رہے کہ تصوف کی روایت میں عشق ایک بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ عشق کی اقسام بتاتے ہوئے سید علی عباس جلال پوری رقم طراز ہیں:

''عشق کے دو پہلو ہیں (i)____عشقِ حقیقی جسے اہلِ مغرب عشقِ روحانی کہتے ہیں۔(ii)____عشقِ مجازی۔ صوفیہ عشقِ حقیقی کے مدعی ہیں اور محبوبِ ازلی سے اظہارِ محبت کرتے ہیں۔ عشقِ مجازی کے دو معروف پہلو ہیں۔(i) رومانی عشق۔ (ii) ہم جنسی عشق''(۴(

تصوف کے بارے میں دو طرح کے نظریات سامنے آتے ہیں کچھ لوگ اسے قبولیت کا درجہ دیتے ہیں اور کچھ اسے مسترد کرتے ہیں۔ غلام احمد پرویز اگرچہ تصوّف کے مخالف ہیں اور اسے غیر ضروری قرار دیتے ہیں لیکن ایک مقام پر وہ تصوف کے بنیادی لوازمات پر بحث کرتے ہوئے اسے ایک شخصی تجربہ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں

''اس علم کے حصول کی توجیہہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ نفسِ انسانی جب باطن کی گہرائیوں میں چلا جاتا ہے تو یہ وہاں اس حقیقتِ کلی میں جذب ہو جاتا ہے جو کائنات کے رگ و پے میں جاری و ساری ہے اور اس طرح نفسِ انسانی اور حقیقتِ مطلقہ ایک ہو جاتے ہیں۔''(۵(

جب کہ پروفیسر محمد فرمان کا ماننا ہے کہ تصوف ' فکرِ اسلامی کے بنیادی عناصر میں شامل ہے اور دین کے عین مطابق ہے۔ اسی لیے تو وہ کہتے ہیں کہ

''تصوف خالصاً اسلامی تعلیمات کی عملی صورت کا نام ہے اور جب کبھی اس میں غیر ضروری عناصر کو شامل کرکے افراط و تفریط اختیار کی گئی ہے' اپنے اپنے وقت پر ہر

سلسلے کے پیرِ طریقت نے اپنے اجتہاد اور مکاشفات کی بنا پر اس کی اصلاح کی ہے اور دین و دنیا دونوں کو پیش نظر رکھا ہے‘ ان کے ہاں نہ فرقہ بندی ہے‘ نہ کینہ پروری۔‘‘(۶(

کائنات کو سمجھنے کے لیے صوفیا کے ہاں دو بنیادی عقیدے وحدت الوجود اور وحدت الشہود ہیں۔ قاضی عبدالکبیر ان دونوں گروہوں کے درمیان موافقت پیدا کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

’’لفظ وجود کا اطلاق صوفیا کرام کی اصطلاح میں اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے۔ وہی وجود واجب ہے۔ اس سے ان کی مراد ہوتی ہے کہ صرف ذاتِ حق تعالیٰ ہی ہے جو اپنی ذات سے قائم ہے۔ بر عکس دیگر اشیا کے جو ہستی مطلق سے قائم ہیں۔۔۔ وسطِ سلوک میں ہو حالت ہوتی ہے وہ وحدتِ شہود ہے اور انتہائے سلوک کی حالت وحدت الوجود ہے۔ ۔جمہور صوفیا کا مسئلہ توحید وجودی پر اتفاق ہے۔ اظہارِ حقیقت کے لیے البتہ مختلف پیرایوں اور مختلف اصطلاحات کا استعمال کیا گیا ہے۔ مگر حقیقتاً سب آپس میں متفق ہیں۔ عوام اور اغیار کو جو اختلافات نظر آتے ہیں وہ سطحی اور لفظی ہیں نہ کہ معنوی۔‘‘(۷(

تاہم اس بات سے انکار ممکن نہیں ہے کہ کائنات کو سمجھنے کے لیے جدید سائنسی علوم کے ساتھ ساتھ مابعد الطبیعیات نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ جہاں کہیں اپنی محسوس تجرباتی سطح کی وجہ سے سائنس تحدید کا شکار ہوئی ہے وہاں اسے مابعدالطبیعات نے ہی سہارا دیا ہے۔

کائنات کی تفہیم میں بنیادی طور پر جن علوم نے انسان کی مدد کی ان میں فلسفہ‘ فلکیات اور علمِ ریاضی ہمیشہ سے اہم رہے ہیں۔ بعد ازاں فلکیات کی ذیلی شاخوں نے طبیعیات کی شکل اختیار کرلی۔ اب طبیعیات کی بھی سیکڑوں مزید شاخیں ہیں۔ ہم گاہے گاہے ان علوم کی روشنی میں کائنات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس ضمن میں بنیادی فریضہ فلسفے نے ادا کیا جس کا تعلق تعقل سے رہا ہے۔ مختلف فلسفیوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں چیزوں کو جیسے سمجھا بیان کر دیا۔ یہ امر بھی ذہن نشین رہے کہ مختلف مذاہب کے مختلف افکار میں بھی فلسفہ کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ جیسا کہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود بھی بنیادی طور پر دو فلسفیانہ مکاتبِ فکر ہی ہیں۔

وہ پہلا مکتبۂ فکر جس پر یہاں جدید اردو نظم کے کائناتی تناظر میں روشنی ڈالی جائے گی وہ ہے فلسفہ۔ مختلف فلسفیوں نے اپنے اپنے تناظرات میں کائنات کی اس دھیمی لے کی تفہیم کی کوششیں کی ہیں۔ ہم اردو شعرا کے ہاں جب کائنات کے فلسفیانہ عوامل پر نگاہ دوڑائیں تو افضال احمد سید کے ہاں رات اور چاند کے تناظر کو زندگی کے دو مختلف پہلوئوں کی صورت میں اجاگر کیا گیا ہے۔ وہ چاند کو ایک سکّے سے تشبیہہ دیتے ہیں جو ایک طرف تو زندگی کا اظہاریہ ہے لیکن دوسری طرف بہت سے راز چھپائے ہوئے ہے جسے وہ مٹے ہوئے حروف کہتے ہیں اور پھر زنگ کے عالم میں ان کی معدومیت کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔

چاند کے سکّے پر
ایک جانب تمہارا چہرہ ہے
اور دوسری جانب مٹے ہوئے حروف

چاند اگر تانبے کا ہوتا

تو اسے اس رات زنگ لگ جاتا (افضال احمد سید:گھاس سے ہریالی کاٹنے کے بعد)(۸)

افضال فردوس کی درج ذیل نظم میں کائنات کے بارے ہندوئوں کے آواگون چکر کے فلسفے کو بہت خوب صورت انداز میں سموکر کائناتی تفہیم کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ نظم قانون بقائے مادہ‘ قانون بقائے توانائی اور فضا میں نائٹروجن چکر کی بھی بہترین انداز میں تشریح کرتی ہے۔

گرو مہراج کہتے ہیں
کہ یہ سنسار فانی ہے
جو شے دنیا میں آئی ہے
وہ واپس لوٹ جانی ہے
فنا کا ذائقہ چکھنا
ہر اک شے کا مقدر ہے
فنا کا نام ہے دنیا یہ بستی موت کا گھر ہے
میں کہتا ہوں
زمیں پر
اور ہماری کہکشاں میں ہر اک شے آنی جانی ہے
سبھی کچھ غیر فانی ہے
جو مرتا ہے
حقیقت میں بدن تبدیل کرتا ہے (افضال فردوس: نظم)(۹)

مشرق‘ مغرب‘ شمال‘ جنوب کی چار سمتوں سے تو ہر کوئی آشنا ہے۔ لیکن جاوید انور کو ان میں کوئی کمی محسوس ہوتی ہے۔ وہ ان سے ہٹ کر ایک پانچویں سمت میں زندگی کے سبزے کو دیکھتے ہیں۔

آخری بار جب میں ترے ساتھ تھا
تو عزادار میں نے ‘ تجھے کیا بتائوں کہ پھر ‘
سالہاسال کے بعد اُس
طائرِ بے زمان و مکاں کے پروں کی وہی پھڑپھڑاہٹ سُنی
جو ہمیں
سالہاسال تک
پانچویں سمت کے سبز تالاب پر
روزوشب
قتل کرتی رہی (جاوید انور: آخری بار جب میں تیرے ساتھ تھا)(۱۰)

اسی طرح زاہد ڈار کے ہاں بھی دو آنکھوں کی بجائے تیسری آنکھ سے دنیا کو دیکھنے کا رجحان نظر آتا ہے۔ یہ تیسری آنکھ سائنس کی اصطلاح میں تعقل بھی ہوسکتی ہے اور تصوف کی اصطلاح میں مرشد کی روحانی نظر بھی۔ ساتھ ہی تاریکیوں میں روشنی کا خود کو ظاہر کرنے کا رجحان اور اس کی شاعرانہ پیش کاری بھی خوب صورت ہے۔

جس طرح روشنی کرتی ہے سفر
ذہن تاریک خلائوں میں سفر کرتا ہے

تیسری آنکھ میری رہبر ہے   )زاہد ڈار)(۱۱(

زاہد ڈار کے ہاں آواز کی طاقت سے تخلیقِ کائنات کے عقیدے کی شاعرانہ جھلک اور زندگی اور موت کے تعلق کو سمجھنے کے لیے درج ذیل اشعار معاون ہیں۔

لفظ پتھر بھی ہے، پانی بھی ہے اور آگ بھی ہے
وقت دریا بھی ہے، صحرا بھی ہے، آکاش بھی ہے
زندگی موت سے پہلے بھی ہے اور بعد بھی ہے   )زاہد ڈار: نظم)(۱۲(

مذہبی فلاسفہ اور صوفیا کے ہاں اس کائنات کو بے معنی قرار دیا گیا ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ محض دھوکا ہے۔ اسی اندازِ نظر کو بیان کرتے ہوئے شاہین مفتی دنیا کو سرکس کا بھالو قرار دیتے ہیں جس کے اندر کوئی اور چھپا بیٹھا ہے۔ جو اس سے ڈر جائے وہ نقصان اٹھاتا ہے اور اس کی حقیقت کا احساس رکھنے والا لطف اندوز ہوتا ہے۔

دنیا
سرکس کا بھالو ہے
جو اندر سے خالی ہے
جو اس خالی بھالو سے
ڈرجاتا ہے
مرجاتا ہے   )شاہین مفتی: مشتری ہوشیار باش)(۱۳(

کائنات کی ہر شے ایک ہی طرح کے مادے سے بنی ہے۔ ہر شے کی بنیاد ایک ہی ہے۔ فلسفہ اور مذہب کے ہاں اسے روحِ ازل بھی کہا جاسکتا ہے۔ وحدت الوجودی افکار میں یہی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اسی کے زیرِ اثر عبدالرشید روندے ہوئے پھولوں اور انھیں روندنے والے پائوں کو ایک جیسا قرار دیتے ہیں۔

پیروں میں روندا ہوا
تازہ گلدستہ ہی پیر ہیں   )عبدالرشید: دن کا خیمہ)(۱۴(

موت برحق ہے جو وقت سے نہ پہلے ہے نہ بعد۔ موت ایک ایسی شے ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔ موت کے مباحث نے بھی کائناتی تناظرات کو سمجھنے میں ایک معاون کردار ادا کیا ہے۔ موت کے راز نے ہمیشہ سے انسان کو حیرت میں مبتلا رکھا ہے۔ کسی کے نزدیک موت بے معنی ہے۔ کوئی اسی کو سب کچھ سمجھتا ہے۔ کسی کے نزدیک یہ ایک دنیا سے دوسری دنیا تک سفر کا نام ہے۔ کوئی اسے دوست قرار دیتا ہے اور کوئی دشمن۔ موت کا پرندہ کروڑوں لوگوں میں بھی اپنے شکار کو اچک لے جاتا ہے۔ اور جس کی زندگی باقی ہو وہ موت سے ایسے بچ جاتا ہے کہ عقل دانتوں میں انگلیاں دے لیتی ہے۔ فیض کے ہاں اسی بات کا دل کش بیان دیکھیے۔

ہزار پھولوں سے آباد باغِ ہستی ہے
اجل کی آنکھ فقط ایک کو ترستی ہے   )فیض احمد فیض: حسن اور موت)(۱۵(

نصیر احمد ناصر حضرتِ انسان کی جنت سے بے دخلی اور پھر اس دنیا کی امتحان گاہ میں ذمہ داریوں کی بہ دولت اسے یہ نقطہ سمجھاتے ہیں کہ واپسی کا ایک ہی راستا ہے جو موت سے ہو کر گزرتا ہے۔ گویا موت سے پہلے اور بعد کی زندگی میں موت ایک رابطہ کار، ایک پُل کا کردار ادا کرتی ہے۔

اپنے حال میں مست رہو
اور جان لو
کہ باغِ عدن سے نکلے ہوئے
آدمی نے اپنے لیے
واپسی کا راستہ
اتنا مشکل بنالیا ہے
کہ جسے مرے بغیر طے نہیں کیا جاسکتا)نصیر احمد ناصر: کاغذ کی تنہائی)(۱۶(

نصیر احمد ناصر‘ اپنے خالق کے اور اپنے درمیان تعلق کو نفسیاتی سطح پر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو انھیں اپنا آپ بہت پیچھے کہیں دکھائی دینے لگتا ہے۔

اے مرے عکسِ جمال!
آگہی محدود ہے‘ تیری ارادت لازوال
تو ہمیشہ کے لیے ہے
میں ذرا سا لمحہ بھر کا اک خیال!! (نصیر احمد ناصر: روشنی‘ تیرے جنم یُگ پر ایک نظم!)(۱۷(

آئینہ کا لفظ فلسفہ و تصوف میں اپنی ذات کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور کائنات کے اسراروں کے معنوں میں بھی۔ شہزاد احمد انسان کو اس کی اصلیت سے آگاہ کرنے کے اسی انداز کو تمثیلیہ کی صورت میں بیان کرتے ہیں کہ انسان کے تکبر نے جب اسے خود سے جا ملایا تو وہی دن اس سے اس کی توقیر چھین لینے کا باعث بنا۔

جہاں اندر جہاں
اس کی فضیلت کے فسانے ہیں
مگر لگتا ہے یہ قصے پرانے ہیں
وہ انسان جس کے عظمت کے ترانے گائے جاتے تھے
اسی دن مرگیا تھا
جس دن اُس نے آئینہ دیکھا تھا
اور آئینے سے باہر
ہر اک شے پر حقارت کی نظر ڈالی تھی
اس دن‘ اس نے اپنی ساری عظمت
--- روند ڈالی تھی! (شہزاد احمد: وہ کہتے ہیں)(۱۸(

سید مبارک شاہ کائنات کی تخلیق کے عمل کی وضاحت کرتے ہوئے عظیم دھماکے کے نظریے کو شاعرانہ مزاج میں بیان کرتے ہیں اور وہ امر جس نے اس ذرّے کو دھماکے پر مجبور کیا اسے ’’حرفِ کُن‘‘ قرار دیتے ہیں۔یہ امر طبیعیاتی اور مابعدالطبیعیاتی دونوں سطحوں پر کائنات کو سمجھنے میں معاون ہے کہ تصوف کے نزدیک کن بہ حیثیت ایک لفظ اور خدائی صفت کے نمایاں مقام رکھتا ہے اور طبیعیاتی سطح پر یہ توانائی کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔

’’ہمیں نابود مت کرنا
کہ جب تقسیم ہونے کا عمل ممکن نہیں رہتا

تو پھر ذرّہ
ذرا سی چوٹ کھانے پر
دھماکے کو اگلتا ہے
دھماکے کو سمجھتے ہو؟
دھماکہ جس سے حرف کن ٹپکتا ہے
ہمیں نابود مت کرنا‘‘ (سید مبارک شاہ: ہمیں نابود مت کرنا)(۱۹(

شہزاد احمد کو پوری دنیا یک ساں نظر آتی ہے۔ اتنی رائگانی کہ انھیں رائگانی کا احساس بھی فضول اور بے کارِ محض محسوس ہونے لگتا ہے۔گویا یہ کائنات ایک دھوکا ہے۔ مابعدالطبیعیات میں بھی اس کائنات کو محض دھوکا اور فریبِ نظر قرار دیا گیا ہے اور جدید طبیعیاتی تحقیقات بھی اسی پر دال ہیں جن میں سب سے بڑا کردار کوانٹم طبیعیات کا ہے۔

یہاں سے اٹھوں بھی تو جائوں کہاں
ایک جیسا ہے سارا جہاں
یہاں رایگانی کا احساس بھی رایگاں ہے)شہزاد احمد: بہت تھک گیا ہوں)(۲۰(

کائنات کی حقیقت تک رسائی ہر عہد کے انسان کا خواب رہی ہے جو آج تک خواب ہی ہے۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی سوچ ایک نیا زاویۂ نگاہ اختیار کرلیتی ہے۔ وہ خود سے طرح طرح کے سوالات کرنے لگتا ہے۔ ایسا ہی سوال ہمیں شہزاد احمد کے ہاں دکھائی دیتا ہے کہ آنکھ جس چیز کو میلو ں سے جکڑنے کی صلاحیت رکھتی ہے ہاتھ اُس سے محروم کیوں ہیں۔ اشیا کی ماہیت کو سمجھنے کے حوالے سے یہ ایک اہم نقطہ ہے۔ دوسری طرف یہ ہمارے حواس کی حد بندیوں کو بھی ظاہر کرتی ہے۔

آنکھوں اور ہاتھوں میں اتنا فاصلہ کیوں ہے؟
جو کچھ دیکھ رہا ہوں
اس کو حاصل کرنا مشکل ہے
جو کچھ حاصل ہوا ہے
وہ بھی لاحاصل ہے!
میری آنکھیں دور خلا میں دیکھ رہی ہیں
اور خلا میرے ہاتھوں کو دیکھ رہا ہے
میرے ہاتھ خلا جیسے ہیں)شہزاد احمد:میرے ہاتھ خلا جیسے ہیں)(۲۱(

ہوا زندگی کی بنیادی ضروریات میں سے ہے۔ ہر نظریے کے مطابق زندگی کی تخلیق اور اس کے ارتقا و ترویج اور قیام کے لیے ہوا بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ ہوا جو ہماری زمین کے گرد مختلف لہرو ں کی صورت میں قید ہے تو اُس کی قید زندگی کی ضمانت ہے مگر اُس کی ہتھ کڑی کی طرح کائنات کی ہر شے ہتھ کڑی پہنے ہوئے ہے۔اس کے علاوہ زندگی کی اصل (روح) بھی ہوا کے ہی معانی رکھتی ہے۔ گویا زندگی کو سمجھنے کے لیے ہوا کا سمجھا جانا بھی ضروری ہےشہزاد احمد کے ہاں اسی ہوا کا بیان ملاحظہ کیجیے۔

اے رہائی طلب کرنے والی ہوا
سچ بتا
تجھ کو آزاد ہونے کی خواہش کہاں سے ملی

تو نے دیکھا نہیں
آسمانوں کی بستی میں جتنے اجرام ہیں
سب کے سب قید ہیں
سب کے ہاتھوں میں
محور کی ہے ہتھکڑی!
اور زمین پر تو آزاد ہونے کی خواہش
فقط خواب ہے   )شہزاد احمد: رہائی طلب کرنے والی ہوا)(۲۲(

شہزاد احمد انسانی عقل اور اس کے احساسات کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ انھوں نے نفسیاتی علوم کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اسی کی بہ دولت وہ ہر حقیقت کو اپنی ہی آنکھوں میں تلاش کرنے پر اکساتے ہیں کہ جو بھی ہے وہ تمہارے اپنے اندر احساس کی صورت موجزن ہے۔ ہر شے کی حقیقت کو خود میں تلاش کرو۔جہاں اس کا ظاہری اشارہ مادی کائنات کی طرف ہے وہیں اپنے من میں تلاش کا صوفیانہ انداز بھی اس میں جھلکتا ہے۔

وہی پڑھ جو تری آنکھوں میں لکھا ہے
انہی میں سب جہت رکھے ہوئے ہیں
)وہ جہت بھی جن سے ہم نا آشنا ہیں(
جہت کی آرزو، ہم کو
کبھی جنت میں لے آئی
کبھی دوزخ میں جاپہنچی
تری جنت تری دوزخ
تری آنکھوں میں ہے   )شہزاد احمد: ساری دیواریں گرادے)(۲۳(

شہزاد احمد بھی ہندو فلسفے کی طرح زندگی سے موت اور موت سے زندگی کی طرف سفر کی بات کرتے ہیں۔ مگر ان کے ہاں اس کا بیانیہ اس حوالے سے مختلف ہے کہ ہندو فلسفہ کے مطابق ہر شے گھوم کر اپنی پہلی حالت تک آپہنچتی ہے جب کہ شہزاد احمد اسے ارتقا کی صورت میں دیکھتے ہیں اور معمولی شے کی موت پر اس سے بہتر شے کی تعمیر کی عمارت کھڑی کرنے کے قائل ہیں۔

عجیب بارش ہے
زندگی بھی ہے، موت بھی ہے
یہ ایسا سکتہ ہے، جس کے اک رُخ پہ موت ہے
دوسرا رُخ، حیات ہے، ارتقا ہے
ساری چہل پہل ہے   )شہزاد احمد: عجیب بارش ہے)(۲۴(

فلسفہ نے جب عملی صورت اختیارکی تو اُسے سائنس کا نام دے دیا گیا۔ ہر علم نے کسی نہ کسی طورکائناتی کی عقدہ کشائی کا فریضہ سرانجام دیا۔ ان علوم میں طبیعیات اور اس کی ہر شاخ نے اہم کردار ادا کیا۔ طبیعیات کی کچھ سطحیں عمومی ہیں جنھیں ہم خالص طبیعیات کہہ سکتے ہیں اس کے علاوہ فلکیات اور کوانٹم طبیعات نے بہت سی الجھنوں کو سلجھایا بھی لیکن بہت سی الجھنیں پیدا بھی کیں ۔ ان علوم کی حدود ایسی ہیں جہاں خالص طبیعیاتی قوانین غیر مؤثر ہوجاتے ہیں۔ خالص طبیعیات حوالوں سے جیسے کائنات کو سمجھا گیا اور کیسے اُسے جدید اردو نظم کے شعرا نے اپنے ہاں جگہ دی، جب اس بات کی تلاش

کے سفر پر نکلتے ہیں تو جاوید انور کے ہاں کائناتی یک سانیت اور اس میں رقصاں توانائی کا احساس سامنے آتا ہے۔
اس ریتلے بدن کی
جھلسی ہوئی رگوں میں
ہے تیل کا تماشہ
اور برف کی تہوں میں
ہے سورجوں کا گریہ
یا پانیوں کی دہشت
یا خشک سالیاں ہیں
مہتاب سے ٹپکتا
تاریکیوں کا لاوا
رخسار داغتا ہے
اس صُبح کا ستارا)جاوید انور: اشکوں میں دھنک)(۲۵(
اختر حسین جعفری ہماری زندگی کو موت کے مہیب پنجوں میں جکڑا ہوا دیکھتے ہیں لیکن اُسی کو کام یابی کی ضمانتی بھی سمجھتے ہیں کہ یہی حد بندی اس کی زندگی ہے۔ جیسے سمندر و دریا جب تک کناروں کے حصار میں ہیں اپنا وجود رکھتے ہیں۔ اگر کناروں کا وجود نہ رہے تو ان کا اپنا وجود بھی ختم ہوجائے گا۔اقبال کے ہاں بھی ہمیں کائناتی حد بندی اسی صورت معاون نظر آتی ہے۔
سمندر اس سال ساحلوں کے حصار میں تھا
یہ سایۂ تیغِ موج قاتل کے سر سے گزرا
یہ پرچمِ آب سے کوئی فتح کا ستارا٬ گھری ہوئی کشتیوں میں اُترا)اختر حسین جعفری: سالنامہ)(۲۶(
اختر حسین جعفری کو اپنی پہچان کا سفر پریشان رکھتا ہے۔ مگر وہ مایوس نہیں ہیں۔ وہ ستاروں کو اپنا معاون سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اپنی حقیقت تک رسائی کے اس سفر میں ستارے ان کے راستے میں آنے والے بند دروازوں کے قفل توڑ کر انھیں کائناتی دھند میں مستور اپنی حقیقت تک پہنچنے میں مددگار ہوں گے۔گویا وہ حکمِ ربی کے مطابق کائنات پر غور و تفکر کرتے ہوئے اس کی حقیقت تک پہنچ جانا چاہتے ہیں۔
سمتوں کا نہیں اصول کوئی
بے رُشد قدم ٹھہر گئے ہیں
میں منزلِ جاں کے اس سفر میں
اس صدق کی طرح بے سہارا
پہچان کی بھیک کے لیے جو
ہر عہد میں دربدر پھرا ہے
میں منزلِ جاں کے اس سفر میں
ٹھہرا ہوں کہ آج رات تارے
توڑیں گے طلسمِ قفلِ ابجد
بخشیں گے زمیں کو لوحِ محفوظ

پہچان کی ابتدا کریں گے   )اختر حسین جعفری: پہچان کی ابتدا)(۲۷(
سید حسنین بخاری انسان کو کائنات کااصل قرار دیتے ہوئے یہ نظریہ اپناتے ہوئے کہ انسان کائناتِ اصغر سہی لیکن کائناتِ اکبر بھی اسی کے اندر پنہاں ہے۔ یہ ایک طرح کی صوفیانہ فکر کی کی باز آفرینی بھی کہی جا سکتی ہے۔اور سائنسی سطح پر انسان کا بیانیہ بھی کہ کائنات کو سمجھنے کے سفر کی ابتدا انسان نے سب سے پہلے اپنی ذات پر ہی سوال اٹھا کر کی۔
’’منجمد جسم و جاں
پاؤں میں کہکشاؤں کی ہیں بیڑیاں
پیٹھ پر آسماں
عرش اندر نہاں
قلب میں لامکاں
میں ہوں
سیارِ آخر سے آگے جہاں‘‘   (حسنین بخاری: سیار آخر سے آگے جہاں)(۲۸(
حسنین بخاری اپنی خوبصورت نظم ’’صفر ایک‘‘ میں کائنات میں خدا اور انسان کے باہمی تعلق کو ایک ریاضیاتی تمثیل کی صورت میں بیان کرتے ہیں۔یہاں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ’’ایک‘‘ حقیقت ہے اور ’’صفر‘‘ اس کا متلاشی۔یہاں ایک اور صفر کی عددی قیمت بھی بڑے خوب صورت معانی پیدا کرتی ہے۔ صفر اکیلا کچھ بھی نہیں ہے لیکن ایک سے اس کا انسلاک اس کی قیمت میں کئی گنا اضافہ کرنے کا باعث بھی بنتا ہے۔ گویا انسان کا خدا سے ربط ہی اس کی حقیقی قدروقیمت کا ضامن ہے۔
زماں و مکاں، کل جہاں، سب سماوات
صفروں کے جھرمٹ ہیں
جو ’’ایک‘‘ کی جستجو میں
جنم دن سے محوِ سفر ہیں
وہی ’’ایک‘‘ ان کو
عدم کی گھٹا ٹوپ تاریکیوں سے
بچائے ہوئے ہے
اسی ’’ایک‘‘ سے ’’صفر‘‘ کا رابطہ
اس کو دس، سو، ہزاروں، کروڑوں
کی قوت عطا کر رہا ہے
عدد ’’صفر‘‘ کا ارتقاکر رہا ہے
سمجھنے میں اس کو اگرچہ زمانے لگیں گے
حقائق مگر اس کی تفہیم سے
خوب صورت فسانے لگیں گے‘‘   (حسنین بخاری: صفر۔ایک)(۲۹(
حسنین بخاری کے کائناتی شعور کی ترجمان نظم ’’اگر اک کہکشاں ہر آدمی کو سونپ دی جائے‘‘ ملاحظہ کیجیے جس میں وہ کائنات کی وسعت کو بیان کرنے کے لیے انسانوں کی تعداد کے ساتھ کائنات میں موجود کہکشائوں کا موازنہ کرتے ہیں۔
’’اگر اک کہکشاں ہر آدمی کو سونپ دی جائے

تو کھربوں کہکشائیں پھر بھی بچ جائیں
کہ وہ تعداد میں
روئے زمیں
کے سارے انسانوں سے زائد ہیں
)حسنین بخاری: اگر اک کہکشاں ہر آدمی کو سونپ دی جائے)(۳۰(

جدید طبیعیات جہاں تخلیق کی وجہ عظیم دھماکے کو مانتی ہے وہیں اس کے اختتام کا سبب عظیم بھنچاؤ کو قرار دیتی ہے۔ پروین طاہر کائنات کے اختتام کو طبیعیات کے ''عظیم بھنچاؤ'' کے نظریے سے سامنے لانے کی کوشش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

اب کے تمھارا تجربہ
سنگین تھا!
منفرد تاروں کو تم نے روند ڈالا
جھرمٹوں کے شوق میں
نورو ظلمت کا تفاوت
بھول بیٹھے
کہکشانی ذوق میں
خود ہی سمٹاؤ کو ایسی
وسعتوں میں ڈھال کر
کیوں تمھارے پاؤں
سیلانی کہیں رکتے نہیں؟
وقت کو تو واپسی کی
راہ پر جانا ہی تھا
او رپھیلاؤ سمٹ کر
ایک ہو جانا ہی تھا! (پروین طاہر: ماقبل(

نصیر احمد ناصر کے ہاں معلوم سے آگے کی تلاش جاری ہے۔ یہ ہماری سمتیں تو بے گانہ نہیں ہیں مگر انھیں کائنات میں دیگر سمتیں بھی دکھائی دیتی ہیں اور پھر ایک مرکز پر ان کے خوب صورت ملاپ کا احساس بھی ہے جہاں بیٹھ کر وہ خاموشی کے چند لمحوں کے اسیر بن جانے کے تمنائی ہیں۔

میں جائوں گا وہاں
جہاں کائنات کی
ساری دشائیں مل کر
ایک انوکھی زاویہ نما
نک (Nook) بناتی ہیں
اور کچھ دیر بیٹھوں گا
خاموشی سے----! (نصیر احمد ناصر: گوشۂ تنہائی)(۳۱(

سمتوں کا یہی سفر انھیں وہاں لے آتا ہے کہ انھیں سمتوں کی تعداد' دو' چار' پانچ یا چھے نہیں بل کہ دس محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہ نیا احساس ایک طرح کی پریشانی کا باعث

بھی بنتا ہے کہ آخر اتنی سمتوں میں خود کو سنبھالنا کیسے ممکن ہوگا۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ جدید طبیعیات کی String Theory کے نتائج بھی کچھ ایسے ہی ہیں۔ اس نظریے نے سمتوں کے بارے تمام قدیم تصورات کی نفی کردی ہے۔اس کے مطابق سمتوں کی صحیح تعداد کا ابھی تک تعین نہیں کیا جاسکااور ماہرینِ طبیعیات کا خیال ہے کہ یہ کم از کم بھی ۸۰ سے زیادہ سمتیں ہیں۔ تاہم نو سمتوں تک سرِ دست طبیعیات رسائی حاصل کر چکی ہے۔

ایک ہی جانب چلتے چلتے
کتنی عمریں بیت گئی ہیں
دس جہتوں میں کون چلے گا
بھُر بھُر کرتی جسم کی مٹّی
اس آوے میں کون جلے گا
کوئی محدب، کوئی مجوّف
کس چہرے میں عکس ڈھلے گا
کھڑکی کے اس پار کا منظر
یک سمتی بہلاوا ہے
اندر آئو، غور سے دیکھو
اتنی جہتوں کا پھیلائو
دیواروں کا پہناوا ہے (نصیر احمد ناصر: ابعادیت)(۳۲)

اسی طرح ایک اور نظم ''بارش کیسے لائیں '' میں وہ سات سمتوں کی بات کرتے ہیں یعنی چھے معلوم سمتوں آگے، پیچھے، دائیں، بائیں، اوپر اور نیچے کے سوا ساتویں سمت کا بھی احساس رکھتے ہیں۔

موسیقار، گوّیے
برکھا راگ الاپیں
شاعر شعر سنائیں
پیر، فقیر، سوالی
رقص، دھمال، قوالی
درگاہ، مزار، قبور
لنگر، دیگیں، ڈالی
وجد میں سات دشائیں (نصیر احمد ناصر: بارش کیسے لائیں)(۳۳)

نصیر احمد ناصر وقت کو ایک ہی نقطے پر مرکوز حالت میں دیکھتے ہوئے ماضی، حال اور مستقبل کو ایک جیسا پاتے ہیں اور روشنی کی راہ نمائی میں اس کی گرہ کشائی کرنا چاہتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ روشنی خود بھی ایک دھوکا ہے کہ بے رنگ نظر آتی ہے مگر در حقیقت یہ سات رنگوں کا مجموعہ ہے۔وقت اور روشنی کے اس ملاپ کو نظریۂ اضافت نے بھی اسی انداز میں سمجھا ہے۔

روشنی کے اس محیطِ بے کراں میں
دیکھ سکتا ہوں
میں ہر اک عکس کی تجرید کو
موجود سے معدوم ہوتی، خواہشِ نادید کو

ان گنت روشن مداروں کے جلو میں
کائناتی عید کو
فاصلوں میں جذب ہوتے
دائروں کی پھیلتی امید کو
لوٹ جانا ہے جنھیں انجام سے تمہید کو
وقت کی تردید کو
ایک نقطے پر ہے ماضی، حال، مستقبل کی آنکھ
ارتکازِ نور کے مخروط میں
تینوں زمانے آرہے ہیں دید کو --- !!! (نصیر احمد ناصر: لائٹ کونز)(۳۴(

ان کائناتی مظاہر میں شہزاد احمد جدید سائنسی نظریات کی پیروی میں کائنات کے پھیلائو کے حامی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ یاد رہے کہ بہت سے مقامات پر انھوں نے اس کی نفی کرتے ہوئے ارتکاز اور کائناتی سکڑائو کی بات بھی کی ہے جو کہ خود اپنی جگہ پر ایک سائنسی نظریہ ہے۔

ستارے دور ہوتے جارہے ہیں
فلک محصور ہوتے جارہے ہیں)شہزاد احمد: زمیں اب کون سی منزل میں ہوگی؟)(۳۵(

ستاروں سے آنے والی روشنی نئے کائناتی افکار کو جنم دے رہی ہے۔ آج کا انسان حیران و سرگرداں ہے کہ اس کا اختتام کہاں پر ہوگا۔ بہ قول شہزاد احمد:

یہ چاروں اور پھیلی روشنی کس کے لیے ہے؟
یہ اتنی تیز رو کیوں ہے؟
یہ کس کی جستجو میں ماری ماری پھر رہی ہے؟
ہزاروں کائناتیں اپنے پیچھے چھوڑ آتی ہے
کہاں آکر رُکے گی؟
کیا کرے گی؟
کچھ خبر اس کو نہیں ہے! (شہزاد احمد)(۳۶(

اسی کائناتی سکڑائو کی ہم آہنگی میں جو کہ شہزاد احمد کے نزدیک زیادہ بہتر نظریہ ہے وہ آگے کے اس سفر کو واپسی کا سفر سمجھتے ہیناور روشنی کی رفتار سے زیادہ رفتار کے ساتھ سفر کرتے ہوئے حال کے ساتھ ساتھ ماضی اور مستقبل تک رسائی کے لیے پر امید بھی ہیں۔

شاید میں ایسی رفتار سے بھاگ رہا ہوں
جس کے سامنے
روشنی کی رفتار بھی کوئی چیز نہیں ہے
شاید میں وہ سارے رشتے توڑ چکا ہوں
جن رشتوں کے ہونے سے
یہ دنیا اس صورت میں موجود ہے
جوہم دیکھ رہے ہیں
روشنی سے آگے جانا بھی

پیچھے کی جانب جانا ہے   )شہزاد احمد: دستک بھی نہیں ہوگی)(۳۷(
خواہشات اپنی جگہ اہم لیکن کائنات کی بے انتہا وسعت سے بھی کنارہ کشی کرنا ممکن نہیں ہےکائنات کی بے پناہی اور اجسام کا مسلسل تغیر پذیر رہنا جسے طبیعیات کی اصطلاح میںTRANSMUTATION کہا جاتا ہے' ذیل کے اشعار کا بنیادی نقطہ ہے۔ کائنات کی اسی بے پناہی کو بیان کرتے ہوئے شہزاد احمد لکھتے ہیں:

اتنا بڑا جہاں ہے
جس کا اندازہ کرنا بھی ناممکن ہے
ہر سو لاکھوں اور کروڑوں عالم ہیں
ہر عالم میں اربوں کاہکشائیں ہیں
کاہکشاں میں سورج ہیں سیارے ہیں
اور اس حدِ نظر تک پھیلی ہوئی پہنائی میں
کتنے ہی دم دار ستارے ہیں
یہ دم دار ستارے
میلوں تک پھیلے انگارے ہیں
یہ انگارے اکثر برف میں ڈھل جاتے ہیں
اور کبھی اپنی' سورج کی حدّت ہی سے
--- جل جاتے ہیں
اپنا روپ بدل جاتے ہیں   )شہزاد احمد: اتنا بڑا جہاں ہے)(۳۸(

شہزاد احمد روشنی کے رنگوں کی بے رنگی اور اس کی حقیقت کا ادراک بھی رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ کس طرح ایک منشور ان رنگوں کی حقیقت کو کھولتا ہے۔

روشنی رنگوں سے بنتی تھی
مگر بے رنگ ہوتی تھی   )شہزاد احمد: ساری دیواریں گرادے)(۳۹(

سائنس دان اس بات پر متفق ہیں کہ جیسے عظیم دھماکے کی صورت میں پہلے کائنات بنی اور پھر ایک اور دھماکے کی وجہ سے ہمارا نظامِ شمسی بنا' ایسے دھماکے کائنات میں مسلسل جاری ہیں لیکن راستے میں موجود خلا ان آوازوں کو ہم تک پہنچنے نہیں دیتا۔

وہ گھن گرج جو فضائوں میں تیرتی ہے
لیکن ہمارے کانوں تلک
نہپنہچے رسائی اس کی
اسی کی ترمیم کی ہوئی ہے
خلا نے تسلیم کی ہوئی ہے   )شہزاد احمد: عجیب بارش ہے)(۴۰(

کائنات کی بے پناہی کا احساس ' حساس دلوں کو عجیب سے خوف میں مبتلا کردیتا ہے۔ ڈاکٹر جواز جعفری جب اس پہلو پر غور کرتے ہیں تو انھیں باہر کی طرح اندر بھی تاریکی اور خلا کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انھیں اپنے مسکن' زمین' کی کم مائیگی کا احساس بھی دامن گیر ہوتا ہے۔ وہ زمین سے محبت میں مبتلا ہیں اور وہ محبت کو کائنات کی سب سے بڑی سچائی سمجھتے ہیں اسی لیے وہ دودھیا کہکشاں کی محبت کی مثال دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ ذیل کی طویل نظم میں ستاروں کی تخلیق کی بھی بات کرتے ہیں ۔ وقت ایک چرواہے کی طرح اپنی ان کہکشائوں کو لے کر اپنے سفر میں محو ہے اور باقی سب اس کے

اشارے کے مطابق چل رہے ہیں۔وہ اس پھیلتی کائنات سے خوف زدہ ضرور ہیں لیکن ابد تک جانے کی خواہش بھی کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتی۔ان کے نزدیک کائنات کی برتر قوتوں میں وقت سب سے اہم دکھائی دیتا ہے۔

میرے اند ایک خلا ہے
جسے میں اپنی تنہائی سے بھرتا ہوں
میرے باہر بھی ایک خلا ہے
تاریک سمندر بہتا ہے
میری زمین
کالے پانیوں میں ڈوبتا جزیرہ ہے!
جانے والی!
میرے پائوں کے تلووں مینتیری محبت جاگتی ہے
میں زمین کے ساحل پر ننگے پائوں کھڑا
اس ڈوبتے جزیرے پر
اپنے حصے کی مٹی ڈال رہا ہوں!
کالے پانیوں کے ساحل پر
جگہ جگہ
تیرے ننگے قدموں کے نشان ہیں
ہوا انھیں مٹانے پر تُلی ہوئی ہے!
میرے باہر کے خلا میں
تاریک سمندر بہتا ہے
جس کی سطح پر الہڑ کہکشائیں ککلی ڈالتی ہیں
جب کبھی ککلی ڈالتی کہکشائیں چکرا کر آپس میں ٹکراتی ہیں
تو ستارے
کہکشائوں کی
روشنی سے لدی ڈالیوں سے
تازہ پھلوں کی طرح
جھڑ جھڑ کر
نامعلوم ابدی خطوں میں گرتے چلے جاتے ہیں!
جب اَن گنت ستارے
اس لامتناہی آتشبازی میں جل بُجھتے ہیں
تو کسی نامعلوم غم میں سوگوار کائنات
کچھ دیر کے لیے
اپنا ماتمی لباس اتارتی ہے
اور میری آنکھوں کی خوابگاہ میں
تیرا سُرخ آنچل لہراتا ہے!
سنو! محبت میں کائنات کی بیکرانی سانس لیتی ہے
اور کائنات کی ساری وسعت

تیری بانہوں کے پھیلائو تک ہے
اس آگے کچھ نہیں
محض سوال گونجتے ہیں!
جانتی ہو
سورج آنکھ کھلتے ہی اُس دودھ جیسے بدن والی
کہکشاں پر مرمٹا تھا؟
اور آج تک راکھ کردینے والی نارسائی کے دُکھ میں
پائوں سے گردش باندھے پھرتا ہے
اور ابھی ابھی جلتی دھوپ میں
اُس کی گلی کا چوتھا چکر لگانے گیا ہے!
وقت کا چرواہا
ہماری محبتوں
مجبوریوں
اور حیرتوں سے بے نیاز
کہکشائوں کے ریوڑ کو
اپنی جبری چھڑی سے
افق کی سمت
تیزی سے ہانکے لیے جا رہا ہے!
روٹھنے والی!
اس سے پہلے کہ نامعلوم سمت میں سرپٹ بھاگتی ہماری کہکشاں
ہمیں اپنے آفاق گیر بازوئوں میں سمیٹے
کائنات کے آخری کنارے سے باہر جاگرے
میری بُجھتی آنکھوں پر
اپنے روشنی افزاء ہونٹوں سے طویل بوسہ سے
کہ مجھے ابد کا کنارہ دیکھنا ہے
مجھے جاننا ہے
کہ اس کنارے سے آگے کیا ہے؟
محض حیرت
کوئی اور کائنات؟
یا کچھ بھی نہیں
یا پھر سِرے سے یہ سوال ہی مُبہم ہے
تیری باتونی آنکھوں کے اشارے کی طرح
بُہت ہی مُبہم)جواز جعفری: مجھے ابد کا کنارہ دیکھنا ہے()۴۱(

ہر فرد اپنے گھر سے محبت کرتا ہے۔ ڈاکٹر جواز جعفری عام لوگوں کی طرح اینٹ مٹی سے بنے گھر کے قائل نہیں ہے۔ ان کے نظریات آفاقی ہیں اسی لیے انھیں پوری زمین اپنا گھر دکھائی دیتی ہے اور ہر انسان میں اپنی جان۔ وہ جب اپنے اس گھر اس زمین کے ساتھ اپنے تعلق کو سوچتے ہیں تو انھیں محسوس ہوتا ہے کہ کسی بیج کی صورت وہ کسی اور ان

جان سیارے سے اس زمین پر وارد ہوئے۔ ہوش سنبھالا تو اس مٹی کے محبت کے اسیر ہوگئے ۔ ان کی محبت میں دیوانگی کی کیفیت ہے۔ وہ دیوانگی جو انھیں فرار نہیں ہونے دیتی۔ وہ اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور اور خلائوں میں رقصاں ہیں۔ وہ گھوم کر پھر اُسی نقطۂ آغاز تک آپہنچتے ہیں۔ عدم فراریت کا یہ احساس ان کے سامنے پوری کائنات کو بلیک ہول بنا کے پیش کرتا ہے۔

میں کسی دوسری کہکشاں کے
گمنام سیّارے سے آکر
تیری مٹی پر اُترا تھا
اور اسی دن سے
تیری مٹی
اور روشنی کا اسیر ہوں!
میں ایک عُمر سے
)تیرے اندر(
تیری اجنبی فضائوں میں گر رہا ہوں
اور شاید
کائنات کے پھر سے ڈھیر ہوجانے تک
یونہی گرتا رہوں!
وقت میرے لیے تھم گیا ہے
یا پھر یہاں کی فضا ہی
وقت کے لمس سے محروم ہے؟
تیری کشش
مجھے کہیں بھاگنے نہیں دیتی
میں تیری ذات سے
باہر نکلنے کی کوشش میں
عالمگیر روشنی کی طرح
تیری ذات کا پورا چکر کاٹ کر
پھر سے نقطۂ آغاز پر آجاتا ہوں!
میری کائنات!
کیا تو بلیک ہول ہے؟)جواز جعفری: بلیک ہول()۴۲(

شہاب صفدر رات کے اندھیروں کو روشنیوں سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں اور یہ ایک مسلمہ سائنسی حقیقت ہے کہ کائنات میں روشن اجسام کی نسبت اندھیروں کا راج ہے۔ شہاب صفدر اسے رات سے تعبیر کرتے ہیں۔

روشنی کا حوالہ بھی اب
آگہی کا اُلٹ پھیر ہے
کوئی سچی خبر
کوئی روشن سحر
ازکراں تا کراں سیلِ ظُلمات ہے

رات ہی رات ہے)شہاب صفدر: ازکراں تا کراں)(۴۳(

زاہد امروز بارش کو زمین اور آسمان کے رشتے کے ثبوت کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ایک ایسا مظہر ہے جو زمین اور آسمان میں دوری کے باوجود تعلق کا احساس قائم رکھتا ہے کہ پانی چکر کی صورت کبھی زمین کی طرف لپکتا ہے اور کبھی بخارات بن کے اوپر کی طرف۔ یہ آبی چکر زمین اور آسمان کی محبت کا ثبوت ہے۔

اروشی!
تم بہت نادان ہو
بارش کو بادل سے الگ پہچانتی ہو
اگر یہ مختلف ہیں تو
زمین اور آسماں کا باہمی رشتہ کہاں ملتا ہے؟)زاہد امروز: اروشی)(۴۴(

جاوید انور کائنات کے معلوم خطّے سے باہر نکلتے ہیں تو ان کا تخیل انھیں بہت سی نئی دنیائوں اور نئے سورجوں سے آشنائی بخشتا ہے۔ مختلف آوازوں اور خاموشیوں کے دوران مینوہ دن اور رات کے چکر میں وقت کو گھومتا محسوس کرتے ہیں۔

سرِ پردہ کئی سورج، کئی برگد
بہت سی انتہائیں ہیں
خموشی ہے
صدائیں ہیں
کنواں ہے موت کا یہ زندگی، جس میں
کبھی شب ناچتی ہے اور کبھی دن گھومتا ہے
آنکھ میں بجھتے ہوئے سورج لیے
پگھلا ہوا لوہا تری پلکوں سے گرتا ہے
مرے ہونٹوں پہ جمتا ہے! (جاوید انور: اس شہرِ خرابی میں)(۴۵(

اظہر غوری اس دریافت شدہ دنیا کے اصول و ضوابط سے آگاہ ہیں اور یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم بھی سورج کے گرد گھومتے ایک سیارے کا حصہ ہیں ۔ کہکشائوں ، ستاروں، سیاروں اور سورجوں کے بننے کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے تو یقینا ایسی ہی زندگی کسی اور سیارے پر بھی ہوگی جس تک رسائی کی کوشش کرنی چاہیے۔اس کے ساتھ ہی اس نظم میں فلکیاتی مظاہر کا خوب صورت بیان بھی ملتا ہے۔

میں تمھارے لیے نئے نظامِ شمسی کا انتخاب کررہا ہوں
کائنات کی کہکشائوں میں کئی ایک سیارے
اپنے اپنے سورجوں سے ہماری طرح جُڑے ہوئے ہیں
ہماراجذب اور بڑھا تو
باطن سے کوئی جذبہ بھی باہر نہیں نکل سکے گا
سبھی جذبات اور واقعات باطن بُرد ہوتے چلے جائیں گے
جیسے سوارب برس کی کسی بھی کہکشانی زندگی میں
دس کروڑ سورج سُپر نووا بن کر پھٹ جاتے ہیں
ویسے ہی قریباً سو برس کی انسانی زندگی میں

ایک ہزار تمنائیں لاینحل مسئلہ بن کر ضائع ہو جاتی ہیں)اظہر غوری: بلیک ہول)(۴۶(

سائنس دانوں کے مطابق تاریخِ انسانی نے بہت سے برفانی ادوار دیکھے ہیں۔ یہ ادوار ارتقا کے پیش خیمہ رہے ہیں۔ ہماری زمین زندگی کی گٹھری اٹھائے کبھی صحرا کی صعوبتیں برداشت کرتی رہی تو برفانی تودے اس کا مسکن بنے۔نیز سائنس دانوں کا خیال ہے کہ ہر بار زندگی کی ابتدا میں برف کے دوروں کو ہی اہمیت حاصل رہی ہے۔

خالی سی اک گٹھڑی ہے کندھوں پر‘
کہ جس میں ایک ریگستان کی ساری صعوبت بند ہے
سارا سفر گرمی کے تپتے ہوئے موسموں سے باردا کی برف تک
)عبدالرشید: کیا ہے کچھ پتا چلتا نہیں)(۴۷(

کمال صدیقی بھی کائنات کی بے پناہی پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ کائنات کی پُر اسراریت ابھی ہمارے مکمل ادراک میں نہیں ہے۔ سامنے نظر آنے والی شے دھوکا بھی ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ کوانٹم طبیعیات نے انسان کوایسی الجھنوں میں پھنسایا ہوا ہے جو عقل اور حواس کو پریشان کیے ہوئے ہے۔ کمال صدیقی بھی یہی کہتے ہیں کہ بہت سے ایسے مظاہر کو میں نے تو نہیں لیکن میرے آلات نے پرکھا ہے۔آج بھی ماہرینِ فلکیات و طبیعیات بہت سے کائناتی مظاہر کو صرف اس بنیاد پر رد نہیں کر پاتے کہ اگرچہ وہ دکھائی نہیں دیتے لیکن ان کے ہونے کے ثبوت طیف کی صورت واضح ہیں۔

افق سے تابہ افق -----
)افق کہ جو مری نظروں کی سرحدوں میں ہیں
افق‘ جو آج بھی اوجھل مری نگاہ سے ہیں(
افق سے تابہ افق زندگی دھڑکتی ہے!
زمیں سے تابہ فلک -----
)فلک‘ کہ جن کے ستارے مری نگاہ میں ہیں
فلک‘ کہ میری بصارت سے بھی پرے جو ہیں
فلک۔ کہ ایک حقیقت ہیں‘ پھر بھی جن کا وجود
مری نظر میں نہیں ہے‘ مرے شعور میں ہے!
فلک‘ کہ جن کے ستاروں کی روشنی میں نے
نظر سے دیکھی نہیں‘ پھر بھی جانتا ہوں میں
کہ ان میں کاہکشائیں مدام رقص میں ہیں!
میں ان کے رقص کے انداز سے نہیں واقف
مگر سنی ہے وہ آواز میرے آلوں نے
جو ان کی برق کی پازیب سے نکلتی ہے) (کمال احمد صدیقی: آفاق)(۴۸(

نصیر احمد ناصر کی نظم SNAPSHOT دیکھتے ہی معروف سائنس دان SIR JAMES JEANSکا مضمون THE DYING SUN ذہن کے دریچوں پر دستک دینے لگتا ہے۔ جس میں انھوں نے سورج کے مسلسل حرارت کھونے کے عمل کے ذریعے یہ نتیجہ نکالا کہ سورج زوال آمادہ اور موت کے سفر پر روانہ ہے۔

سنو‘ اجنبی ہم سفر!

اس سے پہلے کہ گھڑیوں کی خاموش ٹِک ٹِک
دھماکے کی صورت
سماعت کے پردوں سے ٹکراکے
بیمار سورج کے مرنے کا اعلان کردے
چلو' ڈوبتی شام کے دور جاتے ہوئے منظروں کی
لہو رنگ تصویر
احساس کی اندھی سکرین پر ثبت کرلیں)نصیر احمد ناصر(SNAPSHOT) :۴۹(

سورج کی طرح چاند بھی اپنی روشنی خارج کرتے ہوئے موت کی طرف چل رہا ہے۔ یہ یاد رہے کہ چاند کی اپنی کوئی روشنی نہیں ہے بل کہ یہ سورج کی روشنی کے سہارے روشن ہے۔ اگر سورج اپنی روشنی سے محروم ہوجائے گا تو اس پر انحصار کرنے والا چاند بھی اندھیرے کا مرکز بن جائے گا جسے نصیر احمد ناصر خود کشی قرار دیتے ہیں۔

ساحلی چٹانوں پر
سرجھکائے بیٹھا ہے
خودکشی سے پہلے ' چاند)نصیر احمد ناصر)(۵۰(

لازمی نہیں ہے کہ جو چیز دکھائی نہ دے وہ ہو بھی نہیں۔ صوفیانہ فکر بھی یہی کہتی ہے اور جدید کوانٹم طبیعیات بھی۔ ایسی ہی سوچ نصیر احمد ناصر کے ہاں بھی دکھائی دیتی ہے جب وہ رات کے دل میں چھپے سورج کو اپنے تخیل کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔یہ سورج ظاہر تو نہیں ہے لیکن اس کا عدم اظہار اس بات کا کافی ثبوت نہیں ہے کہ وہ موجود نہیں ہے۔

رات کے دل میں سورج تھا
اور وہ کھِل کھِل ہنستی تھی
چاند کی پیلی رنگت پر! (نصیر احمد ناصر)(۵۱(

قدیم ترین انسانوں نے فطرت کے رازوں کی پردہ کشائی کے لیے مظاہرِ فطرت کا مشاہدہ کیا ہے۔ ستارا صُبح یا جسے پنجابی میں ''سرگی دا تارا'' کہاجاتا ہے' رات کے آخری کنارے کا مسافر ہے جو صبح کی آمد کی خبر دیتا ہے اور صبح اس کے اس انداز پر مسکرادیتی ہے۔یہ ستارا دن اور رات کے ملاپ کا وہ حسین نقطہ ہے جسے کوئی حساس دل ہی دیکھ سکتا ہے۔

رات کے کنارے پر
صُبح مُسکراتی ہے
آخری ستارے پر)نصیر احمد ناصر)(۵۲(

حقیقی زندگی میں ابھی تک انسان وقت سے بہت پیچھے ہے لیکن خواب تو ان اصولوں کی زد سے باہر ہوتے ہیں جو اس نظام کو چلا رہے ہیں۔ اسی لیے شاعر کا تخیل اس دنیا کی بھی سیر کرتا ہے جو اس کی حقیقی دست رس میں نہ ہو۔ مزید یہ کہ نصیر احمد ناصر کائنات کے پھیلائو کے ساتھ اس کے سکڑائو پر بھی یقین رکھتے ہیں اور اس لمحے کے منتظر ہیں جب کائنات پھر سے یوں سمٹ جائے کہ اس کا مشاہدہ مشکل نہ رہے۔گویا ان کے ہاں BIG BANGاور BIG CRUNCH جیسے دونوں مظاہر ہی اظہار کی صورت پاتے ہیں۔

پانی اور ہوا کے ساتھ چلتے ہوئے

وقت مجھ سے آگے نکل جاتا ہے
اور میں۔۔ اس زمین کا تنہا مسافر
تم سے بہت پیچھے
بچی کھچی عمر کا توشہ سنبھالے
پھیلائو کی آخری حد سے
کائنات کے سمٹنے کا انتظار کرتا ہوں
رات کا سایہ دیے کی لو سے ڈر جاتا ہے
آسمان کا خیمہ بہت چھوٹا ہے
اور روشنی میرے دل سے کہیں زیادہ
لیکن فاصلوں کے مدار
خوابوں کے دائروں سے بڑے نہیں ہوتے)نصیر احمد ناصر: پانچواں مفرد)(۵۳(

نصیر احمد ناصر ، سورج کی زردی مائل سرخ روشنی کو لال پلکا کہہ کر پکارتے ہیں اور اس میں انھیں کائنات کے بھید کھولنے کا پیغام ملا ہے جو سورج نے بہت دور سے بھیجا ہے۔گویا وہ بھی ایک سائنس دان کی طرح روشنی (توانائی) کی راہ نمائی سے اس کائنات کے اسراروں سے پردہ اٹھانا چاہتے ہیں۔

لال پلکا اڑ کے آیا ہے
بہت ہی دور سے
پیغام لایا ہے
سرائے نور سے)نصیر احمد ناصر:لال پلکا)(۵۴(

اختر حسین جعفری اپنے سر پر تنے ہوئے اس آسمان کی ساخت اور وجود پر اظہارِ حیرت کرتے ہیں کہ آخر اسے کس نے اور کیسے یہاں پر رکھ چھوڑا۔ وہ آسمان کو بھی مادی اجسام کی طرح خیال کرتے ہیں اگرچہ آج سائنس دانوں کا خیال ہے کہ آسمان کی کوئی حقیقت نہیں اور جہاں ہماری بصارت کی حدود ختم ہو جاتی ہیں وہاں ہمیں یہ نیلا رنگ دکھائی دینے لگتا ہے۔تاہم ایک وقت ایسا بھی رہا ہے کہ اسے کبھی طشتری سمجھا جاتا رہا اور کبھی بڑا طشت، کبھی اسے گرد کے بگولے کا نام دیا گیا اور کبھی ہوا کا بندھن۔

اے عدم کی درا!
دیر سے سُن رہا ہوں میں تیری صدا
ایک پل تو ٹھہر، اپنا چہرہ اسی سُست پڑتے ہوئے خون
میں ڈھونڈ لوں
سر پر گرتے ہوئے بار سے پوچھ لوں
کس نے باندھاسے؟ اور سر پر مرے کس نے
رکھا اسے؟)اختر حسین جعفری)(۵۵(

اختر حسین جعفری کے نزدیک اجرامِ فلکی کائنات کی ماہیت کو سمجھنے کا سب سے بڑا وسیلہ ہیں۔ انسانی تاریخ اور علوم پر اس کی دست رس نے اس کے لیے ان تمام اجرام کے راز کھول کر رکھ دیے ہیں۔ سورج ، شہابیے اور چاند ابھی اپنے جوبن تک نہیں پہنچ پائے۔ اگر تاریخ پر غور کیا جائے اور بہ تدریج ان عوامل کے ارتقا کا جائزہ لیا جائے تو کائنات کے تمام راز طشت ازبام ہو سکتے ہیں۔

تپتے ہوئے آسماں کو چھونا
عجیب خواہش‘ عجب جنوں ہے جو شامِ احساس پالتی ہے
دہکتے تنور آفتابوں کی یا شہابوں کی ملکیت میں یہ اپنی قسمت کا
پارۂ نان ہو کہ مہتاب
کیوں ابھی نیم پخت ہے‘ کیوں اناج اس کا
زباں پہ پُورا گھُلا نہیں ہے
دہکتے تنور۔۔ ان کے اندر ہزارہا سال کا تجسس سوال صورت سلگ رہا ہے
یہ عصر سارے سوال سارے
پیادہ پا‘ کشتیوں‘ رتھوں‘ بیل گاڑیوں پر
اشارتوں پر‘ علامتوں پر سوار ہوکر یہاں تک آئے تھے اور کسی آگ کے عمق میں
اتر گئے ہیں)اختر حسین جعفری)(۵۶(

ہم کن زمانوں میں جی رہے ہیں کہ ہمارا مستقبل ہر لمحہ حال اور حال ہر لمحہ ماضی بنتا جا رہا ہے۔ گویا ہم ادھورے پن کا شکار ہیں۔ ہم بھی ادھورے ہیں اور کائنات کے بارے ہمارا علم بھی ادھورا ہے۔ ہم صرف اپنے جانے پہچانے اصولوں کی بنیاد پر اپنے سینوں میں موج زن آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں سرگرداں ہیں۔ہم کائنات کو اسی آہنگ سے دیکھتے ہیں جیسا ہمارا علم ہے ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس کے راز آج بھی منکشف نہ ہو پائے ہیں۔

یہ آشنا صبح کا ستارا
کہ جس کی آگاہیوں کا ناسور‘ میرے سینے میں جل رہا ہے
میں اس ستارے کی سمت روبرو قضا کھڑا ہوں
میں اپنے باطن کی اوٹ میں ہوں
یہ خشتِ ساعت کہ جس کی بالیں سے جسم آدھا نکل کے مجھ کو
بلا رہا ہے)اختر حسین جعفری: ایک خط ۔ آشنا ورثوں کے نام)(۵۷(

اختر حسین جعفری زندگی اور کائنات کے تعلق کی صراحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ میں ایک ستارے کا مکین ہوں جس میں رب کی تخلیق کی روشنی چمکتی نظر آتی ہے۔ رات وجود پہ نیند طاری کر دیتی ہے اور اک دشمن کی طرح بے ہوش کرکے ہر احساس چھین لیتی ہے مگر اس سے بچائو کے لیے کوئی مورچہ بھی نہ تو موجود ہے نہ ہی کار آمد کہ ہم خود کو چھپا بھی نہیں سکتے اور خوابوں کا اثر ہمیں ہمارے وجود سے نکال باہر لے جاتا ہے اور ہم دوسری دنیا میں جیتے ہیں۔ یہ انسان کو سمجھنے کا نفسیاتی پہلو ہے۔قدیم اساطیری حوالوں میں بھی نیند اور خواب کے ایسے ہی تعلقات کا ذکر بھی ملتا ہے۔

اک ستارے میں ہے مکاں میرا
اس مکاں میں تمھارے نام کی ضو
رات دشمن سہی مری‘ پھر بھی
مورچہ کوئی میری چھت پہ نہیں
میں نہیں خندقوں میں پوشیدہ
میں برونِ وجود زندہ ہوں)اختر حسین جعفری: اک ستارے میں ہے مکاں میرا)(۵۸(

اختر حسین جعفری زندگی کو ایک سفر قرار دیتے ہیں اور سورج کو ایک کتا جو مسلسل ہماری بو سونگھ کر ہمارا سراغ لگاتا ہے۔ ان اندھیروں میں چاند بھی سورج کا ہم راہی

بن کر حقائق کو سامنے لانے لگتا ہے۔ یہ سفر زندگی کے ساتھ ساتھ ارتقا کا سفر بھی ہے جو نئی دنیائوں تک رسائی کو ممکن بناسکتا ہے۔

سفر کی رات تعاقب میں ہے سگِ مامور
نشانِ پا سے سراغِ بدن نکالے گا
مدد کرے گا عدو کی، نکل کے ابر سے چاند
دکھائے گا سبھی ہست و بود کی راہیں
قدم قدم پہ انہی جنگلوں سے ملتی ہیں
جہاں پہ ڈھونڈی ہے مفرور قیدیوں نے پناہ
اُفق اُٹھائیں گے پھر سے کوئی نئی دیوار
بُنیں گے غولِ بیاباں باڑ لوہے کی
ہوا کہے گی کہ خودیافتی کی منزل پر
فصیلِ ذات سے محکم کوئی فصیل نہیں (اختر حسین جعفری)(۵۹)

چپک گیا ہے جلی انگلیوں کی پوروں سے
بجھے چراغ سے جیسے شرر تھا خوابیدہ
خود اپنی ذات کی تردید کے شواہد بھی
مرے خلاف صف آرا، مرے خلاف گواہ (اختر حسین جعفری)(۶۰)

اختر حسین جعفری انسان کو ایک ایسا پرندہ قرار دیتے ہیں جو شش جہات کا قیدی ہے اور اس سے باہر کی دنیا تک نہیں پہنچ جاتا۔ لیکن وہ یہ یقین ضرور رکھتے ہیں کہ ان شش جہات سے آگے بھی ابھی بہت کچھ غیر دریافت شدہ ہے اور اس تک پہنچنے کے لیے ہمیں قدیم کلیشوں کو توڑ کر سفر کرنا ہوگا۔

مجھے یقیں ہے کہ یہ نیا ہم صفیر میرا
مری طرح سے زمیں کے شیشے کی شش جہت سے نہ آگے پرواز کرسکے گا
وہ ایک میٹھی صدا کی ندی
جو رات دن کی جلی زمینوں سے دور سرسبز جنگلوں میں رواں ہے
نغمے بکھیرتی ہے
کوئی سدھایا ہوا پرندہ نہ اس کے سربستہ ساحلوں پر
اتر سکے گا (اختر حسین جعفری: سدھائے ہوئے پرندے)(۶۱)

شہزاد احمد کہتے ہیں کہ ہماری کائنات میں ہر لمحہ ہنگامہ آرائی ہے۔ سمتوں کا یہ جال وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اور یہ ابھی تک نہیں پتا کہ آخر سمتوں کا یہ پھیلائو کہاں جاکر رُکے گا۔جدید طبیعیات کیSTRING THEORY بھی سمتوں کے اسی وسیع پھیلائو کی پروردہ ہے۔

عجب ہنگامہ ہر جانب بپا ہے
اور ہر جانب
کئی سمتیں ازل سے تاابد پھیلی ہوئی ہیں
ہزاروں کہکشائیں گیند کی صورت لڑھکتی ہیں
کئی سمتوں میں جاتی ہیں

مگر واپس نہیں آتیں   )شہزاد احمد: زمانے ان گنت گزرے)(۶۲(
شہزاد احمد آسمان کو کالا سمندر کہتے ہیں جس میں وقت کا بسیرا ہے جو چیزوں کے بننے بگڑنے کا سبب بنتا ہے۔ کبھی تعمیر کرتا ہے تو کبھی تخریب۔ یہاں شہزاد احمد کے ہاں آسمان اور وقت کے تعلق کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کائنات کو دیکھنے کا یہ وہی حیرت ناک اندا زہے جس پر عہدِ قدیم کا اولین انسان عمل پیرا ہوکر آسمان کی حقیقت جاننے کی کوشش کرتا تھا۔

آسمان کالے سمندر کی طرح
اپنی گہرائی میں گرتا ہی چلا جاتا ہے
ایک چکر ہے جو پھرتا ہی چلا جاتا ہے
ایک گرداب ہے جس میں ہر شے
بنتی اور ٹوٹتی شکلوں کی طرح
ریزہ ریزہ ہوئی جاتی ہے   )شہزاد احمد: رات تنہا نکل آئی گھر سے)(۶۳(

کوانٹم طبیعیات میں DOUBLE SLIT EXPERIMENT نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ حقیقت اور دھوکا میں کتنا قریبی تعلق ہے۔ ہمیں بہت کچھ ایسا نظر آتا ہے جو حقیقت نہیں ہوتا۔ اس کائنات میں ڈھیروں سراب ہیں۔طبیعیات کے ساتھ ساتھ مابعدالطبیعیات میں بھی نہ صرف ایسے افکار کی صدا سنائی دیتی ہے بل کہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ طبیعیات نے اب اس بات کو قبولیت کی سند دی ہے جسے مابعدالطبیعیات بہت پہلے سے مان چکی ہے۔ اسی بات کو بیان کرتے ہوئے شہزاد احمد کا خیال کچھ یوں سامنے آتا ہے کہ

حقیقت جس کو جانا تھا
وہ بینائی کے دھوکے تھے
ہراک دیوار ان آنکھوں کو
دروازہ نظر آئی   )شہزاد احمد: ابھی آدھا سفر ہی طے ہوا ہے)(۶۴(

باقی چیزوں کی حقیقت تو کجا انسان آج تک اپنی ہی حقیقت کو نہیں سمجھ پایا ہے۔ اپنی اور اپنی تخلیق کی حقیقت انھیں پریشان رکھتی ہے اور خود کے بارے میں یہی پریشانی شہزاد احمد کو یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے:

میں بشر ہوں کہ کوئی سایا ہوں
حیرت اس بات پہ ہے
کیسے تاریکی میں، میں گھر سے نکل آیا ہوں   )شہزاد احمد: مجھ کو کچھ یاد نہیں)(۶۵(

زمین ابھی بھی خلائوں کے تسلط میں ہے۔ اجسام کے درمیان کشش باہمی کا قیام ہی اس کائناتی نظام کے استحکام کا ضامن ہے مگر بہت کچھ ان دیکھا بھی ہے۔ یہ ان دیکھی چیزیں BLACK HOLESاور ANTI-MATTER ہیں ۔ شہزاد احمد انھیں آسیب قرار دیتے ہیں۔کیوں کہ یہ بھی آسیب کی صورت اجسام پر قابو پا لیتے ہیں اور پھر انھیں فرار نہیں ہونے دیتے۔

زمینوں سے خلائوں کا تعلق اب بھی قائم ہے
مگر اس خالی رستے میں بھی کئی آسیب پلتے ہیں   (شہزاد احمد: ڈرو اُس وقت سے)(۶۶(

ستاروں کی تخلیق کا عمل مسلسل جاری ہے۔ روز نت نئے ذرّات تخلیق پاتے ہیں اور ٹوٹتے رہتے ہیں۔ یہ کائنات مجوعۂ تغیرات ہے۔ اس کائنات کی مستقل صفت تغیر ہے۔صوفیا کے نزدیک بھی حرفِ کُن کی روایت ہر لمحہ نئی تخلیقات کی ضامن ہے کیوں کہ ان کا خالق ابھی زندہ ہے جیسے شہزاد احمد بھٹی کی مثال دیتے ہیں۔مگر اس کے ساتھ عدم تبدیلی بھی حیرت کے نئے در وا کرتی ہے۔بہ قول شہزاد احمد:

اگرچہ یہ جہاں بے حد پرانا ہے
مگر بڑے پرانے اس جہاں میں
ستارے آج بھی تخلیق ہوتے ہیں
وہ ذرّے جن کی عمریں اب کروڑوں سال ہیں
دیکھنے میں یوں نظر آتے ہیں
جیسے آج ہی بھٹی سے نکلے ہوں
وہ بھٹی جس نے یہ ذرّے بنائے ہیں
ابھی تک گرم ہے
اور اس کے اندر ایسے ذرّے روز بنتے ہیں
فنا جو ہو نہیں سکتے

مگر اس خاک داں میں ایسی چیزیں ان گنت ہیں
جن میں اب تک کوئی تبدیلی نہیں آئی
عجب تبدیل ہوتا یہ جہاں ہے
جو کبھی تبدیل ہوتا ہی کہاں ہے (شہزاد احمد: تبدیل ہوتا ہوا جہاں)(۶۷)

نظم ’’ستارے اور زمین‘‘ میں وہ ستاروںاور زمین کے مقام کا تعین کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

یہ ستارے خشک پھیکی ریتلی مٹی کے گھر
ان کی چمکیلی جبینیں دوزخی آنکھوں کا نور
ان کی پتھریلی زمینیں بے گیاہ و بے شجر
ان کی آوارہ ہواؤں میں بلندی کا غرور
بے حرارت دھوپ ان کی ان کے چشمے بے سرور (شہزاد احمد: ستارے اور زمین)(۶۸)

شہزاد احمد جدید سائنسی علوم کے تناظر میں کائنات کو نئے انداز اور نئی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ حقائق کو دیکھنے کے لیے سب سے پہلے ہمیں اپنی حدود کو توڑنا ہوگا۔ ہمیں اس سے باہر کوئی ایسا مقام ڈھونڈنا ہوگا جہاں سے ہم اس کا بہتر نظارہ کر پائیں اور وہ مقام یقینا موجود ہے۔ ارشمیدس نے سائنسی اصولوں کی بنا پر ہی یہ دعوا کیا تھا کہ اگر مجھے خلا میں کھڑے ہونے کا مناسب مقام اور مناسب لمبائی کی لوہے کی سلاخ دے دی جائے تو میں اکیلا اس پوری زمین کو الٹ سکتا ہوں۔اس کے ساتھ ساتھ شہزاد احمد کو جو دوسری دنیا دکھائی دیتی ہے وہ ہماری دنیا سے بہت مختلف ہے۔

نہیں یہ خوش نما رستے ستاروں تک نہیں جاتے
یہ ان غاروں تلک جاتے ہیں

جن کے دوسری جانب
فلک ہے تو سہی
لیکن ہمارے آسماں جیسا نہیں ہے
وہاں کا آسماں
جھکتی کماں جیسا نہیں ہے
وہاں کا کوئی ذرّہ‘ کوئی سورج بھی
ہمارے وہم جیسا یا گماں جیسا نہیں ہے
وہاں بارش بھی ہے‘ دریا بھی ہیں
لیکن بہائو خاک کے آبِ رواں جیسا نہیں ہے
وہاں کے رہنے والے بھی سفر کرتے یں
لیکن یہ سفر
صحرا میں بھٹکے کارواں جیسا نہیں ہے
وہاں سے بھی ہزاروں خوش نما رستے نکلتے ہیں
مگر وہ بھی ستاروں تک نہیں جاتے
کئی ایسے جہانوں کی طرف جاتے ہیں
جن کی وسعتیں اتنے پرت رکھتی ہیں
جو ہم سے گنے جاتے نہیں ہیں
پرت اندر پرت چلتی ہیں موجیں روشنی کی
روشنی سیدھی نہینچلتی
بہت لہرا کے چلتی ہے
یہاں جتنے پرت ہیں
وہ زمیں بھی آسماں بھی ہیں
وہ یوں اک دوسرے کے ساتھ ہیں
جیسے کسی اونچی عمارت کی چھتیں ہوں
یہ چھتیں تو ختم ہونے میں نہیں آتیں
چھتوں کے درمیاں
سورج‘ ستارے‘ چاند سب کچھ ہے
یہاں حدِّ نظر تک
پھول ہیں‘ پودے ہیں‘ بادل ہیں
اور اک بادل تو ایسا ہے
کہ جس پر بیٹھ کر
ہم ہر پرت کی وسعتوں کو دیکھ سکتے ہیں)شہزاد احمد: خوش نما راستے)(۶۹(

جدید سائنس کہتی ہے کہ کائنات ایک نہیں ہے بل کہ کئی کائناتیں ہو سکتی ہیں۔ شہزاد احمد سوال کرتے ہیں کہ آخر یہ کائناتیں ‘ یہ کہکشائیں کب تک یوں ہی محوِ سفر رہیں گی۔ کبھی تو ان کے سفر کا اختتام ہوگا۔اختتام کے حالات بھی نئے مباحث کو جنم دیتے ہیں۔
کئی ارب سال پہلے تخلیق ہوے والی

یہ کائناتیں‘ یہ کہکشائیں
اگر رہیں گی‘ تو کب تلک جاگتی رہیں گی
کہاں تلک بھاگتی رہیں گی
کبھی تو تھک ہار کر گریں گی
خود اپنے پیروں کو چوم لیں گی! (شہزاد احمد: عجیب بے چارگی کا عالم ہے)(۷۰)

لیکن انھیں اس بات کا یقین ہے کہ وہ لمحہ ضرور آئے گا جب سب کچھ بدلنے لگے گا۔ اسی بدلائو کی کہانی ان کی نظم ’’ابھی یہاں کچھ بھی تو نہیں‘‘ میں کچھ یوں سامنے آتی ہے:

اب وہ لمحہ کب آئے گا
جب اس راکھ کے اندر سے
آئینے باہر آئیں گے
کبھی ستارے بن جائیں گے
اور کبھی آنکھوں میں آنسو
لیکن ابھی وہ آنکھیں تو موجود نہیں ہیں
جن کی ایک نظر
منظر کو کچھ سے کچھ کرسکتی ہو!
جو اِن رخنوں کو بھی بھرسکتی ہو
جن کا ہونا‘ انہونا ہے
لیکن ابھی وہ ہاتھ کہیں موجود نہیں ہیں
جو انگارے چُن سکتے ہوں
جو اڑتی کرنوں کو پکڑ کر
نئی زمینیں‘ نئے ستارے بن سکتے ہوں
ابھی یہاں کچھ بھی تو نہیں ہے
ابھی یہاں کچھ بھی تو نہیں ہے
کچھ بھی نہیں! (شہزاد احمد: ابھی یہاں کچھ بھی تو نہیں)(۷۱)

کائنات کو سمجھنے کا ایک اور انداز مابعدالطبیعیاتی ہے۔ مابعدالطبیعیاتی انداز تمام مذاہب کی جان رہے ہیں۔ معرفتِ الٰہی اور حقیقتِ کائنات اور اس میں انسان اور خدا کا مقام جاننے کے لیے تاریخِ انسانی کی ابتدا سے ہی عبادات و ریاضت کے سلسلوں کا ذکر ملتا ہے۔ صوفیا نے ہمیشہ کائنات کی ایسی تفہیم کی کوششیں کی ہیں جن کو سمجھنے کے لیے راہِ سلوک کا سالک ہونا ضروری ہے۔ بہت سے لوگ تصوف کے مخالف بھی رہے ہیں۔ اس کے حق اور مخالفت میں مباحث کا سلسلہ شروع سے ہی جاری و ساری ہے۔ صوفیا کا بنیادی عقیدہ ہماری اس معلومہ دنیا کی نفی کرکے اثباتِ ذات کرنا ہے۔ دنیا میں رہتے ہوئے بھی اس سے اجتناب کرنا اور اس دنیا کے اصولوں سے ماورا اپنے اصول و ضوابط کے مطابق زندگی گزارنا ہے۔ دنیا کی ہر زبان کے ادب میں صوفیانہ عناصر ملتے ہیں۔ اگر ہم جدید اردو نظم کے کائناتی تناظر کو دیکھیں تو واضح ہوتا ہے کہ ان شعرا کے ہاں بھی صوفیا کے کائناتی شعور کی کاوشیں نظر آتی ہیں۔اقبال کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

خالی ہے کلیموں سے یہ کوہ و قمر ورنہ

تو شعلۂِ سینائی‘ میں شعلۂِ سینائی!
تو خاک سے کیوں پھوٹا میں شاخ سے کیوں ٹوٹا
اک جذبۂِ پیدائی اک لذتِ یکتائی
غوّاصِ محبت کا اللہ نگہباں ہو
ہر قطرۂِ دریا میں‘ دریا کی ہے گہرائی)اقبال: لالۂِ صحرائی)(۷۲(

اقبال کے ہاں ہمیں صوفیانہ مضامین کی بھرمار دکھائی دیتی ہے۔ ان اشعار میں وہ تکوینِ کائنات کے عناصر کے باہمی ربط کو ظاہر کرتے ہیں کہ یہ کائناتِ رنگ و بو خدا نے اپنی پہچان کے لیے پیدا کی اور انسان کو نیابت کا عہدہ دے کر اس دنیا میں بھیجا۔ پھر وہ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ آخر اس مرکز سے جدائی کیوں کر ہوئی؟تو جواب ملتا ہے کہ خالق نے یہ کائنات اپنی یک تائی کے اظہار کے لیے پیدا کی۔ اس کائناتِ اکبر میں کائناتِ اصغر (انسان) خود اتنا گہرا ہے کہ اس تک ہی رسائی ممکن نہیں ہے۔ عموماً ان سلاسل میں انسان کو قطرہ کہا گیا ہے اور روحِ ازل‘ روحِ ربّی کو دریا۔ قطرہ دریا سے ملنے کو بے تاب ہے لیکن وجود کی دیوار درمیان میں حائل ہے۔ وہ اس دیوار کو توڑ دینا چاہتا ہے۔ اسی لیے صوفیا کے ہاں موت کو ایک اچھے دوست کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے جو جزو کو کل سے ملا دیتی ہے۔ اقبال انسان کی گہرائی کو قطرہ قرار دے کر یہ بھی کہتے ہیں کہ قطرے کی گہرائی میں دریا کی گہرائی موج زن ہے۔

ایسا ہی ایک اور خوب صورت بیان ہمیں اقبال کی شہرۂِ آفاق نظم ’’جبریل و ابلیس ‘‘ میں بھی نظر آتا ہے۔ جب جبریل ؑ ‘ ابلیس کو اس کے گناہ کا احساس دلاکر شرمندہ کرنا چاہتے ہیں تو ابلیس کا احساسِ تفاخر اس سے یہ کہلواتا ہے کہ جو مزا ٹوٹنے میں ہے وہ قائم رہنے میں کہاں۔ تم تو صرف اللہ ہو کے ورد کے عادی ہو‘ حقیقت جاننا ہو تو میری طرح راندۂِ درگاہ بن کر دیکھ پھر تجھے سمجھ آئے کہ اصل رنگ کیا ہے۔ میں تو اسی رنگ کے نشے میں مست ہوں۔

آہ اے جبریل! تو واقف نہیں اس راز سے
کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو)اقبال: جبریل و ابلیس)(۷۳(

اسلامی نظریات کے مطابق خدا کے چار مقرب فرشتوں میں سے ایک اصرافیل ہیں جو قیامت کے روز صور پھونکیں گے اور تمام کائنات پہلے تباہ ہوگی اور پھر ہر ذی روح دوبارہ سے جی اٹھے گا اور اپنے رب کے حضور پیش ہوگا۔ راشد نے اپنی شاعری میں جہاں خدا کی موت کی بات کی ہے وہیں پر اصرافیل کو بھی موت سے ہم کنار دکھایا ہے کہ اب وہ جی اٹھنے کے رنگ باقی نہیں رہے۔ اگرچہ یہ مسلم امت کی کوتاہ علمی کا نوحہ ہے لیکن اس کے مابعدالطبیعاتی عناصر کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

مرگِ اصرافیل پر آنسو بہائو
وہ مجسّم ہمہمہ تھا‘ وہ مجسّم زمزمہ
وہ ازل سے تاابد پھیلی ہوئی غیبی صدائوں کا نشاں! (ن۔م۔راشد: اصرافیل کی موت)(۷۴(

اصرافیل ؑ نظامِ کائنات کو چلانے والے اہم ستونوں میں سے ایک ہے۔ راشد جب اس کی موت کا اعلان کرتے ہیں تو ساتھ ہی کائنات میں آنے والی تبدیلیوں پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ اصرافیل کی موت تمام آوازوں کی ‘ سازوں کی اور وقت کی موت ہے۔

مرگِ اصرافیل سے‘

اس جہاں کا وقت جیسے سوگیا‘ پتھراگیا
جیسے کوئی ساری آوازوں کو یکسر کھا گیا‘
ایسی تنہائی کہ حُسنِ تام یاد آتا نہیں
ایسا سنّاٹا کہ اپنا نام یاد آتا نہیں! (ن۔م۔ راشد: اصرافیل کی موت)(۷۵(

صوفیانہ روایت میں انسان کو قطرہ اور دل کو آئینہ کہا گیا ہے۔ صوفیا کا بنیادی مطمعِ نظر اپنے قلب کی صفائی ہے تا کہ وہ نورِ ازل کا مشاہدہ کر سکیں۔ اس کے لیے مختلف طرح کے چلّے اور عبادات و ریاضت کے رجحانات عام ہیں۔ ایوب خاور بھی کائنات کو سمجھنے کی اسی صوفیانہ کاوش کا حصہ بنتے ہیں تو انھیں بھی زندگی اس راہ کی دیوار نظر آتی ہے۔ اس دیوار کے دوسری جانب حیرت ہی حیرت ہے مگر اس تک پہنچنے کے لیے اس آئینے کا ٹوٹ جانا ضروری ہے۔ آئینہ دھوکا ضرور ہے مگر ہے تو اصل کا پرتو ہی۔

اسی اک آئینے کا عکس ہے
میری محبت بھی
تمھارے چاہنے والوں کی حیرت بھی
یہ حیرت آئینے کے ٹوٹنے تک ہے
ہمارے ہاتھ سے سانسوں کی ڈوری چھوٹنے تک ہے)ایوب خاور: انتظارِ شکستہ)(۷۶(

اس کائنات میں بہت سے اسرار پوشیدہ ہیں ۔ اگر ہم ان اسراروں کا بھید پانا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی مرضی کو چھوڑ کر اس خالق کی مرضی کے مطابق چلنا ہوگا۔ یہ جو کچھ ہمیں دکھائی دے رہا ہے یہ سب فریبِ نظر ہے کہ ’’لا‘‘ کے پردے کے پیچھے ’’الا‘‘ کے رنگوں سے لطف اٹھانے کا معیار کٹھن ہے۔ جب وہ چشمِ بینا حاصل ہوجائے تو حقیقت خود سامنے آجاتی ہے اور نئے رنگ واضح ہونے لگتے ہیں۔بہ قول جاوید انور:

ان کہی نظم کی طغیانی میں
ہیں بھنور کتنے‘ گُہر کتنے ہیں
کتنے اِلاّ ہیں پسِ پردۂ لا
چشمِ نابینا کے آفاق میں ہیں
کتنے بے رنگ کُرّے
کتنے دھنک رنگ خلا)جاوید انور: برف کے شہر کی ویران گزرگاہوں پر)(۷۷(

اختر حسین جعفری بھی کہتے ہیں کہ اس دنیا کی زندگی بھی دھوکا ہے اور موت بھی کہ اس کے بعد تو پھر سے جی اٹھنا ہے‘ تو یہ موت اور یہ حیات کیا چیز ہےنہیں۔حقیقت تک رسائی حاصل کرو کہ اس دنیا میں دھوکے ہی دھوکے اورغم ہی غم ہیں۔ ان اشعار میں صوفیا کی طرز پر دنیا کو دکھوں کا گھر قرار دیا گیا ہے۔

بہتے دن کا گدلا پانی
کچھ آنکھوں میں
کچھ کانوں میں۔ اور شکم میں نا آسودہ درد کی کائی
اس دریا میں لمحہ لمحہ ڈوبنے والے!
تیرا جینا مرنا کیسا؟

تیرا پار اترنا کیسا؟   )اختر حسین جعفری: تیرا پار اُترنا کیسا)(۷۸(

وحدت الوجودی صوفیا کو کائنات کی ہر شے میں خدا دکھائی دیتا ہے۔ ایسے ہی عناصر ویدانتی فلسفہ کی بنیاد بھی ہیں۔ اردو ادب میں اس فلسفہ کے حوالے سے ڈھیروں مباحث موجود ہیں۔ اختر حسین جعفری بھی ہر شے میں اسی کا جلوہ دیکھتے ہیں اور ہمیں ان کے ہاں وحدت الوجودی افکار کی گونج سنائی دیتی ہے۔

سرِ نگاہ وہی عکسِ آئینہ خانہ
ہر ایک رُخ پہ ہے جس کے نشانِ صدق و دروغ
وہ عکسِ آبِ تحیّر ازل کے دریا کا
درونِ ارض و سما ممکنات کا پانی
کہیں پہ چشمۂ آبِ صفا، کہیں جوہڑ
وہ عکس، پھول سرِ مرقدِ امیدِ حیات   )اختر حسین جعفری)(۷۹(

اختر حسین جعفری کے ہاں کائناتی حقیقت کو جاننے کے لیے حدوں کو توڑنے کا اظہار ملتا ہے۔ وہ لفظ سے نہیں اس کے اندر چھپے معنی سے پیار کرتے ہیں۔ اسی طرح مخلوق سے تعلق میں بھی انھیں خالق کی تلاش ہے اور اسی انداز سے وہ نئے معانی کے متلاشی بھی ہیں۔

اٹھائیں فرشِ سماعت سے لفظ لفظ کی خشت
صدا کے خشک سمندر کو چھان کر دیکھیں
کہاں ہے جوہرِ صورت کہاں زرِ معنی
جگائیں حرف کو خوابِ سفر سے اور پوچھیں
کہاں وہ قصر ہے جس کے کھُلے دریچے سے
دکھائی دیتا ہے مفہوم کا نیا چہرہ   )اختر حسین جعفری)(۸۰(

روح ، زندگی کی علامت ہے۔ جب تک روح ہے جسم بھی زندہ رہتاہے اور روح (ہوا) کے نکلتے ہی بے جان ہو جاتا ہے۔ اختر حسین جعفری اسے ہوا کا لباس قرار دیتے ہیں کہ یہ اترے گا تو یقین کا ساحل عطا ہوگا اور حقائق دکھائی دیں گے۔ کیوں کہ جسم کے بغیر روح اور روح کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں رہتا۔ یہ مکمل طور پر کائناتی تعلق کو سمجھنے کا ایک صوفیانہ انداز ہے۔

بدن سے اترے شکن در شکن لباسِ ہوا
لہو کی لہر کسی ساحلِ یقین پہ رُکے
ہٹے نگاہ کے شیشے سے عکس کا پردہ
تو وہ سپیدۂ خوابِ ازل نظر آئے
اٹھائے پھرتا ہے جس کی شبیہہ ناخنِ درد
فلک کی شاخ سے اُتریں وہ طائرانِ ابد
پروں سے جن کے اُفق تا اُفق دمِ پرواز
زمینِ منتظر و کوہِ بے ارادہ پر
دھنک کے رنگ میں گردِ ممات گرتی ہے   )اختر حسین جعفری)(۸۱(

ایک اور شورِ قیامت کہ بند قبر کھُلے

اک اور ضرب کہ تمثال دار آئینہ
تمام عکسِ مکرّر ترے رہا کردے
اک اور ضرب کہ بودونبود کی تقسیم
اسی فصیل‘ اسیِ خشتِ ماسوا تک ہے
قدم اک اور کہ اُس کاخ و کو میں روشن ہے
وہ ہفت رنگ ستارہ جو آسماں میں نہیں
ہمارے ساتھ غریب الدّیار جس کے لیے
دنوں کی شاخِ برہنہ‘ شبوں کی زلفِ تہی
قدم اک اور کہ آگے وہ معرکہ ہے جہاں
صداقتوں کے مقابل صداقتیں ہوں گی)اختر حسین جعفری)(۸۲(

وحدت الوجودی فلسفہ کے پیرو ہر شے میں خدا کے وجود کے قائل ہیں۔ انھیں ہر شے کے اندر اک حقیقت کا بھید نظر آتا ہے۔ راہی معصوم رضا بھی ایک تمثیل کے ذریعے وجود کے اندر موجود دوسرے وجود کا پتا دیتے ہیں۔ اس نظم کو دو انداز سے سمجھا جاسکتا ہے۔ ایک طرف تو ماں بچے کے اندر اپنا آپ تلاش کرتی ہے کہ وہ اس کی خالق ہے شاید اسی لیے چاند میں ’’بڑھیا‘‘ کے عکس سے معنی پیدا کیے گئے ہیں اور دوسری طرف اس میں خالقِ حقیقی کی جھلک کو ظاہر کیا گیا ہے۔

ماں سے اک بچے نے پوچھا
چاند میں یہ دھبا کیسا ہے
ماں یہ بولی
چندا بیٹے
جس کو تم دھبا کہتے ہو‘ وہ تو اک پاگل بڑھیا ہے
بچے نے معصوم آنکھوں سے کچھ لمحوں تک ماں کو بڑی حیرت سے دیکھا
اور یہ پوچھا:
ماں! جب میں چندا بیٹا ہوں تو مجھ میں بھی اک پاگل بڑھیا ہوگی
ماں نے اس کو بھینچ لیا
اس کے لب چومے
گردن چومی‘ ماتھا چوما
اور یہ بولی: ہاں تجھ میں بھی اک بڑھیا ہے)راہی معصوم رضا: چاند کی بڑھیا)(۸۳(

زاہد ڈار بھی جسم کو پرواز کے راستے کی رکاوٹ سمجھتے ہیں اور اس سے آزادی کے طلب گار ہیں کہ وہ ایک بھرپور اڑان کا لطف لے سکیں۔ یہی رویہ ہمیں صوفیا کے ہاں بھی دکھائی دیتا ہے۔

میں ہوائوں میں پرواز کرنا چاہتا ہوں
میرا جسم مجھے اڑنے نہیں دیتا
میرا جسم میرے لیے ایک بوجھ بنا ہوا ہے
میں اپنے جسم سے سخت بے زار ہوں)زاہد ڈار)(۸۴(

مبارک احمد بھی حقیقت تک پہنچنے کے لیے نسبت کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہر شے کی حقیقت اس وقت تک عیاں نہیں ہو سکتی جب تک اس کی نسبت کی وضاحت نہ ہو پائے۔ جیسے انسان کی اس موجودہ دنیا سے محبت بھی اسی نسبت کی وجہ سے ہے کہ انسان کو اس میں خالق کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور یہ اس کا مسکن ہے۔

چونکہ میں جانتا ہوں کہ زماں ہمیشہ زماں ہی رہے گا
اور مکاں ہمیشہ صرف مکاں ہی
اور جو کچھ بھی حقیقت میں ہے
او رکی حقیقت صرف ایک خاص وقت
اورصرف ایک خاص جگہ ہی کی نسبت سے ہے (مبارک احمد: ایش وینز ڈے)(۸۵)

شہزاد احمد بھی ایک صوفی کی طرح موت کو بہترین دوست قرار دیتے ہیں اور اس کی تلاش میں ہیں۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ شہزاد احمد کی زندگی میں وہ لمحہ بھی آیا جب ڈاکٹروں نے انھیں مردہ قرار دے دیا لیکن بعد ازاں وہ پھر سے جی اٹھے۔گویا ان کے ہاں موت کا ایک انتہائی مختلف نوعیت کا ذاتی تجربہ بھی موجود ہے۔ ان کے اشعار میں موت کے حوالے سے اس کا استعاراتی بیان کئی جگہ پر موجود ہے۔

خاک کردے گا کسی دن مجھے تنہا ہونا
موت سے بڑھ کر نہیں کوئی رفیق (شہزاد احمد: آج تک)(۸۶)

کاش یہ سایہ ابد تک مرے ہمراہ رہے
آج تک موت کا پیچھا نہیں چھوڑا میں نے (شہزاد احمد: آج تک)(۸۷)

شہزاد احمد ہماری دنیا کو ہمیشہ سے موجود سمجھتے ہوئے یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر ایسا ہی تھا تو پھر ہم اسے جان کیوں نہیں پاتے۔ کہیں یہ سب وقت کا کھیل تو نہیں کہ ہمیں حقیقت کو پانے کے لیے اپنے آپ کو کھونا پڑے گا۔

یہ عالم اک زمانے سے یہاں موجود ہے
لیکن کہاں ہے؟
کیا اسے محسوس کرنے کے لیے
محسوس کرنے کی صلاحیت
ہمیں کھونی پڑے گی؟
ہم بھی اس بنتے ہوئے٬ مٹتے ہوئے
لمحے کی صورت ہیں
جو ہے بھی اور نہیں بھی ہے! (شہزاد احمد: یہ کیسا ٹوٹتا بنتا جہاں ہے)(۸۸)

صوفیا٬ رب کو نہاں خانۂ دل میں مقیم مانتے ہیں اور اسے دیکھنے کی تڑپ میں جیتے ہیں۔ لیکن اسے دیکھنے کے لیے آنکھیں بند ہونا (موت) ضروری ہے۔ دوسری طرف اس سے مراد مراقبہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ جس میں عبادت و ریاضت کی بنا پر صوفیاموجود سے ماورا حدود تک رسائی کے دعوے دار بنتے ہیں۔اور دورانِ مراقبہ وہ اپنی ظاہری آنکھوں کو بند کرکے باطن کی آنکھ کھولنے کی کوشش کرتے ہیں جو اس معلوم کائنات کے اصولوں سے منحرف ہے۔

تم کون ہو سامنے تو آئو!
لیکن تمھیں دیکھنے کی خاطر
آنکھیں مری بند ہورہی ہیں
کیا تم مری روح میں مکیں ہو؟
یا میری طرح کہیں نہیں ہو! (شہزاد احمد: کب تک تمھیں ڈھونڈتا پڑے گا)(۸۹(

اس دنیا میں حاضر و غیر حاضر کیا ہے؟ کیا ہر موجود شے حقیقت میں موجود اور ہر غایب شے حقیقت میں غیر حاضر ہے؟ تصوف تو ہر شے کو دھوکا قرار دیتا ہے اور آج کے دور میں کوانٹم طبیعیات کے نظریات بھی کچھ ایسے ہی ہیں۔شہزاد احمد اسی غیر یقینیت کو بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ

زمین و آسماں لاکھوں برس سے
اپنی اپنی شکل میں موجود ہیں
لیکن یہ ہونا۔ کیا نہ ہونے کی علامت ہے؟)شہزاد احمد: زمانہ ہوگیا)(۹۰(

اسی احساس کے تحت شہزاد احمد بھی اس کائنات اور زمان کودھوکا اور فریب قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس میں پھیلائو ہی پھیلائو ہے اور اجسام کے درمیان لامتناہی فاصلے رکھ دیے گئے ہیں۔

یہاں جو کچھ ہے‘
اس کو دیکھ کر میں سوچتا ہوں
یہ خزانہ کچھ نہیں
ازل سے تاابد پھیلا ہوا ہے
سارا زمانہ۔ کچھ نہیں ہے)شہزاد احمد: ہوا بھی چلتی رہتی ہے)(۹۱(

اے مالکِ کائنات تونے
یہ کیسا جہاں بنا دیا ہے
کیوں فاصلے رکھ دیے ہیں اتنے
ہر شے کو مٹا مٹادیا ہے)شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ)(۹۲(

شہزاد احمد تخلیق کے ابتدائی لمحے کو بیان کرتے ہوئے جدید سائنس کا نظریہ بیان کرتے ہیں جس کے مطابق کائنات عظیم دھماکے کے بعد اولین تین سیکنڈز میں بے تحاشا انداز میں پھیلی اور پھر پھیلائو کا یہ سفر کم رفتاری سے چل پڑا۔اور آخر کار اس پھیلائو کو پھر سکڑائو کی صورت اختیار کرتے ہوئے اس کائنات کی تباہی کا باعث بننا ہے۔

وہ کیسی صبح تھی‘ کیسا سماں تھا
سفر جب کارواں درکارواں تھا
جو دریا اپنی آنکھوں سے نہاں تھا
نئے آغاز کی جانب رواں تھا)شہزاد احمد: بہت بے آبرو ہونے کے دن ہیں)(۹۳(

سائنس دانوں نے بھی صوفیا کی طرح کائنات میں غیر مرئی اجسام اور غیر سماعی آوازوں کے وجود کا احساس حاصل کیا ہے۔ انھی عناصر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شہزاد احمد رقم طراز ہیں کہ

میرے سارے جسم میں بینائی ہے

اور آنکھیں وہ جہت بھی دیکھتی ہیں
جو ہمیشہ سے یہاں موجود تھی
لیکن کبھی میں نے اُسے دیکھا نہ تھا
میں وہ آوازیں بھی سُن سکتا ہوں
جن کی بازگشت
آنے والے ان زمانوں سے بھی آتی ہے مجھے
جن کی قسمت میں بدلنا ہی نہیں
اپنے چکر سے نکلنا ہی نہیں)شہزاد احمد: جسم سے باہر نکل آیا ہوں میں)(۹۴(

جو بھی اس کائنات میں موجود ہے وہ ازل سے ہے۔ ہر شے صرف اپنے ارتقا کے اس سفر میں ہے جہاں اس کی منزل خود کو وقت آنے پر ظہور کے قابل بنا کے پیش کرنا ہے۔ اسی لیے شہزاد احمد اس دنیا کو وہم کا بندی خانہ قرار دیتے ہیں۔

یہاں ایک ذرّہ بھی ایسا نہیں
جو نیا ہو!
نئے پن کی خواہش فقط وہم ہے
اور تو 'وہم کے بندی خانے میں ہے)شہزاد احمد: رہائی طلب کرنے والی ہوا)(۹۵(

نظر سمجھتی ہے ہر زمانہ رکا ہوا ہے
مگر خلا کی بسیط وسعت میں
کوئی بھی ایسی شے نہیں ہے
کہ جس کے بارے میں
ہم تیقّن سے یہ بتائیں
وہ ہے' نہیں ہے)شہزاد احمد: عجیب بے چارگی کا عالم ہے)(۹۶(

یہ دھوکا تمام کائناتی مظاہر میں کارفرما ہے۔ اندھیرا اور اجالا بھی اسی کی کڑیاں ہیں۔ یہاں موجود تمام اشیا ایک سی نہیں ہیں بل کہ یہاں تو بہت کچھ ایسا ہے کہ جس تک رسائی ہماری سوچ کے اختیار میں بھی نہیں ہے۔تاہم ان کے وجود سے انکار ممکن نہیں ہے۔

اُجالے اور اندھیرے کا نرالا سلسلہ ہے
کبھی بننے کبھی مٹ جانے والا
یہی وہ سلسلہ ہے
جس پر قائم ہیں ستوں
سب آسمانوں کے
گئے گزرے زمانوں کے
ان انجانے جہانوں کے
جہاں تک سوچ بھی جاتی نہیں ہے
مگر ''وہ '' ہیں
ہمیں پورا یقیں ہے)شہزاد احمد: ابھی آدھا سفر ہی طے ہوا ہے)(۹۷(

سائنس نے خدائی ذرّے کی دریافت کے بعد کائنات کو دیکھنے کا تناظر بدل لیا ہے۔ خدائی ذرّہ اُس ابتدائی ذرّے کو قرار دیا گیا ہے جس کا حجم نہ ہونے کے برابر اور کمیت بے

انتہا تھی اور اس کے پھیلائو کے نتیجے میں یہ کائنات وجود میں آئی۔ شہزاد احمد خود کو وہی ذرّہ قرار دیتے ہیں۔ صوفیا کے ہاں بھی ایسے ہی تصورات دکھائی دیتے ہیں کہ وہ خود میں کائنات کو مستور پاتے ہیں۔

میں اُس ریزے کی صورت ہوں
کہ جس سے
کئی سمتیں لپٹ کر رہ گئی ہیں
کئی طرفیں چمٹ کر رہ گئی ہیں
میں ذرّہ ہوں
مگر میں اک جہاں ہوں
اگرچہ تم نہیں پہچانتے ہو
کون ہوں میں
اور کہاں ہوں
میں شاید کارواں ہوں
کارواں در کارواں ہوں
میں ہوں اک بحر میری حد نہیں ہے (شہزاد احمد: میں اک ذرّہ ہوں)(۹۸)

ڈاکٹر جواز جعفری اس معلوم کائنات کی وسعت سے غیر مطمئن ہیں اور ایک نئی دنیا کی تلاش کا جذبہ رکھتے ہیں۔ نئی دنیا کی یہ تلاش بھی عجیب ہے جس کا اظہار ان کی نظم ’’کائنات کے غیر منکشف خطوں میں چہل قدمی‘‘ میں دکھائی دیتا ہے۔ وہ نیلے آسمان کی بلندی سے زمین کو سر کے بل زمین پر گرتا ہوا محسوس کرتے ہیں اور خود کو آسمان کی شاہراہِ سفید کے کنارے محوِ انتظار پاتے ہیں کہ

نیلے آسمان کی بلندی سے
سر کے بل زمین پر گرتی
شاہراہِ سفید کے کنارے
کسی اجنبی روشنی کے استقبال کی خاطر
میں آسمان پر
آنکھیں لگائے کھڑا ہوں
جو صدیوں پہلے
میری سمت روانہ ہوچکی ہے! (جواز جعفری: کائنات کے غیر منکشف خطوں میں چہل قدمی)(۹۹)

اس انتظار کی بنیادی وجہ محض روشنی کا استقبال ہی نہیں ہے بل کہ اس روشنی کے ہاتھوں دوسری دنیا ئوں سے پہنچنے والا وہ سندیس ہے جو زندگی کو اس علم کی حدسے ماورا کردے گا ‘ جسے ہم اب تک جانتے ہیں۔ یہ سندیسا بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ یہ سندیسا روشنی کے بنیادی وسیلے یعنی سورج نے بھیجا ہے جو اپنی عمرِ عزیز کا بڑا حصہ گزار چکا ہے۔ اب بڑھاپا اس کا مقدر ہے۔ یہ سندیس روشنی کے اس نشیمن کا حاصل ہے۔ اسی لیے وہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ کائناتی پیغام تمام قدیم کلیشوں کو توڑ ڈالے گا۔ ہر چیز اپنا مقام کھودے گی۔ حتّٰی کہ اس بھید کے کھلتے ہی خدا بھی آنکھوں کی منڈیر سے اک آنسو کی صورت نیچے جا گرے گا۔ یہاں خداسے مراد ہماری معلوم حدود ہیں جو ایک تصور پر آ کر

اختتام پذیر ہوجاتی ہیں۔ لیکن حقائق کی دنیا اس تصور سے آگے بھی موجود ہے جس تک ڈاکٹر جواز جعفری کا تخیل راہ نمائی کرتا ہے اور وہ ان غیر منکشف خطوں کی سیر سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔

روشنی کی اس اَن چھوئی دوشیزہ کے ہاتھ میں
میرے لیے ایک سندیسہ ہے
ستاروں سے میرے تعلق کا
جو کائنات کے مضافات میں
روشنی بانٹتے
کسی بوڑھے سورج نے مجھے بھیجا ہے!
اس سندیسے میں
میرے لیے اک بھید ہے
جس کے کھُلتے ہی
خُدا میری آنکھوں کی منڈیر سے گر جائے گا
اور اَن دیکھی کہکشاؤں کے
آنکھ سے اوجھل موسموں
اور اجنبی سمتوں میں پر کھولے
ستاروں کے بلند پرواز پنچھی
ایک ایک کرکے
میری ہتھیلی پر اترنے لگیں گے!
میری محبوب!
میں تیرا مرمریں ہاتھ تھامے
کائنات کے غیر منکشف خِطّوں میں
تیرے ساتھ
چہل قدمی کی خواہش میں زندہ ہوں!

)جواز جعفری: کائنات کے غیر منکشف خطوں میں چہل قدمی)(۱۰۰(

کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ یہ وہ بنیادی سوال ہے جس پر ہر سائنس دان اور فلسفی نے غور کیا ہے۔ نیوٹن کے قانونِ تجاذب کے مطابق کائنات کے ہر دو اجسام کے درمیان کشش یا دفع کی قوت پائی جاتی ہے جو ان اجسام کی کمیتوں کے حاصلِ ضرب کے راست متناسب اور ان کے مراکز کے درمیان فاصلہ کے مربع کے بالعکس متناسب ہوتی ہے۔ اس تجاذبی قوت کو کیونڈش نے تجرباتی سطح پر ثابت بھی کیا۔ کائناتی اجسام میں موجود ایسی ہی کشش ڈاکٹر جواز جعفری کو خود کو کائنات سے موازنے پر اکساتی ہے اور کائنات کے اور اپنے درمیان رشتوں تک رسائی حاصل کرنے میں مدد دیتی ہے۔ مگر یہاں اس معلوم سائنسی پہلو سے ایک قدم آگے بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ مادی سطح سے اک قدم آگے بڑھتے ہیں۔ یہاں بہ ظاہر وہ اپنی محبوبہ سے مخاطب ہیں جو روشنی ہے۔ مگر کائنات اور روشنی کے درمیان تعلق بہترین انداز میں اشیا کی ماہیت کو بیان کرتا ہے۔ شاید یہی وہ راستا ہے جس پر ابھی سائنس نے سفر کی ابتدا کی ہے اور مادی حدود سے آگے بڑھ کر اشیا کو توانائی کی صورت میں پرکھنے کا

ڈول ڈالا ہے۔ یہ تو ابھی ابتدا ہے کہ اس سفر کی انتہا تو بہت دور ہے۔اور اس فکری سفر کی ابتدا کرنے میں ڈاکٹر جواز جعفری اور شہزاد احمد جیسے شعرا کا کردار انتہائی اہم ہے۔

کائنات اور میرے بیچ
زمین اور چاند جیسا رشتہ ہے
)بظاہر غیر جسمانی(
لیکن اس قُرب آمیز دوری
اور راکھ کردینے والی بے تعلقی کے باوجود
تیرے اندر
ایسی کون سی قُوّت ہے؟
جو اتنے فاصلے سے
مجھ پر اثر انداز ہوتی ہے!
زمین زاد!
میں اپنے قدموں کے نیچے بچھے
تیرے راستوں سے نکل کر
کائنات کی تعمیر سے بچ جانے والے
ملبے کی طرح
سورج کے مضافات میں
)تیری رونقوں اور اپنی ویرانیوں سے دور(
آوارہ ستاروں کے کسی غول کے ہمراہ
بھٹکتے بھٹکتے
ڈھیر ہوجانا چاہتا ہوں!
مگر میرے پائوں سے
تیرے ہاتھ تک
کوئی اَن دیکھی زنجیر ہے
جو مجھے تیرے مدار سے باندھے رکھتی ہے!
میں تیری کشش سے
چھوٹ جانے کی تمنا میں
کولہو کے بیل کی طرح
تیرے گرد چکر کاٹ رہا ہوں! (جواز جعفری: زمین اور چاند جیسا رشتہ)(۱۰۱(

دوسری طرف اس نظم میں سورج اور دیگر اجرام کی گردش پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جو توانائی کی ان دیکھی زنجیر کے ساتھ بندھے اپنے ہی راستوں پر چلے جارہے ہیں۔ خلا ان کی زندگیوں کا حاصل ہے جو آخر ان کی مادی سطح کا اختتام کرکے انھیں توانائی میں بدل ڈالے گا۔ اس بدلائو کے لیے ذات کے اندر کے سفر کی بھی شدید ضرورت ہے اسی لیے ڈاکٹر جواز جعفری کہتے ہیں کہ باہر کے اس خلا کی طرح میرے اندر بھی ایک خلا ہے 'جسے میں اپنی تنہائی سے بھرتا ہوناور میرے باہر بھی ایک خلا ہے۔ ان خلائوں میں وجودِ انسانی تاریک

پانیوں میں ڈوبتے جزیرے کی صورت ہے‘ جو زندگی کی رگوں سے لہو نچوڑ لینے کو ہے مگر پھر بھی وہ مایوس نہیں ہیں اور کہتے ہیں:

جانے والی!
میرے پائوں کے تلووں مینتیری محبت جاگتی ہے
میں زمین کے ساحل پر ننگے پائوں کھڑا
اس ڈوبتے جزیرے پر
اپنے حصے کی مٹی ڈال رہا ہوں!
کالے پانیوں کے ساحل پر
جگہ جگہ
تیرے ننگے قدموں کے نشان ہیں
ہوا انھیں مٹانے پر تُلی ہوئی ہے!
میرے باہر کے خلا میں
تاریک سمندر بہتا ہے
جس کی سطح پر الہڑ کہکشائیں ککلی ڈالتی ہیں)جواز جعفری: مجھے ابد کا کنارہ دیکھنا ہے)(۱۰۲(

اور جب یہ کہکشائیں کبھی آپس میں ٹکراتی ہیں ان کے ٹکرائو سے نئے ستارے جنم لیتے ہیں اور یہ ان گنت ستارے بھی پہلے موجود ستاروں کے جھرمٹ میں جا ملتے ہیں ۔ اس طرح ہر تخریب نئی تخلیق کا پہلو ہوتی ہے۔ ان ستاروں کی ان دیکھی دنیا اور کائنات کے وہ غیر منکشف خطے ان کی تمنائوں کا حاصل بن جاتے ہیں۔

جب کبھی ککلی ڈالتی کہکشائیں چکرا کر آپس میں ٹکراتی ہیں
تو ستارے
کہکشائوں کی
روشنی سے لدی ڈالیوں سے
تازہ پھلوں کی طرح
جھڑ جھڑ کر
نامعلوم ابدی خطوں میں گرتے چلے جاتے ہیں!
جب اَن گنت ستارے
اس لامتناہی آتشبازی میں جل بُجھتے ہیں
تو کسی نامعلوم غم میں سوگوار کائنات
کچھ دیر کے لیے
اپنا ماتمی لباس اتارتی ہے
اور میری آنکھوں کی خوابگاہ میں
تیرا سُرخ آنچل لہراتا ہے!
سنو! محبت میں کائنات کی بے کرانی سانس لیتی ہے
اور کائنات کی ساری وسعت
تیری بانہوں کے پھیلائو تک ہے
اس آگے کچھ نہیں

محض سوال گونجتے ہیں!
جانتی ہو
سورج آنکھ کھلتے ہی اُس دودھ جیسے بدن والی
کہکشاں پر مرمٹا تھا؟
اور آج تک راکھ کردینے والی نارسائی کے دُکھ میں
پائوں سے گردش باندھے پھرتا ہے
اور ابھی ابھی جلتی دھوپ میں
اُس کی گلی کا چوتھا چکر لگانے گیا ہے!
وقت کا چرواہا
ہماری محبتوں
مجبوریوں
اور حیرتوں سے بے نیاز
کہکشائوں کے ریوڑ کو
اپنی جبری چھڑی سے
افق کی سمت
تیزی سے ہانکے لیے جا رہا ہے!
روٹھنے والی!
اس سے پہلے کہ نامعلوم سمت میں سرپٹ بھاگتی ہماری کہکشاں
ہمیں اپنے آفاق گیر بازوئوں میں سمیٹے
کائنات کے آخری کنارے سے باہر جاگرے
میری بُجھتی آنکھوں پر
اپنے روشنی افزاء ہونٹوں سے طویل بوسہ سے
کہ مجھے ابد کا کنارہ دیکھنا ہے
مجھے جاننا ہے
کہ اس کنارے سے آگے کیا ہے؟
محض حیرت
کوئی اور کائنات؟
یا کچھ بھی نہیں
یا پھر سِرے سے یہ سوال ہی مُبہم ہے
تیری باتونی آنکھوں کے اشارے کی طرح
بُہت ہی مُبہم (جواز جعفری: مجھے ابد کا کنارہ دیکھنا ہے)(۱۰۳)

یہ حیرت انھیں کائنات کی گہرائیوں اور گیرائیوں کا ادراک دیتی ہے اور پھر وہ انسان کی ارتقائی منازل میں شعور کی آبیاری کو انتہائی اہم گردانتے ہوئے کائناتی تناظر میں کچھ اہم سوال اٹھاتے ہیں۔

چاند اور سورج کی گردشیں
شمار کرتے کرتے
''شعور'' جوان ہوگیا

اب وہ دریا کے جھُرّ یوں بھرے چہرے کو دیکھ کر سوچتا
کہ پانی اور ہوا میں سے
کس کی عُمر زیادہ ہے؟
خُدا اور مادے میں سے
کونسی بڑی حقیقت ہے؟
کائنات کے مضافات میں تیرتے ہوئے زمین کے ذرّے پر زندگی
کس منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے؟
اس کا مستقبل کیا ہے؟)جواز جعفری: وائلڈ لائف اور تیسری دنیا)(۱۰۴(

وہ اُن اَن دیکھی دنیائوں کا ادراک رکھتے ہینمزید برآں وہ ان تک پہنچنے کے راستے سے بھی آشنا ہیں اور جانتے ہیں کہ روشنی ہی وہ وسیلہ ہے جو انھیں ان کی اس منزل تک پہنچا سکتا ہے۔ جدید طبیعیات بھی اس بات کو مانتی ہیں کہ روشنی کی یہ بے انت پھیلی لہریں ہی کائناتی سفر کی گزرگاہ ہیں۔صوفیا کے ہاں یہ روشنی وہباطنی قوت ہے جو راہِ سلوک کے راہی کو اپنی نفس کشی کی صورت حاصل ہوتی ہے۔انھی گزرگاہوں کا ذکر ان کی نظم میں ملاحظہ ہو۔

سُنو!
میری آنکھوں کے کھیت میں
اجنبی سمتوں کا
تجسس اُگتا ہے!
میرے کانوں پر
اَن سُنی آوازوں کا
رزق اُترتا ہے!
اور میرے پائوں کو
کسی غیر مُنکشف سیّارے کی
اَن چھوئی خاک پر
اپنے نقش چھوڑنے جانا ہے!
میری ناک
کسی اجنبی مٹی کی خوشبو کو
اپنے اندر اتارنے کی آرزو میں
جاگتی ہے!
اور زبان
کسی نامعلوم سیّارے کی
زرخیز مٹی میں جڑ پکڑنے والے
سایہ دار درختوں کی شاخوں پر لہراتے
رس بھرے پھلوں کی تمنّا میں
روزہ دار ہے!
مجھے زمین سے خلا تک
روشن راستوں کا

جال بچھانا ہے!
میں روشنی کے سرکش گھوڑے کو
اپنے اصطبل میں
کھونٹے سے باندھ کر آیا ہوں!
اس پُشت پر زین
اور رکاب میں پائوں رکھنا
میرا خواب ہے
)کہ اکثر خواب ناممکنات ہی کی شاخ پہ کھِلتے ہیں) (جواز جعفری: میں زمین کا وفادار ہوں)(۱۰۵(

سائنسی اندازِ فکر اور اپنی ذات پر تفکر ڈاکٹر جواز جعفری کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ زندگی کی ابتدا اور انتہا کیا ہے۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ شایدمیں کسی دوسری کہکشاں کے گم نام سیّارے سے آکر اس زمین کی مٹی میں بیج کی صورت پیوست ہوا اور اس روشنی کا اسیر ٹھہرا۔ اس اسیری نے وقت کے احساس کو دھندلا دیا ہے۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ وقت میرے لیے تھم چکا ہے اور میں اس جذب کے ہاتھوں مجبور ہوکر گرتا چلا جا رہا ہوں۔ یہ تجاذبی قوت فرار کی راہ نہیں دیتی ۔ اسی سے یہ احساس جنم لیتا ہے کہ کیا یہ پوری کائنات ہی بلیک ہول تو نہیں جو اپنے مدار تک آنے والی ہر چیز کو اپنے اندر کھینچ لیتی ہے۔ دوسری طرف ایک اہم سوال بلیک ہول سے وقت کے تعلق کا بھی اٹھایا گیا ہے کہ بلیک ہولز میں وقت ٹھہر جاتا ہے۔

میں ایک عُمر سے
)تیرے اندر(
تیری اجنبی فضائوں میں گر رہا ہوں
اور شاید
کائنات کے پھر سے ڈھیر ہوجانے تک
یونہی گرتا رہوں!
وقت میرے لیے تھم گیا ہے
یا پھر یہاں کی فضا ہی
وقت کے لمس سے محروم ہے؟
تیری کشش
مجھے کہیں بھاگنے نہیں دیتی
میں تیری ذات سے
باہر نکلنے کی کوشش میں
عالمگیر روشنی کی طرح
تیری ذات کا پورا چکر کاٹ کر
پھر سے نقطۂِ آغاز پر آجاتا ہوں!
میری کائنات!
کیا تو بلیک ہول ہے؟)جواز جعفری: بلیک ہول)(۱۰۶(

عابد ودود کے نزدیک ہماری یہ دنیا خواب کی حیثیت رکھتی ہے۔ خواب کبھی حقیقت نہیں بنتے۔ یہاں یہ امر بھی ذہن نشین رہے کہ ہندو فلسفہ کے مطابق بھی کائنات دراصل برہما کا خواب ہے۔ وہ اک خواب دیکھتا ہے ' اُس خواب کے مطابق دنیا تخلیق کرتا ہے اور سو جاتا ہے۔ سونے کے دوران مینوہ اک نیا خواب دیکھتا ہے اور اس جاگنے کے دوران مینوہ موجود دنیا کو تباہ کرکے پھر سے خواب کے مطابق دنیا کی تعمیرِ نو کرتا ہے۔ جدید فلسفیوں اور سائنس دانوں کے ہاں یہ نظریہ سائنسی نظریات کے قریب ترین پایا جاتا ہےیہ خواب ہمارے احساسات کا نام ہیں۔ اسی لیے عابد ودود اسے محض خوش عقیدگی قرار دیتے ہیں۔

یہ دوست ' یہ حبیب' یہ دُنیا' یہ کائنات
سب خواب ہے اور خواب بجز خواب کچھ نہیں
یہ خوش عقیدگی کے سوا اور کچھ نہیں (عابد ودود: سب خواب ہے)(۱۰۷)

اور اسی خوش عقیدگی کی وضاحت کرتے ہوئے موت کے تناظر میں اعجاز رضوی لکھتے ہیں کہ آنکھیں ' خوابوں کا نشیمن ہیں۔ خواب ازل سے ابد تک رہتے ہیں۔ ان کا شرمندۂ تعبیر ہونا ایک الگ سوال ہے' لیکن خواب کبھی بھی موت سے ہم آغوش نہیں ہوتے۔ یہیں پر یہ الجھن بھی ان کے ذہن کے دریچے پر دستک دینے لگتی ہے کہ موت کی حقیقت کیا ہے۔ جب خواب نہیں مرتے تو آنکھیں موت سے کیوں کر ہم کنار ہوتی ہیں۔

خواب تو نہیں مرتے
خواب دیکھتی آنکھیں
جانے کیسے مرتی ہیں (اعجاز رضوی: سوال)(۱۰۸)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مادی دنیا خواب ہے اور توانائی بھی کوئی حقیقی حیثیت نہیں رکھتی۔ سائنسی علوم نے بھی کائناتی تفہیم کے حوالے سے دو بنیادی لوازمات پر بحث کی ہے یعنی مادہ اور توانائی۔ اور نیوٹن کے شہرۂ آفاق قانون کے مطابق مادہ اور توانائی باہم تبدیل ہو سکتے ہیں۔ یہی وہ مظہر ہے جو کائنات کی حتمی اکائی کو یک جا رکھے ہوئے ہے۔ اسی لیے تو عابد ودود توانائی (روشنی) کے اثبات کے بھی قائل نہیں ہیں۔

میں نے دیکھا کہ اُفق پر کوئی
آدھ اک روشنی کی دھاریں تھیں
اور وہ نوحہ کناں تھیں ایسی
جیسے کہتی ہوں مجھ سے اے شاعر!
''اتنی امید اُجالوں سے نہ رکھ
روشنی کو کوئی ثبات نہیں'' (عابد ودود:روشنی کو کوئی ثبات نہیں)(۱۰۹)

ایک اور مقام پر عابد ودود اپنی نظم میں انسانی کم مائیگی کا ماتم کرتے ہیں لیکن آخر میں خدائی کے طالب دکھائی دیتے ہیں۔ان کے ذہن میں یہ سوال کھٹکتا رہتا ہے کہ ان کی حقیقت کیا ہے۔ کیا خدا کوئی وجود ہے یا یہ صرف ایک طرح کا احساس ہے۔ اگر احساس ہی خدا کا نام ہے تو پھر انسان خود ہی اپنا پروردگار بھی ہو سکتا ہے۔

میں کیا ہوں اور کہاں ہوں
لیکن یہ سوچتا ہوں
کہ ہم تمام انساں
کیا یونہی بے کلی کے سائے میں خوار ہوں گے

یاہم بھی عزم لے کر
نکلیں گے راستوں پر
آئے گا اپنا موسم.........
موسم کے صرف ہم ہی پروردگار ہوں گے)عابد ودود: پروردگار)(۱۱۰(

احمد فقیہہ وقت پر غور کرتے ہیں تو انھیں اس میں ابہام سے واسطہ پڑتا ہے۔ سائنسی بنیاد پر یہ کہا جاتا ہے کہ وقت دراصل دو واقعات کے رونما ہونے کے درمیانی وقفہ کا نام ہے۔ مگر شاعر کے ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کہ یہ وقفہ کیسا ہے۔ کیا یہ وقفہ خود اپنی بھی کوئی حیثیت رکھتا ہے یا محض چل چلائو کا نام وقت ہے۔ وقت شاید مکمل ہو کر بھی بہت سی چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں تقسیم ہے جن کے اتصال سے وقت کا مجموعی تصور جنم لیتا ہے۔

بزمِ جہاں کی پہنائی میں
وقت اک نقش مکمل ہے پر
پھر بھی اکثر یوں لگتا ہے
صبح و شام امیری میں بھی
وقت کا حال زبونلگتا ہے
جیسے اپنی وحدت میں بھی
کوئی چوراچورا سا ہو
لاکھ مکمل ہونے پر بھی
کوئی نقش ادھورا سا ہو)احمد فقیہہ: آشوب)(۱۱۱(

سید مبارک شاہ کے ہاں کائنات کو سمجھنے کے لیے اس کے مختلف عناصر کو جس خوب صورتی کے ساتھ انھوں نے ریاضیاتی زبان میں سمویا ہے وہ قابلِ داد ہے۔ ذرا ان کی نظم ’’گنتی‘‘ پر نگاہ ڈالیے کہ کس خوب صورتی سے انھوں نے کائناتی عوامل کی ترتیبِ نزولی کو استعمال میں لاتے ہوئے آٹھ سے ایک تک کا سفر مکمل کیا ہے۔

یہ آٹھواں پہر شمار کرنا
کہ سات رنگوں کے اس نگر میں
جہات چھ ہیں
حواسِ خمسہ
چہار موسم
زماں ثلاثہ
جہان دو ہیں
خدائے واحد!
یہ تیری بے انت وسعتوں کے سفر پہ نکلے ہوئے مسافر
عجیب گنتی میں کھو گئے ہیں)سید مبارک شاہ: گنتی)(۱۱۲(

وحدت الوجودی فلسفہ کے مطابق انسان روحِ ازل کا حصہ ہے جو اس سے بچھڑ چکا ہے۔ یہ جسم اس کے راستے کا پتھر ہے جو روحوں کے ملاپ کو روکتا ہے۔ صرف اس پتھر کے ہٹنے کی دیر ہے کہ حقیقت کھُل کر سامنے آجاتی ہے۔ دوسری طرف صوفیا کے ہاں دل کو آئینے سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔ اگر یہ آئینہ صاف اور پاکیزہ ہو تو اس میں روحِ ازل کی

جھلک دکھائی دیتی ہے۔ حیرت کے یہ ادوار محض وجود کے قیام تک ہیں۔ وجود کی موت اس حیرت کی بھی موت ہے جو ہماری سانس کی ڈوری سے پیوست ہے ۔ اسی کا اظہار کرتے ہوئے ایوب خاور کائنات کی حقیقت بارے رقم طراز ہیں:

اسی اک آئینے کا عکس ہے
میری محبت بھی
تمہارے چاہنے والوں کی حیرت بھی
یہ حیرت آئینے کے ٹوٹنے تک ہے
ہمارے ہاتھ سے سانسوں کی ڈوری چھوٹنے تک ہے)ایوب خاور: انتظارِ شکستہ)(۱۱۳(

وقت کس طرح پھیلا اور کائنات کس طرح اس کے آگے سرنگوں ہو گئی۔ یہ ایک بنیادی سوال ہے۔ ا س پر روشنی ڈالتے ہوئے سید حسنین بخاری وقت کی خصوصیات میں ہی اپنے اس سوا ل کا جواب پاتے ہوئے لکھتے ہینکہ

یہ ایک لمحہ کہ جس میں اربوں برس کی وسعت
چھپی ہوئی ہے
ازل سے پہلے، ابد سے آگے کے سارے ادوار
جس کی آغوش میں پڑے ہیں

یہ ایک لمحہ کے جس کے چاروں طرف
زمانوں کے دائرے دھیرے دھیرے بنتے چلے گئے ہیں
سبھی جہانوں کے زاویے اس کے پہلوؤں سے نکل رہے ہیں
یہ ایک لمحہ کہ
جس میں کن کی صدائیں کانوں میں آرہی ہیں
عدم سے موجود بن رہے وجود معدوم ہو رہے ہیں)حسنین بخاری: وہ ایک لمحہ)(۱۱۴(

وقت کے موضوع پر ان کی نظم ’’گھڑی کائناتی‘‘ ایک طویل نظم ہے جس میں وقت کے اتار چڑھائو کو دل کش انداز میں سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ذرا اس کے یہ دو شعر ملاحظہ ہوں:

سوئی جس کی ہر ایک ہے کہکشانی
نہاں جس کے لمحوں میں صدیاں ہزاروں
ٹناٹن۔ ٹناٹن۔ صدا دے رہی ہے
ازل سے بھی پہلے ، ابد سے بھی آگے
زمانوں کا ہم کو پتہ دے رہی ہے
ٹنا ٹن۔ ٹنا ٹن۔ صدا د ے ر ہی ہے)حسنین بخاری: گھڑی کائناتی)(۱۱۵(

اسی ازلی یک سانیت کو سائنسی اصطلاح میں بگ بینگ (عظیم دھماکا) اور خدائی ذرّہ سے واضح کیا جاتا ہے کہ ایک ابتدائی ذرّے (GOD PARTICLE) سے کائنات کی ہر شے وجود میں آئی۔ اس کی ابتدا ستاروں سے ہوئی اور ستاروں کا مادہ بھی وہی ہے جس سے کائنات کی ہر شے نے وجود پایا۔ اسی یک سانیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اظہر غوری ہر

شے کو ستاروں کا مادہ قرار دیتے ہیں کہ اسی مادہ سے ہر شے نے ظہور پایا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اسی یک سانیت سے نیا پہلو تراشنے کے متمنی بھی ہیں۔

ہر شے ستاروں کے مادے سے وجود میں آئی
مگر کائنات، حیات اور تمھاری نسبت سے ہی
میرا حوصلہ، خلوص، روپ اور کردار متعین ہوا
میں خواہشات کی تکمیل کے لیے
تمھیں کسی نئے نظامِ شمسی کا حصّہ بنانے پر غور کررہا ہوں   )اظہر غوری: بلیک ہول)(۱۱۶(

اظہر غوری پر یہ یک سانیت ایک نیا افق بھی کھولتی ہے کہ جب ہر شے کی بنیاد ایک ہی ہے تو پھر اگر ایک ہمارا نظامِ شمسی زندگی کی تخلیق پر مائل ہو سکتا ہے تو باقی نظام ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔ اس سوال کے جواب میں انھیں ان حالات سے واسطہ پڑتا ہے جو زندگی کی تخلیق کا باعث بنے تو تو وہ ان حالات کے منتظر دکھائی دیتے ہیں اور مایوس نہیں ہوتے بل کہ نئے نظامِ شمسی اور نئی زندگی کے ظہور کے منتظر رہتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی کشش کی شدت سے بھی پریشان دکھائی دیتے ہیں کہ اس سے کیوں کر چھٹکارا پا یا جاسکے گا کہ اس کی قوتِ تجاذبہ تو کہیں اور نکلنے ہی نہیں دیتی۔

میں تمھارے لیے نئے نظامِ شمسی کا انتخاب کررہا ہوں
کائنات کی کہکشائوں میں کئی ایک سیارے
اپنے اپنے سورجوں سے ہماری طرح جُڑے ہوئے ہیں
ہمارا جذب اور بڑھا تو
باطن سے کوئی جذبہ بھی باہر نہیں نکل سکے گا
سبھی جذبات اور واقعات باطن بُرد ہوتے چلے جائیں گے
جیسے سوارب برس کی کسی بھی کہکشانی زندگی میں
دس کروڑ سورج سُپر نووا بن کر پھٹ جاتے ہیں
ویسے ہی قریباً سو برس کی انسانی زندگی میں
ایک ہزار تمنائیں لاینحل مسئلہ بن کر ضائع ہو جاتی ہیں   )اظہر غوری: بلیک ہول)(۱۱۷(

ایک بنیادی ذرّے کا نظریہ ہمیں اعجاز رضوی کے ہاں بھی دکھائی دیتا ہے۔ وہ بھی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ہر شے کی ابتدا ایک ہی ہے۔ جب بنیادی مادہ ہی ایک ہے تو پھر اشیا مختلف کیسے ہوسکتی ہیں۔ جیسے کوئلے کو جلایا جائے یا ہیرے کو، اختتام دونوں کا ایک ہی مادہ یعنی کاربن ڈائی آکسائیڈ اور راکھ پر ہوتا ہے۔ اگرچہ دونوں کی ظاہری شکل و صورت اور قدرو قیمت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

وہ مندر ہو یا مے خانہ
پچھتاوا ہے
چاندی سونا رنگیں کاغذ
سب لاوا ہے   )اعجاز رضوی: پچھتاوا ہے)(۱۱۸(

جہاں تک وقت کی بات ہے تو اعجاز رضوی وقت کے یک طرفہ بہائو کے قائل دکھائی دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ گھڑی کی چال وقت نہیں ہے کہ وہ تو رُک بھی جاتی ہے لیکن

وقت کبھی نہیں رُکتا۔ یہ تسلسل کے ساتھ چلتا رہتا ہے۔ اس کی زندگی میں قیام نہیں ہے۔ وقت رات اور دن کے تسلسل کا نام ہے جو ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے کشاں کشاں آگے کی طرف بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ زمین اور سورج کے رشتوں کا یہ تسلسل وقت کا چکر بناتا ہے۔ اسی چکر سے مختلف موسم پیدا ہوتے ہیں۔ انھی موسموں کی بہ دولت کبھی ہم دریائوں کی طغیانی کا شکار بنتے ہیں اور کبھی سوکھے کا۔جب ہم زندگی کے حوادث سے خوف محسوس کرتے ہیں تو یہ خوف بنیادی طور پر وقت کے بدلائو کا خوف ہے۔

کبھی بپھرے ہوئے سمندر میں ہمارا جی لُبھاتا ہے
کبھی سوکھے ہوئے دریا ہمارا منہ چڑاتے ہیں
کبھی اونچی پہاڑی سے
کوئی گرتا ہوا چشمہ
ہمارا آئینہ بن کرہمیں وہ سب دکھاتا ہے
جسے ہم دیکھنے سے خوف کھاتے ہیں
اسی کو وقت کہتے ہیں (اعجاز رضوی: بڑے کمرے سے بڑا سچ)(۱۱۹)

اعجاز رضوی کائناتی پہلو سے دیگر اجرامِ فلکی کی طرح چاند کو بھی دیکھتے ہیں۔ وہ ماضی کی دھند میں پنہاں اپنی حقیقت کے متلاشی دکھائی دیتے ہیں۔ انھیں محسوس ہوتا ہے کہ چاند کاجو چہرا سامنے ہے وہ تو حقیقت نہیں۔ بل کہ حقیقت تو اس کے پیچھے کہیں چھپی ہوئی ہے۔ یہ پوشیدہ چہرا دراصل تاریخِ انسانی اور اس کے ارتقا کا استعارہ ہے۔

چاند کے سکّے پر
ایک جانب تمھارا چہرہ ہے
اور دوسری جانب مٹے ہوئے حروف

چاند اگر تانبے کا ہوتا
تو اسے اس رات زنگ لگ جاتا (افضال احمد سید: گھاس سے ہریالی کاٹنے کے بعد)(۱۲۰)

چاند ‘ سورج‘ ستارے ‘ سیارے اور کہکشائیں پر اسرار ہیں۔ راز ہی زندگی ہیں اور زندگی کا حاصل بھی جیسے آئن سٹائن نے کہا تھا کہ میری نظر میں حسین ترین شے وہ ہے جو پُر اسرار ہو۔ یہ اسرار ہمیشہ سے ذہنِ انسانی کو الجھائو کاشکار کرتے چلے آئے ہیں اور ان کی حقیقت کی تلاش کے سفر میں ہی انسان نے اس کائنات کو تسخیر کرنے کے خواب دیکھے ہیں۔ جدید اردو نظم کے بہت سے شعرا کے ہاں اس خواب کا اظہار کیا گیا ہے۔ احمد صغیر صدیقی بھی اس پراسراریت کے دبیز پردوں میں چھپی حقیقت تک رسائی کے لیے بے چین ہیں۔ وہ خود کلامی کے انداز میں نئی دنیا اور اس کے انداز پر روشنی ڈالتے ہیں کہ وہ دنیا کہیں ہے بھی یا صرف اور صرف خوابوں کا ہی مسکن ہے۔

افق کے اس طرف بھی
سنتے ہیں اک اور دُنیا ہے
بُجھی آنکھوں کی راتوں میں
کسی دوری پہ استادہ

بہت سے ماہ پارے جھلملاتے ہیں
طلسمی دُھند میں ؟ڈوبی ہوئی
چاروں طرف خلا آواز دیتی ہے
ہوائوں کے سبک دھارے بلاتے ہیں)احمد صغیر صدیقی: تماشا)(۱۲۱(

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ اولین عہد سے ہی انسان نے جن چیزوں پر غوروخوض کو اپنا راہ نما بنایا ہے ان میں خُدا‘ انسان کی اپنی ذات‘ زمین اور آسمان سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ان پر روشنی ڈالتے ہوئے احمد صغیر صدیقی کائناتی رشتوں کی تلاش کرتے ہیں تو انھیں انسان ‘ اک خواب ‘ زمین‘ اک سوچ‘ آسمان ‘ اک دُھند‘ آگہی ‘ اک وہم اور زندگی قسطوں میں موت کی صورت نظر آتی ہے۔

آدمی
اک خواب ہے
اک سحرکاری
یہ زمیں
اک سوچ ہے
اک رنگ باری
آسماں
اک دُھند ہے
سمتوں پہ طاری
آگہی
اک وہم ہے
معنی سے عاری
زندگی
اک موت ہے
قسطوں میں جاری)احمد صغیر صدیقی: تفہیم)(۱۲۲(

کائنات اور اس کے افعال ہمیشہ سے ہی حساس افراد کے اذہان کو جکڑے رہے ہیں۔ ایسی ہی ذہنی اضطراب کی کیفیت احمد صغیر صدیقی کی نظم ’’خودکلامی‘‘ میں دکھائی دیتی ہے جہاں وہ مختلف کائناتی مظاہر پر سوال اٹھاتے ہیں اور ان کی حقیقت کے متلاشی دکھائی دیتے ہیں۔

یہاں کوئی بات نئی نہیں ہے جنابِ من
یہ روش سنکتی ہوائوں کی
یہ بھڑکتا بُجھتا چراغ بھی
نہیں کچھ پتا کہ یہ خامشی ہے کہ شور ہے
یہ عروج کیا ہے زوال کیا
یہ جواب کیا ہیں سوال کیا
یہ ستارہ کوئی آنکھ میں کہ سفر کوئی
کوئی دھوپ ہے کہ ہے سائباں
یہ ہے آسماں کہ ہے خاک داں

بہت ہو چکا یہ دماغ اب نہ کھائیے
کہ یہ آگ سرد ہے کس لیے
کہ یہ چاند زرد ہے کس لیے)احمد صغیر صدیقی: خودکلامی)(۱۲۳(

احمد صغیر صدیقی ' وقت کو ایک صوفیانہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ وقت نہیں گزرتا بل کہ وقت کے ہاتھوں میں ہم لوگ کھلونوں کی طرح ہیں جنھیں وقت توڑ پھوڑ کا شکار کر کے چلتا بنتا ہے۔ وقت حادثات کا نام نہیں ہے۔ یہ تو اپنی جگہ ہمیشہ سے قائم دائم ہے۔ اگر ان کی اس وضاحت کو دیکھا جائے تو ہمیں اک ایسے مسلک کا پیروکار دکھائی دیتا ہے جس کے نزدیک وقت خدا کا متبادل ہے۔ خدا کی طرح وہ بھی ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا جب کہ باقی کائنات کھیل سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

ہماری گھڑیاں
سوئیاں رکھتی ہیں
سرکتی سوئیاں ہمیں بتاتی رہتی ہیں
وقت کتنا گزر چکا ہے
مسئلہ یہ نہیں کہ وقت گزر رہاہے
مسئلہ یہ ہے کہ ہم گزر رہے ہیں)احمد صغیر صدیقی: مسئلہ)(۱۲۴(

ناہید قمر اپنے پی ایچ ڈی اردو کے مقالہ بہ عنوان ''جدید اردو فکشن میں تصورِ وقت'' میں وقت کی جہات اور اس کے تصور پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ

''وقت ایک ایسی تجرید ہے جو نہ دیکھی جا سکتی ہے نہ سُنی یا چھوئی جا سکتی ہےہم وقت کے حوالے سے مدت' عرصہ اور زمانہ جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو اُس میں پھیلائو اور وسعت پذیری کا مفہوم خود بہ خود شامل ہوجاتا ہےکیوں کہ ہم وقت کا عمومی تصوراس کائنات میں ہونے والے واقعات کے ذریعے کرتے ہیں' اس لیے یہ کہنا کسی حد تک درست ہے کہ زمانے کا تصور مادے کی حرکات سے انسانی شعور میں پیدا ہوتا ہے اور وقت کا معیار و مقیاس انسانی شعور ہی ہے۔''(۱۲۵(

اسی بات کو ایک سائنسی لغت میں یوں بیان کیا گیا ہے:

n the ہ"What we see in space at any instant is intirely contuinue surface of our light cone... The "wherewhens" of space time are relative. Infact, since everything we see in space, from our own bodies to the distant quasars, are images from the past, the actual present state of universe is never seen, the scientist, most make clear distinction between "That which appears to be" and "That which)۱۲۶actually is."(

جہاں تک وقت کا تعلق ہے تو نصیر احمد ناصر وقت کے ٹھہرائو نہیں بل کہ اس کے تسلسل کے قائل ہیں۔ وہ اک ایسا عنصر ہے جس کے گرد کائناتی مظاہر گھومتے ہیں۔ ہمارے نظامِ کائنات میں وقت بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے نزدیک وقت کسی بھی چیز سے ماورا ہے۔ حالات سے ماورا ہوکر بس چلتے ہی چلے جانااُس کا اولین اور بنیادی مقصد ہے۔ اُس کی رفتار کو تھام لینا ممکنات میں سے نہیں ہے۔ وہ ماضی ' حال اور مستقبل کا بیانیہ ہے۔ ماضی

کی طرح مستقبل بھی ان جانا ہے۔ ہم حال کے باسی ہیں مگر ہماری آشنائی حال سے بھی نہیں ہے۔ ہم اس کے ہر رنگ سے بے گانہ اور اجنبی ہیں۔

کاسنی پھولو کہو!
تم نے اُس کو
کون سے موسم کی خوشبو میں
ہوائوں کی فصیلوں پر
لکھا تھا ’’آشنا‘‘
وہ تو صدیوں پر محیط
اک اجنبی سا گیت ہے
وقت اُس کا نام ہے
رفتار اُس کی ریت ہے! (نصیر احمد ناصر: کاسنی پھولو کہو!)(۱۲۷(

وقت کائنات کی حقیقت ہے مگر وہ بہرے پن کا شکار ہے۔ وہ افراد و اشیا کے غم و آلام کو سننے اور سمجھنے کی قوت نہیں رکھتا۔ وہ صرف اپنی ڈگر پر چلتا رہتا ہے کہ یہی اُس کا منتہا ہے۔ اسے اشیا کے بننے بگڑنے سے کوئی غرض نہیں ہے۔راستے بھی محض راستے ہی ہیں۔ اُن پر چلنے والے منزل کو پالیں یا گم راہی کے عمیق سمندر میں ڈوب جائیں ‘ وہ اس سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔

وقت تو ویسے بھی
ایک ازلی بہرے پن میں مبتلا ہے
اور راستے بس راستے ہوتے ہیں
چلتے رہو
چلتے رہو تمام عمر)نصیر احمد ناصر: بے آغاز راستوں کا سفر)(۱۲۸(

وقت کی دھند سے باہر نکلا جا سکتا ہے۔ جدید طبیعیات دان اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اگر ہم روشنی کی رفتار سے زیادہ رفتار سے سفر کرنے کے قابل ہو سکیں تو وقت ہمارے سامنے ہار جائے گا اور ماضی ‘ حال اور مستقبل کا کھیل بے معنی ہو جائے گا۔ وقت ایک اندھے کنویں کی طرح ہے جس سے نکلنے کا راستا عمر (حال) سے فرار ہی ہے۔

آنکھیں اگر ایک بار
وقت کے اندھے کنویں میں گرجائیں
تو انھیں نکالنے کے لیے
ڈول ڈول عمر کا سارا پانی باہر انڈیلنا پڑتا ہے)نصیر احمد ناصر: سارے خواب کلیشے ہیں)(۱۲۹(

نصیر احمد ناصر وقت کو پر پیچ لہروں سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ وقت کے سیدھی لکیر میں چلنے کے قائل نظر آتے ہیں۔ یہ آگے بڑھتا جارہا ہے اور دیگر اشیا ہر گزرتے لمحے کے ساتھ معدومیت کا شکار ہوتی چلی جارہی ہیں۔

دیکھو‘ میں یہاں لکیریں کھینچتے کھینچتے
دائروں کی ابدیت میں نابود ہوچکا ہوں
اور وہاں تمھارے جسم کے ساحل پر
وقت کا بہائو

آہستہ آہستہ شانت ہوتا ہوا
دم توڑ رہا ہے (نصیر احمد ناصر: کائنات کا آخری گیت)(۱۳۰)

زمان و مکان کا یہ چکر بھی وقت کی عطا ہے۔ گزرتے وقت نے انھیں ارتقا کے سفر پر آمادہ کیا اور ان کی یادداشتوں کو آثار کی صورت محفوظ کر لیا ہے۔

ان گنت صدیوں کے انبار میں
تمھارے زمان و مکاں دبے پڑے ہیں (نصیر احمد ناصر: ڈسٹ بن میں زندگی)(۱۳۱)

کائنات کی زندگی بھی وقت کی مرہونِ منت ہے۔ جب تک وقت کا پہیہ گھوم رہا ہے تب تک ہر شے کا وجود باقی ہے۔ وقت کا اختتام ہی کائنات کا اختتام ہے۔

ابھی تکلے پہ دھاگا گھومتا ہے
ابھی کر لے سکھی باتیں
طلسمِ خواب کی گھاتیں (نصیر احمد ناصر: کلابہ ٹوٹنے کی دیر ہے)(۱۳۲)

جب وقت کا یہ چرخا رکے گا تو ہر طرف قیامت کا سماں ہوگا۔ وقت تو تب بھی ہوگا مگر نئے انداز نئے بہروپ میں سامنے آئے گا۔ یہاں ہمیں ہندو اساطیر کا رنگ بھی دکھائی دیتا ہے اور سائنسی تعلیمات کا پرتو بھی۔

آسماں کا سر خمیدہ ہے
کلابہ ٹوٹنے کی دیر ہے
چرخہ رکے گا
زور سے گھومے گا
پھر تاریخ کا پہیہ
زمیں پوشاک بدلے گی
نئی تقویم لکھنے کے لیے کاتب
سیاہی میں ستارے گھولتا ہے (نصیر احمد ناصر: کلابہ ٹوٹنے کی دیر ہے)(۱۳۳)

ایک اور مقام پر وہ وقت کے ٹھہراؤ کو بھی بیان کرتے ہیں مگر یہ ٹھہراؤ اس کی بنیادی خصوصیت نہیں ہے۔ وقت کو سکون حاصل نہیں ہے بل کہ اسے تو چلتے ہی رہنا ہے۔ یہ کسی بھی لمحہ اپنے سکون کے خول کو توڑ کر باہر نکلے گا اور پھر سے وہی چل چلاؤ کا عالم ہوگا۔

(لمحوں کی) محراب کی اوٹ میں
سرجھکائے کھڑا وقت
ازلوں سے چُپ چاپ
سانسوں کی آندھی کو روکے ہوئے
تھک گیا ہے
ابھی چل پڑے گا (نصیر احمد ناصر: یہاں تو وہی خواہشِ آب ہے)(۱۳۴)

نصیر احمد ناصر وقت کے اس حصار سے باہر نکلنے کے تمنائی ہیں۔ وہ وقت کی فصیل کو پاٹ کر ان دیکھی ان جانی دنیائوں کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ وقت کی تحدید کرتے ہوئے اسے ازل اور ابد کے مابین کا دورانیہ تصور کرتے ہیں۔ گویا وقت ایک سیدھی قطار میں

چلتا ہے۔ یہ یک سمتی ہے۔ وہ اسی سمت میں آگے بڑھنا چاہتے ہیں ‘اُس دنیا تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں جو وقت کے سفر کا اگلا پڑائو ہے۔

ازل کی اولیں ساعت‘ ابد کا آخری لمحہ
یہیں پر مرتکز سارا زمانہ ہے
مگر مجھ کو فصیلِ وقت کے
ٹھہرے ہوئے اس دائرے کو پارکرنا ہے
ابد کی سرحدوں سے دور آگے
لاجوردی روشنی سے پیار کرنا ہے
ترا شہرِ محبت تو مرا پہلا پڑائو ہے
جسے تو آخری منزل سمجھتی ہے
دلوں کے راستوں پر وہ فقط اک نیم روشن سا الائو ہے
بڑی لمبی مسافت ہے‘ بڑا گہرا یہ گھائو ہے
ابد کے اس طرف بھی راستے ہی راستے ہیں
فاصلوں کا ایک نادیدہ بہائو ہے
جسے میں دیکھ سکتا ہوں
مگر میں تو مسافر ہوں
ترے شہرِ محبت میں ذرا سی دیر ٹھہروں گا)نصیر احمد ناصر: ابد کے اُس طرف بھی فاصلے ہیں)(۱۳۵(

لیکن وہاں تک پہنچنا بھی تو کوئی کارِ آساں دکھائی نہیں دیتا کہ وقت کا یہ راستا کس طرف سے آرہا ہے اور کس طرف کو جا رہا ہے یہ فی الحال ہم جان ہی نہیں پائے۔ ہماری عمر تو مسافرت کا نام ہے۔ ایک ایسا سفر جو ہم ان مسدود راستوں پر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ہم وقت کے قیدی ہیں۔ وقت کی زنجیروں کو توڑنے کی خواہش بجا لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید ان زنجیروں کو توڑنا ہمارے بس میں نہیں ہے۔ ہم اس کے حلقۂ دامِ خیال میں ہیں۔

لاحاصلی‘ کارِ زیاں‘ امرِ محال
رینگتی صدیوں‘ تھکی عمروں کے بوجھل بوجھ میں
تلملاتے ماہ و سال
راستہ بے سمت ہے‘ مسدود ہے)نصیر احمد ناصر: روشنی‘ تیرے جنم یُگ پر ایک نظم!)(۱۳۶(

کہ عمروں کے تسلسل میں
ہمارے خواب زنجیروں کے حلقے ہیں
جنھیں ہم توڑ سکتے ہیں نہ جن کو چھوڑ سکتے ہیں! (نصیر احمد ناصر: بے کراں دکھ کی مسافت)(۱۳۷(

افتخار نسیم وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ ماضی‘ حال اور مستقبل کو ایک ہی لمحہ میں مرکوز دیکھنا چاہتے ہیں۔ جدید طبیعیات بھی اس نظریے سے اتفاق کرتی ہے کہ ماضی ‘ حال اور مستقبل تو صرف اور صرف ہمارے اپنے پیمانے ہیں ورنہ تو حقیقت میں تینوں زمانے ایک ہی ہیں۔ ہمارا تصورِ وقت جو ماضی‘ حال اور مستقبل کے تانے بانے میں الجھا ہوا ہے

اُس کی بنیادی وجہ ہماری کم رفتاری ہے۔ اگر انسان روشنی کی رفتار سے زیادہ رفتار سے حرکت کرنے پر قادر ہوجائے تو وہ ماضی اور حال کی دنیائوں کا سفر بھی کرسکتا ہے۔ سائنس فکشن اور قدیم داستانوں میں بھی ایسے بہت سے کردار دکھائے گئے ہیں جب کوئی فرد ماضی یا مستقبل کی خاک چھانتا پھرتا ہے۔

سوچتا ہوں میں کئی راتوں سے
کاش اک زاویۂ وقت پہ ایسے رُک جائوں
جس میں آتے ہوں نظر
ماضی و حال اور مستقبل)نصیر احمد ناصر: خود کلامی)(۱۳۸(

منیر نیازی وقت کے ٹھہرائو کو ماننے والے شعرا میں سے ہیں۔ وہ اس کی روانی کو ایک وہم قرار دیتے ہیں۔ وہ وقت کو ایک حنوط شدہ لاش قرار دیتے ہیں جو احساسات اور تبدیلیوں کا کوئی پہلو نہیں جانتی۔

زماں کی روانی فقط واہمہ ہے
ہر اک شے
خود اپنی جگہ پر
حنوطی ہوئی لاش ہے
وقت کی منجمد کاش ہے
وقت ٹھہرا ہوا ہے!! (منیر نیازی: وقت ٹھہرا ہوا ہے!)(۱۳۹(

منیر نیازی وقت کو ایک جامد و ساکت دروازے کی صورت میں دیکھتے ہیں جو صرف گزرنے والوں کو راستا دیتا ہے لیکن اپنی جگہ پر قائم بالذات ہے۔ یہ دروازہ تو صرف راستا ہے۔ اس سے آگے اور پیچھے دو مختلف دنیائیں آباد ہیں اور یہ ان دونوں دنیائوں کو ملانے کا واحد راستا ہے۔

کتنا بڑا یہ دروازہ ہے
جس کو طول اور عرض سے
کچھ بھی غرض نہیں ہے
جس کو آنے والوں اور پھر
لوٹ کے جانے والوں سے کیا لینا ہے
آنے جانے والے تو بس جھونکے ہیں
جو دروازے کے پٹ پر دستک دے کر
آگے بڑھ جاتے ہیں!! (منیر نیازی: کتنا بڑا یہ دروازہ ہے)(۱۴۰(

ڈاکٹر وزیر آغا دن اور رات کو وقت کا لباس قرار دیتے ہیں۔دن اور رات کی تبدیلی ہی وقت ہے مگر اس سے پرے کیا ہے، کیسے ہے اور کیوں ہے؟ یہ جاننا ابھی باقی ہے کہ

یہ دن اک شجر ہے
جو چھلکے کے ملبوس سے اپنے ننگے بدن کو جدا کرکے
تاروں بھری کینچلی کو پرے پھینک کر
کالی، اندھی زمیں کی کسی درز سے جھانکتا ہے!
''کہاں ہوں، یہ کیسا جہاں ہے، یہ لیلا رچائی ہے کس نے؟؟''
________نہیں جانتا! (وزیر آغا: یاترا)(۱۴۱(

نذر محمد راشد برِّ صغیر پاک و ہند کے ان اہم جدید نظم گو شعرا میں شامل ہیں جنھیں اپنی سیاسی سوچ اور مستقبل پر نظر کے حوالے سے اہم مقام حاصل ہے۔ اُن کے نزدیک وقت بندوق ہی کی طرح ایک آلہ ہے جو اس بات سے بے نیاز ہے کہ اُسے کس نے بنایا اور کس نے خریدا۔ جس طرح بندوق کا کام سامنے شخص کو نقصان پہنچانا ہے اسی طرح وقت اور اس کے نتائج کا انحصار بھی اس کے استعمال پر ہے۔ ہم نے وقت کو بھلا دیا ہے لیکن دشمن کے لیے وقت خمیدہ راستے کی طرح نیچے اترنے کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔

مگر وقت مینار ہے
اور دشمن اب اُس کی خمیدہ کمر سے گزرتا ہوا
اُس کے نچلے اُفق پر لڑھکتا چلا جارہا ہے! (ن۔م۔راشد: تیل کے سوداگر)(۱۴۲(

اس سب کے باوجود راشد مایوس نہیں ہیں۔ انھیں اس بات کا احساس ہے کہ وقت ہی کائنات ہے اور انسان اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے اس پر دست رس حاصل کر سکتا ہے۔ درج ذیل مصرعوں میں تو وہ وقت کی بے کرانی کے ایسے قائل دکھائی دیتے ہیں کہ وقت خدا محسوس ہونے لگتا ہے جو ہر شے پر چھایا ہوا ہے۔

وقت کے اس مختصر لمحے کو دیکھ
تو اگر چاہے تو یہ بھی جاوداں ہوجائے گا
پھیل کر خود بے کراں ہوجائے گا)ن۔م۔راشد: طلسمِ جاوداں)(۱۴۳(

ایک اور مقام پر وہ وقت کو جھیل اور تاریخِ انسانی کو اس جھیل میں اٹھتی لہروں سے تشبیہہ دیتے ہیں۔

یہ جھیل وہ ہے کہ جس کے اوپر
ہزاروں انساں
اُفق کے متوازی چل رہے ہیں
اُفق کے متوازی چلنے والوں کو پار لاتی ہیں
وقت لہریں۔۔
جنھیں تمنا ' مگر' سماوی خرام کی ہو
انھی کو پاتال زمزموں کی صدا سناتی ہیں
وقت لہریں
انھیں ڈبوتی ہیں وقت لہریں)ن۔م۔راشد: گماں کا ممکن۔ جو تو ہے میں ہوں)(۱۴۴(

دوسری طرف راشد یہ بھی سمجھتے ہیں کہ وقت سے مفر ممکن نہیں ہے۔ ہم تو وقت کے دریا کے دھارے میں بہتے تنکوں کی طرح ہیں۔ وقت کی لہریں ہمیں بہائے لیے جاتی ہیں اور فرار ناممکن ہے۔

جو سطحِ دریا پہ ساتھ دریا کے تیرتے ہیں
یہ جانتے ہیں یہ حادثہ ہے
کہ جس سے ان کو
)کسی کو) کوئی مفر نہیں ہے! (ن۔م۔راشد: گماں کا ممکن ۔ جو تو ہے میں ہوں)(۱۴۵(

احمد فقیہہ وقت کی یک سانیت کے خلاف ہیں۔ اسی لیے وہ اسے ایک بڑی اکائی سمجھتے ہیں جو خود کئی چھوٹی اکائیوں سے بنا ہے۔ یہ ایک ایسی بڑی مشین کی صورت ہے

جس کی تخلیق میں کئی چھوٹی مشینوں کا ہنر کارفرما ہے۔ اسی لیے انھیں وقت زبوں حالی کا نا مکمل نقش دکھائی دیتا ہے۔

بزمِ جہاں کی پہنائی میں
وقت اک نقش مکمل ہے پر
پھر بھی اکثر یوں لگتا ہے
صبح و شام امیری میں بھی
وقت کا حال زبونلگتا ہے
جیسے اپنی وحدت میں بھی
کوئی چوراچورا سا ہو
لاکھ مکمل ہونے پر بھی
کوئی نقش ادھورا سا ہو (احمد فقیہہ: آشوب)(۱۴۶)

احمد صغیر صدیقی کے ہاں وقت کا بیانیہ طبیعیاتی اور مابعد الطبیعیاتی سطح پر دکھائی دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وقت کو ماپنے کا ہمارا معیار گھڑیا ں ہیں‘ جن کی مدد سے ہم ساعتوں کا حساب لگاتے ہیں اور گزرتے وقت کی چال کو محسوس کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ لیکن درحقیقت وقت نہیں گزر رہا بل کہ ہم گزرتے جا رہے ہیں۔ ہم وقت کی اس ریت کو اپنے ہاتھوں کی مٹھی سے نکالتے جا رہے ہیں۔ یہ وقت کا نہیں بل کہ ہمارا منفی پہلو ہے۔

ہماری گھڑیاں
سوئیاں رکھتی ہیں
سرکتی سوئیاں ہمیں بتاتی رہتی ہیں
وقت کتنا گزر چکا ہے
مسئلہ یہ نہیں کہ وقت گزر رہاہے
مسئلہ یہ ہے کہ ہم گزر رہے ہیں (احمد صغیر صدیقی: مسئلہ)(۱۴۷)

اختر حسین جعفری کے ہاں بھی وقت کا واضح تصور دکھائی دیتا ہے۔ وہ ازل سے ابد تک وقت کی تحدید کو مانتے ہیں اور اس حد کے اندر وقت کے بہاؤ کے قائل ہیں۔ اُن کے نزدیک وقت کایہ بہاؤ یک طرفہ ہے ۔ اسی لیے ہر گزرتا لمحہ فوراً ہی قصّۂ پارینہ بن جاتا ہے جس کی بازیافت ممکن نہیں ہوتی۔ ہر لمحہ اپنی جگہ اٹل اور قیمتی ہے کہ وہی آج‘ گزر جانے پر تاراج ہے۔

مجھ میں کتنا ازل
مجھ میں کتنا ابد‘ کتنی تاریخ ہے
میں نہیں جانتا
ایسے دن رات کو دل نہیں مانتا‘ پور پر جن کی گنتی ٹھہرتی نہیں
آج ‘ بس آج ہے
کل سحر تک یہی آج تاراج ہے (اختر حسین جعفری)(۱۴۸)

اختر حسین جعفری کے نزدیک وقت ہی وہ بنیادی وسیلہ ہے جس کے گرد کائنات کی تخلیق کا کھیل گھوم رہا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کھیل کے پہلو بھی بدلتے جارہے ہیں۔ اسی لیے وہ خود کو وقت کی دھول میں اٹا ایک جسم قرار دیتے ہیں اور اس کی ابتدا سے پہلے اور انتہا کے بعد بھی سیکڑوں زمانوں کی امید رکھتے ہیں۔ صوفیا کے ہاں بھی ہمیں وقت کا ایسا

ہی احساس نظر آتا ہے کہ رب تب بھی تھا جب وقت نہیں تھا اور وہ تب بھی ہوگا جب وقت نہیں ہوگا۔

تھکے ہوئے آفتاب! تیرے غروب کا وقت آگیا ہے
یہ ایک پَل جو ازل سے پہلے کا ایک پل ہے
جو انتہائوں کے بعد کی کوئی انتہا ہے
اس ایک پل میں ڈھکے چھپے سیکڑوںزمانے
شروع و آغازِ آفرینش کے عُذر اموات کے بہانے
تھکے ہوئے آفتاب! تیرے سفر کی مٹی میں میرا چہرہ ہے
میرے چہرے پہ منجمد اشک‘ داغ‘ دشنام‘ میری ساعت‘
مرا زمانہ‘ مرا جہاں ہے (اختر حسین جعفری)(۱۴۹)

افضال فردو س کی نظم ’’بچپن والے گھر کے نام‘‘ ان کی بچپن کی یادوں کے سفر کی داستان ہے‘ جس میں وہ گزرے ہر پل کو ذہن کی قید سے آزاد کر کے صفحۂ قرطاس پر بکھیرتے چلے جاتے ہیں۔ اسی بیانیے میں ہمیں وقت اور اس کے ساتھ خدا کی مقتدریت کا احساس بھی درج ذیل انداز میں ملتا ہے:

اس باغ میں وقت کے مالی نے
اب کے جو جھولے ڈالے ہیں
میں ان کو جھول نہیں سکتا
میں بچپن بھول نہیں سکتا (افضال فردوس: بچپن والے گھر کے نام)(۱۵۰)

مجید امجد کے ہاں وقت کا دولابی احساس ملتا ہے۔ ان کے ہاں وقت پر اتنے زیادہ اور واضح مباحث ملتے ہیںکہ بعض ناقدین ادب کہتے ہیں کہ مجید امجد کے نزدیک وقت ‘ خدا کے متبادل معانی میں بھی مستعمل ہے۔ وہ وقت کی طوالت میں تاریخِ انسانی کو ایک مختصر لمحہ سمجھتے ہیں۔وقت اور زندگی دونوں ہی خالق کی راگنی کی خوب صورت تانیں ہیں جس کے ملاپ سے سُر سنگیت پیدا ہوتے ہیں۔اور وقت کا یہ سنگیت ہی زندگی بھی ہے۔اندھیرے اجالے اور دیگر عوامل مل کر ہمیں ہماری زندگی کا حصّہ عطا کرتے ہیں۔

ابد کے سمندر کی اک موج جس پر مری زندگی کا کنول تیرتا ہے
کسی ان سنی دائمی راگنی کی کوئی تان۔ آزردہ‘ آوارہ‘ برباد
جو دم بھر کو آکر مری الجھی الجھی سانسوں کے سنگیت میں ڈھل گئی ہے
زمانے کی پھیلی ہوئی بیکراں وسعتوں میں یہ دو چار لمحوں کی میعاد
طلوع و غروبِ مہ و مہر کے جاودانی تسلسل کی دو چار کڑیاں
یہ کچھ تھرتھراتے اجالوں کا روماں‘ یہ کچھ سنسناتے اندھیروں کا قصہ
یہ جو کچھ کہ میرے زمانے میں ہے اور یہ جو کچھ کہ اس کے زمانے میں‘ میں ہوں
یہی میرا حصہ ازل سے ابد کے خزانوں سے ہے بس یہی میرا حصہ! (مجید امجد: امروز)(۱۵۱)

زاہد ڈار کے نزدیک وقت حدود سے ماورا ہے۔ ہر چیز اس کے آگے بے بس ہے ۔ وہ وقت کے آغاز و انجام کے قائل نہیں ہیں تاہم وقت باقی چیزوں کو زندگی اور موت دیتا ہے۔ کیوں کہ وقت کا نہ کوئی آغاز ہے نہ پیدایش تو اس کی موت بھی ممکن نہیں۔

جب ہم نہیں ہوں گے تو آسمان کہاں جائے گا؟

ٹوٹے ہوئے ستارے کہاں جاتے ہیں؟
وقت کے سامنے سب بے بس ہیں
وقت سب سے بے نیاز گزرتا جاتا ہے
وقت کا نہ کوئی آغاز ہے نہ انجام
جو شروع ہوتا ہے وہ ختم بھی ہوتا ہے
جو پیدا ہوتا ہے وہ مرتا بھی ہے)زاہد ڈار(۱۵۲)

ایک اور مقام پر زاہد ڈار ہمارے وقت کے پیمانوں کو زیرِ بحث لاتے ہیں کہ ہم تو وقت کو اجرامِ فلکی کی حرکات سے ماپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چاند سورج کی حرکات ہمارے دن اور رات تخلیق کرتے ہیں۔ ان میں گڑبڑ ہمارے دن اور رات کے احساسات کو بھی بدل ڈالے گی۔ لیکن یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ یہ وقت ٹھہراؤ میں ہے یا حرکت میں۔

ایک عرصے سے میں نے چاند کو نہیں دیکھا
میرے لیے رات اور دن برابر ہیں
وقت مسلسل بہہ رہا ہے
یا شاید ٹھہرا ہوا ہے
میرے لیے سب برابر ہے)زاہد ڈار(۱۵۳)

یوسف ظفر وقت کو تخلیقی عناصر میں بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ اسی بنا پر وہ اسے کھاد، بیج اور پانی قرار دیتے ہیں۔ وہ اسے ایک مدہوش کر دینے والی رقاصہ کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ وہ وقت کی ہمیشگی کے حق میں نہیں ہیں بل کہ شب و روز کے ایک چکر کا نام دیتے ہیں۔انسان نے روحِ ازل کے جلوے کی تمنا کی ہے جو صرف اُسی کی خصوصیت ہے ۔ یہاں جو بھی ہے وہ ہمارے وقت کے احساس سے مربوط ہونے کی وجہ سے ہے۔ صوفیا کے ہاں بھی ایسے ہی تصورات دکھائی دیتے ہیں۔

وقت کی کھاد سے ہر نقش نمو پایا تھا
وقت دانہ تھا کبھی، وقت کبھی پانی تھا

میں نے پھر جان لیا، وقت وہ رقاصہ ہے
محفلِ زیست کو کرتی ہے جو محرومِ شعورِ ہستی
میں نے پھر جان لیا وقت ہے ابلیس کا کھیل
وقت پائندہ نہیں
وقت پابندِ شب و روز ہے، پائندہ نہیں

وقت کی راکھ میں اب اخگرِ تاباں ہے کہاں
وقت کے ساز میں وہ نغمۂ لرزاں ہے کہاں
کہ یہاں تیرے سوا، میرے سوا، کوئی نہیں جلوہ فشاں! (یوسف ظفر: مجذوب)(۱۵۴)

شاہین مفتی وقت کی تبدیلی کی قائل دکھائی دیتی ہیں۔

ڈولتے بنتے بگڑتے نقشِ پا
وقت شاید گرگیا فٹ پاتھ پر)شاہین مفتی: دن کا زوال(۱۵۵)

عبدالرشید وقت کے مسلسل بہاؤ کے قائل ہیں۔ اس کا کام مدام چلتے چلے جانا ہے۔ مگر وہ اسے ایک ایسی چکّی کی صورت میں بیان کرتے ہیں جو خالی چلتی جارہی ہے اور کوئی بھی نتائج سامنے نہیں آرہے۔

یہ دن ایسی چکی ہے چلتی ہے لیکن کوئی دانہ
گندم کا پستا نہیں
خود میں چھپنے کا یارا نہیں
ایسی ترتیب جس کی صفیں پوری کھل نہ سکیں (عبدالرشید: دن کا خیمہ)(۱۵۶)

شہزاد احمد کے ہاں ہمیں دیگر سائنسی مباحث کے ساتھ وقت کا تصور بھی ملتا ہے۔ان کے نظریات میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ وہ لمحۂ موجود کے ساتھ اس لمحے کو بھی بیان کرتے ہیں جب روشنی کی توانائی رفتار بنی۔ آج ہم وقت کو ماپنے کے لیے کوئی بھی طریقہ وضع کریں تو اسے روشنی کے تناظر میں ‘ اُس کی رفتار کی مدد سے ہی بیان کرتے ہیں۔ شہزاد احمد اس سوچ میں محو دکھائی دیتے ہیں کہ کیا اس کے علاوہ کوئی اور پیمانہ بھی ہو سکتا ہے جس سے وقت کو ماپا جا سکے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر ابھی تک کسی سائنس دان نے بھی غور نہیں کیا۔

زمانے ان گنت گزرے
مگر شاید وہ اک لمحہ نہیں گزرا
کہ جس میں روشنی رفتار بنتی ہے
ہر اک شے
اپنی اپنی خود کشی کے واسطے تلوار بنتی ہے (شہزاد احمد: زمانے ان گنت گزرے)(۱۵۷)

وقت کو دائرے میں چلتا سمجھا جاتا ہے یا عمومی نظریہ ہے کہ اسے ابتدا سے انتہا کی طرف مایل بہ سفر گردانا جاتا ہے۔ شہزاد احمد اس کے الٹے بہاؤ پر بھی نظر ڈالتے ہیں۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہر شے ماہیتِ قلب کرتی ہوئی اپنے اس بنیادی نقطے کی طرف پلٹ رہی ہے جس سے اُس کی تخلیق ہوئی۔ یہی حال وقت کا بھی ہے۔

جتنے بھی دریا ہیں الٹے بھاگ رہے ہیں
شاید وقت اپنے پیروں پر واپس لوٹ رہا ہے
دن اور رات تو اسی طرح ہیں
لیکن ایک زمانے تک
پہلے دن آیا کرتا تھا۔ اب رات آئی ہے (شہزاد احمد: دستک بھی نہیں ہوگی)(۱۵۸)

وقت ایک سمندر ہے جس کی دھاروں میں زندگی سانس لیتی ہے۔ ہر شے کی انفرادیت وقت کی ہی مرہونِ منت ہے۔ اگر وقت نہ ہو تو یہ سب بھی ختم ہوجائے جیسے پانی کے بغیر مچھلی۔

سماں بھی اک سمندر ہے
سمندر میں بہت سی مچھلیاں ہیں
مچھلیوں میں رنگ ہیں
اور رنگ بھی ایسے

جو پانی میں کبھی گھلتے نہیں ہیں   )شہزاد احمد: وہ کہتے ہیں)(۱۵۹(
سائنس کا عمومی نظریہ ہے کہ ایک بنیادی نقطہ سے کائنات کی ابتدا ایک عظیم دھماکے سے ہوئی۔ اور اس کے بعد کائنات پھیلنا شروع ہوگئی۔ شہزاد احمد سمجھتے ہیں کہ ابھی یہ تو ابتدا ہے کہ ابھی ایسے کئی غبارے دھماکوں سے پھٹنے کو ہیں اور جہاں وہ کائنات کو پھیلتا ہوا دیکھتے ہیں وہیں انھیں اب دھماکوں کی بہ دولت پھیلائو نہیں بل کہ سکڑائو دکھائی دیتا ہے۔ کائنات کو دیکھنے کا یہ ایک انفرادی اور نیا پہلو ہے جو شہزاد احمد کے ہاں دکھائی دیتا ہے۔طبیعیات بھی اس نظریے پر یقین رکھتی ہے لیکن اسکے مطابق ابھی سکڑائو کا عہد شروع نہیں ہوا تاہم شہزاد احمد اسے اپنے تخیل کی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں۔

کس طرح وقت کی رو سے خاک میں تبدیل ہوئی
کس طرح ختم نہ ہوتی وسعت
نیلے افلاک میں تبدیل ہوئی
کیسے پھولا وہ غبارہ کہ ہے پھٹنے کے قریب
اب تو وسعت ہے سمٹنے کے قریب   )شہزاد احمد: یہ زمیں ہے مرا کالا پانی)(۱۶۰(

وقت ایک مسلسل بہائو کا نام ہے۔ آخر اس بہائو کا انجام کیا ہے۔ کائنات کی ہر شے آہستہ آہستہ زوال آمادہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ کیا وقت بھی تھکاوٹ کا شکار ہوکر زوال کی طرف چل رہا ہے؟ یہی سوال شہزاد احمد کے ہاں پنپتا ہے۔

چلو اب ہم گزرتے وقت کا دامن پکڑ لیں
اس سے پوچھیں
’’کون ہو تم
کس نگر سے آئے ہو
جانا کہاں ہے؟
جو تم دن رات رہتے ہو سفر میں
کیا کبھی تھکتے نہیں ہو!
نیند کیا تم کو کبھی آتی نہیں ہے؟‘‘   (شہزاد احمد: کیا کریں ہم)(۱۶۱(

شہزاد احمد کی سوچ انھیں وقت اور اجرامِ فلکی میں تعلقات کو جاننے پر اکساتی ہے۔ اس تعلق کی تلاش میں وہ وقت کو ایک ایسی فاحشہ کی صورت میں دیکھتے ہینجو ہر فرد کو اپنے ہونے کا احساس دے کے لبھاتی تو رہتی ہے لیکن اس قربت کو حدود سے ماورا نہیں ہونے دیتی۔ وہ اپنا آپ کبھی کسی کو نہیں دیتی۔ وقت کا یہ بیانیہ جتنا خوب صورت ادبی پیرا یۂ اظہار رکھتا ہے اتنا ہی سائنسی بھی ہے۔

کبھی میں سوچتا ہوں
وقت کا رشتہ
ستاروں‘ آسمانوں اور خلائوں سے ہے
یا ہر لحظہ گردش کرنے والی یہ گھڑی
ٹک ٹک کے نغمے گائے جاتی ہے

یہ اک آوارہ لڑکی ہے
جو لاکھوں آشنا رکھتی ہے

لیکن ایک بھی ایسا نہیں ہے
جس سے کھُل کر بات کرتی ہو
وہ ایسی فاحشہ ہے
جو کسی کو ساتھ سونے کی اجازت نہیں دیتی
سبھی کے پاس رہتی ہے
سبھی سے دور رہتی ہے)شہزاد احمد: نگاہیں)(۱۶۲(

وقت سیدھی چال نہیں چلتا۔ شہزاد احمد کے ہاں بہت سے مقامات پر وقت کے بہائو پر سوالات ملتے ہیں۔ وہ نہ اسے دائروی مانتے ہیں نہ ہی سیدھی لکیر کی صورت چلتا ہوا۔ ان کے ہاں اس کا آہنگ کچھ مختلف ہے کہ کبھی یہ آگے بڑھتا ہے اور کبھی پیچھے۔ جس طرح ایک ہی صفحے پر آگے پیچھے کی طرف پنسل سے مسلسل حرکت کی وجہ سے بننے والی لکیریں حقیقی شکل کو دھندلا دیتی ہیں کہ ان میں سے اصل اور ابتدائی لکیر کون سی تھی۔ اسی طرح وقت کے یہ پلٹے بھی چیزوں کو پراسرار بنادیتے ہیں ۔ اگر وقت کی حرکت مستقیم خط میں ہوتی تو پھر ہم اسی لکیر پر آگے بھی بڑھ سکتے تھے اور پیچھے بھی اور کائنات کے تمام بھیدوں تک ہماری رسائی کوئی مشکل امر نہ رہتی۔

ذرا سوچو ' اگر یہ وقت سیدھی چال چلتا
زندگانی کس قدر آسان ہوجاتی
کبھی ہم لوٹ کر ماضی کو جاتے
اور اس کی شکل ہی تبدیل کر آتے
کبھی فردا کی جانب ہم سفر
تو کرتے ہی چلے جاتے
خدا کا کون سا اسرار ہے
جو اِن نگاہوں سے چھپا رہتا)شہزاد احمد: نگاہیں)(۱۶۳(

مگر 'آج' جو آج موجود ہے کتنا بے مایہ ہے
وقت کی لہر بھی کیا عجب چیز ہے
جب گزرتی ہے احساس تک ہم کو ہوتا نہیں ہے
اور کہنے کو ہم بھی اسی لہر کے منتظر ہیں)شہزاد احمد: ابھی تونے دیکھا نہیں)(۱۶۴(

افضال فردوس ہماری دنیا کو ایک باغ سے تشبیہہ دیتے ہیں اور خدا کو وقت کا مالی قرار دیتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ کھیل اُسی نے رچایا ہے۔ وقت بھی اُسی کی دست رس میں ہے۔ وقت کے ڈالے ہوئے جھولے ارتقا کی کڑیاں ہیں جنھیں بھول پانا ممکن نہیں کہ اس کے بغیر یہ سلسلہ نا مکمل رہتا ہے۔

اس باغ میں وقت کے مالی نے
اب کے جو جھولے ڈالے ہیں
میں ان کو جھول نہیں سکتا
میں بچپن بھول نہیں سکتا)افضال فردوس: بچپن والے گھر کے نام)(۱۶۵(

انسان کا سفر ازل سے جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔ وقت بدلتا رہتا ہے۔ جو آج حال ہے وہ کل تاریخ کا حصہ بن کر دور کہیں گہرائیوں میں دفن ہوجائے گا۔ مگر یہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اپنے آثار کے ساتھ یہ ہمیشہ اپنے ہونے کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ ہر شے احساس کے ساتھ زندہ ہے۔ ہر شے اپنی اصلیت کو کسی نہ کسی صورت اپنے تاریخی ارتقائی حوادث کی صورت میں زندہ رکھتی ہے۔ انھی شواہد کی بنا پر علم الحجریات کے ماہرین اشیا کے درمیان تعلق جاننے کی کوششوں میں مگن رہتے ہیں۔ وقت کے اسی ارتقائی سفر کو بیان کرتے ہوئے اختر حسین جعفری رقم طراز ہیں:

مجھ میں کتنا ازل
مجھ میں کتنا ابد' کتنی تاریخ ہے
میں نہیں جانتا
ایسے دن رات کو دل نہیں مانتا' پور پر جن کی گنتی ٹھہرتی نہیں
آج ' بس آج ہے
کل سحر تک یہی آج تاراج ہے)اختر حسین جعفری)(۱۶۶(

خاطرغزنوی وقت اور ارتقا کا تعلق درج ذیل الفاظ میں واضح کرتے ہیں۔

موسموں کے گھومتے پہیّے
ازل سے تاابد بس ایک ہی رفتار اپنائے ہوئے
ارتقا کا ایک ہی قانون کہنہ
اور نمو کی ایک ہی بوسیدہ مرجھائی کتاب
زندگی اک دائرہ__ تکمیل موت
میں ہر اک اقدام کی تفسیر سے آگاہ ہوں
جسم کی وحدت__ خزاں
جسم کی دوئی بہار گل فشاں
پھر اندھیرا
صفر ابھر آئے
اندھیرا
پھر سے صفر
حرفِ تکمیلِ حیات'' (خاطر غزنوی: کمپیوٹر)(۱۶۷(

جاوید انور روشنی کی معنویت میں وقت کی حقیقت کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ روشنی کی یہ لکیریں سی جو بند دروازوں کی اوٹ سے قطرہ قطرہ ٹپکتی باہر نکل رہی ہیں یہ بھی وقت کے بہائو کے نشانات ہیں۔ یہ صدیوں کے سمندر کی لہریں ہیں جو حال' ماضی اور مستقبل کو بیان کرتی ہیں۔

بے صدا صدیوں کے چونے سے چُنی دیواریں
جو کہ ماضی بھی ہیں' مستقبل بھی
جن کے پیچھے ہے کہیں
آتشِ لمحۂِ موجود کہ جو
لمحۂِ موجود کی حسرت ہے

مری نظم کی حیرت ہے)جاوید انور: برف کے شہر کی ویران گزرگاہوں پر)(۱۶۸(

وقت کی یہ رفتار ارتقا کو ظاہر کرتی ہے۔ ہر گزرتا لمحہ مستقبل سے حال اور پھر حال سے ماضی کی طرف چل پڑتا ہے۔ یہ وقت یوں ہی گزرتا چلا جائے گا۔ نیز یہ کہ گزرتا وقت‘ زندگی سے دوری اور موت سے ہم آہنگی کا نام ہے۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ سورج اپنی توانائی کھوتا چلا جارہا ہے۔ توانائی کھونے کے اس عمل کو نصیر احمد ناصر ناتوانی سے عبارت کرتے ہیں اور اس بیمار سورج کے تن سے زندگی (توانائی) کی آخری رمق بھی چھین لیے جانے کے بعد اُس کی موت کا اعلان کرتے ہوئے اُس کے احساس کو قید کرلینے کا ارادہ کرتے ہیں۔

سنو‘ اجنبی ہم سفر!
اس سے پہلے کہ گھڑیوں کی خاموش ٹِک ٹِک
دھماکے کی صورت
سماعت کے پردوں سے ٹکراکے
بیمار سورج کے مرنے کا اعلان کردے
چلو‘ ڈوبتی شام کے دور جاتے ہوئے منظروں کی
لہو رنگ تصویر
احساس کی اندھی سکرین پر ثبت کرلیں)نصیر احمد ناصر :)SNAPSHOT)۱۶۹(

صرف سورج ہی نہیں بل کہ چاند بھی موت کے سفر پر روانہ ہے۔ اس کی زندگی کا ہر لمحہ اسے موت کے قریب لیے جا رہا ہے جسے نصیر احمد ناصر خود کشی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ساحلی چٹانوں پر
سرجھکائے بیٹھا ہے
خودکشی سے پہلے ‘ چاند)نصیر احمد ناصر)(۱۷۰(

لیکن پھر بھی موت محض اختتام نہیں بل کہ ایک نئی حیات کا نام ہے۔ ہر موت سے حیاتِ نو جنم لیتی ہے۔ اسی لیے نصیر احمد ناصر کو رات کے اندھیرے دامن میں مسحور کرتی مسکراتی ہوئی صبح کا پوشیدہ منظر بھی دکھائی دیتا ہے ۔ وہ ستاروں کے غروب کو سورج اور روشنی کی آمد کا پیغام سمجھتے ہیں ۔ گویا ایک کی موت دوسرے کی حیات ہے۔مزید یہ کہ رات کی تاریکی میں انھیں صبحِ نو کے اجالے کا پرتو نظر آتا ہے۔یہی انداز آواگون کے فلسفے کا بھی ہے۔

رات کے کنارے پر
صُبح مُسکراتی ہے
آخری ستارے پر)نصیر احمد ناصر)(۱۷۱(

میں نے دیکھے خواب میں
روشنی کے دستخط
رات کی کتاب میں)نصیر احمد ناصر)(۱۷۲(

زندگی اور موت کے تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے اختر حسین جعفری زندگی اور وجودِ انسانی کی مثال دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دن زندگی کا استعارہ ہے ۔ اس کے دکھوں کا گدلا پانی کبھی نا آشنا صدائوں کی صورت کانوں کا مقدر بنتا ہے اور کبھی دکھ و آلام کے آنسوئوں کی صورت میں آنکھوں کے حصے آتا ہے۔ زندگی تو موت کی امانت ہے۔ ہم دریا کی لہروں کی صورت ہیں۔ ہر لہر زندگی کی لہر ہے اور یہ بے انت سمندر موت کا سمندر ہے۔ لہر بھی تو سمندر کا ہی ایک حصہ ہے لہٰذا اسے سمندر سے الگ سمجھنا بے وقوفی ہے ۔ اسی طرح زندگی بھی موت کے بے انت سمندر کی اک لہر ہی ہے۔ لہٰذا پار جا اُترنا یا اسی کے راستوں میں خاک ہوجانا ایک سا ہی ہے۔ موت اور حیات دو الگ چیزیں نہیں بل کہ بدلائو کا نام ہیں۔

بہتے دن کا گدلا پانی
کچھ آنکھوں میں
کچھ کانوں میں۔ اور شکم میں نا آسودہ درد کی کائی
اس دریا میں لمحہ لمحہ ڈوبنے والے!
تیرا جینا مرنا کیسا؟
تیرا پار اترنا کیسا؟)اختر حسین جعفری: تیرا پار اُترنا کیسا)(۱۷۳(

پھر موت بھی تو اُسی کو آتی ہے جو زندگی رکھے۔ عناصرِ فطرت میں ہوا ایک ایسا عنصر ہے جسے نصیر احمد ناصر موت سے ماورا قرار دیتے ہیں۔ وہ ہوا کو ہمیشہ سے رواں مانتے ہیں اور اسے صدیوں پر محیط تاریخ کا رازدار سمجھتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ تاریخِ انسانی اور اس سے پہلے کے ادوار کی کہانی بھی اسی ہوا کے دل میں محفوظ ہے۔دوسری طرف اس میں ایک صوفیانہ فکر کا پہلو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔کیوں کہ ہوا کا جسم نہیں ہوتا لہٰذا اس کے لیے موت بھی لایعنی سی چیز ہے۔ صوفیابھی ہوا (روح) کے ازلی وجود کے قائل ہیں اور اسے موت سے ماورا سمجھتے ہیں کیوں کہ موت کے لیے وجود ہونا ضروری ہے۔ خدا بھی اسی لیے موت سے ماورا سمجھا جاتا ہے کہ وہ کوئی جسم کوئی وجود نہیں رکھتا۔

اگر میرے سینے میں خنجر اتارو
تو یہ سوچ لینا
ہوا موت سے ماورا ہے
ہوا ماں کے ہاتھوں کی تھپکی
ہوا لوریوں کی صدا ہے
ہوا ننھے بچوں کے ہونٹوں سے نکلی دعا ہے!
اگر میرے سینے میں خنجر اتارو
تو یہ سوچ لینا
ہوا کا کوئی جسم ہوتا نہیں..... (نصیر احمد ناصر:ہوا موت سے ماورا ہے)(۱۷۴(

جاوید انور کہتے ہیں کہ یہ جو کچھ دکھائی دے رہا ہے اور جو پوشیدہ ہے اس میں بہت سی ابتدائیں اور انتہائیں مدفون ہیں۔ خدا اور انسان کے ساتھ کائناتی رشتوں میں لپٹے ہوئے اہم عناصر میں زندگی اور موت بھی شامل ہے اور زندگی اور موت کے اسی رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے ان کا خیال ہے کہ

کنواں ہے موت کا یہ زندگی، جس میں
کبھی شب ناچتی ہے اور کبھی دن گھومتا ہے
آنکھ میں بجھتے ہوئے سورج لیے
پگھلا ہوا لوہا تری پلکوں سے گرتا ہے
مرے ہونٹوں پہ جمتا ہے! (جاوید انور: اس شہرِ خرابی میں)(۱۷۵)

وقت کا پہیا چلتا رہتا ہے اور یہ زندگی کو موت اور موت کو زندگی سے ملاتا چلا جاتا ہے۔ دن رات کا آنا جانا اور آنکھوں میں جلتی زندگی کی لو کا بجھ جانا ایک ہی جیسے عوامل ہیں۔چاند اور سورج توانائی کے منابع ہیں۔ سورج کی روشنی سے چاندبھی روشن ہے۔ مگر اس کی دودھیا حرارت بھی تو توانائی کی ہی ایک شکل ہے۔ نصیر احمد ناصر اس توانائی کو ایک نئے رنگ سے دیکھتے ہیں کہ اس کی بہ دولت آسمان پگھلتاہے۔ اگر اس سے یہ مطلب نکالا جائے کہ سائنس جلد ہی شاید اس روشنی کے منبع کو کسی نئی صورت میں دیکھتے ہوئے نئی دنیا کی تلاش میں نکل کھڑی ہو تو بے جا نہ ہوگا۔

چاند کی دودھیا حرارت سے
منجمد آسماں پگھلتا ہے
قطرہ قطرہ اُداسیاں ٹپکیں! (نصیر احمد ناصر)(۱۷۶)

جاوید شاہین کائناتی صداؤں پر غور کرتے ہیں۔ اقبال بھی اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ کائنات تعمیر کے مراحل سے گزر رہی ہے اور ہر طرف سے ’’کُن‘‘ کی صدا سنائی دے رہی ہے۔ یہاں اس بات کی بھی وضاحت کرتے چلیں کہ بیسیوں صدی کے اختتامی عشروں میں سائنس دانوں نے ریڈیائی لہروں پر تحقیق کے دوران انتہائی نحیف آوازوں کو بھی محسوس کیا۔ جب ان آوازوں پر مزید تحقیق کی گئی تو یہ بات سامنے آئی کہ پوری کائنات میں ان آوازوں کی شدت ایک سی ہے اور ان کا منبع حدِّ ادراک سے ماورا ہے۔ بعض صوفیا کے نزدیک یہ آواز وہی ’’ہو‘‘ کی آواز ہے جو حاصلِ زیست ہے۔ سائنسی اصول Doppler's Effectکے تناظر میں ان آوازوں کا منبع جاننے کی بارہا کوشش کی گئی لیکن ابھی تک اس میں کامیابی نہیں ہو پائی ہے۔ بعض سائنس دان یہ یقین رکھتے ہیں کہ یہ آواز کسی دوسرے سیارے سے آرہی ہے اور بعض کے نزدیک یہ آواز ہماری معلومہ دنیا کے اندر سے ہی کسی ایسے ان جانے منبع سے پیدا ہورہی ہے جو عام ذرایع سے بہت مختلف ہونے کی بنا پر اس آواز کو ایک ہی شدّت سے پوری دنیا میں بکھیر رہا ہے۔اسی منبع کی تلاش کرتے ہوئے جاوید شاہین لکھتے ہیں:

کوئی آواز ہے
روٹھی ہوئی جیسے نگر سے ہے
سفر میںہے
کہ اکتائی ہوئی اپنے سفر سے ہے
پتا چلتا نہیں
آتی کدھر سے ہے
سوادِشہر سے؟
یا شہر کا پُر شور مرکز
اُس کا مسکن ہے؟

کسی گنجان آبادی سے؟
یا اس کا ٹھکانہ کوئی بن یا کوئی مدفن ہے؟)جاوید شاہین: کوئی آواز ہے)(۱۷۷(

جیسا کہ بارہا کہا جاچکا ہے کہ سائنسی اور غیر سائنسی دونوں علوم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ کائنات دو عمومی اشیا سے بھرپور ہے: مادہ اور توانائی۔ چاہے انسان ہو یا خدا ' اُسے انھی عناصر کے مطابق سمجھنے اور اس کی تفسیر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہماری کائنات میں بکھری ہوئی یہ توانائی مختلف صورتیں رکھتی ہے جن میں سے ایک قسم آواز بھی ہے۔ طبیعیات کے قانون بقائے توانائی کے مطابق توانائی نہ تو پیدا ہو سکتی ہے اور نہ ہی فنا تاہم اسے ایک قسم سے دوسری قسم میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ سلیم الرحمان بھی اسی نقطۂ نظر سے جب دیکھتے ہیں تو سائنس دان کے ہم نظریہ محسوس ہوتے ہیں' جو یہ دعوا کرتے ہیں کہ ہم جو بھی لفظ بولتے ہیں وہ توانائی کی لہروں کی صورت میں اس دنیا میں موجود رہتے ہیں۔ ہم ابھی تک ایسے آلات پیدا نہیں کر پائے جن کی مدد سے ان قدیم آوازوں کو سُن پائیں۔ تاہم کچھ سائنس دانوں کا یہ خیال ضرور ہے کہ مستقبل قریب میں ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ ماضی میں کہے گئے ان الفاظ کو ہوبہ ہو اسی آہنگ میں سُن پائیں گے جیسا کہ انھیں ماضی میں کسی فرد یا شے نے ادا کیا تھا۔ انھی الفاظ کو سننے کی تمنا سلیم الرحمان کی نظم میں بھی دکھائی دیتی ہے۔

ہوا میں اڑتے ہوئے لمحے کے لفظوں کو چھو لیں
اپنے خیالات کے عکسوں کو دیکھ لیں
آئو
دوری اورنزدیکی کے سراب کو
خواب کے زوم لینزوں کے طلسم میں بند کرلیں
آئو اس ایک دن میں
نوخیزعمری میں بھیگے ہوئے خواب کی
ناتمامی کو قطرہ قطرہ نچڑتے دیکھیں)سلیم الرحمان: ایک دن میں زندگی)(۱۷۸(

یہ آوازیں ہمیشہ سے اسی طرح قائم ہیں۔ سائنس دان کی پہنچ ان تک بعد میں ہوتی ہے اور وہ ان کی ماہیت کو جاننے کی کوشش کرتا ہے مگر شاعر اپنے تخیل کی بنا پر اِن اَن دیکھی اور اَن سُنی صدائوں کو سُنتا ہے۔ مگر وقت کے بہائو کے ساتھ یہ آوازیں بھی کہیں اور بہہ نکلتی ہیں۔ اختر حسین جعفری ان صدائوں میں اپنے اصل کے متلاشی ہیں۔ وہ ان کی صورت گری سے اپنی حقیقت کو جاننے کی سعی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اے عدم کی درا!
دیر سے سُن رہا ہوں میں تیری صدا
ایک پل تو ٹھہر' اپنا چہرہ اسی سُست پڑتے ہوئے خون
میں ڈھونڈ لوں
سر پر گرتے ہوئے بار سے پوچھ لوں
کس نے باندھااسے؟ اور سر پر مرے کس نے
رکھا اسے؟)اختر حسین جعفری)(۱۷۹(

یہاں سر پر گرتا ہوا بار آسمان اور تقدیر کا نشان ہے۔ تقدیر و تدبیر کا یہی پہلو شاعر کو پریشان رکھتا ہے اور وہ یہ سوچنے لگتا ہے کہ اسے کس نے' کب' کہاں' کیسے اور کیوں

رکھا ہے۔ اس کا مقصد و منتہا کیا ہے؟ اور اسی مقصد کی بازآفرینی میں ہی حقائق کی بجا آوری ممکن ہو سکتی ہے۔اور اسی سفر کے دوران اختر حسین جعفری کو آفتاب کی تھکاوٹ کا احساس ہوتا ہے۔ آفتاب کی یہ تھکاوٹ اس کے موت کے سفر پر مسلسل روانہ رہنے کی بہ دولت ہے، جس کا اظہار بہت سے شعرا کے ہاں دکھائی دیتا ہے۔ہر لمحہ اپنے اندر سیکڑوں رازوں کو دفن کیے موت کی آغوش میں جانے کو بے قرار رہتا ہے۔ یہی زمان کی حقیقت ہے۔ بہ قول اختر حسین جعفری:

تھکے ہوئے آفتاب! تیرے غروب کا وقت آگیا ہے
یہ ایک پَل جو ازل سے پہلے کا ایک پل ہے
جو انتہائوں کے بعد کی کوئی انتہا ہے
اس ایک پل میں ڈھکے چھپے سینکڑونزمانے
شروع و آغازِ آفرینش کے عُذر اموات کے بہانے
تھکے ہوئے آفتاب! تیرے سفر کی مٹی میں میرا چہرہ ہے
میرے چہرے پہ منجمد اشک، داغ، دشنام، میری ساعت،
مرا زمانہ، مرا جہاں ہے (اختر حسین جعفری)(۱۸۰)

انسان کائنات کا مرکز ہے اور اس کے رازوں کا سب سے بڑا شناور بھی۔ وہ اشیا کی حقیقت اور ان کے باہمی تعلق کی تلاش میں سرگرداں رہا ہے۔ اس امر کے لیے کبھی اس نے تجرباتی علوم کا سہارا لیا ہے کبھی مذہب کا اور کبھی تخیل کی ہم راہی اختیار کی ہے۔ ایسے ہی رشتوں کی تلاش میں زاہد امروز بھی جب غور کرتے ہیں تو انھیں ہر یک سانیت میں تضاد اور ہر تضاد میں یک سانیت کی لہر پنپتی نظر آتی ہے۔

اروشی!
تم بہت نادان ہو
بارش کو بادل سے الگ پہچانتی ہو
اگر یہ مختلف ہیں تو
زمین اور آسماں کا باہمی رشتہ کہاں ملتا ہے؟ (زاہد امروز: اروشی)(۱۸۱)

خُدا، خالقِ کُل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مذہب اور سائنس کے درمیان بنیادی جنگ کی وجہ ہی خدا کا وجود رہا ہے۔ سائنس دانوں کا یہ خیال رہا ہے کہ خُدا کی کوئی حقیقت نہیں جب کہ مذاہب کا اولین نظریہ ہی وجودِ خدا سے جنم لیتا ہے۔ ہمارے جدید اردو نظم گو شعرا کے ہاں بھی خدا کو مختلف تناظرات میں دیکھا گیا ہے۔ کسی نے وقت کو ہی خدا قرار دے دیا، کسی نے اُس کی موت کے گُن گاتے ہوئے نطشے کے نظریہ کا پرچار کیا اور کسی نے اسے گروہوں میں بانٹ دیا۔ کسی نے اُس کے وجود کو بنیادی ضرورت سمجھا اور کسی نے اُسے محض فریب کا نام دیا۔ عمومی روّیہ یہی ہے کہ خدا خالقِ کائنات ہے۔ جب حضرت محمدؐ سے بھی کفار نے خدا کی ماہیت بارے سوال کیا تو انھیں یہی دلیل دی گئی کہ خدا ایک ہے اگر دو ہوتے تو ان میں تضاد اور جھگڑا پیدا ہوجاتا۔ اسی طرح جب قیامت پر سوال اٹھایا گیا تو انھیں یہ دلیل دی گئی کہ جو خدا ایک بار پیدا کرنے پر قادر ہے وہ دوسری بار بھی پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔افضال فردوس بھی خدا کی اسی جہت کا اظہار کرتے ہوئے اس سے ایسے عوامل کے خواست گار ہیں جو عمومی تجربہ کے خلاف ہیں لیکن خدا کے نزدیک تو وہ مشکل نہیں کہ وہ تو جو چاہے کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔

تیرے واسطے کیا مشکل ہے
تو سب کچھ کرسکتا ہے
تو میرے سوکھے دریا کو
پانی سے بھر سکتا ہے
پیاسی دھرتی
پیاسی گلیاں
جل تھل بھی کرسکتا ہے
چاہے تو
میری کھڑکی میں
سورج بھی دھر سکتا ہے)افضال فردوس: حمد)(۱۸۲(

مزید آگے بڑھنے پر افضال فردوس کے ہاں ہمیں صوفیانہ افکار کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ صوفیا کے ہاں بھی لباس عموماً جسم اور زندگی کے معانی میں مستعمل ہے۔ جب تک یہ لباس روح کے پیرہن پہ رہتا ہے ‘ روح اس دنیا کی زینت بنی رہتی ہے۔ اسلامی نظریہ کے مطابق خدا نے تمام جان داروں کی ارواح ایک ہی بار میں تخلیق کیں اور ان سے وفاداری کا ایک عہد لیا جسے عہدِ الست کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مگر انسان اس دنیا میں آکر اس کے رنگوں میں مگن ہو کر صرف اسی کا ہوکر رہ جاتا ہے۔ کام یابی اس کا مقدر ہے جو اس ملبوس کو گناہ کی غلاظت سے آلودہ نہیں ہونے دیتا۔ افضال فردوس بھی اسی معمے پر پریشانی کا شکار نظر آتے ہیں اور اپنے محبوب (خدا) سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں:

میں نے جو ملبوس
فقط اس دن کی خاطر سلوایا تھا
جب تم واپس آئو گے
وہ ملبوس ابھی تک
بالکل ویسے ہی رکھا ہے
اب جب تم میرے بھی نہیں ہو
جان! فقط اتنا بتلادو
اس ملبوس کا کیا کرنا ہے)افضال فردوس: ملبوس)(۱۸۳(

تخلیقِ ارواح کے متعلق ہندوانہ نظریہ بھی اہمیت کا حامل ہے۔ آواگون یا جونی چکر کے نام سے جانا جانے والا ہندو فلسفہ جسم اور روح کے باہمی تعلق کی وضاحت کرتا ہے۔ وہ بھی دیگر مذاہب کی طرح اس دنیا کو عارضی قرار دیتا ہے۔ ہندو نظریہ کے مطابق جب روح کو کسی جسم کے ساتھ اس دنیا میں بھیجا جاتا ہے تو اس کا حتمی مقصد برہما کی اسی روح کی طرف پلٹ جانا ہوتا ہے جس سے اُسے بہ وقتِ تخلیق علاحدہ کیا گیا۔ اپنے اعمال کی بہ دولت وہ برہما کی روح سے مل سکتا ہے۔ اور اس سفر کے راستے میں جو بھی کچھ آتا ہے وہ سب فنا ہو جانے والا ہے لہٰذا اُس سے نظریں بچاکر نکلنا اور اپنے مقصد کو ذہن نشین رکھنا بنیادی ذمہ داری قرار پاتا ہے۔ آواگون چکر کی صورت ہمیں کاربن چکر‘ نائٹروجن چکر اور پانی کے چکر کے صورت میں سائنس میں بھی نظر آتی ہیں کہ کس طرح عناصر مسلسل سفر میں گھومتے رہتے ہیں اور مختلف اشکال اختیار کرتے رہتے ہیں۔
گرو مہراج کہتے ہیں

کہ یہ سنسار فانی ہے
جو شے دنیا میں آئی ہے
وہ واپس لوٹ جاتی ہے
فنا کا ذائقہ چکھنا
ہر اک شے کا مقدر ہے
فنا کا نام ہے دنیا یہ بستی موت کا گھر ہے
میں کہتا ہوں
زمیں پر
اور ہماری کہکشاں میں ہر اک شے آتی جاتی ہے
سبھی کچھ غیر فانی ہے
جو مرتا ہے
حقیقت میں بدن تبدیل کرتا ہے)افضال فردوس: نظم)(۱۸۴(

جاوید انور بھی خدا کو ازلی اور خالقِ کُل کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور اس کے سامنے خود کو بے مایہ محسوس کرتے ہیں۔ وہ خدا کی تخلیقی صفت اور ہر شے پر اُس کی دست رس اور فوقیت کو ظاہر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

دُھند میں سانس کا پھول کھلایا
قطرے کو گہرائی دی
تو نے چُپ کو چیخ بنایا
مٹی کو گویائی دی
تو لمحے کو صدی بنائے
اور سُر کو کرے ترانہ
میرے پاس اک خالی جھولی
تیرے پاس خزانہ)جاوید انور: ایک دُعا)(۱۸۵(

علم الاعداد نے بھی کائناتی تفہیم میں انتہائی اہم کردار ادا کیا ہے۔ عصرِ حاضر میں بہت سے عوامل ایسے ہیں جن کی عملی توجیہہ تو آج تک بیان نہیں کی جاسکی لیکن ریاضیاتی سطح پر ان کی پیش کاری ضرور کی گئی ہے۔ تعویذ گنڈے اور ان پر لکھے ہوئے اعداد' ہندو جوتشیوں کا کنڈلی ملانے اور بنانے کا انداز ' مخصوص اعمال اور اوراد کو ایک مخصوص تعداد میں کرنا ' یہ سب کے سب انسان کے علم الاعداد پر یقین کی ہی بہ دولت ہیں۔ ان اعداد میں سات کا ہندسہ اہمیت کا حامل ہے جیسے دورانِ حج سات چکر' صفا و مروہ کی پہاڑیوں کے سات چکر' سات زمین اور سات آسمان وغیرہ۔ جاوید انور بھی اپنی نظم میں اسی عدد کو استعمال کرتے ہوئے خدا کی ذات پر سوال اٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں

ساتویں آسماں پر کوئی
اپنی جنت میں لیٹا ہے دوزخ کا ہیٹر جلائے ہوئے
اور ہاتھوں میں ریموٹ پکڑے ہوئے
اپنے ٹی وی پہ سب دیکھتا ہے جو ہم اور تم
کررہے ہیں مگر
کتنی سردی ہے اس شہر میں

مجھ کو معلوم ہے
اور اُس کو نہیں (جاوید انور: ریچھ کیوں ناچتا ہے)(۱۸۶)

یہاں خدا کے علم پر بھی سوال اٹھایا گیا ہے اور اگر ذرا گہرائی سے دیکھا جائے تو جنت اور جہنم کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ ہیٹر سے مراد جہنم ہے جب کہ سردی سے مراد اس دنیاوی زندگی کے مصائب کی سرد مہری۔اسی شک کی کڑی کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ کائنات کے سفر میں پوشیدہ اسرار پر بھی خامہ فرسائی کرتے ہیں اور چشمِ بینا سے ماورا افلاک کی سیر کرتے ہوئے ان کی عقدہ کشائی کرتے ہیں کہ سب حقیقت وہ نہیں جسے آنکھ دیکھ پائے بل کہ اس سے بڑھ کر بھی بہت کچھ ہے جس تک پہنچنے کی ہمت ہمارے اعضا نہیں رکھتے۔

ان کہی نظم کی طغیانی میں
ہیں بھنور کتنے' گُہر کتنے ہیں
کتنے اِلاّ ہیں پسِ پردۂ لا
چشمِ نابینا کے آفاق میں ہیں
کتنے بے رنگ کُرّے
کتنے دھنک رنگ خلا (جاوید انور: برف کے شہر کی ویران گزرگاہوں پر)(۱۸۷)

ڈاکٹر جواز جعفری انسان کی ارتقائی منازل میں شعور کی آبیاری کو انتہائی اہم گردانتے ہیں اور پھر کائناتی تناظر میں کچھ اہم سوالات اٹھاتے ہیں۔انھی سوالات کی بازگشت میں انھیں خدا اور مادے کے تعلق سے بھی واسطہ پڑتا ہے اور وہ اس گومگوں کا شکار ہوجاتے ہیں کہ ازلی حقیقت کیا ہے۔ خدا اور مادے میں تعلق کیا ہے؟ زندگی کی ابتدا و انتہا کیا کسی مخصوص پیرائے میں ایک منضبط انداز میں بڑھ رہی ہے یا یہ ایک حادثے کا نتیجہ ہے۔ انھی سوالات کی بازگشت انھیں پریشان کیے رکھتی ہیں جن تک ابھی سائنس کی رسائی بھی ممکن نہیں ہو پائی ہے۔

چاند اور سورج کی گردشیں
شمار کرتے کرتے
''شعور'' جوان ہوگیا
اب وہ دریا کے جھُرّ یوں بھرے چہرے کو دیکھ کر سوچتا
کہ پانی اور ہوا میں سے
کس کی عُمر زیادہ ہے؟
خُدا اور مادے میں سے
کونسی بڑی حقیقت ہے؟
کائنات کے مضافات میں تیرتے ہوئے زمین کے ذرّے پر زندگی
کس منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے؟
اس کا مستقبل کیا ہے؟ (جواز جعفری: وائلڈ لائف اور تیسری دنیا)(۱۸۸)

اختر حسین جعفری خدا کو حقیقتِ لم یزل سمجھتے ہیں۔ وہ وحدت الوجودی نظریات کے زیرِ اثر کائنات کی ہر شے میں خدا کو ہی دیکھتے ہیں اور اُس کی ذرّہ نوازیوں کا ذکر کچھ انداز میں کرتے ہیں:

تیرا نام وہ بادل جس کا پیغمبر پر دشت و جبل میں سایہ ہے
تیرا نام وہ برکھا جس کا رم جھم پانی
وادی میں دریا کہلائے اور سمندر بنتا جائے
تیرا نام وہ سورج جس کا سونا سب کی ملکیت ہے
)اختر حسین جعفری: اک انعام کے کتنے نام ہیں)(۱۸۹(

مجید امجد کے ہاں کائناتی تفکر کے احساسات اپنی بھرپور جولانیاں دکھاتے ہیں۔ خدا اور وقت کے تعلق کے حوالے سے ان کی نظم ''کنواں'' انتہائی اہمیت کا حامل ہے جس میں وہ وقت کو ایک کنویں سے تشبیہہ دیتے ہیں جس کا کام چلتے ہی چلے جانا ہے اور ہر چکر کی تکمیل پر نئے چکر کے سفر پر روانگی اس کا مقدر ہے۔ وہ وقت کے اس کنویں پر خدائی دست رس کے قائل ہیں اور اُسے کنویں والے کے نام سے پکارتے ہیں جو اپنی گادی پر بیٹھا بنسی کے مست سروں سے لطف اٹھارہا ہے اور تقدیر کا پانی کھیتوں کو اپنی مرضی سے سیراب کیے پھرتا ہے لیکن وہ اس سب سے ماورا ہوکر اپنی ہی دھن میں مگن ہے۔

کنویں والا' گادی پہ لیٹا ہے مست اپنی بنسی کی میٹھی سریلی صدا میں
کہیں کھیت سوکھا پڑا رہ گیا اور نہ اس تک کبھی آئی پانی کی باری
کہیں بہہ گئی ایک ہی تند ریلے کی فیاض لہروں میں کیاری کی کیاری
کہیں ہوگئیں دھول میں دھول لاکھوں' رنگارنگ فصلیں' ثمردار ساری)مجید امجد: کنواں)(۱۹۰(

زاہد ڈار عمومی کائناتی تناظر میں خدا کے وجود کا انکار کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ خدا کی تلاش کے سفر میں مایوسی کا شکار ہو کر اکتاہٹ کا شکار ہو جاتے ہیں اور سوال کرتے ہیں کہ اگر خدا ' دیوی ' دیوتا موجود ہیں تو کہاں ہیں۔ میں تو ان کی تلاش کے سفر سے تھک چکا ہوں لیکن انھیں کہیں نہیں پایا۔وہ آسمان جسے خدا کا مسکن قرار دیا جاتا ہے' خدا سے خالی ہے۔ ہم لوگوں نے اپنے اپنے نظریات کے مطابق اپنے اپنے خدا خود تراش رکھے ہیں۔ یہاں اُن کے ہاں بھی راشد کی طرح خدا کی حتمی نفی نظر نہیں آتی بل کہ جس طرح راشد مشرق اور مغرب کے الگ الگ خدائوں کا ذکر کرتے ہیں اسی طرح زاہد ڈار بھی یہ سمجھتے ہیں کہ ہر کسی کا خدا جُدا ہے۔

میں تھک گیا ہوں یارو
اکتاگیا ہوں یارو
لفظوں کی تیرگی سے
تاروں کی روشنی سے
اب دیوتا کہاں ہیں
اور دیویاں کہاں ہیں
لیکن جو ٹھیک پوچھو
یارو' تو آسماں پر
کوئی خدا نہیں ہے
سارے خدا یہیں ہیں
ذہنوں میں اور دلوں میں
تیرا خدا جُدا ہے

اس کا خدا جدا ہے
میرا خدا جدا ہے)زاہد ڈار)(۱۹۱(
شاہین مفتی کے ہاں بھی خدا کی ذات کو لے کر ایسے ہی ابہام نظر آتے ہیں۔ قدیم اساطیری عہد سے ہی آسمان کو دیوی دیوتائوں کے مسکن کے طور پر دیکھا جاتا رہا ہے۔ مگر شاہین مفتی اس بارے متشکک ہیں اور لکھتے ہیں:
آسمانوں پہ مگر کوئی نہیں ہے شاید
آسمانوں کا مکیں اور کہیں ہے شاید
یا فقط یہ بھی کوئی حسنِ یقیں ہے شاید)شاہین مفتی: ایک اور جنم)(۱۹۲(
عبدالرشید یہ سمجھتے ہینکہ ہماری یہ کائنات ہماری دست رس سے باہر اور ہمارے لیے اجنبی ہے لیکن جو اس کا خالق ہے وہ اس کے تما م تر اسراروں سے واقف ہے - وہی ہے جو نیند کے ذریعے تھکن سے نجات دلاتا ہے اور رنج و راحت کے احساسات بخشتا ہے۔
جو اجنبی شہروں کی میزوں پر فراموشی کے جالوں میں تھکن اور رتجگے اورنیند کے قتلے ڈبوتا ہے ‘
کہ جس نے دن کی پھانکیں کاٹ کے تُرشی کوزخموں پر ملا ہے ‘
اور خوشی اور رنج کو اور غم کی بے تابی کو لفظوں کے چمکتے مائع چہروں سے چرایا ہے ‘
زیاں اک حرف ہے اور رائیگاں ہونا حقیقت ہے‘
ہزیمت اور شکستہ خاطری وہ کڑوا پھل ہے ذائقہ جس کا لہو میں بھرتا رہتا ہے
)عبدالرشید: ایک نظم اپنے لیے)(۱۹۳(
مبارک احمد ترتیب و آہنگ کو ہی خدا قرار دیتے ہیں۔ مگر وہ خدا کے وجود سے انکار نہیں کرتے اور اسی آہنگ کی نشانی سے خدا تک پہنچتے ہیں۔ اسی لیے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ ترتیب اور نظم و نسق ایسا ہے کہ اگر خدا خود بھی چاہے تو اپنے آپ سے انکار نہیں کرسکتا۔ایسے ہی نظریات کا پرچار عصرِ حاضر کے کائناتی حوالے سے سب سے معروف سائنس دان اسٹیفن ہاکنگ بھی کرتے ہیں۔
آہنگ خدا ہے
کائنات میں آہنگ کے علاوہ کوئی اور شے نہیں
کوئی ہے؟
کوئی ہے جو آہنگ سے عاری رنگ و حرکت یا حرف و صوت کی مثال لائے
کوئی نہیں!
یہ تو خدا کے لیے بھی ناممکن ہے
کہ خدا اپنی نفی پر قادر نہیں
کہ اس میں
اور اس کی کائنات میں
آہنگ کے علاوہ کچھ اور ہے ہی نہیں)مبارک احمد)MANIFESTATION(:۱۹۴(
اسی لیے خیر اور شر کی طاقتوں کو بھی اسی آہنگ اور ترتیب کا مظہر گرادانتے ہوئے خیرو شر کی آویزش کو بھی خدا کے ہونے کے ثبوت سے تعبیر کرتے ہیں۔ خیر اور شر‘ خدا اور شیطان کی اس جنگ میں انسان ایک لڑھکتے ہوئے فٹ بال کی طرح ہے‘ جو

کبھی خدا کے قدموں میں جا گرتا ہے تو کبھی شیطان کے قدموں میں‘ کیوں کہ ان میں سے کوئی بھی ہار ماننے پر آمادہ دکھائی نہیں دیتا۔ یہ جنگ انسان کی موت اور قیامت تک جاری رہتی ہے اور اس جنگ کا احوال تاریخ کے اوراق پر ثبت ہوتا چلا جاتا ہے۔

خدا بڑا طاقت ور ہے
لیکن شیطان نے بھی ہار نہیں مانی
انسان ان دونوں کے درمیان
بے اختیار فٹ بال کی طرح ہے
اور تاریخ
ان دونوں کے درمیان
اس کھیلے جانے والے کھیل کی
روداد
یہ کھیل جاری رہے گا
تا آنکہ فٹ بال کی پھونک نکل جائے)مبارک احمد(LEGEND) :۱۹۵(

میرا جی کا شمار جدید اردو نظم کے اہم ستونوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے انسان کی نفسیاتی الجھنوں کو اپنی نظموں کا موضوع بنا یا ہے۔ وہ خدا کو بھی نفسیاتی سطح پر ہی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ وہ اسے روحِ ابد کے نام سے معنون کرتے ہیں اور اس سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ میں تمھاری حقیقت کو پا چکا ہے اور تمھاری حقیقت تصور سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

میں تجھے جان گیا روحِ ابد
تو تصوّر کی تمازت کے سوا کچھ بھی نہیں
)چشمِ ظاہر کے لیے خوف کا سنگیں مرقد(
اور مرے دل کی حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں
اور مرے دل میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں)میرا جی: خُدا)(۱۹۶(

نذر محمد راشد کا شمار بھی جدید اردو نظم کے اہم ترین شعرا میں ہوتا ہے۔ خاص طور پر سیاسی و سماجی حوالے ان کی شاعری کی پہچان بنے اور خدا پر کیے ہوئے ان کے مباحث اور ان کی موت کے بعد کے حالات نے انھیں ایک متنازعہ شخصیت کے طور پر متعارف کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔ راشد اپنے عہد کے رمز شناس تھے۔ انھوں نے نام نہاد ملائوں کی اجارہ داری کا نوحہ لکھا ہے۔ انھوں نے اہلِ مشرق کی گہری نیند پر چوٹ لگائی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ راشد وہ فرد تھے جنھوں نے اقبال کے بعد امتِ مسلمہ کے غم کو سب سے زیادہ محسوس کیا تو غلط نہ ہوگا۔ وہ اسی ملا پرستی کی بنا پر خدا اور ملا کا تعلق واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

سیمگوں ہاتھوں سے اے جان ذرا!
کھول مے رنگ جنوں خیز آنکھیں!
اسی مینار کو دیکھ
صبح کے نور سے شاداب سہی
اسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے
اپنے بے کار خدا کی مانند

اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا ملائے حزیں)ن۔م۔راشد: دریچے کے قریب)(۱۹۷(

راشد افلاس زدہ ملا اور خدا دونوں کو بے کار قرار دیتے ہیں اور ان دونوں سے ہی مایوسی کا اظہارکرتے ہیں۔ ان کا یہ انکار سماجی سطح پر امت کے مطالعے سے جنم لیتا ہے کہ وہ امت جسے سب سے بہتر قرار دیا گیا وہ دنیا میں بے عزتی اور بے توقیری کا شکار ہے۔ ایسے میں وہ پہلے تو خدا کی ذات کے بارے میں تشکیک کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نہ جانے وہ ہے بھی کہ نہیں۔

صُبح جب باغ میں رس لینے کو زنبور آئے
اس کے بوسوں سے ہوں مدہوش سمن اور گلاب
شبنمی گھاس پہ دو پیکر یخ بستہ ملیں
اور خدا ہے تو پشیماں ہوجائے! (ن۔م۔راشد: اتفاقات)(۱۹۸(

اور آخرکار وہ خدا کی موت کا اعلان کرتے ہیں کہ فرشتے اس کا جنازہ لیے جا رہے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو راشد خدا کے جنازے کی بات کرتے ہوئے خدا سے انکاری نہیں ہیں بل کہ وہ اہلِ مغرب پر خدا کی کرم نوازیوں کی بہ دولت وہاں اسے مانتے ہیں اور اسے مغرب کا خدا قرار دیتے ہیں۔

خُدا کا جنازہ لیے جارہے ہیں فرشتے
اُسی ساحرِ بے نشاں کا
جو مغرب کا آقا تھا مشرق کا آقا نہیں تھا! (ن۔م۔راشد: پہلی کرن)(۱۹۹(

راشد کے ہاں خدا کے انکار کی نفی کے لیے اور بھی بہت سے مقامات سے تشریح کی جاسکتی ہے۔ مثلاً درج ذیل مصرعوں پر غور کرنے سے واضح ہوگا کہ راشد خدا کی موت کو استعاراتی معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ کیوں کہ موت کے بعد بھی وہ خدا کو خود اپنے جنازے کے ہم راہ اپنے سورج کی چھتری تلے کھڑا محسوس کرتے ہیں اور ایک نئے انسان کے طلوع کا گیت گاتے ہیں۔ وہ نیا انسان جو تعقل کو راہ نما بنا کر اپنے آئندہ سفر پر روانہ ہوگا۔

روایت ‘ جنازہ
خدا ‘ اپنے سورج کی چھتری کے نیچے کھڑا
نالہ کرتا ہوا
جنازے کے ہم راہ‘ چلتے ہوئے
گھر کے بے کار لوگوں کا شورو شغب
ریاکار لوگوں کو شوروشغب کا سرور
نئے آدمی کا نزول
اور اس پر غضب کا سرور)ن۔م۔راشد: نیا آدمی)(۲۰۰(

وہ لوگوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ خدا کا ہونا نہ ہونا تو ان لوگوں کے لیے اہم ہے جو عقل کی راہ بری میں سفر کرنے کے عادی ہوں۔ اقوامِ مشرق تو حقیقت سے بہت دور کسی تصوراتی دنیا کی باسی دکھائی دیتی ہیں۔ ایسے میں انھیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ خدا ہے بھی کہ نہیں کیوں کہ خدا کو ڈھونڈنے والوں کو تو کائنات کی ہر شے میں میں اس کا پرتو دکھائی دینے لگتا ہے۔

تجھ کو کیا اس سے غرض ہے کہ خدا ہے کہ نہیں؟
دیکھ پتّوں میں لرزتی ہوئی کرنوں کا نفوذ
سرسراتی ہوئی بڑھتی ہے رگوں میں جیسے
اوّلیں بادہ گساری میں نئی تند شراب
تجھ کو کیا اس سے غرض ہے کہ خدا ہے کہ نہیں؟ (ن۔م۔راشد: اتفاقات)(۲۰۱)

صرف اسی فرد کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہوتا ہے جو حالات کے مطابق خود کو معقول ثابت کرسکے۔ اسی لیے راشد وقت (زمانہ) کو خدا قرار دیتے ہیں۔ ایسے میں وہ اُسے برا کہنے والوں کو بھی طعن و تشنیع کا شکار بناتے ہیں کہ اُسے برا مت کہو کہ اگر تم اُسے سمجھ نہیں پاتے تو یہ تمھاری غلطی ہے۔ وہ تو ہمیشہ سے اپنے ہی اصولوں کے مطابق دائم اور آباد ہے۔

''زمانہ خدا ہے' اِسے تم بُرا مت کہو''
مگر تم نہیں دیکھتے۔۔ زمانہ فقط ریسمانِ خیال
سُبک مایہ' نازک' طویل
جُدائی کی ارزاں سبیل!
وہ صبحیں جو لاکھوں برس پیش تر تھیں
وہ شامیں جو لاکھوں برس بعد ہوں گی
انھیں تم نہیں دیکھتے' دیکھ سکتے نہیں
کہ موجود ہیں' اب بھی' موجود ہیں وہ کہیں'
مگر یہ نگاہوں کے آگے جو رسّی تنی ہے
اسے دیکھ سکتے ہو اور دیکھتے ہو
کہ یہ وہ عدم ہے
جسے ہست ہونے میں مدّت لگے گی
ستاروں کے لمحے' ستاروں کا سال!

''لو دیکھو' کیسے اسی ایک رسّی کے دونوں کناروں
سے ہم تم بندھے ہیں!
یہ رسّی نہ ہو تو کہاں ہم میں تم میں
ہو پیدا یہ راہِ وصال؟''
مگر ہجر کے ان وسیلوں کو وہ دیکھ سکتا نہیں
جو سراسر ازل سے ابد تک تنے ہیں!
جہاں یہ زمانہ۔۔ ہنوزِ زمانہ
فقط اک گِرہ ہے! (ن۔م۔راشد: زمانہ خدا ہے)(۲۰۲)

راشد کے ہاں خدا کی تلاش کا سفر جاری رہتا ہے اور آخر کار وہ حقیقتِ ازلی کو پالیتے ہیں۔ اسی کی وضاحت کرتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں:

اور ایسے ساحل پر آلگا ہوں
جہاں خُدا کے نشانِ پا نے پناہ لی ہے
جہاں خُدا کی ضعیف آنکھیں

ابھی سلامت بچی ہوئی ہیں
یہی سماوی خرام میرا نصیب نکلا
یہی سماوی خرام جو میری آرزو تھا۔)ن۔م۔راشد: گماں کا ممکن۔ جو تو ہے میں ہوں)(۲۰۳(

نصیر احمد ناصر بھی خدا کی مقتدریت کے گن گاتے ہیں۔ وہ تمام کائناتی عناصر کو اس کا غلام مانتے ہیں اور اُس سے دعا کرتے ہیں کہ ہر شے تیرے ہی اختیار میں ہے تو ' تو اپنے اختیار سے ہی ہر شے میں گنگناہٹیں بھر کے اس کائنات اور ہماری معلوم دنیا کو خوشیوں' رنگوں اور امنگوں کا مسکن بنا دے۔

خداوندا!
میں اک لمحہ تری بے انت صدیوں کا
مری یہ عمر تیرے وقت کی کترن ہے
نیلا آسماں ازلوں سے تیری نیند کی تقدیس ہے
تو' رات کے دل میں
ستاروں کے ابد روشن کیے بیٹھا ہے
آوازیں تری خاموشیوں کی گنگناہٹ ہے
تو نغموں کا سمندر ہے
کراں سے تاکراں پھیلی اداسی کا مداوا ہے
مگر میری زمینوں کے مقدر میں
خلائوں کی اسیری ہے
انھیں آزاد کردے
کائناتی فاصلوں کی تیرگی میں روشنی بھردے
مجھے بے انت کردے)نصیر احمد ناصر: خلائوں کی اسیری میں دعا)(۲۰۴(

وہ بھی خدا کو کہیں دور اوپر بیٹھا محسوس کرتے ہیں۔ لیکن وہ کسی شے سے ان جان نہیں ہے۔ وقت بھی اس کی تخلیقات میں سے ایک ہے۔ گزرتے وقت کے ہر لمحے پر اس کی گرفت اور نظر ہے۔ وہ ابتدا سے بھی واقف ہے اور انتہا سے بھی۔ اس کی مرضی کے مطابق ہی یہ کارخانۂ قدرت چل رہا ہے۔

زینے والا
ازلوں کی چُپ سادھے
اپنے ابد کی بے اندازہ اونچائی سے
وقت کا ایک مدوّر لمحہ
ہر جانب لڑھکا کر
سیڑھی سیڑھی
دیکھ رہا ہے
پاتال کے پاپی کنویں میں
اس کی کھٹ کھٹ کرتی
صدیاں گونج رہی ہیں!! (نصیر احمد ناصر: زینے والا)(۲۰۵(

ایک اور مقام پر وہ خدا کو عرابچی (رتھ بان) قرار دیتے ہیں۔ اُس نے دنیا کا یہ کھیل سجایا‘ اس رتھ کو چلایا اور خود کہیں جا سویا۔ ان افکار میں بھی ہمیں راشد کے نظریات کی گونج سنائی دیتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا‘ جو ان گنت زمانوں کو محیط ہے۔ اس کا اقتدار ہر شے پر ہے۔وہ دنیا کو ایک چوبی گاڑی سے تشبیہہ دیتے ہیں جو بس چلے جارہی ہے۔ ان جانی منزلوں کی طرف اس کا سفر رواں ہے۔ وہ بہ ظاہر سویا ہوا ضرور ہے لیکن یہ گاڑی اُسی کی مرضی کے تابع اپنے سفر میں محو ہے۔

عرابچی سوگیا ہے
طولانی فاصلوں کی
تھکن سے مغلوب ہوگیا ہے
خبر نہیں ہے اُسے‘ کہاں ہے
بس ایک لمبے کٹے پھٹے
ناتراش رستے پہ چوبی گاڑی
ازل سے یونہی
ابد کی جانب رواں دواں ہے
ذرا سے جھٹکے سے
چرچراتی ہے جب
تو بوسیدگی کی لاکھوں تہوں میں لپٹا
ہر ایک ذی روح چونکتا ہے---
عرابچی خواب دیکھتا ہے
وہ شاہ زادی کا ہاتھ تھامے
سنہری رتھ میں سوار ہوکر
عجب جہانوں میں‘ شُبھ زمانوں میں
کھوگیا ہے
عرابچی سوگیا ہے---! (نصیر احمد ناصر: عرابچی سوگیا ہے)(۲۰۶(

نصیر احمد ناصر روشنی سے مخاطب ہوکر کائنات کی نیرنگیوں کی پردہ کشائی کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی تلاش انھیں تاریخ و تہذیب کے سفر پر اکساتی ہے۔ ہمارے اردگرد بکھری اشیا میں انھیں خدا کا پرتو دکھائی دیتا ہے اور وہ اُسے ان میں قیدی کی صورت دیکھتے ہیں مگر آزادی کی تاریخ سے ان جان ہیں۔وہ زمین کو مٹی میں گوندھے ہوئے آنسو سے تعبیر کرتے ہیں جو وقت کی مٹھی کی قید میں ہے۔ وقت سے باہر جو بھی ہے وہ ’’لا‘‘ ہے۔ جس کا ادراک انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ اُس کی حقیقت صرف ر ب ہی جان سکتا ہے۔ اس نظم کے اختتام پر صوفیانہ نظریات کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے کہ وجود ہی راستے کی دیوار ہے۔ رب نے خود کو خود ہی مستور رکھا ہے اور جب وجود کا یہ پردہ ہٹے گا تو پھر رب بھی آزاد ہوگا اور اپنے آپ کو آشکار کردے گا۔ اس کی جلالت و عظمت کے سامنے کائنات کی ہر شے دھول مٹی کی صورت نظر آئے گی۔

اداسی مجھے لکھ رہی ہے
خطوں میں‘ کتابوں میں
ٹیبل پہ بکھرے ہوئے کاغذوں میں---

خدا قید مینہے
تمھیں یاد ہے کچھ
رہائی کی تاریخ کیا ہے؟
زمیں ایک آنسو ہے' مٹّی میں گوندھا ہوا
وقت کی بند مٹھی میں کچھ بھی نہیں
فقط جسم کی خاک ہے'
نارسائی کا دکھ ہے'
اداسی ہے' ''لا'' ہے
کسی دن اسے کھول کر دیکھنا
بھُربھُری ریت سارے خلا پاٹ دے گی
خدا خود سے آزاد ہوگا (نصیر احمد ناصر: روشنی' تمھارے لیے ایک اداس نظم!)(۲۰۷)

خدا ازل سے ابد تک قائم ہے۔ وہ احساسات کی صورت ہمارے اندر پنپتا ہے۔ خدا قرآن میں خود فرماتا ہے کہ میں انسان سے اُس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں۔ نصیر احمد ناصر خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو بیٹیوں کے ساتھ تعلق سے واضح کرتے ہیں جو دور رہ کر پاس اور پاس رہ ر بھی دور رہتی ہیں۔

خدا جو ازل سے ابد تک
زمانوں' جہانوں کی سنجیدگی اور پاکیزگی کا
بہت خوب صورت سا احساس ہے
بیٹیوں کے دکھوں اور خوشیوں کا ہم راز ہے
بیٹیوں کے محبت بھرے دل کا انداز ہے
بیٹیوں کی طرح دور ہے' پاس ہے!! (نصیر احمد ناصر: سُندُس)(۲۰۸)

ان کے ہاں ہمیں ہندو اساطیر کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ وہ خدا کو برہما کے روپ میں بھی دیکھتے ہیں اور یہ سوچتے نظر آتے ہیں کہ شاید ہم بھی برہما کے خواب کی بیداری کے زمانے میں زندہ ہیں اور اس دوران میں پرم آتما (برہما) نئی تخلیق کا خواب دیکھ رہی ہے۔

کیا خبر ہم کسی عظیم خواب کی بیداری میں ہوں
اور کوئی ہمیں کائناتی آنکھ سے دیکھ رہا ہو
پر م آتما کو خواب دیکھتے ہوئے ڈسٹرب مت کرو!!
(نصیر احمد ناصر: خواب اور محبت کی کوئی عمر نہیں ہوتی)(۲۰۹)

ان اساطیری پہلوئوں میں ہی ایک پہلو اوتار سے متعلق ہے۔ ہندو فلسفہ میں وشنو کے اوتاروں پر سیر حاصل مباحث موجود ہیں جن کا مختصر ذکر باب اوّل میں کیا جا چکا ہے۔ وحدت الوجودی صوفیا کے ہاں بھی ایسے عناصر کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ نصیر احمد ناصر بھی ان کے ہم آواز ہی دکھائی دیتے ہیں جب وہ کہتے ہیں کہ
عدالت کو کیا معلوم
کہ خدا دکھی لوگوں کی گواہی دینے کے لیے

کبھی کبھی خود کٹہرے میں آجاتا ہے!   (نصیر احمد ناصر: عدالت کو کیا معلوم!)(۲۱۰(

شہزاد احمد کا شمار جدید اردو نظم کے ان نام ور شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے تفکرِ کائنات کو اپنی سوچ کا مرکز بنایا۔ ان کے ہاں بھی خدا کا ایک واضح تصور ابھرتا ہے۔ وہ اُسے خالق‘ مالک اور رب کی صورت دیکھتے ہیں اگرچہ ان کی نظم ’’اُس گماں کی طرف‘‘ میں خدا کی ذات پر تشکیک ہی دکھائی دیتی ہے لیکن ذرا غور کریں تو اس سے آگے بیان کردہ مظاہر خود ہی اُس کے ہونے کی دلیل دے دیتے ہیں۔

مجھے لے چلو اس گماں کی طرف
جس کا ہونا نہ ہونا بھی ثابت نہیں!
کس نے لکڑی کے تختے پہ ابجد لکھی؟
کس نے سیدھی لکیروں کو الٹا کیا؟
کس نے سوچا کہ کیا ہونے والا ہے
کیا ہورہا ہے   )شہزاد احمد:اُس گماں کی طرف)(۲۱۱(

شہزاد احمد خدا کے ہونے کے قائل تو ہیں مگر اُس کی غنی ہونے کی صفت پر بھی بہت یقین رکھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک مخلوق کو تو فرق پڑتا ہے اس بات سے کہ وہ خدا کو مانے یا نہ مانے لیکن خدا اس احساس سے ماورا ہے۔ اُسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اس کو یہ پروا بھی نہیں ہے
کوئی اس کو دیکھ رہا ہے!
یا اس کے ہونے ہی سے غافل ہے   )شہزاد احمد:اڑتا بادل)(۲۱۲(

ُبن دیے کس نے یہ تا رو پود
کس کے ہاتھ میں آیا نظامِ کائنات
کس کے ذرے بن گئے دنیا ستارے آفتاب
کس نے آوارہ خیالی کو پلائی فکرِ شیریں کی شراب
کس نے یہ سب کچھ بنایا؟
اور خود تاریک پردوں میں کہیں بیٹھا رہا
کیا یہ سب پھیلاؤ میرے واسطے ہیں
یا میں خود ، اس کی پرانی روح میں بیٹھا ہوا
گن رہا ہوں اس کے اشکوں کی قطار
پونچھتا ہوں اس کے آنسو، مانگتا ہوں اس سے بھیک   )شہزاد احمد:زہریلی تخلیق)(۲۱۳(

پھر شیطان کا تصور ابتدا سے ہی خدا کے ساتھ موجود رہا ہے۔ خیرو شر کی انھی قوتوں نے اہرمن و یزداں کی صورت بیان پایا۔ خدا کیا ہے؟ خدا مقتدریت کا نام ہے۔ جسے وہ مقتدریت حاصل ہوجائے وہی خدا ہے۔ شہزاد احمد خود پر غور کرتے ہیں تو انھیں اپنے اندر بھی خیرو شر کی آویزش سے پالا پڑتا ہے۔

خدا بننا کہاں سے میں نے سیکھا
تربیت حاصل کہاں سے کی

خدا میں کیسے بنتا؟
دل میں اک شیطان رہتا تھا
’’مٹادے اپنی ہستی کو
مٹادے پوری بستی کو‘‘ (شہزاد احمد)(۲۱۴(

خدا نے انسان کو اپنی پہچان کے لیے تخلیق کیا۔ وہ اُس وقت بھی موجود تھا جب کچھ نہ تھا۔ وہ تب بھی موجود ہوگا جب کچھ نہ ہوگا۔ صوفیا کے ہاں اسی دیدار کی کسک انھیں ہر لمحہ پابۂ زنجیر رکھتی ہے۔ وہ دل اور انسان کو ایسے آئینے کی صورت میں دیکھتے ہیں جس کی پاکیزگی میں حقیقتِ ازلی کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ اسی صوفیانہ رنگ کا اظہار کرتے ہوئے شہزاد احمد آئینہ در آئینہ تخلیق کی وضاحت کرتے ہیں کہ خدا نے اپنی پہچان کے لیے‘ خود کو دیکھنے کے لیے آئینہ (انسان) بنایا اور پھر آئینے بنتے چلے گئے۔ اور یہی آئینے اس حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

تیری آنکھیں ہینکہ تکوین کا پہلا لمحہ
جس کے پہلے کوئی موجود نہ تھا
اُس کے سوا
اور وہ خود بھی نہیں جانتا تھا
اس کو کیا کرنا ہے
کب کرنا ہے----!
پھر اچانک تری آنکھوں میں یہ خواہش جاگی
انھیں کچھ دیکھنا ہے
---- اور پھر آئینہ ایجاد ہوا
اس کے بعد آئینے ہی آئینے
ہر طرف پھیل گئے
میں بھی آئینہ ہوں
اور دیکھ رہا ہوں تجھ کو
تجھے پایا ہے
مگر ڈھونڈ رہا ہوں تجھ کو
تو کہیں ہے کہ نہیں
پوچھ رہا ہوں تجھ کو! (شہزاد احمد:تو کہیں ہے‘ کہ نہیں)(۲۱۵(

شہزاد احمد دنیا کو اختتام کی طرف مائل دیکھتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق خدا نے لفظ کُن (ہوجا) کہا تو فیکون (ہوگیا)۔ تمام سامی مذاہب میں بنیادی طور پر تخلیق کا یہی نظریہ کارفرما دکھائی دیتا ہے کہ تخلیق اُس خدا کی چاہت کی بہ دولت ہوئی ہے۔ شاعر پھر سے وہی کُن کی صدا سُننا چاہتا ہے کیوں کہ اُسے کائنات زوال آمادہ دکھائی دیتی ہے۔

اے خدا پھر سے کُن پکار کبھی
یہ جہاں ٹوٹنے ہی والا ہے
بنتی جاتی ہے یہ فضا ناسور
آسمان پھوٹنے ہی والا ہے
رُک گئے قافلے ستاروں کے

اور سورج بھی خاک اڑانے لگا
جو تری اک صدا پہ ابھرا تھا
وہ زمانہ تو اب ٹھکانے لگا)شہزاد احمد:اے خدا پھر سے کُن پکار کبھی)(۲۱۶(

اگر لفظ ''کُن'' کے بعد تخلیق کا عمل ازسرِ نو شروع ہوجائے تو پھر شہزاد احمد کی نگاہ اس منظر کی طرف لوٹنے لگتی ہے کہ آخر پہلی تخلیق ' پہلا ذرّہ کیا ہوگا؟ کیا وہی ذرّہ ہوگا کہ جو اس سے پہلے بھی تخلیق میں فوقیت کا حامل رہا ہے۔ اُسے کیسے اور کس نام سے پکارا جائے گا۔

مگر میں سوچتا ہوں
پہلا ذرّہ کون گا؟
اور کہاں سے آگیا تھا؟
اس سے پہلے جو کچھ تھا
ہم اُسے کیا نام دیں
''کیسے پکاریں!'' (شہزاد احمد:لیکن)(۲۱۷(

خالق و مخلوق کے رشتے اپنی جگہ اہم سہی لیکن خالق خود کیسا ہے۔ جب شہزاد احمد اس پر غور کرتے ہیں تو وہ خدا کو واحد (اک اکائی) کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ وہ جسم سے آزاد ہے مگر اُس کی طاقت' اُس کی معدومیت اتنی شدید ہے کہ وہ کسی بھی شے کو فراریت کا راستا نہیں دیتی اور ہر شے اُسی کی مرضی کے قید خانے کا حصّہ بن جاتی ہے۔

مگر وہ اک اکائی
جس کا چہرہ ہے نہ آنکھیں ہیں
نہ اس کے دست و بازو ہیں
تمھیں ہلنے نہیں دیتی
وہاں تو تم کو بھی
معدومیت چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے)شہزاد احمد:کیا کرینہم)(۲۱۸(

شہزاد احمد ایک صوفی کی طرح خود کے راستے اپنے اندر خدا کی تلاش میں ہیں۔

مگر مجھے تو یہ لگتا ہے
کہ میں اس کائنات میں ہی کہیں موجود تھا
اور یہ کائنات میرے اندر چپک کر رہ گئی تھی
مگر یہ واقعہ ہو اکیسے؟
جیسے ذرّے کے ساتھ بہت سی جہتیں چمٹی ہوئی ہیں
ممکن ہے یہ کائنات میری کوئی خاص جہت ہو
یہ کائنات جو لامحدود ہے لامتناہی ہے اور میں
وقت کا قیدی ہونے کے باوجود
ایک ایسے پرندے کی طرح آزاد ہوں جسے اڑنے کے لیے
نہ پروں کی ضرورت ہے نہ ہوا کی!! (شہزاد احمد)(۲۱۹(

جب اس سے آگے بڑھتے ہیں تو شہزاد احمد انسان اور کائنات کے تعلق کو تاش کے پتوں کے کھیل سے ظاہر کرتے ہیں۔تاش کے باون پتوں کے علاوہ اس میں دوجوکر بھی ہوتے ہیں۔ جوکر دراصل فالتو پتے ہیں جن کا کھیل میں کوئی کردار نہیں لیکن اگر کوئی پتا

کھوجائے تو اس کی جگہ انہیں استعمال کیا جا سکتا ہے۔گویا جوکر تاش کا کم زور ترین پتا بھی بن سکتا ہے اور طاقت ور ترین پتا بھی۔ شہزاد احمد خدائی بھیدوں کی تلاش کے سفر میں اُسے جوکر سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ جو ہو کے بھی اہم نہیں اور نہ ہوکے بھی اہم ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس وقت زیادہ ہوتا ہے جب کھیل کے باون پتوں میں سے کوئی ایک بھی کھو جائے۔ وہ خدا کو ایسے عنصر کی صورت سمجھتے ہیں جو اس کائناتی کھیل میں شریک تو نہیں ہے مگر اس سے علاحدہ بھی نہیں ہے۔ اُس کا تعلق بھی عجیب نوعیت کا حامل ہے۔ صوفیا کے ہاں بھی خدائی حوالے سے ایسے ہی نظریات دیکھنے کو ملتے ہیں۔

کیا کوئی جوکر بھی ہے؟
ماورائے آسماں جاتی ہوئی پہنائی میں
کہکشاں کی انجمن میں' ذات کی تنہائی میں
دور ہوتی وسعتوں تک' بحر کی گہرائی میں
جنتوں کی رونقوں میں' خاک کی رسوائی میں
پھوٹتے آتش فشاں میں' پھول کی زیبائی میں
روح کے جذبِ دروں تک' عقل کی دانائی میں
وہ سماعت میں جھلکتا ہے' کبھی بینائی میں
سوچتا ہوں میں وہ جوکر کون ہے؟
جو کسی بھی تاش کے پتوں میں ہے
ہر جگہ موجود ' ہر قریے میں ہے
گردشِ دوراں میں ہر لحظے میں ہے
روپ اس کا کچھ بھی ہو
لیکن ہر اک بہروپ میں رہتا ہوں وہ
یعنی ہر منظر میں
پس منظر میں
ہر پردے میں ہے
وہ اصولوں کا اصول
زندگی نقشِ قدم' پیروں کی دھول
وہ کبھی پتّا' کبھی کانٹا' کبھی بے رنگ پھول
وہ گلستاں کی مہک' وہ ریگ زاروں کا ببول
اس کی خاطر سارے امکاں ہیں ملول
اس کو نا منظور سب کچھ ہے
اور وہ سب کو قبول
وہ سبھی کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں
شکل بھی بے شکل اس کی
اور وہی سب سے حسیں
کس قدر دل کش ہے' کتنا دل نشیں
اس قدر میٹھا کہ گویا انگبیں
کیابتائوں میں گماں ہے یقیں

کھیل پتوں میں شامل
تاش میں شامل نہیں!   (شہزاد احمد:جوکر)(۲۲۰)

وجودِ انسانی پر بحث کرتے ہوئے جاوید انور اسے ریتلا بدن اور اس کی رگوں میں دوڑتے لہو کو ایندھن قرار دیتے ہیں۔ موت (برف کی تہہ) میں زندگی (سورجوں کا گریہ) دیکھتے ہیں۔ گویا موت سے حیات کی پیام بری کا ادراک رکھتے ہیں۔لیکن جو نیا پن سامنے آتا ہے وہ سورج کے حوالے سے ہے کہ سورج روشنی ہی نہیں بل کہ تاریکی بھی پھیلاتا ہے۔ اس سے تاریکی کی شعاعیں بھی نکل رہی ہیں۔ گویا وہ آئن سٹائن کی اس بات کو بیان کر رہے ہیں کہ اندھیرا بہ ذاتِ خود کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ جس طرح زندگی کا نہ ہونا موت اور حرارت کا نہ ہونا ٹھنڈک ہے بالکل اسی طرح روشنی کا نہ ہونا ہی اندھیرا ہے۔

اس ریتلے بدن کی
جھلسی ہوئی رگوں میں
ہے تیل کا تماشہ
اور برف کی تہوں میں
ہے سورجوں کا گریہ
یا پانیوں کی دہشت
یا خشک سالیاں ہیں
مہتاب سے ٹپکتا
تاریکیوں کا لاوا
رخسار داغتا ہے
اس صُبح کا ستارا   )جاوید انور: اشکوں میں دھنک)(۲۲۱)

اسی طرح اختر حسین جعفری اپنے آپ کو اس وسیع و عمیق کائنات میں اجنبی محسوس نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک یہ تمام اجرام ان کے لیے راہ نما کا کردار ادا کرتے ہیں۔ ان اجرام کی حرکت پر دست رس نے انسان کو اس قابل بنا دیا ہے کہ اس کے جسم کی دیوار کی اینٹیں باہر ابل پڑی ہیں اور دیوار سے باہر کی دنیا کوبھی دیکھ پارہی ہیں ۔ گویا انسان نے اپنے باطن کی اوٹ کو پالیا ہے اور وہ اپنے حال کے مدار سے نکل کر مستقبل کے مدار میں بھی جھانک سکتے ہیں جو انھیں اپنی طرف بلا رہا ہے۔

یہ آشنا صبح کا ستارا
کہ جس کی آگاہیوں کا ناسور‘ میرے سینے میں جل رہا ہے
میں اس ستارے کی سمت روبرو قضا کھڑا ہوں
میں اپنے باطن کی اوٹ میں ہوں
یہ خشتِ ساعت کہ جس کی بالیں سے جسم آدھا نکل کے مجھ کو
بلا رہا ہے   )اختر حسین جعفری: ایک خط ۔ آشنا ورثوں کے نام)(۲۲۲)

اختر حسین جعفری خدا سے مخاطب ہوتے ہیں اور سب سے پہلے اپنے مسکن کی وضاحت کرتے ہیں کہ میں ایک ستارے کا اسیر ہوں اور وہ ستارا تمھارے وجود کی روشنی سے ہی درخشندہ ہے۔ رات (موت) دن (زندگی) کی دشمن ہے مگر اس سے بچنے کے لیے نہ تو کسی مورچے کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی خندق کی کیوں کہ وہ زندگی کی لہروں کو

صرف وجود کے اندر نہیں بل کہ باہر بھی محسوس کرتے ہیں۔ انھیں تمام کائناتی اجسام میں اپنی زندگی کی لہک دکھائی پڑتی ہے۔

اک ستارے میں ہے مکاں میرا
اس مکاں میں تمھارے نام کی ضو
رات دشمن سہی مری، پھر بھی
مورچہ کوئی میری چھت پہ نہیں
میں نہیں خندقوں میں پوشیدہ
میں برونِ وجود زندہ ہوں)اختر حسین جعفری: اک ستارے میں ہے مکاں میرا)(۲۲۳(

وقت اور خدا کے ساتھ کائنات کو سمجھنے کا ایک بنیادی پہلو اس کائنات میں انسان کا مقام ہے۔ تمام مذاہب اور علوم اس بات پر متفق ہیں کہ ہماری موجودہ معلومات تک انسان اس کائنات کی سب سے باشعور ہستی کی صورت سمجھا جاسکتا ہے۔ صوفیا کے ہاں تو رب تک رسائی کے لیے اپنے آپ تک رسائی کا راستا بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ سائنس دانوں نے بھی انسان کو سمجھنے کی کوشش کی اور فلسفہ نے بھی۔ مگر انسان کی حقیقت تک رسائی کا ہر کسی کا انداز مختلف رہا۔ انسان، جسے کائناتِ اصغر کہا جاتا ہے، کائنات یعنی کائناتِ اکبر کے اسرار کھول رہا ہے ، مگر مقامِ حیرت ہے کہ کائناتِ اصغر کے مقام کا تعین ابھی تک کسی حتمی صورت میں نہ ہو پایا ہے۔ کائنات پر انسان کی اسی دست رس کو بیان کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں:

کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر
لگا کے آئنۂ عقلِ دور بیں میں نے
کیا اسیر شعاعوں کو برقِ مضطر کو
بنادی غیرتِ جنت یہ سرزمیں میں نے
مگر خبر نہ ملی آہ! رازِ ہستی کی
کیا خرد سے جہاں کو تہِ نگیں میں نے
ہوئی جو چشمِ مظاہر پرست وا آخر
تو پایہ خانۂ دِل میں اسے مکیں میں نے)اقبال: سرگزشتِ آدم)(۲۲۴(

اقبالؔ کو کائنات کی یہ ہنگامہ آرائی بھی انسان کے ہی دم قدم سے دکھائی دیتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انسان اس کائناتی کھیل کے مرکزی کرداروں میں شامل ہے جب کہ باقی اشیا تو محض تماشائی ہیں جو اس کی ہر کام یابی پر زیادہ سے زیادہ تالیاں ہی پیٹ سکتے ہیں مگر اس قابل نہیں ہیں کہ کھیل کے اس میدان میں اتر کر اس کا مقابلہ کرسکیں۔ صوفیا کے ہاں بھی ایسے ہی افکار دکھائی دیتے ہیں کہ وہ نیابتِ الٰہی اور انسان اور خدا کے درمیان محبت کے رشتے پر یقین رکھتی ہیں اور اس کی استواری کے لیے وفا کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔

ہے گرمیِ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم
سورج بھی تماشائی، تارے بھی تماشائی! (اقبال: لالۂ صحرائی)(۲۲۵(

ڈاکٹر جواز جعفری کے ہاں تمام کائناتی تناظرات پر سیر حاصل بحث ملتی ہے۔ جہاں وہ وقت ، خدا، کائنات اور دیگر جان دار مخلوقات کے ساتھ اپنے تعلقات کی حقیقت کو جاننا چاہتے ہیں وہیں بہ حیثیت ایک انسان کے وہ غیر جان دار اشیا کے ساتھ بھی اپنے تعلق کی وضاحت

کرتے ہیں۔ کیوں کہ کائنات تو ان تمام اشیا کا ہی مجموعہ ہے۔ یہاں یہ وضاحت بھی کر دی جائے کہ بے جان اشیا میں بھی توانائی موجود ہوتی ہے اور اسی توانائی کی بہ دولت بعض سائنس دان اب انھیں بھی جان دار ہی قرار دیتے ہیں لیکن وہ ان کی عام جان داروں سے مختلف سطح کے قائل ضرور ہیں۔ ڈاکٹر جواز جعفری کے ہاں بھی اس پوشیدہ تعلق کو جان لینے کی کسک شدید ہے۔ ان کے ہاں صرف تعلق کو جان لینا ہی کافی نہیں ہے بل کہ اس تعلق کی بنیاد پر ہی وہ اپنی محبت کا نذرانہ پیش کرنے کو بھی تیار ہیں۔ وہ اپنے اور دیگر اجسام و اجرام کے درمیان پائے جانے والی قوتِ کشش کا بھی ادراک رکھتے ہیں لیکن اس کشش کی نوعیت و ماہیت ان کے راستے کا ایک پتھر ہے جو انھیں اطمینان اور سکون کی منزل تک پہنچنے نہیں دیتا۔ وہ اس کشش کے سرور میں رہتے ہوئے بھی بے گانگی محسوس کرتے ہیں اسی لیے اس مدار سے نکل کر اپنی مرضی کے سورج کے گرد مکمل وارفتگی کے ساتھ گھومنا چاہتے ہیں کہ یہی عظمتِ انسانی کا ما حصل ہے۔

کائنات اور میرے بیچ
زمین اور چاند جیسا رشتہ ہے
)بظاہر غیر جسمانی(
لیکن اس قُرب آمیز دوری
اور راکھ کردینے والی بے تعلقی کے باوجود
تیرے اندر
ایسی کون سی قُوّت ہے؟
جو اتنے فاصلے سے
مجھ پر اثر انداز ہوتی ہے!
زمین زاد!
میں اپنے قدموں کے نیچے بچھے
تیرے راستوں سے نکل کر
کائنات کی تعمیر سے بچ جانے والے
ملبے کی طرح
سورج کے مضافات میں
)تیری رونقوں اور اپنی ویرانیوں سے دور(
آوارہ ستاروں کے کسی غول کے ہمراہ
بھٹکتے بھٹکتے
ڈھیر ہوجانا چاہتا ہوں!
مگر میرے پائوں سے
تیرے ہاتھ تک
کوئی اَن دیکھی زنجیر ہے
جو مجھے تیرے مدار سے باندھے رکھتی ہے!
میں تیری کشش سے
چھوٹ جانے کی تمنا میں
کولہو کے بیل کی طرح

تیرے گرد چکر کاٹ رہا ہوں! (جواز جعفری: زمین اور چاند جیسا رشتہ)(۲۲۶(

عابد ودود اپنی نظم''پروردگار'' میں انسانی کم مائیگی پر نوحہ کناں دکھائی دیتے ہیں۔ وہ انسان کے موجودہ معیار سے غیر مطمئن دکھائی دیتے ہیں اسی لیے وہ اس کائنات پر انسان کے غیر مشروط تسلط کا عندیہ دیتے ہیں اور خود ہی موسموں کے خدا ہوکر خدائی عوامل میں اثر اندازی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

میں کیا ہوں اور کہاں ہوں
لیکن یہ سوچتا ہوں
کہ ہم تمام انساں
کیا یونہی بے کلی کے سائے میں خوار ہوں گے
یاہم بھی عزم لے کر
نکلیں گے راستوں پر
آئے گا اپنا موسم..........
موسم کے صرف ہم ہی پروردگار ہوں گے)عابد ودود: پروردگار)(۲۲۷(

انسان کی اس بے توقیری اور کائنات میں اس کے مقام کی وضاحت میں اس کی مجبوری سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اسی مجبوری کا ماتم شاہین مفتی بھی درج ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

یہ ہم کون ہیں؟
وقت کی شاہراہوں پہ ننگے قدم
تیز تر دھوپ میں
بے ردا ' بے اماں)شاہین مفتی: یہ ہم کون ہیں)(۲۲۸(

انسان اس کائنات میں ظہور پذیر ہونے کے بعد کائنات کے اسراروں کو کھولنے کا تمنائی ہے۔ انسان اور خدا کے کردار کے درمیان تعلق کی صراحت کرتے ہوئے شاہین مفتی کہتے ہیں کہ مانا کہ خدا تک ہماری رسائی نہیں۔ ہم اس کی کوششوں میں ہیں لیکن وہ خدا کیسا ہے جو آسمانوں پر رہ کر بھی ہم سے ہماری حقیقت نہیں پوچھتا۔ گویا یہ بھی ایک نیا سوال ہے کہ وہ واقعی ہمیں جانتا ہے اس لیے نہیں پوچھتا یا وہ ہمیں اس قابل ہی نہیں سمجھتا کہ ہم سے پوچھا جائے۔

آسمانوں کی کھڑکی
کھلی ہے مگر
خالقِ شش جہت
مالک بحروبر
دیکھ سکتا نہیں
پوچھ سکتا نہیں
یہ ہم کون ہیں؟)شاہین مفتی: یہ ہم کون ہیں)(۲۲۹(

عبدالرشید انسان کو اپنی تلاش کے سفر میں گم دیکھتے ہیں کہ اس سفر کے بعد ہی کوئی اور سفر شروع ہوگا۔ انسان پہلے اپنے حقیقی مقام کو جان لے تو ہی باقی ہر شے کی

حقیقت جان سکتا ہے کہ وہ تو فی الحال خود کو بھی نہیں سمجھ پایا تو اور کسی چیز کی تلاش تو بعد کا مرحلہ ہے۔

وہ سارے پیرہن پتوں کے تھے' ہلکی ہوا سے اڑ گئے
اب ماس کی گُتھلی میں بالوں کے برابر ہڈیاں پوشاک ہیں' اوڑھیں نچوڑیں کیا
کہ جاں تو حرزِ جاں ہے' سانس کے بازو پہ استر کی طرح لپٹی ہے
بجھتا کوئلہ ہے راکھ کا مدفن جسے آغوش ہے
جو اپنے ہی دہن کے شور میں گم ہے وہ کیا دیکھے (عبدالرشید: کیا ہے کچھ پتا چلتا نہیں)(۲۳۰)

نصیر احمد ناصر کے ہاں بھی مقامِ انسان پر بارہا اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ ان کے درج ذیل اشعار میں انسان کے حوالے سے صوفیانہ اور اساطیری نظریات کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ وہ برہما کے خواب کی طرح بارہا وجود پانے اور صوفیا کے نظریہ کہ آدم ایک نہیں تھا بل کہ کئی آدم کے حامی دکھائی دیتے ہیں۔

میں ان کھیتوں میں بارہا بویا اور کاٹا گیا ہوں
میں دھرتی کا بیج ہوں
یا کائنات کا دل (نصیر احمد ناصر: رات زندگی سے قدیم ہے)(۲۳۱)

لیکن انسان محض کائناتی تکوین کا ایک بے مایہ پہلو نہیں ہے۔ وہ کائنات کو خدا کی آنکھ سے ٹپکا آنسو قرار دیتے ہیں اور اس کا ہاتھ تھام کر خدا کے سامنے اپنے اور اس کے مقام کو بیان کرنے کے خواہاں بھی دکھائی دیتے ہیں۔

کائنات بھی ایک آنسو ہے
خدا کی آنکھ سے ٹپکا ہوا
مجھے اجازت دو
میں تمھارا ہاتھ تھامے ہوئے
پل سراط سے گزرنا چاہتا ہوں
مرنے سے پہلے مرکر
خدا کے سامنے سرخ رو ہونا چاہتا ہوں (نصیر احمد ناصر: تاریخ کا جنما تنتر)(۳۳۲)

نصیر احمد ناصر کے نزدیک کائنات کے اسرار کو سمجھنے کے لیے انسان کے اپنے مقام کو سمجھنا بھی لازم ہے۔ اس کے بعد ہی وہ اس قابل ہوپائے گا کہ خدا کی خدائی میں حقیقی مقام کی وضاحت و صراحت کرسکے۔ اس بازیابی کے لیے وہ تاریخ کے دھارے پر نظر ڈالتے ہیں اور ان کے ذہن میں کئی سوالات جنم لیتے ہیں۔ انسان کے مقام کو سمجھنے کے لیے ان کی نظم ''ہم نے کب تجھ کو یاد کیا!'' کے سوالات غور طلب ہیں۔

کب مٹی کے زخم بھرے
کب دکھ کی تجسیم ہوئی
کب آنکھوں کی عریانی کو
جسموں کا ملبوس ملا
کب آئینہ خانوں میں

عکس بٹے، تقسیم ہوئی
کب ایک چھناکے سے
لمحے کا دل ٹوٹا،
صدیوں کی زنجیر بنی
کب روشنیوں کے پھول کھلے،
رنگوں سے تصویر بنی
کب قرنوں کی خاموشی کو
آوازوں کا اذن ملا
لفظ بنے، تفہیم ہوئی
کب سانسوں کی مدھم لے پر
تلواروں کا رقص ہوا،
نیزوں پہ سر گھوم گئے،
رسمِ وفا تبدیل ہوئی
کب یہ دسترخوان سجے
زیتون، پنیر اور نان سجے
کب نیند کے میدانوں میں
خوابوں کا اک شہر بسا
کب قدموں کی چاپ اُبھری،
دل کا دروازہ کھُلا
کب یادوں کے لشکر گزرے
عمریں پامال ہوئیں
کب تاریخ کا پہیہ گھوما،
نسلیں بے حال ہوئیں
اپنے اپنے حال کے قیدی
ہم اک جال کے قیدی
ہم کیا جانیں تو نے کیسا
گھیر گھمایا، چکر باندھا ،
کون ابد آباد کیا
ہم نے کب تجھ کو یاد کیا!
کب ہم نے تجھ کو یاد کیا!! (نصیر احمد ناصر: ہم نے کب تجھ کو یاد کیا!)(۲۳۳(

مبارک احمد بھی دیگر شعرا کی طرح ان سوالات کی زد پر ہیں۔ وہ انسان کے ذہنی سفر کے تمام تر ارتقا کے باوجود اسے ایک بونا سمجھتے ہیں جو اپنے ہاتھوں میں ایک مختصر سا پیمانہ لیے کائنات کی بے انت گہرائیوں کو ماپنے کا عزم لیے ہوئے ہے مگر وہ نہیں جانتا کہ یہ اس کے اختیار سے باہر ہے۔ اسی کی وضاحت وہ درج ذیل الفاظ میں کرتے ہیں۔

مجھے تم پہ ترس آتا ہے
کیا تم حال کی گھڑی میں ماضی کی جکڑ بندیوں سے
چھٹکارا پانے کی اہلیت رکھتے ہو

تم جو ہر لمحہ پھیلتی فضا کی وسعتوں کو ناپنے کے لیے
اپنے بونے ہاتھوں میں فُٹ پکڑے ہوئے ہو
تم جو لامحدود امکانات کا وزن کرنے کے لیے
تکڑی اور باٹ اٹھائے پھرتے ہو
اور نہیں جانتے کہ وقت نے پیمانوں کو اور اقدار کو بدل دیا ہے
)مبارک احمد(MANIFESTATION) :۲۳۴(

شہزاد احمد جب کائنات کے انسانی پہلو پر غور کرتے ہیں تو انسان کو پابندِ تقدیر اور مجبور پاتے ہیں۔ انسان تقدیر کے ساتھ ساتھ اس مٹی کا بھی قیدی ہے اور اس قید نے انسان سے اس کی حقیقی پہچان چھین لی ہے۔ گویا ہمیں اپنی پہچان کے لیے اس قید سے چھٹکارا پانا ہوگا۔

ہم روزِ ازل سے پابہ گِل ہیں
تھک ہارچکے ہیں مضمحل ہیں
پہچان اپنی کھوچکے ہیں
ہم کتنے عجیب ہوچکے ہیں)شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ)(۲۳۵(

جدید طبیعیات کے مطابق کائنات کی ابتدا ایک بے انتہا چھوٹے اور کثیف ذرّے سے ہوئی، جس کے پھیلائو نے کائنات کی تمام اشیا کو جنم دیا۔ شہزاد احمد بہ حیثیت ایک انسان ہونے کے خود کو وہی ذرّہ قرار دیتے ہیں جس کا پھیلائو یہ کائنات اور اس کی ہمہ گیری ہے۔

میں اک سیلاب کی صورت
کئی سمتوں میں بڑھتا جارہا ہوں
کبھی میں روشنی بن کر زمین پر پھیلتا ہوں
کبھی میں گرد کی صورت، فلک کو ڈھانپ لیتا ہوں
یہاں پر جس قدر بھی روپ ہیں
میرے ہی سب بہروپ ہیں
مرے چہرے ہیں لاکھوں
اور کروڑوں میری آنکھیں ہیں)شہزاد احمد: میں ذرّہ ہوں)(۲۳۶(

کیوں کہ وہ خود کو بنیادی ذرّہ سمجھتے ہیں لہٰذا انھیں ہر شے کے ساتھ اپنا رشتہ نظر آتا ہے۔ یہ رشتہ بھی عجیب قربت اور دوری کا آہنگ ہے کہ پاس رہ کر بھی نہیں ہے اور نہ ہوکر بھی ہر شے اپنے وجود اور تعلق کی غمازی کرتی ہے۔

میں کہیں بھی نہیں ہوں
مگر ہر جگہ مجھ کو ہونے کا احساس ہے
میں کسی کی طلب میں نہیں
اور نہ کوئی مرے پاس ہے)شہزاد احمد: میں کہاں ہوں)(۲۳۷(

اس کے ساتھ ہی شہزاد احمد اس بات پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ انسان کی تخلیق بامقصد ہے۔ وہ اک وعدے کے ساتھ اس کائنات میں مبعوث ہوا اور انسان کا بنیادی فریضہ اُسی وعدے کی تکمیل ہے۔

مگر تم تو اس خاک پر
ایک وعدہ نبھانے کو آئے تھے

تم نے کہا تھا
مجھے کوئی پروا نہیںہے
کہ خلقت مجھے کیا سمجھتی ہے!
میں تو وہی کچھ کہوں گا... جو میں جانتا ہوں
مگر تم نے جو کچھ کہا ' تم وہ کہنا نہیں چاہتے)شہزاد احمد: وقت کی کیا کمی ہے)(۲۳۸(

انسان کائنات کی ذی شعور ہستی اور زمین اس کا مسکن ہے۔ تصورِ کائنات کو سمجھنے کے لیے جہاں خدا اور انسان کو سمجھنا ضروری ہے وہیں اس زمین کا مقام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ جدید اردو نظم کے شعرا نے زمین اور اس کے مقام پر اور اس کے ساتھ انسان کے تعلق پر بھی بہت سے افکار کو زینتِ شعر بنایا ہے۔ ایسے ہی ایک شعر میں یوسف ظفر زمین کی حد بندی کے حق میں دکھائی نہیں دیتے۔ وہ انسان کو ان حدود سے ماورا اور ہر شے کا اس کا مطیع دیکھنا چاہتے ہیں اور مکاں سے باہر تک انسانی رسائی کو اہم سمجھتے ہوئے کہتے ہیں:

اگر یہی ہے کہ کوئی نہیں مکاں میرا
تو یہ زمین ہے میری' یہ آسماں میرا)یوسف ظفر: حسنِ تحلیل)(۲۳۹(

اختر حسین جعفری زمین کی تخلیق کا تعلق ' تخلیقِ انسان سے جوڑتے ہوئے زمین کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان کی پیدایش زمین و آسمان کی کسی منصوبہ بندی کے طور پر ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ نہ تو وہ زمین کو بہری سمجھتے ہیں نہ ہی آسمان کو اندھا بل کہ یہ دونوں مل کر انسان کو ایک کھلونے کی صورت اس سے کھیل رہے ہیں۔اختر حسین جعفری ان دونوں سے نئے انداز میں نبرد آزما ہونا چاہتے ہیں۔

کھڑی دیوار سے چھت کو ہٹادوں
زمیں کا بوجھ اس لمحے پہ رکھ دوں
وہ لمحہ جو مجھے حاصل نہیں ہے
زمیں بہری نہیں ' سب سُن رہی ہے
فلک اندھا نہیں' سب دیکھتا ہے
وہ روزن جس میں ہیں تازہ سلاخیں
وہ زینہ جس میں رخنہ داغ سا ہے
وہ زینہ جس سے تم اتری تو صدیاں
ہمارے درمیاں حائل ہوئی ہیں)اختر حسین جعفری: شکستہ زینے پر ہجر کی باتیں)(۲۴۰(

ڈاکٹر وزیر آغا عظیم دھماکے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اجرامِ فلکی اور کائنات کے حق میں ہیں۔ وہ زمین کو ایک طشتری قرار دیتے ہیں جو دودھیا راستے کی کہکشاں کے بڑے سے طشت میں رکھی ہوئی ہے اور پھر یہ طشت اس کائنات کے مہیب سے تھال میں رکھی ہوئی ہے۔ اس اندازِ بیان میں قدیم فلکیاتی نظریات کا پرتو دکھائی دیتا ہےگویا کائنات کی تقسیم در تقسیم پراسراریت ان کے ذہنی افق پر ' وا ہے۔

یہ طشتری زمین کی
سماگئی جو اک بڑے سے طشت میں

جو اک بڑے سے تھال میں سما گیا
جسے اک اور بے کراں مہیب طشت کھا گیا　　　　　　)وزیر آغا: سلسلہ در سلسلہ)(۲۴۱(

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ زمین انسان کا مسکن ہے لیکن زاہد ڈار اسے نا مکمل سمجھتے ہیں اور اس میں بے چینی محسوس کرتے ہیں۔ اسی لیے وہ اس کی حدود سے باہر نکل کر کسی نئے سیارے پر زندگی کی تلاش میں ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھیں اپنی مجبوری کا بھی شدت سے احساس ہے کہ زمین کی جکڑن ہی ان کی زندگی کی وجہ ہے۔ اگر یہ جکڑن نہ رہی تو شاید زندگی بھی موجود نہ رہے۔گویا وہ شہزاد احمد اور ڈاکٹر جواز جعفری کے ہی نظریات کی ترویج کرتے ہیں۔

ہم فطرت سے ماورا ہیں
ہماری پیدائش کا مقصد کائنات کی تسخیر ہے
اب اس چہرے اور جسم کو بھول جائو
آنکھیں بند کرلو
یہ دنیا تمھاری منزل نہیں ہے
دوسری دنیا میں کوئی تمھارا انتظار کررہا ہے
میں ایک نا سمجھ اور کم زور آدمی ہوں
میں اپنے جسم سے باہر نہیں نکل سکتا
مجھے زمین نے جکڑ رکھا ہے　　　　　　)زاہد ڈار)(۲۴۲(

شہزاد احمد کے ہاں زمین کا اسطوری حوالہ درج ذیل شعر میں نظر آتا ہے جہاں وہ زمین کو خوابوں کا مرکز گردانتے ہوئے باقی تمام اشیا کو زمین کے سینے سے جنم لینے والے خواب قرار دیتے ہیں اور برہما کی بار بار کی نیند نئے خوابوں کو جنم دیتی ہے۔

اس زمیں پر تو خواب بکھرے ہیں
یہ زمیں خواب ہی اگاتی ہے
کھیتیاں نیند سے بھری اس کی
نیند ہی باربار آتی ہے　　　　　　)شہزاد احمد: آخری خواب)(۲۴۳(

سائنس کے مطابق ہماری یہ کائنات مادہ اور توانائی کا مجموعہ ہے۔ آواز‘ روشنی‘ حرارت وغیرہ سب ہی توانائی کی مختلف اشکال ہیں۔ جب مذہبی حوالے سے ’’کُن‘‘ کی بات کی جاتی ہے تو بعض علما وہاں بھی لفظ سے مراد توانائی ہی لیتے ہیں۔ تینوں سامی مذاہب میں توانائی کا یہ نظریہ کسی نہ کسی صورت ملتا ہے۔ بیسویں صدی کے اختتام پر سائنس دانوں نے بہت سی ایسی کائناتی آوازوں کا مشاہدہ کیا جن کا ذریعہ ابھی تک نامعلوم ہے۔ مختلف مذاہب کے صوفی فرقے ان ہی آوازوں کو کائنات کا مرکزی نقطہ سمجھتے ہیں۔ یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ مسلم صوفیا کے قریب کُن کی آواز یا سخی سلطان باہو کی ہو کی صدا یا ہندوازم اور سکھ ازم میں اوم کی صدا کے اشارے اسی آواز کی طرف ہیں جو کائنات میں ہر طرف گونجتی ہے۔ اس آواز کی توانائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یوسف ظفر رقم طراز ہیں کہ

افق سے تا بہ افق گونجتی ہے ایک صدا
مری صدا ہی نہ ہو؟ میں تو ہوں‘ مگر خاموش
کسے پکارا ہے کس نے ستارۂ سحری!

تری نوا ہے مگر بامِ عرش پر خاموش   )یوسف ظفر: حسنِ تحلیل)(۲۴۴(

انھی اَن جانی آوازوں کا بیانیہ ہمیں جاوید شاہین کے ہاں بھی دکھائی دیتا ہے۔ وہ بھی ہمیں ایک سائنس دان کی طرح شعوری سطح پر ان آوازوں کی حقیقت کے متلاشی دکھائی دیتے ہیں۔ اسی تلاش کے اگلے سفر میں وہ حقیقتِ کُل تک پہنچنے کے خواہاں ہیں۔

کوئی آواز ہے
روٹھی ہوئی جیسے نگر سے ہے
سفر مینہے
کہ اکتائی ہوئی اپنے سفر سے ہے
پتا چلتا نہیں
آتی کدھر سے ہے
سوادِشہر سے؟
یا شہر کا پُر شور مرکز
اُس کا مسکن ہے؟
کسی گنجان آبادی سے؟
یا اس کا ٹھکانہ کوئی بن یا کوئی مدفن ہے؟   )جاوید شاہین: کوئی آواز ہے)(۲۴۵(

قانون بقائے توانائی کے مطابق توانائی نہ تو پیدا کی جاسکتی ہے نہ ہی فنا تاہم یہ ایک قسم سے دوسری قسم میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ کائناتی تفہیم میں اس کی آوازیں انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ اسی لیے سائنس دان یہ سمجھتے ہیں کہ آج تک پیدا ہونے والے ہر صدا‘ ہر آواز کسی نہ کسی صورت اسی کائنات میں موجود ہے۔ شاید ہم کبھی اس قابل ہوسکیں کہ ان آوازوں کو سننے کی اہلیت حاصل کرلیں۔ ایسا کرنے سے تمام کائناتی راز عیاں ہو جائیں گے اور دنیا سے جھوٹ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا۔ ان مستقلاً موجود آوازوں کو سلیم الرحمان ہوا میں اڑتے ہوئے لفظ کہہ کر حقیقت کا ادراک حاصل کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں:

ہوا میں اڑتے ہوئے لمحے کے لفظوں کو چھو لیں
اپنے خیالات کے عکسوں کو دیکھ لیں
آئو
دوری اورنزدیکی کے سراب کو
خواب کے زوم لینزوں کے طلسم میں بند کرلیں
آئو اس ایک دن میں
نوخیزعمری میں بھیگے ہوئے خواب کی
ناتمامی کو قطرہ قطرہ نچڑتے دیکھیں   )سلیم الرحمان: ایک دن میں زندگی)(۲۴۶(

شہزاد احمد بھی ان آوازوں کو مستقل بالذات مانتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ آوازیں دیواروں کی صورت ہمیں گھیرے ہوئے ہیں۔ ہم ان کے قیدی ہیں۔ صوفیا کے ہاں بھی ہمیشہ اپنے اندر کی مستقل آواز کو سننے پر بہت اصرار کیا جاتا ہے کہ معرفیت کی یہ اولین منزل سمجھی جاتی ہے۔

بہت اونچی ہیں آوازیں
یہ آوازیں بھی دیواریں ہیں
شاید ہم

توانائی کی وہ قسم جس پر سائنس دانوں نے سب سے زیادہ غور کیا روشنی ہے۔ مذہبی حوالوں سے بھی نور کے مباحث تمام ادیان میں دکھائی دیتے ہیں۔ سائنس آج بھی روشنی کو بنیادی حیثیت دے کر کائنات کے سربستہ رازوں کی عقدہ کشائی کی کوشش کر رہی ہے۔ ڈاکٹر جواز جعفری روشنی کی توانائی کو اپنا راہ نما قرار دیتے ہیں۔ وہ روشنی جو صدیوں کا سفر طے کرکے آج اپنے اظہار کے قابل ہوئی۔ یہاں یہ امر بھی سامنے رہے کہ ہم روشنی کی وجہ سے ہی اشیا کو دیکھ سکتے ہیں اور سائنس دان بھی روشنی کی رفتار کی وجہ سے ہی مختلف اجرامِ فلکی کی عمر کا اندازہ لگاتے ہیں کیوں کہ اس کائنات اتنے دور دراز ستارے ہیں کہ ان کے ہمیں دکھائی دینے کے لیے ان کی روشنی ہم تک پہنچنے میں بھی صدیوں پر محیط وقت صرف کر دیتی ہے ۔ سورج ہماری زمین کے لیے توانائی کا سب سے بڑا منبع ہے اور باقی ستاروں کی نسبت زمین سے بہت زیادہ قریب ہے لیکن اس کی روشنی بھی زمین تک پہنچنے میں آٹھ منٹ لگاتی ہے۔ ڈاکٹر جواز جعفری اسی روشنی کی راہ نمائی میں خدا کے استدلال کے حامل دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اسے اپنے لیے دوسرے سیاروں سے آنے والا ایک پیغام سمجھتے ہیں اور اسی پیغام کی بہ دولت سچائی تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ نیز یہاں پر ہمیں نئی دنیا بسانے کی خواہش کا اظہار بھی ملتا ہے۔

نیلے آسمان کی بلندی سے
سر کے زمین پر گرتی
شاہراہِ سفید کے کنارے
کسی اجنبی روشنی کے استقبال کی خاطر
میں آسمان پر
آنکھیں لگائے کھڑا ہوں
جو صدیوں پہلے
میری سمت روانہ ہوچکی ہے!
روشنی کی اس اَن چھوئی دوشیزہ کے ہاتھ میں
میرے لیے ایک سندیسہ ہے
ستاروں سے میرے تعلق کی
جو کائنات کے مضافات میں
روشنی بانٹتے
کسی بوڑھے سورج نے مجھے بھیجا ہے!
اس سندیسے میں
میرے لیے اک بھید ہے
جس کے کھُلتے ہی
خُدا میری آنکھوں کی منڈیر سے گر جائے گا
اور اَن دیکھی کہکشائوں کے
آنکھ سے اوجھل موسموں
اور اجنبی سمتوں میں پر کھولے
ستاروں کے بلند پرواز پنچھی

ایک ایک کر کے
میری ہتھیلی پر اترے لگیں گے!
میری محبوب!
میں تیرا مرمریں ہاتھ تھامے
کائنات کے غیر منکشف خِطّوں میں
تیرے ساتھ
چہل قدمی کی خواہش میں زندہ ہوں!
)جواز جعفری: کائنات کے غیر منکشف خطوں میں چہل قدمی)(۲۴۸(

جاوید انور ان روشنیوں اور آوازوں کو کائنات میں بھٹکتا ہوا محسوس کرتے ہیں اور ان کے ذریعے ہی اپنی اور اس کائنات کی حقیقت کا ادراک حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انھیں ان توانائیوں میں صدیوں کے راز قید دکھائی دیتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ

روشنیاں
بند دروازوں کی درزوں سے ٹپکتی ہوئی
قطرہ قطرہ
شب کی دہلیز پہ گرتی ہیں‘ کبھی
کوئی مدہوش سی لے
جامۂ مے اوڑھ کے آتی ہے گزر جاتی ہے
رات کچھ اور بپھر جاتی ہے
اور بڑھ جاتی ہیں خاموش کھڑی دیواریں
بے صدا صدیوں کے چونے سے چُنی دیواریں
جو کہ ماضی بھی ہیں‘ مستقبل بھی
جن کے پیچھے ہے کہیں
آتشِ لمحۂ موجود کہ جو
لمحۂ موجود کی حسرت ہے
مری نظم کی حیرت ہے)جاوید انور: برف کے شہر کی ویران گزرگاہوں پر)(۲۴۹(

عابد ودود روشنی کے ثبات کے قائل محسوس نہیں ہوتے کہ روشنی کی غیر حاضری اندھیروں کو جنم دیتی ہے۔ یہ روشنی موجود ہو کر بھی خود کو کیسے چھپا لیتی ہے یہ ایک سربستہ راز ہے۔ یہ ایسا کائناتی اصول ہے جو فی الحال ہماری سمجھ سے بالاتر ہے اسی لیے عابد ودود کہتے ہیں کہ روشنی سے اتنی توقعات بے جا ہیں کہ یہ کائناتی راز کھول پائے گی کیوں کہ یہ تو خود کو بھی چھپا جاتی ہے تو کائناتی رازوں کو کیسے مستور نہ رکھ پائے گی۔

میں نے دیکھا کہ اُفق پر کوئی
آدھ اک روشنی کی دھاریں تھیں
اور وہ نوحہ کناں تھیں ایسی
جیسے کہتی ہوں مجھ سے اے شاعر!
’’اتنی امید اُجالوں سے نہ رکھ

روشنی کو کوئی ثبات نہیں‘‘ (عابد ودود: روشنی کو کوئی ثبات نہیں)(۲۵۰(

نصیر احمد ناصر کو رات کی تاریکی میں بھی اس روشنی کا احساس نظر آتا ہے‘ جسے وہ روشنی کے دستخط کہتے ہیں۔ وہ اس کے مکمل غائب ہونے پر یقین نہیں رکھتے ۔ لیکن وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ روشنی کی ماہیت کیسی ہی کیوں نہ ہو اس میں وہ صلاحیت نہیں ہے کہ یہ کائناتی اندھیروں کو مکمل طور پر ختم کر سکے۔ یہ ایک طرح سے بلیک ہولز کی خصوصیت کا بھی اظہار ہیں جو تاریکی کے بادل ہیں۔ وہ اتنے کثیف اور اتنی طاقت سے ہر شے کو اپنے مرکز کی طرف کھینچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ مادی اشیا تو درکنار ‘ وہ توانائی مثلاً روشنی کو بھی باہر نکلنے نہیں دیتے۔ نیز وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ روشنی کی حقیقت تو محض اتنی ہے کہ اس کی مدد سے ہم اندھیرے کو بھی دیکھنے کی قدرت نہیں رکھتے حالاں کہ کہاں یہ جاتا ہے کہ اشیا کو دیکھنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک روشنی نہ ہو۔ اُس کے باوجود روشنی ہی وہ مظہر ہے جو کبھی نہ کبھی کائنات کے اسرار کھول پائے گی کیوں کہ ازل سے ابد تک صرف روشنی کا ہی راج ہے۔

میں نے دیکھے خواب میں
روشنی کے دستخط
رات کی کتاب میں)نصیر احمد ناصر:)(۲۵۱(

روشنی بل دار ہو کہ سیدھی
خلا کی بے لمس تاریکی تو دور نہیں کرسکتی! (نصیر احمد ناصر: کائنات کا آخری گیت)(۲۵۲(

اندھیرا
اندھیرے ہی میں نظر آتا ہے
اسے دیکھنے کے لیے
ست رنگی روشنی کی ٹارچ
کام نہیں آتی! (نصیر احمد ناصر: اندھیرے کی آنکھ)(۲۵۳(

ہے ازل تا ابد
جست بھر فاصلہ
روشنی ---! روشنی!
روشنی---! روشنی! (نصیر احمد ناصر: رقصِ عمر میں وصال)(۲۵۴(

شہزاد احمد توانائیوں کی باہم تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہوئے روشنی سے فرار اور اندھیرے میں سکونت کا خواب دیکھتے ہیں ۔ درج ذیل اشعار میں ’’خاک ہونا‘‘ کا لفظ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ کیوں کہ خاک ہونا سے مراد مر جانا یا اپنے وجود کو ختم کرلینا بھی ہے۔ اندھیروں میں خود کو خاک کرنے سے مراد بلیک ہولز میں خود کو مدغم کر دینا بھی لیا جا سکتا ہے۔ آخری بات بھی اہم ہے کہ یہ بھی موت کہاں ہے یہ تو بس اک تبدیلی ہے۔

چلو ہم روشنی کو بھول جائیں
تیرگی کو یاد رکھیں
خاک ہوجائیں

مگر یہ خاک ہونا بھی تو اک روشنی ہے　　　　)شہزاد احمد: خاک بھی تو روشن ہے)(۲۵۵(

کائنات کی تفہیم کے دوران مینجہاں انسان بہت کچھ دریافت کرتا ہے وہیں بہت کچھ تشنگی بھی رہ جاتی ہے جو مختلف سوالات کو جنم دیتی ہے۔ یہی سوالات مزید تحقیق کی بنیاد بنتے ہیں۔ انسان نے ہر عہد میں ان سوالات سے راہ نمائی لی ہے اور ان کے جوابات جاننے کی کوشش میں سرگرداں رہا ہے۔ کچھ سوالات کے جوابات تو انسان اندازے سے دے لیتا ہے کہ شاید ایسا ہو شاید ویساہو لیکن کچھ سوالات اس کے گلے کی پھانس بن جاتے ہیں۔ ایسے ہی بہت سے کائناتی سوالات جدید اردو نظم گو شعرا کے اذہان میں بھی پنپتے ہیں۔ مختلف شعرا کے ہاں ان میں سے چند سوالات ملاحظہ کیجیے۔

یہاں کوئی بات نئی نہیں ہے جنابِ من
یہ روش سنکتی ہوائوں کی
یہ بھڑکتا بُجھتا چراغ بھی
نہیں کچھ پتا کہ یہ خامشی ہے کہ شور ہے
یہ عروج کیا ہے زوال کیا
یہ جواب کیا ہیں سوال کیا
یہ ستارہ کوئی آنکھ میں کہ سفر کوئی
کوئی دھوپ ہے کہ ہے سائباں
یہ ہے آسماں کہ ہے خاک داں
بہت ہو چکا یہ دماغ اب نہ کھائیے
کہ یہ آگ سرد ہے کس لیے
کہ یہ چاند زرد ہے کس لیے　　　　)احمد صغیر صدیقی: خودکلامی)(۲۵۶(

میں نے جو ملبوس
فقط اس دن کی خاطر سلوایا تھا
جب تم واپس آئو گے
وہ ملبوس ابھی تک
بالکل ویسے ہی رکھا ہے
اب جب تم میرے بھی نہیں ہو
جان! فقط اتنا بتلادو
اس ملبوس کا کیا کرنا ہے　　　　)افضال فردوس: ملبوس)(۲۵۷(

میں آسمان کے ساتھ ساتھ پھیلی
شام کی نارنجی روشنی ہوں
یا سورج کی آنکھ میں رینگتی سرخ دھار؟
یوم عید قربان ہوتی بھیڑوں کا صبر
یا ہیروں کے تعاقب میں کوئلہ کوئلہ پھرتی خواہش؟
میں سر ما میں ابابیلوں کی مرجھائی روح ہوں

یا سرمست درختوں کی چوٹیوں میں مدہوش ہوا؟

ساتویں آسمان پر غوطہ زن پرندے
اگر میری پرسکون روح میں پرواز کرتے ہیں
تو یہ کیسا غبار ہے
جو تمھارے چھوڑ جانے کے بعد
اس سینے میں جمنے لگا ہے؟ (زاہد امروز: میرا غصہ کہاں ہے؟)(۲۵۸)
دکھ تو ان دونوں کو
بیک سمے ملاتا اور جدا کرتا ہے
جس طرح وقت ازل اور ابد کو
تو کیا دکھ ایک مثلث ہے
یا دو سطروں کے بیچ
بے راس دوری کی ہمیشگی---؟ (نصیر احمد ناصر: دکھ)(۲۵۹)

اگر میں نہیں ہوں تو کیا فرق اس سے پڑے گا
اگر ہوں!
تو پھر میرے ہونے سے
چاروں طرف پھیلتی وسعتیں کیا سمٹ جائیں گی
کائنات اک کھلونے کی صورت مرے ہاتھ آئے گی
اور اگر آگئی
تو کھلونا کہاں تک مرا ساتھ دے گا (شہزاد احمد: اے خدا)(۲۶۰)

کیا فرشتوں نے عبادت چھوڑ دی؟
یہ عبادت ہی تو ان کی روح تھی!
میں اگر انسان ہونا ترک کردوں
اور فرشتوں کی طرح
دنیا سے بچ بچ کر چلوں
پھر میں اپنے آپ کو کیا نام دوں
اپنا غم کس سے کہوں
کیا کسی ابلیس کو آواز دوں! (شہزاد احمد: یہ تو ناممکن ہے)(۲۶۱)

عجیب بے چارگی کا عالم ہے
ہر کوئی کل سے بے خبر ہے
نہ سمت کا ہے کوئی تعین
نہ منزلوں کی طرف سفر ہے
جسے اندھیرا سمجھ رہے ہو، وہی سفر ہے
مگر سحر کون سے سمندر میں ہے، کدھر ہے؟

کوئی نہیں بتانے والا
کہاں گیا وہ دبیز اُجالا
خلائوں کو جگمگانے والا
سحر کو ظُلمت بنانے والا (شہزاد احمد: عجیب بے چارگی کا عالم ہے)(۲۶۲)

زمیں کی اڑن طشتری کے مسافر اڑے جا رہے ہیں
جس کہکشاؤں کی جانب جہاں پر
ہزاروں ثریا و پروین سی دلربا دلہنیں
اپنے خوابوں کے دلکش جھروکوں سے ہم کو
صدا دے رہی ہیں
ادھر بے قراری کے عالم میں صدیوں سے ہم
محوِ پرواز ہیں
مگر سوچنا ہے
ہمارے سفر کی نہایت ہے کیا
غرض و غایت ہے کیا؟ (حسنین بخاری: ہمارے سفر کی نہایت ہے کیا؟)(۲۶۳)

ان سوالات کے جوابات کی تلاش انسان کو جانی پہچانی حدود سے ماورا'اَن جانی سرزمینوں کے سفر پر اکساتی ہے۔ جدید اردو نظم گو شعرا بھی ایک ایسی ہی سرزمین کا خواب دیکھتے ہیں جو ان کے احساسات کے مطابق ہو اور اس سفر کے لیے وسائل کی تلاش میں ہیں۔ وہ ایک ان دیکھی' ان جانی' ان چھوئی دنیا کی تلاش میں ہیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر جواز جعفری کے ہاں زندگی کو دوسرے سیاروں پر منتقل کرنے کا واضح رجحان دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنی مٹی سے بھی محبت کرتے ہیں لیکن انسان کی خود غرضی کے باعث اس دنیا کو انسانیت کے لیے غیر محفوظ سمجھتے ہوئے نئی دنیائوں کا سفر کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے وہ روشنی کے گھوڑے پر سوار ہو کر کائنات کے غیر منکشف خطوں تک رسائی کے خواہاں ہیں۔

سُنو!
میری آنکھوں کے کھیت میں
اجنبی سمتوں کا
تجسس اُگتا ہے!
میرے کانوں پر
اَن سُنی آوازوں کا
رزق اُترتا ہے!
اور میرے پائوں کو
کسی غیر مُنکشف سیّارے کی
اِن چھوئی خاک پر
اپنے نقش چھوڑنے جانا ہے!
میری ناک
کسی اجنبی مٹی کی خوشبو کو

اپنے اندر اتارنے کی آرزو میں
جاگتی ہے!
اور زبان
کسی نامعلوم سیّارے کی
زرخیز مٹی میں جڑ پکڑنے والے
سایہ دار درختوں کی شاخوں پر لہراتے
رس بھرے پھلوں کی تمنّا میں
روزہ دار ہے!
مجھے زمین سے خلا تک
روشن راستوں کا
جال بچھانا ہے!
میں روشنی کے سرکش گھوڑے کو
اپنے اصطبل میں
کھونٹے سے باندھ کر آیا ہوں!
اس پُشت پر زین
اور رکاب میں پائوں رکھنا
میرا خواب ہے
)کہ اکثر خواب ناممکنات ہی کی شاخ پہ کھِلتے ہیں) (جواز جعفری: میں زمین کا وفادار ہوں)(۲۶۴(

احمد صغیر صدیقی بھی افق کے پار اُس دنیا تک پہنچنا چاہتے ہیں ۔
افق کے اس طرف بھی
سنتے ہیں اک اور دُنیا ہے
بُجھی آنکھوں کی راتوں میں
کسی دوری پہ استادہ
بہت سے ماہ پارے جھلملاتے ہیں
طلسمی دُھند میں ؟ڈوبی ہوئی
چاروں طرف خلا آواز دیتی ہے
ہوائوں کے سبک دھارے بلاتے ہیں)احمد صغیر صدیقی: تماشا)(۲۶۵(

مجید امجد نے بہت پہلے ہی وقت کے ان بدلتے تناظرات کو بھانپ لیا تھا۔ انھیں آئندہ آنے والی اس تبدیلی کا یقین تھا ۔ یہ الگ بات ہے وہ تاروں تک انسان کی رسائی اور نئی دنیا کی تلاش کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے کہ میرے بعد ہی یہ سب ہوگا تو میرے لیے تو غیر اہم ہوگا کہ میں ان خوابوں کو حقیقت بنتا نہ دیکھ پائوں گا۔

مجھے کیا تعلق۔ میری آخری سانس کے بعد بھی دوشِ گیتی پہ مچلے
مہ و سال کے لازوال آبشارِ رواں کا وہ آنچل‘ جو تاروں کو چھولے)مجید امجد: امروز)(۲۶۶(

عبدالرشید کا تصور انھیں ایک قدم اور آگے بڑھنے پر آمادہ کرتا ہے اور وہ چشمِ تخیل سے انسانی آبادی کو ان دور افتادہ مقامات کی طرف محوِ ہجرت دیکھتے ہیں۔

وہ سب رخصت ہوئے ہیں دور افتادہ زمینوں کی
طرف‘ وہ جن کے ہونے سے میرے لہو نے
آسماں کے بیضوی نعلوں کی قوت جذب کی (عبدالرشید: وہ سب رخصت ہوئے)(۲۶۷)

دنیا میں ابھی بہت سے اسرار پوشیدہ ہیں۔ انسان ان تک رسائی کی کوشش میں نئی دنیا بنانے کے خواب دیکھتا ہے۔ شہزا داحمد اس دنیا کو ان جانے کمروں سے تعبیر کرتے ہیں اور اس ان جانی دنیا کا خوب صورت نقشا درج ذیل الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

ایک کمرا تو ہمارے گھر میں ایسا ہے
جسے ہم نے کبھی دیکھا نہیں
ایک دروازے کے پیچھے‘ کتنے دروازے
مقفل پائے جاتے ہیں
انھیں ہم نے کبھی کھولانہیں
ہم اپنے ٹین کے گھر میں پڑے ہیں
اور ہمارے پاس ہی ایسے محل ہیں
جن کی تابانی نظر کو خیرہ کرتی ہے
چلو اپنی یہ آنکھیں بیچ دیں!
شاید کسی کے پاس یہ بے کار چیزیں بھی نہ ہوں
اور پھر اس جسم پر
لاکھوں کروڑوں آئینے پیدا کریں
اور پھر ان آئینوں میں عکس دیکھیں
اس برہنہ جسم کا
جو ہمارے ساتھ رہتا ہے
مگر ہم نے اسے دیکھا نہیں (شہزاد احمد: آئو اس کی روح میں اتریں)(۲۶۸)

پروفیسر جمیل قلندرعربی اور فارسی زبان پر بھی عمیق دست رس رکھتے ہیں ۔ علاوہ ازیں وہ سائنس اور تصوف کا گہرا مطالعہ بھی رکھتے ہیں۔ ان کی نظم ’’کشکول‘‘ سائنس اور متصوفانہ افکار کے ملاپ پر ایک خوب صورت نظم ہے۔ نظم اگرچہ کافی طویل ہے لیکن اپنے فکری عناصر کی بہ دولت اس قابل ہے کہ اُسے مکمل ہی تحریر کیا جائے۔ اس نظم میں جہاں سائنسی افکار کی صدائے بازگشت دکھائی دیتی ہے وہیں ایک صوفی کے من سے نکلنے والی مدہوش کردینے والی آواز بھی بہت دل کش ہے۔ اس نظم میں انھوں نے اردو کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی کے الفاظ و تراکیب کو بھی تواتر سے استعمال کیا ہے۔ اس نظم کا حاصل ٹیپ کا مصرع ہے کہ ’’وہ کہاں شعر میں سماتا ہے‘‘۔

ساز جو اپنے من میں بجتا ہے

سوز جس سے بدن پگھلتا ہے
رنگ جو چشمِ جاں میں رقصاں ہے

پھول جو روح میں مہکتا ہے
وہ کہاں شعر میں سماتا ہے

کیف جو قلب پہ برستا ہے

طیف جو ذہن میں ابھرتا ہے
جو میری روح کے پرندوں کو

سوئے عرشِ بریں اڑاتا ہے
وہ کہاں شعر میں سماتا ہے
ذکر جو جاں سے جاں ملاتا ہے

فکر جو لامکاں پہ چھاتا ہے
ذوق جو لے سے مے نچوڑے ہے

شوق جو جبر توڑ جاتا ہے
وہ کہاں شعر میں سماتا ہے
وہ افق جو خبر سے اعلیٰ ہے

وہ شفق جو نظر کا ماوٰی ہے
آسماں جس میں سحر قوسِ قزح

رنگ برنگ صورتیں دکھاتا ہے
وہ کہاں شعر میں سماتا ہے
ذھن جو اک وسیع صحرا ہے

قلب جو اک عمیق دریا ہے
عشق جو لامکان کا آدم ہے

حسن جو لازماں کی حوا ہے
وہ کہاں شعر میں سماتا ہے
لازماں جو زماں اگلتا ہے

لامکاں جو مکاں نگلتا ہے
''لاالٰہ'' جو عمائے یزداں میں

لازماں ۔ لامکاں ڈبوتا ہے
وہ کہاں شعر میں سماتا ہے
وہ ازل جو میرا سویرا ہے

وہ ابد جو میرا بسیرا ہے
دونوں بحرِ خودی کے دھارے ہیں

وہ خُدا جو خودی کا ڈیرا ہے
وہ کہاں شعر میں سماتا ہے
سازِ ملکوت جو بجاتا ہے

بزمِ ناسوت جو سجاتا ہے
باغِ ھاھوت کی فضائوں میں

بازِ لاھوت جو اڑاتا ہے
وہ کہاں شعر میں سماتا ہے
نے کی لے سے جو مے پلاتا ہے

من میں اک مدّوجزر لاتا ہے
پریم کا راگ جو الاپے ہے

ذرّوں اور تاروں کو نچاتا ہے
وہ کہاں شعر میں سماتا ہے
قطرہ جو بحر بن کے ٹپکا ہے

ذرّہ جو دشت بن کے پھیلا ہے
لمحہ جو دھر بن کے چمکا ہے

نقطہ جو ایں و آں سموتا ہے
وہ کہاں شعر میں سماتا ہے
گاہے بجلی میں جو چمکتا ہے

گاہے بادل میں جو گرجتا ہے
وہ جو دریائے روح سے یارو!

آگ، شُعلے، دھُواں اٹھاتا ہے
وہ کہاں شعر میں سماتا ہے
وہ جو گُنبد میں گونج اُٹھتا ہے

صَمتِ محراب میں جو گویا ہے
گاہے جو رُوپ میں کبوتر ہے

قُبۂِ سبز پہ اُترتا ہے
وہ کہاں شعر میں سماتا ہے
سایہ جو اِس ہرے شجر کا ہے

عکس جو اس کا پانی لیتا ہے
گونجنا جس کا شورِ مُرغاں سے

غارِ کُہ میں سُنائی دیتا ہے
وہ کہاں شعر میں سماتا ہے
بحر جس کا سکوت گویا ہے

دشت جو قعرِ ہفت دریا ہے
وہ خلا جس کا ایک اندھیرا

ہفت دریائے نور پیتا ہے
وہ کہاں شعر میں سماتا ہے
اشک جو آکے لوٹ جاتا ہے

وہ عَرَق جس سے تَن نہاتا ہے
تیری غُربت سے اے مرے مہتاب

طفلِ جاں جو لہو رُلاتا ہے
وہ کہاں شعر میں سماتا ہے
چہرہ جو حالِ جاں بتاتا ہے

حالِ جاں جو یہ دل چھُپاتا ہے
کوہِ غم پہ یہ عشق کا دائود

درد کا جو زبور گاتا ہے
وہ کہاں شعر میں سماتا ہے

درد بڑھ کے دوا جو بنتا ہے

رنجِ پنہاں جو گنج لاتا ہے
دشتِ ظلمات ھجر و شوق و سفر

چشمۂ نُور جو دکھاتا ہے
وہ کہاں شعر میں سماتا ہے
جنتِ چشم جس کا مُکھڑا ہے

دوزخِ رُوح جس کا ڈھلنا ہے
رُوح و ریحان ہے جس کی زلف و دَہَن

جس کا فردوسِ گوش نغمہ ہے
وہ کہاں شعر میں سماتا ہے
سلسبیلِ قمر بہاتا ہے

زَنجبیلِ سَحر لُٹاتا ہے
وہ جو نمرودِ غم کی آتش میں

دل کو کافور سا بناتا ہے
وہ کہاں شعر میں سماتا ہے
وہ جو غوثِ زَمَن کا دریا ہے

وہ جو غَیثِ چمن کا باجا ہے
زُلف جس کی ہے رات کی رانی

جس کا رُخسار دن کا راجہ ہے
وہ کہاں شعر میں سماتا ہے
بَرق جس میں جمال چمکا ہے

رَعد جس میں جلال گونجا ہے
صاعقہ جس سے ہوش اُڑتا ہے

طُورِ جاں جس سے راکھ بنتا ہے
وہ کہاں شعر میں سماتا ہے
مرتعش تار اک تھپیڑا ہے

جس نے امواجِ دِل کو چھیڑا ہے
دریا کہ جس کی موج کے آگے

یہ زمان و زمیں بکھیڑا ہے

وہ کہاں شعر میں سماتا ہے
لوح جو سینہ ’’ھواللہ‘‘ ہے

وہ قلم جو زبانِ ’’لولا‘‘ ہے
طائرِ فن جو نغمۂ قُرآں

سدرۂ مُصطفٰی پہ گاتا ہے
وہ کہاں شعر میں سماتا ہے
فقر جو موج و رَم میں آتا ہے

علم جو بے زباں بناتا ہے
وہ قلندر جو اپنے کشکول میں

اک سمندر سمیٹ لاتا ہے
وہ کہاں شعر میں سماتا ہے
)جمیل قلندر: کشکولِ قلندری)(۲۶۹(

اس نظم کا پہلا بند ساز اور ساز کے تعلق سے جسم اور روح کے تعلق کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے۔دوسرا بند کیف و سرور اور ایک صوفی کی سرمستی کو بیان کرتا ہے جس کی بہ دولت اس کی روح اپنے اسفل مقام سے اونچائی کا سفر طے کرنے پر آمادہ ہوتی ہے۔ تیسرا بند خالصتاً صوفیانہ انداز کا حامل ہے جہاں ہمیں ایک صوفی کی ذکر و مراقبہ کے ذریعے کائنات کے اسراروں تک رسائی کی جھلک دکھائی پڑتی ہے۔

چوتھا بند آسمان و زمین کے رشتے اور آسمانی توانائی (روشنی) کے امتزاج سے زندگی کی تخلیق کا اشارہ دیتا ہے۔ پانچویں بند میں پھر ایک صوفی کی گونج سنائی دینے لگتی ہے جو اپنے ذہنی رویوں سے خالق کی حقیقت کو سمجھ کر اس کائنات کو تسخیر کرنا چاہتا ہے۔ چھٹے بند میں زمان و مکان کے مباحث شامل ہیں خصوصاً ’’عمائے یزداں‘‘ (مکمل تاریکی) کا اشارہ بلیک ہولز کی طرف ہے۔

ساتویں بند میں زمان و مکان کے مباحث کے ساتھ خدا کی ذات کی تعریف بھی ملتی ہے اور زمان و مکان کو اس کی پہچان کے ذرائع شمار کیا گیا ہے۔ آٹھویں اور نویں بند میں بھی خدا کی صفات اور کائنات پر اس کی دست رس کا بیان ملتا ہے۔ اور نواں بند طبیعیاتی افکار کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے جس میں وہ موسیقی کو آواز کے معانی میں استعمال کرتے ہوئے کائنات کی تخلیقی صدا ’’کُن‘‘ کا اشارہ دیتے ہیں۔

دسواں بند انسان کی عظمت کے گیت گنگناتا محسوس ہوتا ہے اور گیارھواں بند خدائے قدوس و جبروت کی مقتدریت کی کہانی سناتا ہے۔ اور اس امر کے لیے انھوں نے بجلی‘ بادل‘ گرج‘ چمک ‘ آگ ‘ شعلے اور دھواں کے استعارات استعمال کرکے اس نہ صرف صوفیانہ مزاج کی روش دکھائی ہے بل کہ اک عجیب سے آہنگ کی شعریت بھی پیدا کی ہے۔ بارھویں بند میں یہ شعریت موسیقیت کا روپ دھار لیتی ہے اور معراجِ انسانی میں انبیا کے کردار کی وضاحت کرتی ہے۔

تیرھویں بند میں انسان کو سایہ اور خدا کو سرسبز شجر کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے اور آوازوں (ذکر) کے ذریعے ان کے تعلق کو واضح کیا گیا ہے جو اس کائنات (غارِ کُہ) کی خاموشیوں میں سنائی دے رہا ہے۔ اس آواز کو ہم آفاقی آواز بھی قرار دے سکتے ہیں جس پر پہلے بحث کی جا چکی ہے۔ چودھواں بند تیرھویں کا تسلسل ہے اور اس میں بلیک ہول کے حوالے سے اس کائنات اور اس کے رب کو بھی بلیک ہول قرار دیا گیا ہے جو نوروظلمت ہر شے کو اپنے اندر قید کرلینے پر قادر ہے۔ پندرھواں بند انسان کی اس دنیا میں ان کوششوں کو بیان کرتا ہے جن کے ذریعے انسان خدا تک اور کائنات کے حقائق تک پہنچنے کی جدوجہد میں کوشاں ہے۔

سولھواں بند اپنی موسیقیت کی بنا پر انتہائی جان دار ہے اور اس موسیقیت میں کوہِ غم پہ عشق کے دائود کا درد کا زبور گانا گہرے معانی لیے ہوئے ہے۔ سترھویں بند میں بھی انسان اور رب کے تعلق کو واضح کرنے کی کوشش دکھائی دیتی ہے اور اٹھارویں بند میں خدا کی تعریف اس کی تجسیم کرتے ہوئے کی گئی ہے۔ اس تجسیم سے نہ صرف معانی کا ابلاغ آسان ہوگیا ہے بل کہ ایک انفرادی طرز کی موسیقیت بھی روح کو سرشار کرنے لگتی ہے۔

انیسویں بند میں تاریخی تناظر میں خدائی مباحث کو مذہبی اساطیر کے حوالے سے واضح کیا گیا ہے ۔ بیسیویں بند میں تصورِ وقت اجاگر کیا گیا ہے جب کہ اکیسویں بند میں آندھی اور دیگر کائناتی مظاہر کی پیش کش کی گئی ہے اور ان مظاہر کی مدد سے ایک ایسا نظریۂِ کائنات سامنے لایا جاتا ہے جس میں صوفی اور سائنس دان میں یک جائی دکھائی دیتی ہے۔

بائیسویں بند میں انسانی وجود کو زیرِ بحث لایا گیا ہے اور Replicated Sounds کو بیان کرتے ہوئے اس زمان و مکان کو ایک بکھیڑا اور دھوکا قرار دیا گیا ہے۔ تئیسویں بند میں جہاں صوفیا کی طرح ذکر کو کائناتی گتھیاں سلجھانے میں معاون سمجھا گیا ہے وہیں ’’سدرۂِ مصطفٰی ‘‘ کی ترکیب بھی مذہبی تقدس کو ایک انفرادی انداز میں ظاہر کرتی ہے۔ آخری بند میں طبیعیات اور مابعدالطبیعیات کا آہنگ نظر آتا ہے جس میں Oceanic Experience OF Universe Of A Being And Existance کی صورت میں طبیعیات اور ما بعد الطبیعات کی سطحیں ایک دوسرے سے ملتی دکھائی دیتی ہیں۔

کائنات پر ایسے ہی بھرپور مباحث ہمیں معروف دانش ور ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے ہاں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی کتاب’’ عظیم کائنات کا عظیم خدا‘‘ بنیادی طور پر بہت سے سائنس دان نے مضامین کا ترجمہ ہے لیکن انھوں نے ترجمہ کو کہیں پر بھی ترجمہ نہیں رہنا دیا اور اس میں ایک ایسی تخلیقی سرگرمی پیدا کی ہے کہ دل اش اش کر اٹھتا ہے۔ ان مضامین میں جا بجا انھوں نے اپنی تحاریر کو بھی شامل کیا ہے جس سے ان مضامین کی قوت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ وہ ان تمام مباحث سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ

’’ماحصل یہ کہ سائنس بڑھتے بڑھتے روحانیت کی لطیف و حسین منزل تک جا پہنچی ہے اور مادیت کے اندھیرے چھٹ رہے ہیں۔‘‘(۲۷۰(

درج بالا مباحث اس بات کی دلالت کرتے ہیں کہ جدید اردو نظم گو شعرا بہترین کائناتی شعور کے حامل ہیں کیوں کہ انھوں نے کائناتی مظاہر کی تفہیم کے لیے جہاں اپنے فن اور تخیل کو استعمال کیا ہے وہیں وہ طبیعیات اور مابعد الطبیعیاتی علوم کے میدان میں بھی اپنی فکری اپج کوسامنے لانے سے نہیں چوکے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں کائنات کے تمام مظاہر

کی تشریح ایک منظم انداز میں سامنے آتی ہے۔ انھوں نے سابقہ علمی واقفیت کی بنا پر نہ صرف کائنات کی اس الجھی ہوئی گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی ہے بل کہ انھوں نے موجودہ دنیا کو بہتر کرنے کے ساتھ ساتھ ایک متبادل دنیا کا خواب بھی دیکھا ہے اوراس تک رسائی کے راستے بتاتے ہوئے مستقبل کی قیاس آرائی بھی ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ سید محسن نقوی: سوسائٹی اور سائنس 'مشمولہ دیدہ و(آن لائن شمارہ)' علی گڑھ' شمارہ دوئم' جون تا اگست ۲۰۰۸' ص ۳۲
۲۔ قاسم محمود' سید: شاہکار سائنس انسائیکلوپیڈیا' کراچی' شاہکار بک فائونڈیشن' ۱۹۸۷ء' ص ۳۱۴
۳۔ طاہر القادری،ڈاکٹر، اسلام اور جدید سائنس، لاہور:منہاج القرآن پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء،ص ۴۶۴۔۴۶۳
۴۔ علی عباس جلال پوری' سید: جنسیاتی مطالعے' لاہور' تخلیقات' ۲۰۱۳ء' ص۶۹
۵۔ پرویز' غلام احمد: تصوف کی حقیقت'لاہور' طلوعِ اسلام ٹرسٹ' ایڈیشن چہارم ' ۱۹۹۶ء' ص ۲۴
۶۔ محمد فرمان' پروفیسر: اقبال اور تصوف' لاہور' بزمِ اقبال' ۲۰۰۰ء' ص۲۲
۷۔ منصور پوری' قاضی عبدالکبیر: فرہنگِ اصطلاحاتِ تصوف' لاہور' مغربی پاکستان اردو اکیڈمی' ۲۰۱۱ء' ص۱۷۲۔۱۷۱
۸۔ افضال احمد سید: مٹی کی کان' کراچی' آج پبلشرز' ۲۰۰۹ء' ص ۱۲۲
۹۔ افضال فردوس: جب سارا کاجل بہہ جائے' لاہور' دستاویز مطبوعات' ۲۰۰۰ء' ص۱۳۸
۱۰۔ جاوید انور: اشکوں میں دھنک' لاہور' الحمد پبلیشرز' ۱۹۹۴ء' ص۳۳
۱۱۔ زاہد ڈار: تنہائی' لاہور' سنگِ میل پبلی کیشنز' ۱۹۸۸ء' ص ۱۹۱
۱۲۔ ایضاً' ص ۱۹۵
۱۳۔ شاہین مفتی: کنارہ کس نے دیکھا ہے' کراچی' اکادمی بازیافت' ۲۰۰۹ء' ص۱۳۱
۱۴۔ عبدالرشید: انی کنت من الظالمین' لاہور' سانجھ پبلشرز' ۲۰۱۱ء' ص ۹۱
۱۵۔ فیض احمد فیض:نسخہ ہائے وفا' لاہور' مکتبہ کارواں' س ن' ص۴۱
۱۶۔ نصیر احمد ناصر: تیسرے قدم کا خمیازہ' لاہور' سانجھ پبلیشرز' ۲۰۱۳ء' ص۱۰۰
۱۷۔ نصیر احمد ناصر: عرابچی سوگیا ہے' لاہور' تسطیر پبلشرز' ۲۰۰۲ء' ص۹۱
۱۸۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ' لاہور' الحمد پبلی کیشنز' ۱۹۹۷ء' ص۶۷۔۶۶
۱۹۔ مبارک شاہ،سید: مدارنارسائی میں، لاہور: الرزاق پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء' ص ۱۸
۲۰۔ شہزاد احمد: مٹی جیسے لوگ' لاہور' ملٹی میڈیا افئیرز' ۲۰۰۹ء' ص۱۱۹

۲۱۔ ایضاً، ص۱۴۰۔۱۳۹
۲۲۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ، ص۷۸
۲۳۔ ایضاً، ص۱۳۷
۲۴۔ ایضاً، ص۱۹۳
۲۵۔ جاوید انور: اشکوں میں دھنک، لاہور، ص۹۶۔۹۵
۲۶۔ اختر حسین جعفری: آئینہ خانہ، لاہور، مطبوعات پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ص ۴۸
۲۷۔ ایضاً، ص ۹۸۔۹۷
۲۸۔ حسنین بخاری، سیار آخر سے آگے جہاں، لاہور: سعادت پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء،ص ۲۰
۲۹۔ حسنین بخاری، صفر ایک، لاہور: محمد پبلشرز، ۲۰۰۲ء،ص ۱۴۷۔۱۴۹
۳۰۔ حسنین بخاری، کہکشانی پازیبیں، لاہور: سعادت آرٹ پریس، ۱۹۹۲ء،ص۹۱
۳۱۔ نصیر احمد ناصر: تیسرے قدم کا خمیازہ، ص۱۱۰
۳۲۔ نصیر احمد ناصر: عرابچی سوگیا ہے،ص۴۲۔۴۱
۳۳۔ ایضاً، ص۶۵
۳۴۔ ایضاً، ص۴۴۔۴۳
۳۵۔ شہزاد احمد: مٹی جیسے لوگ،ص۱۱۶
۳۶۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ، ص۴۷
۳۷۔ ایضاً، ص۶۰
۳۸۔ ایضاً، ص۷۳۔۷۲
۳۹۔ ایضاً، ص۱۳۶
۴۰۔ ایضاً، ص۱۹۲
۴۱۔ جواز جعفری: مٹھی میں تیرا وعدہ، لاہور، خواب پبلشرز، ۱۹۹۶ء، ص ۹۸۔۹۵
۴۲۔ ایضاً،ص ۱۳۸۔۱۳۷
۴۳۔ شہاب صفدر: نیلگوں، فیصل آباد، مثال پبلشرز، ۲۰۱۳ء، ص۱۲۱۔۱۲۰
۴۴۔ زاہد امروز: خود کشی کے موسم میں، کراچی، آج پبلشرز، ۲۰۰۹ء، ص ۳۴
۴۵۔ جاوید انور: اشکوں میں دھنک، ص۵۹۔۵۸
۴۶۔ اظہر غوری: اظہر غوری کی نظمیں (غیر مشروط محبت) ،لاہور،ملٹی میڈیا افیئرز، ۲۰۰۰ء، ص۴۰۲
۴۷۔ عبدالرشید: انی کنت من الظالمین،ص ۷۳
۴۸۔ زکریا، خواجہ محمد (مرتب): انتخابِ زریں نظم، لاہور، سنگت پبلیشرز، ۲۰۰۷ء، ص ۳۰۸۔۳۰۷
۴۹۔ نصیر احمد ناصر: پانی میں گم خواب، لاہور، تسطیر پبلشرز، ۲۰۰۲ء، ص ۸۱۔۸۰
۵۰۔ نصیر احمد ناصر: زرد پتوں کی شال، لاہور، سانجھ پبلشرز، ۲۰۱۳ء، ص ۸۶
۵۱۔ ایضاً، ص ۱۰۰
۵۲۔ ایضاً، ص ۷۱
۵۳۔ نصیر احمد ناصر: تیسرے قدم کا خمیازہ، ص۲۳
۵۴۔ نصیر احمد ناصر: عرابچی سوگیا ہے، ص۳۵

۵۵۔ اختر حسین جعفری: جہاں دریا اُترتا ہے‘ لاہور‘ فردا پبلشنگ ہائوس‘ ۱۹۹۳ء‘ ص۱۶۶۔ ۱۶۵
۵۶۔ ایضاً‘ ص ۱۷۵
۵۷۔ اختر حسین جعفری: آئینہ خانہ‘ ص ۲۶۔۲۵
۵۸۔ ایضاً‘ ص ۴۱
۵۹۔ ایضاً‘ ص ۶۳
۶۰۔ ایضاً‘ ص ۶۷
۶۱۔ ایضاً‘ ص ۱۰۸
۶۲۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ‘ ص۴۱
۶۳۔ ایضاً‘ ص۸۶
۶۴۔ ایضاً‘ ص۱۰۳
۶۵۔ ایضاً‘ ص۱۰۸
۶۶۔ ایضاً‘ ص۱۳۲
۶۷۔ ایضاً‘ ص۱۷۵۔۱۷۴
۶۸۔ شہزاد احمد: خالی آسمان‘لاہور‘ سنگِ میل پبلی کیشنز‘ ۱۹۸۵ء‘ ص۱۸۷
۶۹۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ‘ ص۱۷۸۔۱۷۶
۷۰۔ ایضاً‘ ص۱۸۲۔۱۸۱
۷۱۔ ایضاً‘ ص۱۸۷
۷۲۔ زکریا‘ خواجہ محمد (مرتب): انتخابِ زریں نظم‘ ص ۱۰۱
۷۳۔ ایضاً‘ ص ۱۰۲
۷۴۔ راشد‘ ن۔م: کلیاتِ راشد‘ مرتبہ خالد شریف‘ لاہور‘ ماورا پبلشرز‘ س ن‘ ص۲۸۳
۷۵۔ ایضاً‘ ص۲۸۸
۷۶۔ ایوب خاور: گُلِ موسمِ خزاں‘ لاہور‘ الحمد پبلی کیشنز‘ ۲۰۱۳ء‘ ص ۴۷
۷۷۔ جاوید انور: اشکوں میں دھنک‘ ص۵۴
۷۸۔ اختر حسین جعفری: آئینہ خانہ‘ ص ۳۷
۷۹۔ ایضاً‘ ص ۵۶
۸۰۔ ایضاً‘ ص ۵۷
۸۱۔ ایضاً‘ ص ۶۸
۸۲۔ ایضاً‘ ص ۸۷۔۸۶
۸۳۔ زکریا‘ خواجہ محمد (مرتب): انتخابِ زریں نظم‘ص ۳۲۴
۸۴۔ زاہد ڈار: تنہائی‘ ص ۵۷
۸۵۔ مبارک احمد: کلیاتِ مبارک‘ لاہور‘ مبارک پبلشرز‘ ۱۹۹۹ء‘ ص ۲۷۹
۸۶۔ شہزاد احمد:آنے والا کل‘ لاہور‘ ملٹی میڈیا افئیرز‘ ۲۰۰۵ء‘ ص۱۹۱
۸۷۔ ایضاً‘ ص۱۹۲
۸۸۔ شہزاد احمد: مٹی جیسے لوگ‘ص۸۵۔۸۴
۸۹۔ ایضاً‘ ص۱۰۹
۹۰۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ‘ ص۳۸

٩١۔ ایضاً٬ص٤٣
٩٢۔ ایضاً٬ ص٣٢
٩٣۔ ایضاً٬ ص٥١
٩٤۔ ایضاً٬ ص٦٣
٩٥۔ ایضاً٬ ص٧٩
٩٦۔ ایضاً٬ ص١٧٩۔١٨٠
٩٧۔ ایضاً٬ ص١٠٢
٩٨۔ ایضاً٬ ص١٤١
٩٩۔ جواز جعفری: مٹھی میں تیرا وعدہ٬ ص ٧٧
١٠٠۔ ایضاً٬ ص ٧٧۔٧٨
١٠١۔ ایضاً٬ ص ٨٣۔٨٤
١٠٢۔ ایضاً٬ ص ٩٤
١٠٣۔ ایضاً٬ ص ٩٥۔٩٨
١٠٤۔ ایضاً٬ ص ١٠٧
١٠٥۔ ایضاً٬ص ١٢١۔١٢٣
١٠٦۔ ایضاً٬ ص ١٣٧۔١٣٨
١٠٧۔ عابد ودود: کڑی دھوپ کا مسافر٬ راولپنڈی٬ حرف اکادمی٬ ٢٠٠٣ء٬ ص١٦٤
١٠٨۔ اعجاز رضوی: بہت سے دُکھ ہیں٬ لاہور٬ ادراک پبلی کیشنز٬ ١٩٩٧ء٬ ص ٣٥
١٠٩۔ عابد ودود: کڑی دھوپ کا مسافر٬ ص١٦٦
١١٠۔ ایضاً٬ ص١٩٥
١١١۔ احمد فقیہہ: حرفِ انکار٬ لاہور٬ الحمد پبلی کیشنز٬ ٢٠١١ء٬ ص ١٠٤
١١٢۔ مبارک شاہ٬ سید: ہم اپنی ذات کے کافر٬لاہور٬ الرزاق پبلی کیشنز٬ ص٩٩
١١٣۔ ایوب خاور: گُلِ موسمِ خزاں٬ص ٤٧
١١٤۔ حسنین بخاری، سیار آخر سے آگے جہاں،ص ٢٧۔٢٨
١١٥۔ حسنین بخاری، کہکشانی پازیبیں، ص٧٢
١١٦۔ اظہر غوری: اظہر غوری کی نظمیں (غیر مشروط محبت) ٬ ص٤٠١
١١٧۔ ایضاً٬ ص٤٠٢
١١٨۔ اعجاز رضوی: بہت سے دُکھ ہیں٬ ص ٣٠
١١٩۔ ایضاً٬ ص ٣٢۔٣٣
١٢٠۔ افضال احمد سید: مٹی کی کان٬ص ١٢٢
١٢١۔ احمد صغیر صدیقی: تجرید٬ کراچی٬ شمع بُک ایجنسی٬ ٢٠٠٦ء٬ ص١٧
١٢٢۔ ایضاً٬ ص٢٨
١٢٣۔ ایضاً٬ ص٣٢
١٢٤۔ ایضاً٬ ص٣٨
١٢٥۔ ناہید قمر: جدید اردو فکشن میں تصورِ وقت٬ مخزونہ نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز٬ اسلام آباد٬مقالہ پی ایچ ڈی
)غیر مطبوعہ) ٢٠٠٥ء٬ ص١٥

۱۲۶- Dictionary of Science, Oxford: Oxford University Press, 2010, P.477
۱۲۷- نصیر احمد ناصر: پانی میں گم خواب‘ ص ۹۷
۱۲۸- نصیر احمد ناصر: تیسرے قدم کا خمیازہ‘ص۷۳
۱۲۹- ایضاً‘ ص۷۶
۱۳۰- ایضاً‘ ص۸۰
۱۳۱- ایضاً‘ ص۸۶
۱۳۲- نصیر احمد ناصر: عرابچی سوگیا ہے‘ص۳۳
۱۳۳- ایضاً‘ ص۳۴-۳۳
۱۳۴- ایضاً‘ ص۸۳-۸۲
۱۳۵- ایضاً‘ ص۸۵-۸۴
۱۳۶- ایضاً‘ ص۹۱
۱۳۷- ایضاً‘ ص۱۰۷
۱۳۸- افتخار نسیم: نرمان‘ فیصل آباد‘ ہم خیال پبلشرز‘ ۱۹۹۴ء‘ ص۹۳
۱۳۹- منیر نیازی: دیکھ دھنک پھیل گئی‘ کاغذی پیرہن‘ لاہور‘ ۲۰۰۳ء‘ ص۶۰
۱۴۰- ایضاً‘ ص۷۸
۱۴۱- وزیر آغا: دن کا زرد پہاڑ‘ لاہور‘ جدید ناشرین‘ ۱۹۶۹ء‘ ص۱۱
۱۴۲- راشد‘ ن۔م: کلیاتِ راشد‘ مرتبہ خالد شریف‘ ص۲۳۸
۱۴۳- ایضاً‘ ص۶۴
۱۴۴- ایضاً‘ ص۵۳۴
۱۴۵- ایضاً‘ ص۵۳۹
۱۴۶- احمد فقیہہ: حرفِ انکار‘ص ۱۰۴
۱۴۷- احمد صغیر صدیقی: تجرید‘ص۳۸
۱۴۸- اختر حسین جعفری: جہاں دریا اُترتا ہے‘ص ۱۶۲-۱۶۱
۱۴۹- ایضاً‘ ص ۱۷۲
۱۵۰- افضال فردوس: جب سارا کاجل بہہ جائے‘ص۴۱
۱۵۱- زکریا‘ خواجہ محمد (مرتب): انتخابِ زریں نظم‘ لاہور‘ سنگت پبلیشرز‘ ۲۰۰۷ء‘ ص ۲۰۶
۱۵۲- زاہد ڈار: تنہائی‘ص ۳۵
۱۵۳- ایضاً‘ ص ۹۰
۱۵۴- یوسف ظفر: کلیاتِ یوسف ظفر مرتبہ ڈاکٹر تصدق حسین راجا‘ اسلام آباد‘ روداد پبلی کیشنز‘ ۲۰۰۵ء‘ ص ۲۶۳- ۲۶۱
۱۵۵- شاہین مفتی: کنارہ کس نے دیکھا ہے‘ ص۳۴۵
۱۵۶- عبدالرشید: انی کنت من الظالمین‘ ص ۹۲
۱۵۷- شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ‘ ص۴۳
۱۵۸- ایضاً‘ ص۵۹
۱۵۹- ایضاً‘ ص۶۵

۱۶۰۔ ایضاً‘ ص۹۳
۱۶۱۔ ایضاً‘ ص۱۵۴
۱۶۲۔ ایضاً‘ ص۱۶۴۔۱۶۳
۱۶۳۔ ایضاً‘ ص۱۶۵۔۱۶۴
۱۶۴۔ شہزاد احمد: ٹوٹا ہوا پل‘ لاہور‘ سنگِ میل پبلی کیشنز‘ ۱۹۹۳ء‘ ص ۹۸
۱۶۵۔ افضال فردوس: جب سارا کاجل بہہ جائے‘ ص۴۱
۱۶۶۔ اختر حسین جعفری: جہاں دریا اُترتا ہے‘ص ۱۶۲۔۱۶۱
۱۶۷۔ خاطر غزنوی، خواب در خواب، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء
۱۶۸۔ جاوید انور: اشکوں میں دھنک‘ ص۵۳
۱۶۹۔ نصیر احمد ناصر: پانی میں گم خواب‘ ص ۸۱۔۸۰
۱۷۰۔ نصیر احمد ناصر: زرد پتوں کی شال‘ ص ۸۶
۱۷۱۔ ایضاً‘ ص ۷۱
۱۷۲۔ ایضاً‘ ص ۲۴
۱۷۳۔ اختر حسین جعفری: آئینہ خانہ‘ ص ۳۷
۱۷۴۔ نصیر احمد ناصر: پانی میں گم خواب‘ص ۴۴۔۴۳
۱۷۵۔ جاوید انور: اشکوں میں دھنک‘ ص۵۹۔۵۸
۱۷۶۔ نصیر احمد ناصر: زرد پتوں کی شال‘ ص ۹۲
۱۷۷۔ جاوید شاہین: دیر سے نکلنے والا دن‘ لاہور‘ فکشن ہاؤس‘ ۲۰۰۴ء‘ ص۱۹
۱۷۸۔ سلیم الرحمان: شام کی دہلیز‘ لاہور‘ لوگ پبلشرز‘ ۱۹۹۳ء‘ ص۹۷
۱۷۹۔ اختر حسین جعفری: جہاں دریا اُترتا ہے‘ص۱۶۶۔ ۱۶۵
۱۸۰۔ ایضاً‘ ص ۱۷۲
۱۸۱۔ زاہد امروز: خود کشی کے موسم میں‘ ص ۳۴
۱۸۲۔ افضال فردوس: جب سارا کاجل بہہ جائے‘ ص۱۵
۱۸۳۔ ایضاً‘ ص۴۲
۱۸۴۔ ایضاً‘ ص۱۳۸
۱۸۵۔ جاوید انور: اشکوں میں دھنک‘ ص۱۹
۱۸۶۔ ایضاً‘ ص۳۷
۱۸۷۔ ایضاً‘ ص۵۴
۱۸۸۔ جواز جعفری: مٹھی میں تیرا وعدہ‘ص ۱۰۷
۱۸۹۔ اختر حسین جعفری: آئینہ خانہ‘ص ۹۵
۱۹۰۔ زکریا‘ خواجہ محمد (مرتب): انتخابِ زریں نظم‘ ص ۲۰۵
۱۹۱۔ زاہد ڈار: تنہائی‘ص ۱۲۳۔۱۲۲
۱۹۲۔ شاہین مفتی: کنارہ کس نے دیکھا ہے‘ ص۳۴۰
۱۹۳۔ عبدالرشید: انی کنت من الظالمین‘ ص ۸۲
۱۹۴۔ مبارک احمد: کلیاتِ مبارک‘ لاہور‘ مبارک پبلشرز‘ ۱۹۹۹ء‘ ص ۱۸۶
۱۹۵۔ ایضاً‘ ص

۱۹۶۔ میرا جیؔ: نظم مشمولہ جدید ادب' جرمنی'شمارہ نمبر۱۹' جولائی تا دسمبر۲۰۱۲ء' ص۳۰۹
۱۹۷۔ راشد' ن۔م: کلیاتِ راشد' مرتبہ خالد شریف' ص۹۷
۱۹۸۔ ایضاً' ص۷۰
۱۹۹۔ ایضاً' ص۱۳۲
۲۰۰۔ ایضاً' ص۵۱۴
۲۰۱۔ ایضاً' ص۶۹
۲۰۲۔ ایضاً' ص۳۴۸۔۳۴۶
۲۰۳۔ ایضاً' ص۵۳۶
۲۰۴۔ نصیر احمد ناصر: عرابچی سوگیا ہے' ص۱۶۔۱۵
۲۰۵۔ ایضاً' ص۱۷
۲۰۶۔ ایضاً' ص۳۲۔۳۱
۲۰۷۔ ایضاً' ص۹۳۔۹۲
۲۰۸۔ ایضاً' ص۱۰۳
۲۰۹۔ نصیر احمد ناصر: تیسرے قدم کا خمیازہ' ص۲۸
۲۱۰۔ ایضاً' ص۳۲
۲۱۱۔ شہزاد احمد:آنے والا کل' لاہور' ملٹی میڈیا افئیرز' ۲۰۰۵ء' ص۱۷۷
۲۱۲۔ ایضاً' ص۲۱۹
۲۱۳۔ شہزاد احمد:خالی آسمان'لاہور' سنگِ میل پبلی کیشنز'۱۹۸۵ء' ص۲۲۲
۲۱۴۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ' ص۳۵
۲۱۵۔ ایضاً' ص۱۰۰۔۹۹
۲۱۶۔ ایضاً' ص۷۵
۲۱۷۔ ایضاً' ص۱۲۶
۲۱۸۔ ایضاً' ص۱۵۶
۲۱۹۔ شہزاد احمد، معلوم سے آگے، لاہور'الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص۱۶۴
۲۲۰۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ'ص۱۹۷۔۱۹۵
۲۲۱۔ جاوید انور: اشکوں میں دھنک'ص۹۶۔۹۵
۲۲۲۔ اختر حسین جعفری: آئینہ خانہ' ص ۲۶۔۲۵
۲۲۳۔ ایضاً' ص ۴۱
۲۲۴۔ زکریا' خواجہ محمد (مرتب): انتخابِ زریں نظم' ص۹۹
۲۲۵۔ زکریا' خواجہ محمد (مرتب): انتخابِ زریں نظم' لاہور' سنگت پبلیشرز' ۲۰۰۷ء' ص ۱۰۱
۲۲۶۔ جواز جعفری: مٹھی میں تیرا وعدہ' ص ۸۴۔۸۳
۲۲۷۔ عابد ودود: کڑی دھوپ کا مسافر' ص۱۹۵
۲۲۸۔ شاہین مفتی: کنارہ کس نے دیکھا ہے' ص۱۵۲
۲۲۹۔ ایضاً' ص۱۵۳
۲۳۰۔ عبدالرشید: انی کنت من الظالمین'ص ۷۴۔۷۳

۲۳۱۔ نصیر احمد ناصر: تیسرے قدم کا خمیازہ، ص۲۰
۲۳۲۔ ایضاً، ص۴۹
۲۳۳۔ نصیر احمد ناصر: عرابچی سوگیا ہے،ص۱۲۳۔۱۲۱
۲۳۴۔ مبارک احمد: کلیاتِ مبارک،ایضاً، ص ۱۸۷
۲۳۵۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ، ص۳۱
۲۳۶۔ ایضاً، ص۱۳۹
۲۳۷۔ شہزاد احمد:آنے والا کل، لاہور، ملٹی میڈیا افئیرز، ۲۰۰۵ء، ص۱۸۰
۲۳۸۔ شہزاد احمد: مٹی جیسے لوگ، ص۱۳۳۔۱۳۲
۲۳۹۔ یوسف ظفر: کلیاتِ یوسف ظفر مرتبہ ڈاکٹر تصدق حسین راجا،ص ۲۶۷
۲۴۰۔ اختر حسین جعفری: آئینہ خانہ،ص ۱۰۹
۲۴۱۔ وزیر آغا: دن کا زرد پہاڑ، ص۵۳
۲۴۲۔ زاہد ڈار: تنہائی، ص ۹۹
۲۴۳۔ شہزاد احمد: مٹی جیسے لوگ، ص۱۳۰
۲۴۴۔ یوسف ظفر: کلیاتِ یوسف ظفر مرتبہ ڈاکٹر تصدق حسین راجا، ص ۲۶۴
۲۴۵۔ جاوید شاہین: دیر سے نکلنے والا دن، ص۱۹
۲۴۶۔ سلیم الرحمان: شام کی دہلیز، ص۹۷
۲۴۷۔ شہزاد احمد:آنے والا کل، ص۱۸۶
۲۴۸۔ جواز جعفری: مٹھی میں تیرا وعدہ، ص ۷۸۔۷۷
۲۴۹۔ جاوید انور: اشکوں میں دھنک، ص۵۳
۲۵۰۔ عابد ودود: کڑی دھوپ کا مسافر، ص۱۶۶
۲۵۱۔ نصیر احمد ناصر: زرد پتوں کی شال، ص ۲۴
۲۵۲۔ نصیر احمد ناصر: تیسرے قدم کا خمیازہ، ص۸۰
۲۵۳۔ ایضاً، ص۱۵۸
۲۵۴۔ نصیر احمد ناصر: عرابچی سوگیا ہے،ص۹۵
۲۵۵۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ، ص۴۸
۲۵۶۔ احمد صغیر صدیقی: تجرید، ص۳۲
۲۵۷۔ افضال فردوس: جب سارا کاجل بہہ جائے، ص۴۲
۲۵۸۔ زاہد امروز: کائناتی گرد میں عریاں شام، ص۹۷
۲۵۹۔ نصیر احمد ناصر: تیسرے قدم کا خمیازہ، ص۴۴
۲۶۰۔ شہزاد احمد: مٹی جیسے لوگ،ص۱۲۹۔۱۲۸
۲۶۱۔ ایضاً، ص۱۴۲۔۱۴۱
۲۶۲۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ، ص۱۸۰
۲۶۳۔ حسنین بخاری، وہ ایک لمحہ، فیصل آباد: سعادت آرٹ پریس، ۱۹۸۸ء،ص ۱۰۷
۲۶۴۔ جواز جعفری: مٹھی میں تیرا وعدہ، ص۱۲۳۔۱۲۱
۲۶۵۔ احمد صغیر صدیقی: تجرید، ص۱۷
۲۶۶۔ زکریا، خواجہ محمد (مرتب): انتخابِ زریں نظم، ص ۲۰۶
۲۶۷۔ عبدالرشید: انی کنت من الظالمین، ص ۴۲

۲۶۸۔ شہزاد احمد: مٹی جیسے لوگ، ص۱۴۴۔۱۴۳
۲۶۹۔ جمیلقلندر، محمد: کشکول،اسلام آباد، منشورات، ۱۹۹۶ء، ص۵۶۔۴۹
۲۷۰۔ غلام جیلانی برق، ڈاکٹر: عظیم کائنات کاعظیم خدا، لاہور، الفیصل ناشران و تاجران کتب، ۲۰۱۱ء، ص ۱۲۷

محاکمہ

گزشتہ ابواب میں ہم نے جدید اردو نظم کے شعرا کے کائناتی شعور پر مختلف علوم کی روشنی میں بحث کی ہے۔ اس دوران میں ہمارے سامنے متنوع نظریات ابھر کر آتے ہیں۔ بہت سے نظریات ایسے ہیں جو قدیم اساطیر ، مذاہب ، عملی سائنسز اور سماجی سائنسز کے حوالے سے بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن بہت سے شعرا نے ان معلومہ حقائق سے آگے بھی قدم بڑھائے ہیں۔ کہیں انھوں نے ان علوم اور ان کے پیدا کردہ نظریات کا ہی اعادہ کیا ہے اور کہیں ان کے لیے نئے راستوں کا انتخاب کیا ہے۔ تاہم ایک یہ بات سامنے ضرور آتی ہے کہ جدید اردو نظم کے شعرا نے کائنات اور اس کے تمام مظاہر و عوامل کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور نتائج اخذ کیے ہیں۔

کائنات فہمی میں بنیادی طور پر انسان اور خدا کے تصورات اور پھر ان کا آپس میں اور کائنات کے ساتھ رشتہ ڈھونڈنے کی سعی کی گئی ہے۔ ان کائناتی رشتوں کی تلاش انسان میں اس عہد میں بھی کی ہے جب اس کا شعور نا پختہ تھا اور آج بھی یہ کوشش جاری ہے جب وہ ستاروں پر کمند ڈال رہا ہے اور زندگی کے نئے پہلوئوں کا متلاشی ہے۔ مختلف شعرا کے ہاں زمان ، مکان، خدا اور انسان پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ان تمام تر تعلقات میں سب سے بنیادی نقطہ جو تمام علوم کے سامنے رہا کہ کائنات میں انسان کا مقام کیا ہے۔ مذاہب

کے حوالے سے خود بہ خود اس کے ساتھ خدا کا تصور بھی آملتا ہے۔ گویا اس تکوین کو سلجھانا کائنات کی الجھی گتھی کو سلجھانے کے مترادف ہے۔

کائنات فہمی کے حوالے سے مذاہب کا اپنا اپنا نقطۂ نظر ہے۔ وہ مذاہب سامی ہوں یا غیر سامی، ان کا رویہ سائنسی ہو یا غیر سائنسی لیکن ہر کسی نے اسے اپنے شعور اور اپنے علم کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بات محلِ نظر رہے کہ کائنات کو دو سطحوں پر سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک سطح مادی ہے جس نے سائنسی علوم کو جنم دیا اور دوسری غیر سائنسی یا روحانی سطح ہے جس کے اصول و ضوابط معلوم مادی دنیا سے ماورا اور بسا اوقات ان کے بالکل مخالف ہیں۔ ان نظریات کی گونج مختلف مذاہب کے صوفیانہ افکار میں سنائی دیتی ہے۔ تمام مذاہب میں کسی نہ کسی صورت اس بات کا اعادہ کیا گیا ہے کہ خدا نے کائنات تخلیق کی۔ کب ، کیسے اور کیوں کے معاملے میں اختلافات اپنی جگہ موجود ہیں۔ ان کی شعوری پیش کاری مذاہب اور اساطیر کی صورت میں موجود ہے جنھیں ہم سابقہ ابواب میں زیرِ بحث لا چکے ہیں۔

جدید اردو نظم کے شعرا کے ہاں ہمیں ایک تحیراتی نقطۂ نظردکھائی دیتا ہے۔ ایک صوفی کی سطح اس سے مختلف ہے کہ وہ خود کو ازلی رازوں کا آشنا سمجھتا ہے۔ ایک سائنس دان عملی تجربات کی راہ نمائی حاصل کرکے حقیقتِ ازلی تک پہنچنے اور کائنات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ایک صوفی اپنے اندر کی آنکھ کھول کر اسے دل کے آئینے میں دیکھنا چاہتا ہے۔ ان تمام باتوں کا اظہار ہمیں جدید اردو نظم گو شعرا کے ہاں بھی دکھائی دیتا ہے۔ سائنس اور مذاہب کے درمیان ایک لمبی جنگ کا دور رہا ہے۔ مذاہب اور ان کے صوفیانہ افکار کی گونج کہتی تھی کہ خدا کو مان لو کہ وہ ہے وہ ایسا ہے جو وجود سے ماورا ہے۔ یہ کائنات اور اس کے لوازمات اسی کی حکمت کے تحت چل رہے ہیں اور وہ جب چاہے ان مسلمہ اصولوں سے انحراف کی صورت بھی خود پیدا کردیتا ہے۔ جیسے دریا نے حضرت موسٰیؑ کو راستا دے دیا۔ سائنس ان عوامل کو ماننے سے انکاری رہی ہے تاہم اب تجرباتی سطح پر ایسا علاقہ سامنے آیا ہے کہ جس کے بارے میں سائنس دانوں کا یہ خیال ہے کہ اگر ایک مناسب رفتار سے ہوا کی لہریں پہاڑوں سے ٹکرائیں تو انعکاس کے بعد وہ دریا سے ٹکرانے پر اتنا دبائو پیدا کرسکتی ہیں کہ وہ پانی کو دیوار کی طرح کاٹ ڈالیں گی اور درمیانی علاقہ خشکی کا منظر پیش کرے گا۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ علاقہ وہی ہے جس کا ذکر حضرت موسیٰؑ کی قوم سے متعلق کتب میں مذکور ہے۔ متصوفانہ سطح پر ان عوامل کی وضاحت مختلف انداز میں کی جاتی رہی ہے۔ چند مثالوں کے ذریعے سائنس اور تصوف کے ان باہمی تعلقات کو واضح کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

حضرت سلیمانؑ نے ملکہ صبا کا تخت بغیر کوئی وقت صرف کیے فوراً حاضر کر لیا تھا۔ سائنس ایسے مافوق الفطرت عوامل کو نہیں مانتی لیکن مشہور وحدت الوجودی صوفی محمد ابنِ عربی اس کی وضاحت کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ انھوں نے لہروں کو مجسم کر دیا تھا۔ آج سائنس بھی اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ اشیا کی ماہیت وہ نہیں ہے جو دکھائی دیتی ہے۔ بل کہ تمام اشیا بنیادی طور پر انتہائی چھوٹے چھوٹے ذرّات سے مل کر بنی ہیں۔ اب تو خیر سے ذرّات کا یہ نظریہ بھی قدیم سمجھا جاتا ہے اور ذرّات کی حرکت کی بہ دولت انھیں لہروں کی صورت میں سمجھنا زیادہ آسان ہے۔ کیوں کہ ذرّات کی شکل میں اشیا کی بہت سی خصوصیات کو مناسب طور پر واضح نہیں کیا جاسکتا۔

صوفیا کے نزدیک بھی کائنات مجموعۂ اضداد ہے اور کائنات میں ہر شے کی ضد موجود ہے۔ نیکی کی ضد بدی‘ اچھائی کی ضد برائی‘ موت کی ضد حیات‘ اندھیرے کی ضد نور‘ الغرض جو بھی چیز ہے اس کی ضد کسی نہ کسی صورت میں ضرور جلوہ گر ہے۔ یہاں تک کہ نیکی اور بدی کے الگ الگ خدا اور دیوتاؤں کا تصوّر موجود ہے۔ سامی مذاہب کے حوالے سے خدا اور ابلیس کو نبرد آزما دکھایا جاتا ہے۔ جدید سائنس بھی اس بات سے اتفاق کرتی ہے کہ ہر شے کی ضد موجود ہے۔ سائنس نے کائنات کی مادی سطح کے مطالعے کے دوران مینغیر مادی اشیا کے شواہد بھی اکٹھے کیے ہیں۔ مادہ کو MATTER اور اس کی ضد کو ANTI-MATTER کا نام دیا گیا ہے۔ سائنس دان اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ مادہ کی ضد بھی موجود ہے جس کو پرکھنے کے لیے موجودہ سائنسی علوم کوئی خاطر خواہ مدد کرنے سے قاصر ہیں۔صوفیا ابتدا سے ہی مادی سطح کے مخالف رہے ہیں اور اس سے کسی اوپری سطح کی تلاش میں سرگرداں رہے ہیں۔ ان تمام نظریات کا بیان بھی ہمیں جدید اردو نظم میں دکھائی دیتا ہے۔

کائنات اصغر(انسان) کو صوفیا کائناتِ اکبر (ہماری دنیا)کی ہی صورت پر دیکھتے آئے ہیں اور ان کے درمیان تعلق کی وضاحت کرتے آئے ہیں ۔جب کہ سائنس نے انسان اور خدا کے درمیان تعلق کو محض ایک مذہبی اور ذہنی رویے کا نام دیا ہے لیکن سائنسی علوم کی ترقی و ترویج نے سائنس دان کو بھی اس بات پر آمادہ کرلیا ہے کہ کائنات میں کوئی عظیم شعور کارفرما ہے جو ہماری عقل سے ماورا ہے۔ اسی بنا پر سائنسی ترقی نے انسان کو تجرباتی سطح پر بھی خدا کے وجود کے قریب کردیا ہے۔ اسی کا اظہاریہ ہمیں جدید اردو نظم کے شعرا کی تخلیقی صلاحیتوں میں بھی نظر آتا ہے۔

ہیزن برگ کے سائنسی نظریۂ غیر یقینیت کے مطابق کسی بھی ذرّے کی ایک وقت میں یا تو رفتار بتائی جا سکتی ہے یا مقام ۔یعنی اس کی حقیقت کو حقیقتِ مطلقہ کی صورت میں ظاہر کرنا ممکن نہیں ہے۔ صوفیا کا رجحان بھی یہی رہا ہے۔ جیسا کہ گزشتہ ابواب میں بھی ہم اس کا مشاہدہ کرچکے ہیں کہ شعرا کے نظریاتِ کائنات میں بھی یہ عنصر کارفرما ہے۔ وہ بھی کائنات میں غیر یقینیت کے قائل نظر آتے ہیں۔

صوفیا نے بھی کائنات کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے اپنی ذات کو اس کا سب سے بڑا ثبوت قرار دیا جیسے اقبال نے کہا کہ

ع میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

اور انسان (کائناتِ اصغر) کو کائناتِ اکبر کی عقدہ کشائی کا مظہر قرار دیا۔ آج سائنس بھی انسان اور اس کے اپنے عوامل کو مظاہرِ کائنات کی ماہیت سمجھنے کے لیے معاون و مددگار سمجھتی ہے۔ جدید اردو نظم کے شعرا کے ہاں بھی یہ رویہ دکھائی دیتا ہے کہ وہ اپنی ذات کے سمندر میں ڈوب کر حقیقت تک رسائی کے لیے اپنے تخیل اور تفکر کو استعمال کرتے ہیں۔

روایاتِ تصوف کے مطابق انسان کل سے بچھڑا ہوا جزو ہے۔ ہماری یہ دنیا اس کی امتحان گاہ ہے۔ اسے اس امتحان سے اس وقت تک حتمی نجات نہیں ملتی جب تک وہ اپنے اصل سے نہ جا ملے۔ تمام اشیا کی بنیادی ماہیت ایک ہی ہے۔ کائنات کے تمام عناصر جان دار ہوں یا بے جان‘ حالاں کہ آج سائنس بے جان اشیا میں بھی حساسیت کے شواہد دیکھنے لگی ہے‘ تمام اشیاکی تشکیل ایک ہی جیسی بنیادی اشیا یعنی پروٹان‘ نیوٹران اور الیکٹران کے

اشتراک سے ہے۔ یہ یاد رہے کہ پروٹان' الیکٹران اور نیوٹران کو کبھی بنیادی ایٹمی ذرّات سمجھا جاتا تھا لیکن اب سائنس دان اس سے تقریباً چھتیس گنا چھوٹے ذرّات یا لہروں تک رسائی حاصل کر چکی ہے جسے کوارکس یا انٹی کوارکس کا نام دیا گیا ہے۔ ہر کوارکس کی ضد انٹی کوارکس کی صورت میں موجود ہے۔ جب ہر شے کی ماہیت ایک ہی ہے تو پھر وہ ذرّہ جسے سائنس نے خدائی ذرّہ GOD PARTICLE کا نام دیا ہے وہ بھی انھی سے بنا تھا جس نے بکھر کر یہ کائنات تشکیل دی۔ وید انتی فلسفہ اور وحدت الوجودی افکار کی باز گشت کہ ہر شے میں خدا ہے ' سائنس کے نزدیک اب کافی حد تک قبولیت کی سند پانے لگی ہے۔

اس کی وضاحت میں ہندوازم کا آواگون یا جونی چکر بھی اہمیت کا حامل ہے کہ ہر شے واپس پلٹتی ہے اور روپ بدلتی ہے۔ کائناتی حوالے سے ہماری کائنات میں مروّجہ سائنس کے مسلمہ اصول جو آبی چکر' نائٹروجن چکر ' آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائیڈ چکر بھی تو واپس پلٹنے کے ہی نام ہیں۔ان افکار ونظریات کوبھی جدید اردو نظم گو شعرا نے اپنی نظموں کی زینت بنایا ہے۔

اس چکر کے حوالے سے جب سائنس دان نے کائنات پر غور کیا تو اس کے سامنے کئی سوالات ابھرے کہ کیا کائنات صرف ایک ہے یا کئی کائناتیں ہیں۔ کیا زندگی کی اصل یا آدم ایک ہے یا زندگی کی اور کوئی صورت بھی ہو سکتی ہے۔ تو اس کے جواب میں اب سائنس ' UNIVERSEنہیں بل کہ MULTIVERSE کے نظریے کو زیادہ قبولیت عطا کرتی ہے کہ کائنات ایک نہیں بل کہ کئی کائناتیں ہیں لہٰذا آدم بھی ایک نہیں ہو سکتا کہ ہر کائنات کے لیے علاحدہ آدم ہونا چاہیے۔ صوفیا کے اکثر گروہ بھی کئی کائناتوں پر یقین رکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے سلوک کی منازل انھیں اَن جانی کائناتوں کی سیر کروا سکتی ہیں۔ نیز کئی کائناتوں کے ساتھ ساتھ کئی آدم ہونے کا نظریہ بھی صوفیا کے ہاں پایا جاتا ہے۔ سائنسی تفکر کی بنیاد پر ایسے ہی کائناتی انداز کی تشریح ہمیں جدید اردو نظم گو شعرا کے ہاں بھی نظر آتی ہے۔

خدا کی ذات طبیعیات اور مابعدالطبیعیات کے مباحث میں ہمیشہ سے بنیادی اہمیت کی حامل رہی ہے۔ دیگر سائنسی علوم کی طرح طبیعیات نے بھی خدا کے وجود پر سوالات کیے ہیں اور اسے دیس نکالا دیے رکھا ہے۔ مابعدالطبیعیات کا تعلق کیوں کہ مادی سطح سے ہمیشہ بلند رہا ہے لہٰذا اس نے احساسات کے مطابق ہمیشہ خدا کے وجود کو ثابت کرنے کی سعی کی ہے۔ سائنس محض اسی بات پر یقین رکھتی چلی آئی ہے جسے وہ اپنے مادی پیمانوں سے پہچان سکے ۔ اسی لیے تو اقبال نے بھی کہا تھا کہ

خوگرِ پیکرِمحسوس تھی انساں کی نظر

ماننا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیوں کر

تو خدا کو ماننے کے لیے بھی سائنس دانوں کو ثبوت کی ضرورت تھی جو مادی سطح کا ہی ہو۔ جدید طبیعیات اور ریاضی کے ملاپ سے سائنس دانوں نے اس کائنات کو سمجھنے کی کوشش کے دوران میں جب عظیم دھماکے کا نظریہ قبول کیا تو اس نے بہت سے سوالات کو جنم دیا۔ ان سوالات پر تحقیق کرتے ہوئے سائنس دانوں نے ایک بنیادی ذرّہ فرض کیا ہے اور اس ذرّے کو خدائی ذرّہ یا GOD PARTICLE کہا گیا ہے۔ سائنسی نظریات کے مطابق یہ ایک ایسا بنیادی ذرّہ تھا جس سے کائنات کی تخلیق ہوئی۔ پہلا عظیم دھماکا اسی ذرّے میں ہوا۔ یہ ذرّہ حجم کے لحاظ سے انتہائی چھوٹا تھا ۔ اتنا چھوٹا کہ اس کے بارے میں سوچنا بھی

شاید ممکن نہیں ہے۔ اس ذرّے کی کمیت پوری کائنات کی کمیت کے برابر تھی۔ ریاضیاتی فارمولے اس نتیجے کو درست ثابت کرتے ہیں۔ اگرچہ انسان نے باقاعدہ اُس ذرّے کو دیکھا نہیں ہے تاہم ریاضیاتی فارمولے اس کے صحیح ہونے کی دلالت کرتے ہیں نیز اس کی بنیاد پر صحیح مانا جانے والا عظیم دھماکے کا نظریہ اور پہلے جان دار کا ظہور وہ عوامل ہیں جنھیں کسی حد تک تجرباتی سطح پر آزما لیا گیا ہے۔ اسی لیے اب سائنس دان بھی اس کائنات کو ایسے خلاق شعور کی کارستانی قرار دیتے ہیں جو پراسرار اور بھیدوں سے معمور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے ایسے سائنس دان جنھوں نے خدا کے وجود کا انکار کیا آج اسے ماننے لگے ہیں۔ ان میں ایک بڑا نام عصرِ حاضر کے معروف ریاضی دان اسٹیفن ہاکنگ کا ہے۔ ہاکنگ پوری زندگی خدا کے وجود کو جھٹلاتے رہے لیکن اپنی عمر کے آخری حصے میں انھوں نے اس کائناتی شعور کے تناظر اور اپنے علم سے حاصل ہونے والے دلائل کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے خدا کے وجود کا اقرار کر لیا۔ جدید اردو نظم کے شعرا کے ہاں بھی خدا کو اسی کائناتی دانش کے انداز میں سمجھنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔

عصرِ حاضر میں طبیعیات کی سب سے مقبول ترین شاخ کوانٹم طبیعیات ہے۔ کوانٹم طبیعیات کا مقصد اشیا کی انتہائی چھوٹی سطح پر ماہیت کو پرکھنا اور حقائق کو سامنے لانا ہے۔ کوانٹم طیعیات کا ایک تجربہ جسے DOUBLE SLIT EXPERIMENT کہتے ہیں اس تناظر میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اس تجربہ میں الیکٹرانی بندوق کے ذریعے مادہ کے انتہائی چھوٹے اجزا یعنی الیکٹرانوں کی بوچھاڑ کو ایک ایسے بورڈ سے گزارنے کا انتظام کیا جاتا ہے جس میں دو سوراخ ہوتے ہیں۔ تجربہ نے یہ ثابت کیا کہ الیکڑان ان سوراخوں سے گزرنے پر بجائے دو مقامات پر اپنا اظہار کرنے کے متعدد مقامات پر اپنے نشانات چھوڑتے ہیں۔ ان نشانات کا طیفی مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ الیکٹران متعدد جگھوں پر ہو سکتے ہیں۔ ہم کسی جگہ بھی ان کی غیر حاضری کو حتمی نہیں کہہ سکتے تاہم طیف کی شدت سے اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ان کے فلاں جگہ پر ہونے کا موقع زیادہ ہو سکتا ہے۔ گویا ایک چیز ایک سے زیادہ جگہ کیسے موجود ہوسکتی ہے۔ مروّجہ صوفی سلاسل میں ایسے بہت سے واقعات زبان زد عام ہیں جب ایک ہی فرد کے ایک سے زیادہ جگہ پر موجود ہونے کو بیان کیا گیا ہے۔ انسان کیوں کہ مادی وجود رکھتا ہے تو سائنس دان ہمیشہ اس کی نفی کرتے رہے ہیں لیکن کوانٹم طبیعیات کے اس تجربہ سے سامنے آنے والے نتائج نے سائنس دانوں کو بھی ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ وہ اب یہ تو ماننے لگے ہیں کہ ایک شے ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ مقامات پر اپنا اظہار کرسکتی ہے مگر اس کی وجہ کی صراحت ابھی تک ممکن نہیں ہو پائی ہے۔ جدید اردو نظم کے شعرا کے ہاں بھی ایسے بہت سے اشعار سامنے آتے ہیں جن میں ایک سے زیادہ مقامات پر موجودگی کی خواہش یا حسی تجربہ کا بیان موجود ہے۔

کائنات کو سمجھنے کے لیے جن عناصر نے سب سے زیادہ اہمیت حاصل کی ہے ان میں سے ایک وقت بھی ہے۔ کسی کے نزدیک وقت خدا کا متبادل ہے تو کوئی اسے خدا سے بھی پہلے موجود مانتا ہے۔ کوئی اس کے دائروی بہائو پر یقین رکھتا ہے اور کسی کے نزدیک اس کا بہائو یک سمتی ہے۔ یک سمتی بہائو میں بھی کوئی اسے ایک طرف بہتا ہوا مانتا ہے اور کوئی اسے دوسری طرف۔ یہاں تک تو بات تھی سائنس کی لیکن صوفیا کے ہاں ایسے بہت سے اشاریے دکھائی دیتے ہیں کہ انھوں نے وقت کی اس چال اس کے اصول و ضوابط کے مخالف چلایا۔ ماضی کی خبر تو تاریخ دیتی ہے لیکن مستقبل کی خبر اور اس کا ادراک ان

عوامل میں سے ہے جن کا اہلِ تصوف دعوا کرتے چلے آئے ہیں۔ اس دعوے کو سائنس ہمیشہ رد کرتی رہی ہے۔ تاہم جدید دور میں طبیعیات نے زمان و مکان کے مجموعی تصورات کو جب ایک ڈبل روٹی کے ٹکڑوں کی صورت پوری کائنات پر منطبق کرنے سے وضاحت کی تو یہ احساس جنم لینے لگا کہ وقت کی کوئی ایسی حقیقت نہیں ہے جیسا کہ اسے سمجھا جاتا رہا ہے۔ ماضی‘ حال اور مستقبل کا تعلق صرف ہمارے احساسات سے ہے۔ ورنہ در حقیقت فرد ایک ہی وقت میں تینوں زمانوں کا مکین ہے۔ نیز یہ کہ وقت سے فرار ممکن ہے تاہم اس کے لیے سائنس یہ بنیادی شرط عاید کرتی ہے کہ متحرک شے کی رفتار روشنی سے زیادہ ہو۔ ایک وقت میں ایسا بھی سمجھا جانے لگا کہ صرف یک سمتی بہاؤ ہی ممکن ہے لیکن اب سائنس بھی اس بات کا اقرار کرتی ہے کہ اگر رفتار پر قابو پانے کی اہلیت حاصل کر لے تو وہ مستقبل اور ماضی دونوں میں نہ صرف سفر کرسکتا ہے بل کہ ان سے واپس لوٹ بھی سکتا ہے۔ قدیم دیومالائی داستانوں میں ہمیں ایسے بہت سے کرداروں سے واسطہ پڑتا ہے جو وقت سے آگے اور پیچھے کی طرف سفر کرتے ہیں اور پھر واپس اپنے زمانے کو لوٹ آتے ہیں۔ عہدِ حاضر میں سائنس فکشن کی بنیاد ہی ان تصورات پر ہے اور تقریباً ہر کہانی ہی ان عوامل کے گرد گھومتی ہے۔ کائنات اور وقت کے بارے میں ایسے ہی افکار ہمیں جدید اردو نظم کے شعرا کے ہاں بھی دکھائی دیتے ہیں جب وہ زمان و مکان پر دست رس پانے کے خواہاں دکھائی دیتے ہیں اور وقت کے عمومی نظریات کی مخالفت کا بیج بوتے ہیں جنھیں عموماً ہماری معاشرتی سطح پر مصدقہ تسلیم کیا جاتا ہے۔علاوہ ازیں وقت کا ایک نیا نظریہ بھی سامنے آتا ہے کہ یہ متحرک تو ہے لیکن اس کی حرکت یک سمتی یا دائروی نہیں بل کہ یہ دونوں سمتوں میں رواں ہے۔اور یہی کائناتی ابہام کی بنیادی وجہ ہے۔

مکانی حوالے سے زمین و آسمان اور دیگر اجرام کے مباحث بھی کائناتی بحث کا حصہ رہے ہیں۔ ان مباحث کے ذریعے سائنس نے کائنات کی حقیقی ماہیت جاننے کی سعی کی ہے۔ سائنس نے معلوم دنیا کے مکانی پہلو کو سمجھنے کے لیے پہلے چار سمتوں کا سہارا لیا۔ چار سمتوں کے ذریعے تشریح کا جو کائناتی ماڈل تھا اسے عموماً 2D (2 DIMENTIONAL) یا دو سمتی نمونہ کہا گیا ہے۔ اس کے ذریعے مکمل تفہیم ممکن نہ ہوسکی تو سائنس دانوں نے 3D (3 DIMENTIONAL) یا تین سمتی نمونے کے ذریعے اس کی وضاحت کی کوشش کی اور اس کے ذریعے وضاحت کرنے میں کافی حد تک کامیابی بھی حاصل کر لی۔ یہ یاد رہے کہ دو سمتی نمونے میں چار اور تین سمتی نمونے میں سمتوں کو چھے سمجھا جاتا ہے۔ بعد ازاں مزید تحقیق نے ان دونوں نظریات کی نفی کردی۔ اس ضمن میں جدید ترین سائنسی نظریہ STRING THEORY کہلاتا ہے۔

اس نظریے کے مطابق سمتیں لامحدود ہیں۔ جب ہم کسی بھی ایٹمی ذرّے کی گہرائیوں تک اترتے ہیں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ اس کا انداز بہت سے دھاگوں اور ریشوں پر مشتمل ہے۔ اس کی صحیح ترجمانی کے لیے ہمیں بہت ہی گہرائی تک اترنا پڑتا ہے۔ اگر اسے سادہ مثال سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو ہم تنے ہوئے ایک دھاگے پر چلتی چیونٹی کی مثال لے سکتے ہیں۔ دھاگا بالکل سیدھا نہیں ہوتا بل کہ اس کی اصل ماہیت گولائی پر مشتمل ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ٹریفک کے کھمبے پر لگی روشنیوں کو باندھنے کے لیے جب ایک دھاتی رسی سے سہارا دیا جاتا ہے تو ہمیں تو بالکل سیدھی دکھائی دیتی ہے لیکن حقیقت میں وہ گول ہوتی ہے۔ اسی طرح دھاگے پر چلتی ہوئی چیونٹی ہمیں تو خطِ مستقیم میں حرکت کرتی

دکھائی دیتی ہے لیکن گر ہم چیونٹی کی سطح پر جا کر دیکھیں تو اس کے پائوں کے نیچے موجود گولائیوں کو محسوس کر سکیں گے۔

اس نظریے نے سمتوں اور مکان کے تمام پرانے تصورات کو رد کردیا ہے اور یہ اعلان کیا ہے کہ سمتوں کی مجموعی تعداد کا ہمیں ابھی ادراک نہیں ہے۔ انتہائی گہرائی میں موجود ان سمتوں کی سطح کا جہاں تک سوال ہے تو سائنس دان اب تک ان ریشوں میں نو سمتیں دریافت کر چکے ہیں اور ان کے خیال کے مطابق کم از کم سمتیں بھی اسّی(۸۰) سے زیادہ ہیں۔ صوفیا کے ہاں بھی ان معلوم سمتوں کو توڑ کر کسی اور ان جانی اور ان دیکھی سمتوں میں شعور کی پرواز کے احساسات ملتے ہیں۔ گویا پھر سے یہ نظریہ یعنی STRING THEORYصوفی اور سائنس دان کو ایک دوسرے کے قریب لے آئی ہے۔ جدید اردو نظم کے شعرا بھی سمتوں کے اس بھید بھائو کے قائل نہیں ہیں۔ اسی لیے ان کے ہاں پانچویں سمت‘ ساتویں سمت اور دسویں سمت میں بڑھنے کی تمنا دکھائی دیتی ہے۔ گویا یہاں پر شاعر پھر سائنس پر فوقیت لے جاتا ہے اور اپنے تخیل کی بنیاد پر ان نئی سمتوں کی دریافت کا مرحلہ پہلے ہی طے کر لیتا ہے جس پر سائنس دان کو سوچنے کا موقع ہی بعد میں ملتا ہے۔

طبیعیات نے کائنات کو سمجھنے کے لیے مادہ اور توانائی کے تعلقات پر غوروخوض کیا ہے۔ توانائی کی وہ اقسام جو سب سے زیادہ زیرِ بحث رہی ہیں وہ آواز اور روشنی ہیں۔ روشنی اور اس سے متعلق وقت کی تشریح پہلے کی جا چکی ہے۔ جہاں تک آواز کی بات ہے تو یہ سائنسی اور صوفیانہ دونوں حوالوں سے اہم ہے۔ سائنس دانوں نے ریڈیائی لہروں پر تحقیق کرتے ہوئے کچھ عجیب آوازوں کا سراغ لگایا۔ سائنسی قوانین کی روشنی میں اس آواز کے منبع کا پتا نہیں چلایا جا سکا اور سائنس دان بھی اب ان آوازوں کی آفاقی حیثیت کو مانتے ہیں۔ یہ آوازیں پوری کائنات میں یک ساں شدت سے موجود ہیں۔ بہ ظاہر سنائی نہ دینے والی ایسی آوازوں کا تصور ہمیں تصوف کے راہ نوردوں کے ہاں بھی ملتا ہے۔ مختلف مذاہب کے سلاسل ان آوازوں کو مختلف ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ تاہم تصوف اور سائنس کی ان آوازوں کے حوالے سے بھی یک جائی دکھائی دینے لگی ہے۔ ایسی ہی ان گنت ان سنی آوازوں پر کان دھرتے ہوئے جدید اردو نظم کے شعرا نے بھی کائناتی تفہیم کا فریضہ سرانجام دینے کی سعی کی ہے۔

روح کا مسئلہ بھی سائنس کے سامنے بہت پرانا ہے۔ سائنس دانوں نے یہ بات جاننے کی ہمیشہ کوشش کی ہے کہ کس طرح ایک جیتا جاگتا فرد جسم مکمل ہونے کے باوجود بالکل ساکت ہوجاتاہے۔ اگر اسے مادی سطح پر دیکھتے ہوئے خون کی حرکت اور توانائی سے متصل کیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ایک فالج زدہ جسم کا حصہ زندہ ہونے کے باوجود مردہ ہوتا ہے۔ اس کی زندگی ‘ موت سے محض اتنی ہی مختلف ہوتی ہے کہ مردہ جسم گلنا سڑنا شروع کردیتا ہے جب کہ فالج زدہ حصہ ایسا نہیں کرتا۔ سائنس نے اپنی تحقیقات کے دوران مینمادہ کے ساتھ ضد مادہ کے وجود کو بھی ماننا شروع کردیا ہے۔ وہ روح جو پہلے نہ تو مادے کی زد میں آتی تھی نہ ہی توانائی کی حد میں ‘ وہ اب اس ضد مادے کی صورت قبولیت کی سطح پانے لگی ہے۔ نیز یہ کہ انسانی کردار کی بنیادوں کو سمجھنے کے لیے اس کے جسم سے خارج ہونے والی شعاعوں کے طیف کو ‘ جسے ماہرینِ نفسیات ’’اورا‘‘ کہتے ہیں بھی استعمال کرکے روح کے استدلال کی طرف قدم بڑھا یاگیا ہے۔ جدید اردو نظم کے شعرا نے

بھی اس پیش قیاسی میں حصہ ڈالا ہے اور روح اور کردار کے کائناتی تعلق کی وضاحت و صراحت کی ہے۔

سائنس بھی اشیا کی ماہیت و صلاحیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہتی ہے کہ ہر نظر آنے والی شے کا ویسا ہی ہوناضروری نہیں اور یہی نظریہ تصوف کا بھی ہے۔ مذاہب میں تو اس دنیا کو صریح دھوکا اور کھیل تماشا قرار دیا گیا ہے۔ اسی لیے سائنس دان بھی اس دنیا کو بہتر سے بہترین بنانے کی کوشش کرتا ہے اور صوفی کے نزدیک جو دنیا اصل ہے وہ اس کی طرف مراجعت کی کوشش کرتا ہے جب کہ جدید اردو نظم کا شاعر نہ صرف یہ کہ موجود دنیا کو بہتر بنانا چاہتا ہے بل کہ وہ ایک متبادل دنیا کا خواب بھی دیکھتا ہے۔

ان تمام مباحث سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ تمام علوم و فنون نے اپنے اپنے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے مزاج کے مطابق کائنات کو سمجھنے اور اسے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ مذاہب‘ فلسفہ‘ تاریخ‘ ادب و اساطیر‘ ریاضی‘ حیاتیات‘ کیمیا‘ فلکیات‘ طبیعیات اور مابعدالطبیعیات نے کائنات کو سمجھنے کے جو جو انداز اپنائے ہیں ‘ جدید اردو نظم کے شعرا نے نہ صرف یہ کہ ان کا مطالعہ کیا ہے اور ان کی پیش کاری کی ہے بل کہ بہت سے مواقع پر دیگر علوم کی راہ نمائی کرتے ہوئے سوچ کا نیا در بھی وا کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہر تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں‘ جدید اردو نظم کے شعرا نے نہ صرف ان دونوں رخوں کا مطالعہ کیا ہے بل کہ ان پر تفکر سے ایک تیسرے رخ کا استنباط بھی کیا ہے۔ انھوں نے ادب و سائنس کے درمیان خلا کو پاٹنے میں اہم کردار ادا کرتے ہوئے مختلف سائنسی تصورات کو بھی ادب دوست لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے اور سائنس دانوں کو بھی نئی سوچ پر اکسایا ہے۔مختصر ترین الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تصوف اور سائنس کی حدود ملنے والی ہیں اور حدود کے اس اتصال میں جہاں سائنس اور تصوف کا کردار اہمیت کا حامل ہے وہیں ان کی ترویج و اشاعت میں جدید اردو نظم نگاروں کے کردار سے صرفِ نظر کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔

کتابیات

شعری مجموعے:

۱۔ احمد صغیر صدیقی: تجرید، کراچی، شمع بُک ایجنسی، ۲۰۰۶ء
۲۔ احمد فقیہہ: حرفِ انکار، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء
۳۔ اختر حسین جعفری: جہاں دریا اُترتا ہے، لاہور، فردا پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۳ء
۴۔ اختر حسین جعفری: آئینہ خانہ، لاہور، مطبوعات پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء
۵۔ اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر: گردِ راہ، کراچی، المسلم پبلشرز، ۱۹۹۳ء
۶۔ ارشد محمود: تصورِ خُدا، لاہور، فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲ء
۷۔ اشفاق حسین: آشیاں گم کردہ، لاہور، وجدان پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء
۸۔ اظہر غوری: اظہر غوری کی نظمیں (غیر مشروط محبت) ،لاہور،ملٹی میڈیا افئیرز، ۲۰۰۰ء
۹۔ اعجاز رضوی: بہت سے دُکھ ہیں، لاہور، ادراک پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء
۱۰۔ افتخار نسیم: نرمان، فیصل آباد، ہم خیال پبلشرز، ۱۹۹۴ء
۱۱۔ افضال احمد سید: مٹی کی کان، کراچی، آج پبلشرز، ۲۰۰۹ء
۱۲۔ افضال فردوس: جب سارا کاجل بہہ جائے، لاہور، دستاویز مطبوعات، ۲۰۰۰ء
۱۳۔ افضال فردوس: گھر یاد آیا، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء
۱۴۔ اکبرؔ الٰہ آبادی: رانا خضر سلطان (مرتب) کلیاتِ اکبر، لاہور، بک ٹاک، جلد اوّل، ۲۰۰۶ء
۱۵۔ اکبرؔ الٰہ آبادی: رانا خضر سلطان (مرتب) کلیاتِ اکبر،لاہور، بک ٹاک، جلد دوم، ۲۰۰۶ء
۱۶۔ امجد اسلام امجد: ساحلوں کی ہوا،لاہور، جہانگیر بک ڈپو،۲۰۰۰ء
۱۷۔ ایوب خاور: گُلِ موسمِ خزاں، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء
۱۸۔ جاوید انور: اشکوں میں دھنک، لاہور، الحمد پبلیشرز، ۱۹۹۴ء
۱۹۔ جاوید شاہین: دیر سے نکلنے والا دن، لاہور، فکشن ہائوس، ۲۰۰۴ء
۲۰۔ جمیل قلندر، محمد: کشکول،اسلام آباد، منشورات، ۱۹۹۶ء
۲۱۔ جواز جعفری: مٹھی میں تیرا وعدہ، لاہور، خواب پبلشرز، ۱۹۹۶ء
۲۲۔ جواز جعفری: عمرِ رواں سے پرے،لاہور،فکشن ہائوس، ۲۰۱۴ء
۲۳۔ جواز جعفری: موت کا ہاتھ کلائی پر ہے،لاہور،فکشن ہائوس، ۲۰۰۴ء
۲۴۔ حالیؔ، الطاف حسین:افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر (مرتب) : کلیاتِ نظمِ حالی،لاہور، مجلسِ ترقی ادب،جلد دوم، ۱۹۷۰ء
۲۵۔ حسنین بخاری: کہکشانی پازیبیں، لاہور: سعادت آرٹ پریس، ۱۹۹۲ء
۲۶۔ حسنین بخاری: صفر ایک، لاہور: محمد پبلشرز، ۲۰۰۲ء
۲۷۔ حسنین بخاری: وہ ایک لمحہ، فیصل آباد: سعادت آرٹ پریس، ۱۹۸۸ء
۲۸۔ حسنین بخاری: آشعوری سیارگاہیں، لاہور: محمد پبلشرز، ۱۹۹۶ء
۲۹۔ حسنین بخاری: زباں اور مکاں___دو جزیرے، لاہور: سعادت آرٹ پریس، ۱۹۹۳ء
۳۰۔ حسنین بخاری: سیار آخر سے آگے جہاں، لاہور: سعادت پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء
۳۱۔ حسنین بخاری: زباں اور مکاں___دو جزیرے، لاہور: سعادت آرٹ پریس، ۱۹۹۳ء
۳۲۔ حسین صمدانی : بارز خواب، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲ء

۳۳۔ حفیظ جالندھری: شاہ نامہ اسلام' لاہور' مکتبہ تعمیرِ انسانیت' س ن
۳۴۔ خاطر غزنوی، خواب در خواب، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء
۳۵۔ خالد علیم: بغداد آشوب ' لاہور' اقدام پبلی کیشنز' ۲۰۰۳ء
۳۶۔ ذوق: شیخ محمد ابراہیم:تنویر احمد علوی' ڈاکٹر (مرتب): کلیاتِ ذوق' لاہور' مکتبہ شعر و ادب' ۱۹۸۸ء
۳۷۔ راشد' ن۔م: کلیاتِ راشد' مرتبہ خالد شریف' لاہور' ماورا پبلشرز' س ن
۳۸۔ زاہد امروز: کائناتی گرد میں عریاں شام' لاہور' سانجھ پبلیشرز' ۲۰۱۳ء
۳۹۔ زاہد امروز: خود کشی کے موسم میں' کراچی' آج پبلشرز' ۲۰۰۹ء
۴۰۔ زاہد ڈار: تنہائی' لاہور' سنگِ میل پبلی کیشنز' ۱۹۸۸ء
۴۱۔ زکریا' خواجہ محمد (مرتب): انتخابِ زریں نظم' لاہور' سنگت پبلیشرز' ۲۰۰۷ء
۴۲۔ ساقی فاروقی: زندہ پانی سچا' لاہور' سنگِ میل پبلی کیشنز' ۱۹۹۲ء
۴۳۔ سلیم الرحمان: شام کی دہلیز' لاہور' لوگ پبلشرز' ۱۹۹۳ء
۴۴۔ سلیم شہزاد: قسم ہے کفارے کی' لاہور' بک ہوم' ۲۰۰۹ء
۴۵۔ سودا' مرزا محمد رفیع :(شمس الدین صدیقی' ڈاکٹر محمد 'مرتب): کلیات سودا' لاہور' مجلسِ ترقیِ ادب'جلد دوم' ۱۹۷۶ء
۴۶۔ سیّد مبارک شاہ، مدارنارسائی میں، لاہور: الرزاق پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء
۴۷۔ شاہین مفتی: کنارہ کس نے دیکھا ہے' کراچی' اکادمی بازیافت' ۲۰۰۹ء
۴۸۔ شہاب صفدر: نیلگوں' فیصل آباد' مثال پبلشرز' ۲۰۱۳ء
۴۹۔ شہریار: کلیاتِ شہریار' لاہور' سنگِ میل پبلی کیشنز' ۲۰۰۸ء
۵۰۔ شہزاد احمد: مٹی جیسے لوگ' لاہور' ملٹی میڈیا افئیرز' ۲۰۰۹ء
۵۱۔ شہزاد احمد: ٹوٹا ہوا پل' لاہور' سنگِ میل پبلی کیشنز' ۱۹۹۳ء
۵۲۔ شہزاد احمد:آنے والا کل' لاہور' ملٹی میڈیا افئیرز' ۲۰۰۵ء
۵۳۔ شہزاد احمد: خالی آسمان'لاہور' سنگِ میل پبلی کیشنز' ۱۹۸۵ء
۵۴۔ شہزاد احمد: اترے مری خاک پر ستارہ' لاہور' الحمد پبلی کیشنز' ۱۹۹۷ء
۵۵۔ شہزاد احمد، معلوم سے آگے، لاہور'الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء
۵۶۔ شہزاد نیئر، برفاب، لاہور: کاغذی پیرہن، ۲۰۰۸ء
۵۷۔ صفی حسن'ڈاکٹر: اگر ہم دو ر سے دیکھیں، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء
۵۸۔ ظفر علی خان: نگارستان' لاہور'یونائیٹڈ پلیشرز' س ن
۵۹۔ ظفر علی خان: بہارستان' لاہور' اردو اکیڈمی پنجاب' ۱۹۳۷ء
۶۰۔ عابد ودود: کڑی دھوپ کا مسافر' راولپنڈی' حرف اکادمی' ۲۰۰۳ء
۶۱۔ عامر سہیل: دجلۂِ دل' لاہور' بک ہوم' ۲۰۱۴ء
۶۲۔ عامر سہیل: شہیدِ عشق' لاہور' سانجھ پبلیشرز' ۲۰۰۹ء
۶۳۔ عامر سہیل: غدر کے پھول' لاہور' سانجھ پبلشرز' ۲۰۱۰ء
۶۴۔ عبدالرشید: انی کنت من الظالمین' لاہور' سانجھ پبلشرز' ۲۰۱۱ء
۶۵۔ عبدالرشید: بنکاک میں اجنبی' لاہور' ملٹی میڈیا افئیرز' ۲۰۰۵ء
۶۶۔ عبدالرشید: افتخار جالب کے لیے نوحہ اور دوسری نظمیں' لاہور' ملٹی میڈیا افئیرز' ۲۰۰۶ء

۶۷۔ فیض احمد فیض:نسخہ ہائے وفا‘ لاہور‘ مکتبہ کارواں‘ س ن
۶۸۔ مبارک احمد: کلیاتِ مبارک‘ لاہور‘ مبارک پبلشرز‘ ۱۹۹۹ء
۶۹۔ مبارک شاہ،سید: مدارنارسائی میں، لاہور: الرزاق پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء
۷۰۔ مبارک شاہ‘ سید: ہم اپنی ذات کے کافر‘لاہور‘ الرزاق پبلی کیشنز‘۱۹۹ء
۷۱۔ مجید امجد: کلیاتِ مجید امجد مرتبہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا‘ لاہور‘ الحمد پبلی کیشنز‘ ۲۰۱۰ء
۷۲۔ منیر نیازی: دیکھ دھنک پھیل گئی‘ کاغذی پیرہن‘ لاہور‘ ۲۰۰۳ء
۷۳۔ میر انیس: کلیاتِ انیس مرتبہ رانا خضر سلطان: کراچی‘ بک ٹاک‘ ۲۰۰۶ء
۷۴۔ میر حسن:خضر سلطان ‘ رانا (مرتب): مثنوی سحرالبیان‘ لاہور‘ بک ٹاک‘۲۰۰۵ء
۷۵۔ میر حسن: مثنویاتِ میر حسن‘ وحید قریشی‘ ڈاکٹر (مرتب) ‘ لاہور‘ مجلس ترقی ادب‘ ۱۹۶۶ء
۷۶۔ میرا جیؔ: کلیاتِ میراجیؔ مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی‘ لاہور‘ سنگِ میل پبلی کیشنز‘ ۱۹۹۶ء
۷۷۔ نسیم‘ دیا شنکر: گلزارِ نسیم‘ رشید حسن خان (مرتب)‘ لاہور‘ مجلس ترقی ادب‘ ۲۰۰۷ء
۷۸۔ نصیر احمد ناصر: تیسرے قدم کا خمیازہ‘ لاہور‘ سانجھ پبلیشرز‘ ۲۰۱۳ء
۷۹۔ نصیر احمد ناصر: پانی میں گم خواب‘ لاہور‘ تسطیر پبلشرز‘ ۲۰۰۲ء
۸۰۔ نصیر احمد ناصر: زرد پتوں کی شال‘ لاہور‘ سانجھ پبلشرز‘ ۲۰۱۳ء
۸۱۔ نصیر احمد ناصر:عرابچی سوگیا ہے‘ لاہور‘ تسطیر پبلشرز‘ ۲۰۰۲ء
۸۲۔ وزیر آغا: دن کا زرد پہاڑ‘ لاہور‘ جدید ناشرین‘ ۱۹۶۹ء
۸۳۔ یوسف ظفر: کلیاتِ یوسف ظفر مرتبہ ڈاکٹر تصدق حسین راجا‘ اسلام آباد‘ روداد پبلی کیشنز‘ ۲۰۰۵ء

تحقیقی و تنقیدی کتب:
۱۔ ابواللیث صدیقی‘ ڈاکٹر: جدید اردو ادبیات‘ کراچی‘ غضنفر اکیڈمی‘ ۱۹۸۹ء
۲۔ ابواللیث صدیقی‘ ڈاکٹر: آج کا اردو ادب‘ علی گڑھ‘ ایجوکیشنل بک ہاؤس‘ ۲۰۰۸ء
۳۔ احتشام علی (مرتب): مجید امجد نئے تناظر میں‘ لاہور‘ بیکن بکس‘ ۲۰۱۴ء
۴۔ احمد سہیل: ساختیات (تاریخ‘ نظریہ اور تنقید)‘ نئی دہلی‘قومی کونسل برائے فروغِ اردو‘۱۹۹۹ء
۵۔ اسٹیفن ڈبلیو ہاکنگ: (مترجم‘ یاسر جواد) کائنات کی تاریخ‘ اسلام آباد‘ مقتدرہ قومی زبان‘۲۰۱۰ء
۶۔ اسٹیفن ہاکنگ: مترجم علیم احمد‘ کائنات کا مکمل ترین نظریہ‘ کراچی‘ فضلی سنز۲۰۰۶ء
۷۔ اسٹیفن ہاکنگ: (مترجم‘ طفیل ڈھانہ‘ پروفیسر)‘ لاہور‘ فکشن ہاؤس‘۲۱۰۲ء
۸۔ انورسدید‘ ڈاکٹر: اردو ادب کی تحریکیں‘ کراچی‘ انجمن ترقی اردوپاکستان‘ ۱۹۹۱ء
۹۔ برائن گرین: (مترجم‘ یاسر جواد) نغمہ کائنات‘ اسلام آباد‘ مقتدرہ قومی زبان‘۲۰۱۱ء
۱۰۔ بورس مور: مذاہبِ عالم کا انسائیکلوپیڈیا‘ یاسر جواد (مترجم)‘ لاہور‘ نگارشات پبلشرز‘ ۲۰۰۶ء
۱۱۔ پرویز‘ غلام احمد: تصوف کی حقیقت‘لاہور‘ طلوعِ اسلام ٹرسٹ‘ ایڈیشن چہارم ‘ ۱۹۹۶ء

۱۲۔ پیارے لال، رائے بہادر: رسومِ ہند، لاہور، مجلسِ ترقیِ ادب، طباعت سوم، ۲۰۰۸ء
۱۳۔ ٹامس گولڈ سٹائین: جدید سائنس کا آغاز، مترجم رشید ملک، لاہور، مشعل، س ن
۱۴۔ جابر علی سید: استعارے کے چار شہر، شعری تنقید، بیکن بکس، لاہور، ۱۹۹۴ء
۱۵۔ جاوید شاہین(مرتب):آٹھ غزل گو، لاہور:مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۶۸ء
۱۶۔ جمیل جالبی ، ڈاکٹر (مرتب): میرا جی ۔ایک مطالعہ، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء
۱۷۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: معاصر ادب، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء
۱۸۔ جیلانی کامران: (میراجیؔ صدی۔منتخب مضامین) مرتبین: ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر عابد سیال، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۰ء
۱۹۔ حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز: اصنافِ ادب، لاہور، سنگت پبلیشرز، ۲۰۱۲ء
۲۰۔ حمید شاہد: راشدؔ۔میراجیؔ۔فیضؔ۔نایاب ہیں ہم، فیصل آباد، مثال پبلشرز، ۲۰۱۴ء
۲۱۔ حمید نسیم: پانچ جدید شاعر، لاہور، دارالشعور، ۲۰۱۵ء
۲۲۔ حنیف کیفی، ڈاکٹر: اردو میں نظمِ معرا اور آزاد نظم، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء
۲۳۔ خلاصۂِ توریت مع زبور و صحائفِ انبیاء، س ن ، لاہور، سکرپچر گفٹ مشن
۲۴۔ رابرٹ بریفالٹ: تشکیلِ انسانیت، عبدالمجید سالک (مترجم)، لاہور، مجلسِ ترقیِٔ ادب، ۱۹۹۴ء
۲۵۔ رشید امجد، ڈاکٹر: میراجی۔شخصیت اور فن، فیصل آباد، مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء
۲۶۔ رشید امجد، ڈاکٹر (مرتب): پاکستانی ادب (۲۰۰۸ء۔۱۹۴۷ء) (انتخابِ شاعری)، اسلام آباد، اکادمی ادبیاتِ پاکستان، ۲۰۰۹ء
۲۷۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر: اصنافِ ادب، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء
۲۸۔ زکریا، ڈاکٹر خواجہ محمد: اکبر الہ آبادی۔تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء
۲۹۔ زکریا، ڈاکٹر خواجہ محمد: چند اہم جدید شاعر، لاہور، سنگت پبلشرز، ۲۰۰۳ء
۳۰۔ زکریا، ڈاکٹر خواجہ محمد(مدیرِ اعلیٰ): تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند، لاہور، پنجاب یونی ورسٹی، جلد پنجم، ۲۰۱۲ء
۳۱۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر: اشاراتِ تنقید، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء
۳۲۔ شازیہ عنبرین، ڈاکٹر: ملتان میں جدید اردو نظم کی روایت،لاہور، بیکن بکس ، ۲۰۱۱ء
۳۳۔ شکیل الرحمٰن:اساطیر کی جمالیات، ہریانہ، مدھوبن، ۲۰۰۹ء
۳۴۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر: نئی پرانی قدریں، کراچی، مکتبہ اسلوب، ۱۹۶۱ء
۳۵۔ شیما مجید (مرتب): مقالات ن م راشد، کراچی، بک ٹائم، ۲۰۱۱ء
۳۶۔ صلاح الدین درویش، ڈاکٹر: انسان، کائنات اور سماج، لاہور، بیکن بکس،۲۰۱۱ء
۳۷۔ ضیا الدین احمد، پروفیسر: اقبال کا فن اور فلسفہ، لاہور، بزمِ اقبال، ۲۰۰۱ء
۳۸۔ ضیاالحسن، ڈاکٹر: جدید اردو نظم۔آغازوارتقا، لاہور، سانجھ، ۲۰۱۲ء
۳۹۔ طارق ہاشمی: اردو نظم اور فرد کی جستجو،(غیر مطبوعہ(
۴۰۔ طاہر القادری،ڈاکٹر، اسلام اور جدید سائنس، لاہور:منہاج القرآن پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء

۴۱۔ طاہرہ پروین: تنقیدی اور تہذیبی مطالعے، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۲۰۰۷ء
۴۲۔ عبدالرئوف نوشہروی، پروفیسر: سائنس اور مسائلِ امروز، کراچی، ایجوکیشنل پریس، ۱۹۸۲ء
۴۳۔ عبداللہ حرم زئی، ڈاکٹر: دام شعور___ سائے سراب التباس، لاہور: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۲ء
۴۴۔ عتیق احمد: فیض، عہد اور شاعر، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱ء
۴۵۔ علی عباس جلال پوری، سید: جنسیاتی مطالعے، لاہور، تخلیقات پبلشرز، ۲۰۱۳ء
۴۶۔ علی عباس جلال پوری، سید: کائنات اور انسان، لاہور، تخلیقات پبلشرز، ۲۰۱۳ء
۴۷۔ علی عباس جلال پوری، سید: عام فکری مغالطے، لاہور، تخلیقات پبلشرز، ۲۰۱۳ء
۴۸۔ علی عباس جلال پوری، سید: اقبال کا علم الکلام، لاہور، تخلیقات پبلشرز، ۲۰۱۳ء
۴۹۔ علی عباس جلال پوری، سید: خرد نامہ جلال پوری، لاہور، تخلیقات پبلشرز، ۲۰۱۳ء
۵۰۔ علی عباس جلال پوری، سید: رسومِ اقوام، لاہور، تخلیقات پبلشرز، ۲۰۱۳ء
۵۱۔ عہدی پوری، دین محمد شفیقی: فلسفۂ ہندو یونان، لاہور، مجلسِ ترقیِ ادب، ۲۰۱۰ء
۵۲۔ غلام جیلانی برق، ڈاکٹر: عظیم کائنات کاعظیم خدا، لاہور، الفیصل ناشران و تاجران کتب، ۲۰۱۱ء
۵۳۔ غلام رسول مہر (مرتب): سرود فتنہ، لاہور، کتاب منزل،۱۹۵۹ء
۵۴۔ غیاث چوہدری: کائنات اور ہم، لاہور، ٹیکنیکل پبلشرز، ۱۹۹۴ء
۵۵۔ فتح محمد ملک، ڈاکٹر: فیض۔شاعری اور سیاست، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء
۵۶۔ فخرالحق نوری، ڈاکٹر: مطالعہ راشدؔ، فیصل آباد، مثال پبلیشرز، ۲۰۱۰ء
۵۷۔ فخرالحق نوری، ڈاکٹر(مرتب): بیادِ راشد ، لاہور، اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی، ۲۰۱۴ء
۵۸۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر (مرتب): اردو ادب کی فنی تاریخ، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء
۵۹۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر(مرتب): مشمولہ اردو ادب کی فنی تاریخ، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء
۶۰۔ فیضان اللہ خان (مئو لف): ہماری کائنات، لاہور، ۱۹۹۶ء، اردو سائنس بورڈ
۶۱۔ کارل پوپر: مترجم ڈاکٹر ساجد علی، سائنس اور تہذیب، لاہور، مشعل، ۱۹۹۷ء
۶۲۔ کارل ساگان:کائنات، (مترجم منصور سعید) لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۱ء
۶۳۔ کوثر مظہری: جدید نظم: حالی سے میرا جی تک،مظہرپبلی کیشن، نئی دہلی ، نومبر۲۰۰۵ء
۶۴۔ کین ولبر: (مترجم امیر خان حکمت)، سائنس اور مذہب کا سنگم، کراچی، سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۳ء
۶۵۔ لطیف قریشی: جیلانی کامران۔ایک مطالعہ، ملٹی میڈیا افیئرز، ۲۰۰۴ء
۶۶۔ محمد اقبال، ڈاکٹر:تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ: مترجم نذیر نیازی ، سید، لاہور، بزمِ اقبال، ۲۰۱۲ء
۶۷۔ محمد فرمان، پروفیسر: اقبال اور تصوف، لاہور، بزمِ اقبال، ۲۰۰۰ء

۶۸۔ محمداقبالؒ' ڈاکٹرعلامہ: کلیاتِ اقبال' لاہور' اقبال اکادمی' ۱۹۹۷ء
۶۹۔ محمود انور' پروفیسر: جدید طبیعیات کاتعارف' لاہور' مجلسِ ترقیِ ادب'۱۹۶۵ء
۷۰۔ محمود علی سڈنی' ڈاکٹر: فلسفہ' سائنس اور کائنات' لاہور' الفیصل ناشران و تاجران کتب' ۱۹۹۵ء
۷۱۔ محمود علی' ڈاکٹر:کائنات اور اس کے مظاہر' لاہور' اردو سائنس بورڈ'۱۹۹۶ء
۷۲۔ میرا جی: اس نظم میں' کراچی' آج پبلشرز' ۲۰۰۲ء
۷۳۔ ناہید قاسمی' ڈاکٹر: جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری' کراچی' انجمن ترقی اردو پاکستان' ۲۰۰۲ء
۷۴۔ نثار اکبر آبادی: شعر اور فنِ شعر' لاہور' جاسم پبلی کیشنز' ۲۰۱۳ء
۷۵۔ نسیم عباس احمر (مرتب و مدون:) ن۔م۔راشدؔ کے خطوط ' لاہور' پاکستان رائٹرز کو آپریٹو سوسائٹی' ۲۰۰۸ء
۷۶۔ نظیر حسین زیدی' پروفیسر ڈاکٹر: مولانا ظفر علی خان بہ حیثیت شاعر' کراچی' انجمن ترقی اردو پاکستان' ۱۹۷۹ء
۷۷۔ نیاز احمد صوفی: ناتمام کائنات' لاہور' اردو سائنس بورڈ' ۲۰۰۳ء
۷۸۔ نیاز فتح پوری' علامہ: خدا اور تصورِ خدا' لاہور' فکشن ہاؤس' ۲۰۱۲ء
۷۹۔ وزیر آغا' ڈاکٹر: اردو شاعری کا مزاج' لاہور' مجلسِ ترقیِ ادب' ۲۰۰۸ء
۸۰۔ وزیر آغا' ڈاکٹر: نظم جدید کی کروٹیں' لاہور' سنگت پبلشرز' ۲۰۱۳ء
۸۱۔ وزیر حسن عابدی: زمان و مکان' لاہور' ادارہ رُشنائی' س ن
۸۲۔ وین برگ: (مترجم' ارشد رازی) سائنسی نظریہ تخلیق کائنات' لاہور' نگارشات پبلشرز'۲۰۰۹ء
۸۳۔ ہادی حسین' ڈاکٹر: مغربی شعریات' لاہور' مجلسِ ترقیِ ادب'۲۰۰۵ء
۸۴۔ ہادی حسین' محمد: شاعری اور تخیل' لاہور' مجلسِ ترقیِ ادب' ۲۰۰۵ء

مقالات:

۱۔ ناہید قمر: جدید اردو فکشن میں تصورِ وقت' مخزونہ نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز' اسلام آباد'مقالہ پی ایچ ڈی
)غیر مطبوعہ) ۲۰۰۵ء
۲۔ سعید احمد: اردو شعرا کا سائنسی شعور (غیر مطبوعہ مقالہ)' مخزونہ گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی' فیصل آباد' ۲۰۱۱۲ء
۳۔ محمد سلیم: پاکستان میں جدید اردو نظم نگاری کا ارتقاء' (مقالہ پی ایچ ڈی غیر مطبوعہ)' مخزونہ جامعہ پشاور' ۲۰۰۳ء
۴۔ منصور احمد قریشی: جوشؔ کی نظم نگاری اوراردو شاعری پر اُس کے اثرات' (پی ایچ ڈی مقالہ غیر مطبوعہ)' مخزونہ
بہائوالدین زکریا یونی ورسٹی' ملتان' ۲۰۰۴ء

رسائل و جرائد:

۱۔ نظم کائنات،ماہنامہ، کراچی' مارچ ۲۰۱۱ء

۲۔ وجدان، لاہور: شمارہ ۱۸،اپریل ۲۰۰۹ء
۳۔ جدید ادب‘ جرمنی‘شمارہ نمبر ۱۶‘ جنوری تا جون ۲۰۱۱ء
۴۔ جدید ادب‘جرمنی‘شمارہ نمبر۱۹‘ جولائی تا دسمبر‘۲۰۱۲ء
۵۔ سپوتنک، لاہور: جلد ۱۱، شمارہ ۷، جولائی ۲۰۰۰ء
۶۔ مشمولہ تکوین‘ لاہور‘ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی‘ ۱۹۹۷ء
۷۔ دیدہ و(آن لائن شمارہ)‘ علی گڑھ‘ شمارہ دوئم‘ جون تا اگست ۲۰۰۸ء

لغت و فرہنگ:

۱۔ حفیظ صدیقی‘ ابوالاعجاز: کشاف تنقیدی اصطلاحات‘ اسلام آباد‘ ۱۹۸۵ء
۲۔ منصور پوری‘ قاضی عبدالکبیر: فرہنگِ اصطلاحاتِ تصوف‘ لاہور‘ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی‘ ۲۰۱۱ء
۳۔ قاسم محمود‘ سید: شاہکار سائنس انسائیکلوپیڈیا‘ کراچی‘ شاہکار بک فائونڈیشن‘ ۱۹۸۷ء
۴۔ Dictionary of Science, Oxford: Oxford University Press, 2010

مکتوب:

۱۔ جاوید شاہین: مکتوب بنام ڈاکٹر سعید احمد، مؤرخہ ۹/مارچ ۲۰۱۲ء